

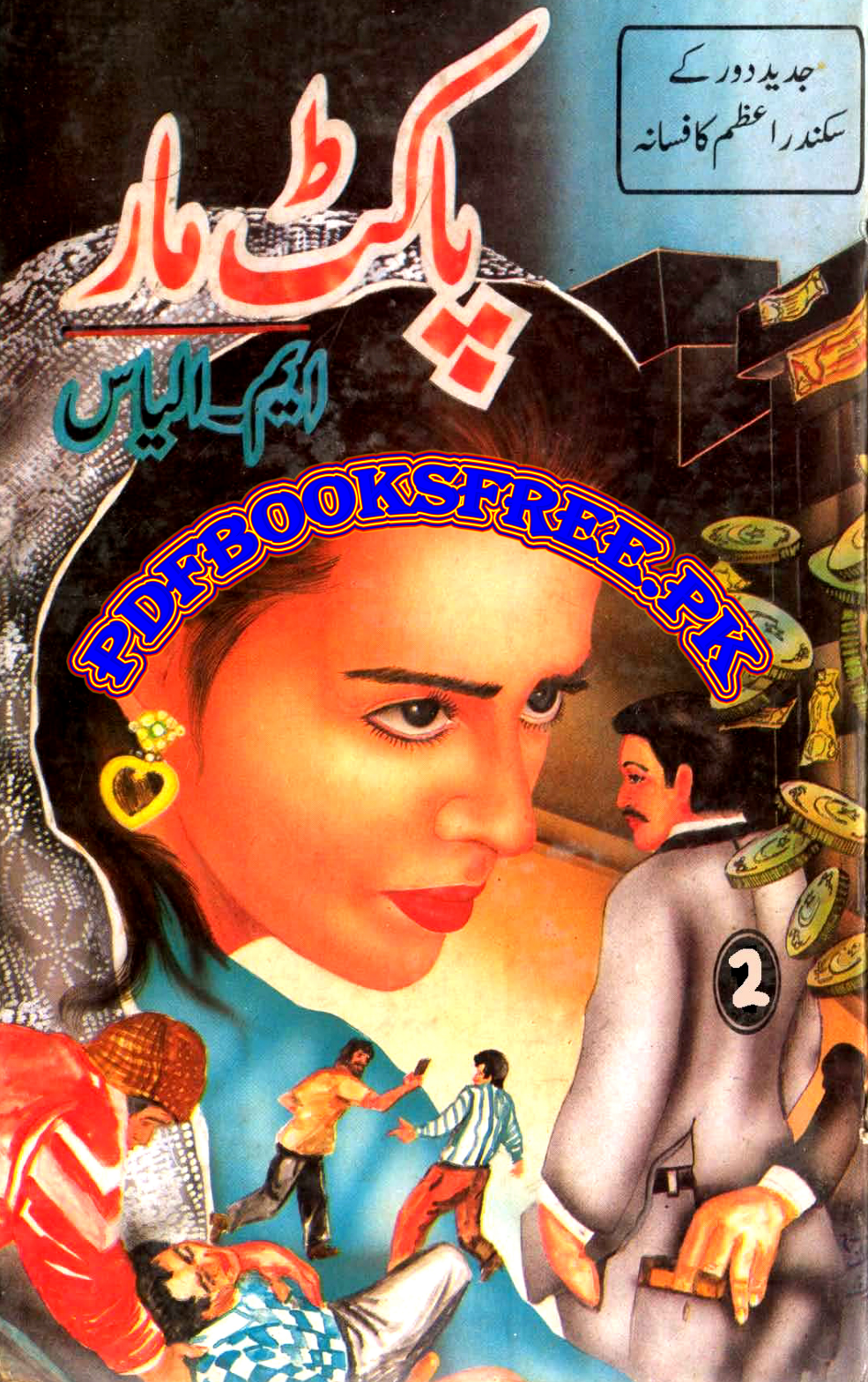
جدید دور کے  
سکندر اعظم کا فسانہ

# کاکٹ مار

انیم لیلیس

PDFBOOKSFREE.PK

2



شکاری انگلیوں کی روداد جو دوسروں کی جیبوں میں ریٹنے کی عادی تھیں  
جدید دور کے سکندر اعظم کا فسانہ

2

# پاکستان

ایم الیاس

گل قریش پبلی کیشنز اینڈ لائبریری

۱۱۔ عمر روڈ، اسلام پورہ، لاہور

چاقو نکل کر میرے ہاتھ میں آگیا۔

نسرین نے جیسے ہی چاقو دیکھا اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ غالباً اسے ہونٹل کے کیبن کا وہ منظر یاد آگیا تھا جب میں نے اس کے بھائی جان کو اسی چاقو کی نوک پر بے بس کر دیا تھا حالانکہ اس کے ہاتھ میں ریوالتور موجود تھا۔

”لڑنا اور ہاتھ پائی کرنا عورتوں کا کام نہیں نسرین بیگم۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ تم اپنے ہاتھ پیروں کے استعمال سے واقف ہو... لیکن میں ان مردوں میں سے نہیں ہوں جو خواتین کے ہاتھوں بے بس ہو جاتے ہیں۔“

میری تمام تر توجہ نسرین کی طرف تھی اس لیے میں یہ نہیں دیکھ سکا کہ نومی کب چپکے سے کھسکتی چلی گئی... اور جب میں اس کی طرف متوجہ ہوا تو وہ نہ صرف باہر نکل گئی تھی بلکہ اس نے دروازہ بھی بند کر دیا تھا۔ نسرین کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے جو چمک پیدا ہوئی تھی وہ یکایک زائل ہو گئی اور اس کی جگہ مسکراہٹ نے لے لی۔

”تمہاری یہی ادا مجھے بے حد پسند ہے۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”ورنہ یقین کرو‘ مردوں سے متاثر ہونا میں نے بھی نہیں سیکھا۔ میں ایک بار پھر تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتی ہوں۔“

”ان ہاتھوں کو مجھ سے دور رکھو جو وقت اور حالات کے تحت دوستی اور دشمنی کے ہاتھ بن جاتے ہیں۔“

میں نے چاقو کی نوک پر انگوٹھا رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں اب تمہاری باتوں میں نہیں آؤں گا۔“

اس کے لبوں پر مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔

اسی لمحے دروازہ کھلا اور نومی نظر آئی۔ اس کے پیچھے باوردی پولیس والوں کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے میں سانس لینا بھول گیا۔ دروازہ کھلنے سے مھض ایک لمحہ قبل میں نے چاقو والا ہاتھ اپنے پتلو میں جھکا لیا تھا پھر میرا ہاتھ آہستہ آہستہ جیب میں ریک گیا۔ پولیس والے میرے ہاتھ میں چاقو نہیں دیکھ سکے تھے۔ تاہم میں حیران اس بات پر تھا کہ نومی نے اتنی جلدی پولیس والوں کو کیسے بلایا۔

نومی کے ساتھ پولیس والوں کو دیکھ کر میں سمجھ گیا... اس نے سوچا ہو گا کہ وہ خود تو اپنی ماکن کو میرے ہاتھوں سے بچا نہیں سکتی تو کیوں نہ پولیس کی مدد حاصل کر لے۔ شاید اس نے دل میں یہ بھی سوچا ہو گا کہ اس کی یہ



نسرین نے مسکراتے ہوئے نومی سے کہا۔ ”سکندر صاحب! میرے دوستوں میں سے ہیں۔ ہمارے درمیان جو غلط فہمی تھی وہ دور ہو گئی۔“

... نومی کے چہرے پر گہرا استعجاب چھا گیا۔ وہ نسرین کی بات سن کر متذبذب ہو گئی تھی جیسے سوچ رہی ہو کہ آخر کس طرح سے اس کی مانگن اور مجھ میں دوستی ہو گئی۔ اور غلط فہمی یکایک ہی کیسے دور ہو گئی۔ جب کہ کچھ دیر پہلے تو معاملہ سنگین صورت اختیار کر گیا تھا۔

”میں اب چلا ہوں۔“ میں نے کہا۔

نسرین نے چونک کر میری طرف دیکھا اور حیرت سے پوچھا۔ ”کمال جا رہے ہو؟“

”اپنے گھر۔ اور کمال؟“

”اگر تمہیں بڑے گھر جانا ہوتا تو کبھی نہ روکتی۔“ اس نے ٹھیکسی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”چھوٹے گھر جا کر کیا کرو گے۔ یہیں رک جاؤ؟“

”سرکاری مہمان خانے میں تو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ وہاں بڑی خاطر مدارت ہوتی ہے۔ یہاں رک کر کیا کروں گا؟“

نسرین کے رخساروں پر سرخی پھیل گئی اور اس کے گداز ہونٹوں پر تبسم بکھر گیا۔ وہ چپکتی ہوئی سی بول۔۔۔ ”سرکاری اور نجی مہمان خانوں کی خاطر تواضع میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔“

”لگتا ہے کہ تم دونوں طرح کی مہمان نوازی سے مستفید ہو چکی ہو۔“

وہ میری بات نظر انداز کر گئی۔ ”دوپہر کا کھانا کھاؤ اور قیلولہ بھی کر لیتے۔ آج نومی بازار سے پھولی لے کر آئی ہے۔ دال چاول بنائے ہیں۔ نومی پھولی بہت اچھی بناتی ہے۔ انگلیاں چائے رہ جاؤ گے!“

”کس کی انگلیاں؟“ میں نے معنی خیز نظروں سے نومی کی طرف دیکھا جو اپنی تعریف سن کر خوش ہو رہی تھی۔ وہ مجھے اس انداز میں متوجہ پا کر الجھ گئی اور اپنی ساڑھی کا پلو درست کرنے لگی۔ پھر میں نے اس کی گندی رنگت کی ہانپوں اور ہاتھوں کی طرف دیکھا تو اس نے آنکھوں پر گھنیری پلکیں گرا لیں۔ سڈول کلاسیاں، نرم و نازک ہاتھ اور لمبی لمبی غرو ملی انگلیاں بہت خوش نما تھیں۔ ان خوبصورت ہاتھوں کے پکے ہوئے کھانوں میں یقیناً

لذت ہوگی۔ اور پھر گھریلو عورتوں کے پکائے ہوئے کھانے تو یوں بھی میری کمزوری تھی۔۔۔ ایک طرف کھانے کی دعوت پر رک جانے کو بی چاہ رہا تھا۔ دوسری جانب ایک نامعلوم سا خوف تھا۔ میری جیب میں سو تو لے سوتا تھا۔

کسی بھی لمحے کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آ سکتا تھا۔ نسرین کا کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ اس نے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ مفاہمت بھی کر لی تھی اور اس کی دلی خواہش بھی تھی کہ میں اس کے ساتھ ایک گھر میں رہوں اور اس کے ساتھ مل کر کام کروں لیکن میں جانتا تھا کہ آگ اور پانی کا سیل کبھی نہیں ہو سکتا۔ نسرین کسی ذہربلی مانگن کی طرح تھی۔ وہ کسی بھی لمحے مجھے ڈس سکتی تھی۔ اور پھر یہ سونا جب تک میری جیب میں تھا میرے لیے کسی پناہ کے بوجھ سے کم نہیں تھا۔ اس بوجھ کو اپنے کندھوں سے ہٹانے کے علاوہ مجھے ابھی نسرین سے چھٹیس ہزار کی رقم بھی وصول کرنا تھی۔۔۔ میں نے سوچانی اٹھال یہ سونا کیسے چھپا دوں اور اس کے بعد رقم حاصل کر کے دونوں چیزیں ایک ساتھ ان لوگوں کے حوالے کر دوں گا تو وہ خوشی سے نمل ہو جائیں گے۔ ”یہ دعوت کسی اور دن پر اٹھا رکھو“

تمہارا گھر تو دیکھ لیا ہے لہذا اب آتا جاؤ ہوں گا۔“

حکمت نسرین کے لیے پریشانی اور کسی مصیبت کا باعث بن سکتی ہے۔ کیوں کہ میں اپنے دفاع میں اس کی مانگن پر الزام تراشی کر سکتا تھا۔ جس سے پولیس نسرین پر شبہ کر سکتی تھی اور اسے پوچھ گچھ کے لیے واکن پر اور پھر تھانے بھی لے جاسکتی تھی۔ سلازمین آسانی سے نسرین کو شناخت کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ چوری کی کار بھی گیران میں بند تھی۔ اگر نومی کے دماغ میں یہ ساری باتیں آجائیں اور اس میں کچھ عقل ہوتی تو وہ پولیس تک جتنے کی حماقت نہ کرتی۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ کلن سے تھیر تو کل ہی چکا تھا۔

میں نے نومی کے چہرے سے بھانپ لیا کہ وہ مجھے اور نسرین کو دوستانہ حالت میں دیکھ کر بچتا رہی ہے۔ جب کہ معاملہ برعکس تھا۔

سب انسپکٹر نے آگے بڑھ کر نسرین سے پوچھا۔ ”کیا وحید الدین گھر ہیں؟“

”کون وحید الدین؟“ نسرین نے متوجہ ہو کر انسپکٹر کی طرف دیکھا۔ ”یہاں تو اس نام کا کوئی آدمی نہیں رہتا۔“

”وحید الدین ایسٹرن ایکسپورٹ اینڈ امپورٹ کارپوریشن کے مالک ہیں۔“

”اچھا وہ۔“ نسرین نے جیسے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ شاید اسے کچھ یاد آ گیا تھا۔

اس سے کہیں زیادہ سکون اور طمانیت مجھے محسوس ہوئی۔ مجھے ٹھنڈے ٹھنڈے پینے چھوٹ رہے تھے اور میری پیشانی عرق آلود تھی۔۔۔ میں ان پولیس والوں کو دیکھ کر دل میں کہہ رہا تھا، بیٹا سکندر تم پھر اس کے ہاتھوں گھٹکت کھا گئے ہو، بہر حال، اب میری کیفیت دوسری تھی میں دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اس نے مجھے

ایک بڑی مصیبت سے نجات دلادی ہے۔

نسرین نے ساڑھی کا پلو شانے پر درست کیا اور باہر نکل گئی۔ اس نے برآمدے میں جا کر اس بیگے کی طرف اشارہ کیا جو دائیں طرف واقع تھا۔ ”وحید الدین کا گھر وہ ہے۔ ان کے گیٹ پر ان کے نام کی تختی لگی ہوئی ہے اور اس تختی پر ان کے گھر کا نمبر بھی لکھا ہوا ہے۔“ اس کا لہجہ تند تھا۔

”اوہ!“ سب انسپکٹر جھپٹ سا گیا اور سر کھاتے ہوئے بولا۔ ”مخاف کیجئے۔ میں اس زحمت کے لیے آپ سے شرمندہ ہوں۔“ پھر توقف کر کے اپنے ساتھی پر برس پڑا۔ ”گدھے کے بچے، تمہاری وجہ سے مجھے شرمندگی اٹھانا پڑی۔ تم لوگوں کی عقل نہ جانے کہاں گھاس چرنے جاتی ہے۔“

نومی نے جلدی سے خود پر قابو پا کر نسرین سے شکایتی لہجے میں کہا۔ ”میں نے ان لوگوں سے کہا تھا کہ وحید الدین یہاں نہیں رہتے لیکن انہوں نے میری ایک نہ سنی۔ اللہ مجھے دھمکیاں دیں اور بری طرح ڈانٹا تھا۔“

”گو یا ہمیں دانستہ تنگ کیا گیا ہے۔“ نسرین نے برہم ہو کر گئی۔ ”میں ایس ایچ او سے شکایت کروں گی۔“

”میں سمجھا تھا کہ یہ لڑکی ملازمہ ہے اور اپنے مالک کو بچانے کے لیے جھوٹ بول رہی ہے۔“ سب انسپکٹر کھیا کر بولا۔ ”آپ تو جانتی ہیں کہ پولیس کسی شکی مزاج بیوی کی طرح ہوتی ہے۔“

”وحید الدین کو کس سلسلے میں تلاش کیا جا رہا ہے؟“ میں نے غیر ارادی طور پر پوچھا۔

”وہ ایکسپورٹ کی آڑ میں منشیات بھیج رہا ہے۔ اس کی گرفتاری کا وارنٹ ہے۔“

سب انسپکٹر معذرت کرتا ہوا اپنے آدمیوں کو لے کر چلا گیا تو نسرین اور نومی اندر آئیں۔ نسرین نے دروازہ بند کیا۔ نومی مجھے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر وہ ہلٹی اور اپنی مانگن کی طرف دیکھا۔



چاہتا ہوں۔

پہلے ایک گلاس پانی تو پلاؤ تاکہ سینے میں گلی آگ تو بجھے۔" میں نے اس سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ "پانی پی چکنے کے بعد شاید کھانے کا موڈ بھی بن جائے۔"

"واقعی!..." اس کا چہرہ خوشی سے دھنکے لگا۔ "یقین کرو میں نے تمہارے لیے سوشل کھانا بکوا یا ہے۔" مصروف میں ابھی پانی لے کر آتی ہوں۔

"تم کیوں تکلیف کرتی ہو؟" میں نے کہا اور اس کے ساتھ ہی کمرے کی طرف چل دیا۔ "یہ کام تو نوی بھی کر سکتی ہے۔" میں نے کمرے میں پہنچ کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں... میں خود ہی لے کر آتی ہوں۔" وہ بولی "نوی شاید اپنے کام میں مصروف ہوگی۔"

نسرین جس پر اسرار انداز میں بچن کی طرف لپکی اس سے میرا ہاتھ اٹکا پھر میں اپنی جگہ بیٹھانہ رہ سکا میں بھی دبے پاؤں اسی سمت لپکا اور بلورچی خانے کے باہر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

نسرین سرگوشی کے انداز میں نوی سے کہہ رہی تھی۔ "تم فوراً" بھولو کے پاس جاؤ اور اس سے کوکے اپنے ساتھ تین چار سلخ آدی لائے تاکہ..."

مجھے نسرین کی پوری بات سننے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں اپنی جگہ آکر بیٹھ گیا۔ وہ جو چال چل رہی تھی میری سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ اپنی تدبیر کو ذکی کارنگ دے رہی تھی کہ میں اس پر شک نہ کروں۔ میں نے اس کے قدموں کی چاپ سنی تو اپنی آنکھیں بند کر لیں، اپنا سر صوفے کی پشت گھسے گا دیا اور اپنی ٹانگیں پسار لیں۔ اس نے قریب پہنچ کر میرا شانہ ہلایا۔ "سکندر صاحب پانی حاضر ہے۔"

میں نے پانی پی کر گلاس واپس کیا وہ گلاس لے کر بلورچی خانے کی طرف گئی تو میں پک کر بیرونی دروازے پر پہنچا اور اسے تھوڑا سا کھول کر باہر جھانکا۔ نوی تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی مجھے گیٹ سے نکلتی ہوئی دکھائی دی۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی اسے یہ خیال آسکتا تھا کہ میں اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ گھبرائیں نے پورا دروازہ کھول دیا۔

نسرین میرے پاس آئی۔ اس نے مجھے دروازے کے پاس کھڑے دیکھا تو اس کے چہرے پر شدید حیرت چھا گئی۔ "کیا ہوا؟ کمال جا رہے ہو؟"

"گھر..." میں نے جواب دیا۔

"مگر تم نے کہا تھا کہ..."

"پانی پی کر میرے ہوش ٹھکانے آ گئے ہیں۔ مجھے دیر ہو رہی ہے اور ہاں تمہاری نوازشات کا بہت شکریہ۔"

پھر میں نے نسرین کے جواب کا انتظار نہیں کیا اور نہ ہی اسے قریب آنے کا موقع دیا۔ میں نے باہر نکلنے وقت اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑسا گیا تھا۔ وہ مجھے پکارتی ہوئی گیٹ تک آئی تھی۔

باہر آکر میں نے ایک خالی جیسی کو روکا اور اس میں سوار ہو گیا۔ جیسی چل پڑی تو میں نے عقب میں جھانک کر دیکھا۔ نسرین گیٹ کے باہر کھڑی میری جیسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ اندر ہی اندر پیچ و تلب کھا رہی تھی۔ میں نے اپنا ہاتھ کھڑکی سے باہر نکال کر لہرایا تو اس کا ہاتھ جوابی طور پر اٹھ نہ سکا۔

میں اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر تیزی سے گھوما اور دروازے کی طرف بڑھا تو نسرین لہراتی ہوئی میرے پیچھے چلی آئی۔ "سکندر! پلیز میری بات تو سنو۔"

میں رکا تو وہ میرے قریب پہنچ کر رکی۔ نوی تیزی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی، جیسے اس نے نسرین کے خیالات پڑھ لیے ہوں اور ہم دونوں کی تھلی میں قفل نہ ہونا چاہتی ہو۔ وہ جیسے اپنی مالکن کی مزاج آشنا تھی اور اس کے مطابق عمل کرنے کی عادی بھی۔

نوی کمرے سے نکل گئی تو نسرین نے مجھے شوخ نگاہوں سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نشہ تھا۔ وہ رسیلی آواز میں بولی۔ "رک بھی جاؤ تاکہ کھانا کھا کر جاؤ گے تو میرا دل بھی خوش ہو جائے گا۔"

"مگر میرا اس وقت جانا بہت ضروری ہے۔" میں نے اس کی محمور نگاہوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "تمہیں گھر جا کر کرنا بھی کیا ہے؟" وہ میرے قریب آگئی۔ "تمہارے کون سے بیوی بچے ہیں جو گھر پر تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔" لگتا ہے تم میری کسی بات پر ناراض ہو گئے ہو۔"

"تم سنے ناراض ہو کر میں کہاں جاؤں گا۔ میں کل صبح تمہارے ہاں ناشتے پر پہنچ رہا ہوں۔ کل سارا دن ہی تمہارے گھر میں اور تمہاری ان حسین آنکھوں کے سامنے رہوں گا۔ کل تم کھانا کھلاؤ یا زہر کھلاؤ یا ان آنکھوں سے شراب پلاؤ، یہ تم پر منحصر ہے۔"

"میں آج کی بات کر رہی ہوں۔" اس کی آنکھوں کی شوخی، دزدیگی میں بدل گئی۔ "کل آؤ گے تو آنکھوں ہی میں نہیں، دل میں بھی بٹھاؤں گی۔"

میرے انکار کے باوجود نسرین مجھے روکنے پر اصرار کیے مگر تو میرے دل میں شکوک و شبہات پیدا ہونے لگے۔ مجھے اس طرح زبردستی روکنے کا مقصد، سونے کا حصول ہی ہو سکتا تھا۔ معلوم نہیں اس کے ذہن میں مجھ سے سونا حاصل کرنے کی کون سی تدبیر تھی! صرف یہ امکان تھا کہ شاید اس کے غنڈے دوست کچھ دیر میں وہاں پہنچنے والے ہوں، جن کی مدد سے وہ مجھ سے سونا چھین لینا چاہتی ہو، اسے اپنے حسن و شباب پر بہت غرور تھا۔ اگر وہ اس انداز سے سوچ رہی تھی تو یہ اس کی بھول تھی۔ مجھ پر اس کے حسن کا جادو نہیں چل سکتا تھا جو دنیا کو فتح کرنے نکلا ہو، اس پر فتح یاب ہونا اتنا آسان نہیں ہوتا۔

"اوکے سویت بے بی! کل صبح میں جوئے کی رقم لے کر پہنچ رہا ہوں۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ پھر میں دروازے کی طرف بڑھا تو وہ لپک کر میری راہ میں حائل ہو گئی اور دوسرے ہی لمحے دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ "کل کس نے دیکھا ہے سکندر۔" اس کا لہجہ جذباتی ہو گیا۔ "اگر تم کھانا کھا کر نہیں جاؤ گے تو پھر میں بھی نہیں کھاؤں گی اور پھر مجھ میں انتظار کی تاب بھی تو نہیں۔ کیا میں صبح تک بھوک رہوں؟"

"شاعر کہتے ہیں کہ انتظار میں جو لذت، کیفیت اور انوکھا مزاج ہے وہ کسی دوسری بات میں نہیں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ بھوک صحت کے لیے بہت ضروری ہے۔" میں نے کہا۔

"لیکن دل کے معاملات مختلف ہوتے ہیں۔" اس نے مجھے عجیب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں ان کا بھی خیال رکھنا چاہئے۔"

مجھے اس سے جان چھڑانا مشکل ہو رہا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ اس کی یہ عشوہ طرازیوں میرے پاس موجود سو تو لے سونے کے سبب ہیں تاہم میں اسے یہ تاثر دیتا نہیں چاہتا کہ میں کسی خدشے کے تحت اس سے جان چھڑانا

کچھ دور جانے کے بعد مجھے اچانک جی کا خیال آیا۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو واپس چلنے کے لیے کہا۔ تاکہ جی کو ہوٹل میں دیکھ لوں۔ واپسی پر مجھے نسرین کے گھر کے سامنے سے گزرنا پڑا تھا۔ مجھے نسرین نظر نہیں آئی۔ اس کا منصوبہ اور حورارہ کیا تھا۔ میں نے ٹیکسی ہوٹل کے سامنے رکوائی۔ ہوٹل کے اندر جا کر دیکھا تو جی نہیں تھا۔ پھر میں دوبارہ ٹیکسی میں آکر بیٹھ گیا۔ واپسی پر نسرین کے گھر کے سامنے سے گزرتے وقت میں نے بھولو اور اس کے ساتھیوں کو نسرین کے گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ تعداد میں چار تھے۔ بظاہر وہ مسلح نظر نہیں آرہے تھے۔ مگر ان کے پاس چاقو، چمچے اور پستول ہو سکتے تھے۔ ان دنوں کراچی میں دن دھاڑے اور رات کے وقت گھروں میں مسلح پرہیزگاروں کا ڈکیتی کرنا عام ہو رہا تھا۔ پولیس ان دلیرانہ اور ہولناک وارداتوں کو روکنے اور ان پر قابو پانے میں بری طرح ناکام ہو چکی تھی۔ میں بھولو کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ نائی گرائی غنڈہ تھا۔ برسوں اس نے اپنے جرم کی سزا کائی تھی۔ اس نے سوسائٹی کے علاقے میں جیولری کی ایک دکان لوٹنے کی کوشش کی تھی۔ وہ گرفتار ہو گیا تھا اور آج کل ضمانت پر رہا ہو کر آیا تھا۔ میں تصور میں نسرین کو کڑھتے دیکھ رہا تھا۔ میرے ہاتھوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

جی میرے گھر کے سامنے میرے انتظار میں بے چین ہو کر ٹھل رہا تھا۔ اس نے مجھے ٹیکسی سے اترتے دیکھا تو لپک کر میرے پاس آیا۔ "خیریت تو ہے سکندر بھائی۔"

"بالکل خیریت ہے۔" میں اسے پریشان دیکھ کر مسکرایا۔ "میں خداوند کے فضل و کرم سے کامیاب لوٹا ہوں۔"

ہم دونوں کمرے میں پہنچ گئے۔ پھر میں نے تفصیل سے اسے سارے واقعات سنا دیے۔ جی نے ساری کہانی سننے کے بعد تبصرہ کیا۔ "سکندر بھائی! نسرین نے آپ سے جھوٹ بولا ہے۔ چکیں ہزار بھی اسی کے پاس ہیں۔ وہ ایک نمبر کی مکار اور جھوٹی ہے۔ چکیں ہزار کی رقم وہ ہضم نہیں کر سکتی۔ وہ ایک ناگن ہے جو کسی بھی لمحے آپ کو ڈس سکتی ہے۔ مگر سکندر بھائی۔" جی نے توقف کر کے گہرا سانس لیا۔ اس کا چہرہ مجھ گیا تھا۔ "آپ اس خبیث شخص کو مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ بظاہر وہ سیدھا سادہ مگر احمق آدمی دکھائی دیتا ہے۔ اس کی باتیں اور حرکتیں بھی کچھ ایسی ہی ہیں مگر وہ اندر سے بڑا کایاں اور خطرناک ہے، ظالم اور شقی القلب ہے، سنگڑ ہے اور بے ضمیر پولیس والوں سے اس کی دوستی باری ہے۔ غنڈے تو پالتو کتوں کی طرح اس کے غلام ہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ آپ کو بخش دے گا۔ وہ رقم اور سونا ہاتھ سے نکل جانے کے بعد خاموش بیٹھا رہے گا۔ وہ تو آپ کی جان کو آجائے گا۔"

میں جی کی باتیں سن کر مسکرایا۔ اس کا خوف اپنی جگہ بجا تھا۔ میں نے اسے تسلی دینے کے لیے کہا۔ "میں اس کینہ فطرت شخص سے اچھی طرح واقف ہوں۔ یوں بھی ہماری زندگی کا مقصد تو خطرات سے کھیلنا ہی رہ گیا ہے۔ جیسے ہم راہن ہڈیا ہرام ڈاکو قسم کی کوئی چیز ہوں۔ اگر اس ذلیل شخص نے ایسی کوئی حرکت کی تو اس سے اسی وقت نمٹ لیا جائے گا۔ ایک بات یاد رکھو جو شخص مجرم ہوتا ہے وہ اندر سے بہت کمزور ہوتا ہے۔ وہ عموماً دوسروں کے بل پر اکتا رہتا ہے۔ اب مجھے اس کی نہیں بلکہ چکیں ہزار کی رقم کی فکر ہے۔ یہ معلوم کرنا بہت مشکل ہے کہ نسرین نے وہ رقم کہاں چھپا رکھی ہے۔"

"ہو سکتا ہے اس نے وہ رقم بینک میں جمع کرا دی ہو۔" جی نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"وہ یہ رقم اتنی جلدی بینک میں جمع کرانے کی حماقت نہیں کر سکتی۔"

"وہ کس لیے؟" جی نے تعجب سے پوچھا۔

"آج کے اخبارات میں اس واردات کی خبر یقیناً آئی ہوگی۔ یہ خبر ہر اس عورت کو بینک والوں کی نظر میں مشتبہ بنا سکتی ہے جو چکیں ہزار کی رقم جمع کرانے کی۔"

"نسرین نے اس پولیو پر بھی سوچا ہو گا۔" جی بولا۔

"یقیناً۔" وہ بہت مکار ہے، ذہین اور تعلیم یافتہ بھی ہے۔ اس کا بھرانہ ذہن یقیناً بہت دور کی سوچتا ہو گا۔

اس طرح وہ اپنے پیروں پر خود کھلاڑی نہیں مار سکتی۔"

"اس بات کا امکان بھی تو ہے اس نے خلف بینکوں میں اکاؤنٹ کھول رکھے ہوں اور رقم کو دو تین

حصوں میں تقسیم کر کے جمع کرا دیا ہو۔"

"...ہاں یہ ممکن ہے۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "لیکن نسرین جیسی لڑکی اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتی کہ کرنسی کے نمبر نوٹ شدہ ہوں، لہذا وہ اس سلسلے میں احتیاط سے کام لے گی۔"

"تب پھر یقیناً" اس نے یہ روپے بینک لاکر میں جمع کروائے ہوں گے۔" جی بولا۔ "بلکہ یہ زیادہ قرین قیاس ہے اور کسی مجرم لڑکی کے لیے لاکر کا استعمال بہت محفوظ طریقہ کار ہے۔"

میں جی کی ذہانت پر عیش عیش کر اٹھا۔ میں نے اس کا شانہ تعجب تھپاتے ہوئے کہا۔ "جی جنہیں پرائیویٹ سرانغ رساں ہونا چاہئے تھا اس طرف تو میرا خیال ہی نہیں گیا تھا۔ اس نے یقیناً وہ رقم لاکر میں رکھ دی ہوگی۔ جیسی تو وہ بڑے سکون اور اعتماد سے کہہ رہی تھی کہ میری الماری اور گھر کی تلاشی لے لو۔ تاہم اس صورت میں رقم کا نامنا مشکل ہو گا۔"

"اگر کوشش کی جائے تو اس سلسلے میں نوئی سے کچھ مدد حاصل ہو سکتی ہے۔" جی نے کہا۔

"وہ کیسے؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔ "کیا تم نوئی سے کچھ راہ و رسم پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے

ہو؟"

"نہیں۔" جی بولا۔ "دراصل میری شناسائی اس کے والد سے ہے۔ وہ کوئی اچھے کردار کا مالک نہیں

ہے۔ کئی برسوں سے تنگ دستی کی زندگی گزار رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ نوئی اس کی واحد اولاد ہے اور وہی اب گھر چلا رہی ہے۔ اب ان کے حالات نہ صرف بہتر ہیں بلکہ بہت بہتر ہیں... نوئی کے محلے کا ایک دکاندار میرا واقف

ہے۔ اس سے مجھے نوئی کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ نوئی آج کل ایک مشکوک قسم کی عورت کے ہاں ملازمت کر رہی ہے۔ اسے پانچ سو روپے ماہوار تنخواہ ملتی ہے۔ اس کے علاوہ تین وقت کا کھانا بھی ملتا ہے۔ اس کا

مطلب یہ ہوا کہ وہ پوری طرح نسرین کی آلہ کار ہے۔ محلے کے لوگ نوئی کے بارے میں کوئی اچھی رائے نہیں رکھتے۔ میرے ذہن میں ایک تدبیر آ رہی ہے اگر آپ اجازت دیں تو اس پر عمل کر کے دیکھوں۔ شاید اس طرح وہ

نسرین کے بارے ہی میں سب کچھ اگل دے۔"

"تمہارے ذہن میں کیا تدبیر ہے؟"

"میں نوئی کو بہ آسانی ایک دوست کی مدد سے اغوا کر سکتا ہوں۔ اغوا ہو کر وہ نسرین کے بارے میں بتانے

پر مجبور ہو جائے گی۔"

”کیا تم اسے قتل کر دینے کی دھمکی دے کر معلومات حاصل کرو گے؟“  
 ”پہلے تو میں اسے رقم کا لالچ دے کر معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کیوں کہ میں نے سنا ہے، وہ بڑی لالچی ہے۔ اگر وہ لالچ سے راہ راست پر نہیں آئی تو پھر اسے قتل ہی کی دھمکی دینا پڑے گی۔ سب کو اپنی جان بچا رہی ہوئی ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ نومی کو اغوا کرنا اس قدر آسان نہیں ہو گا جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ وہ آفت کی پرکھ اور شیطان کی خاکہ ہے۔“

جی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”آپ ذرا اشارہ تو کریں، نومی کیا چیز ہے۔ میں نسرین کو بھی اغوا کر کے یہاں پہنچا سکتا ہوں۔ یہ تو ہمارے ہاتھ کا کھیل ہے۔“  
 ”نومی نسرین کے ہاں سے نکل کر کہاں گئی تھی؟“

”اپنے گھر۔“ جی نے جواب دیا۔ ”نسرین نے دانستہ اسے اس کے گھر بھیج دیا ہو گا۔ تاکہ نومی اس کی تلافی اور آزادی میں غل نہ ہو سکے۔ وہ سونے کی فروخت کو اس کے علم میں نہیں لانا چاہتی ہو گی۔ شاید وہ ایسے معاملات کو نومی سے پوشیدہ رکھتی ہو۔“

”ہاں۔۔۔ میں نے تائید کی۔“ وہ بہت محتاط ہے۔ اس بات کا قوی امکان ہے۔“  
 جی نے مجھے نومی کے اغوا کا منصوبہ تفصیل سے سمجھایا۔ منصوبہ ٹھیک ٹھاک تھا۔ ہم دیر تک اس پر غور خوض کرتے رہے اور اس کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیتے رہے۔ میرے نزدیک نومی کو اغوا کرنا تو آسان تھا مگر اس سے کچھ اگلا لینا آسان نہیں تھا۔ ہم ایک نتیجے پر پہنچ کر مطمئن ہو گئے۔

جی دوسرے کھانا میرے ساتھ کھا کر چلا گیا۔ میں نے سونے کا پیکٹ کسی محفوظ جگہ چھپانے کی غرض سے جیب سے باہر نکالا تو مچا، میری نظر اس پیکٹ کے ایک کونے پر پڑی۔ اس پر گیلی مٹی لگی ہوئی۔ پہلے تو میں سمجھا کہ کوئی اور چیز ہو گی مگر بغور دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ مٹی ہی ہے۔ اسے پیکٹ سے جھڑتے ہوئے دیکھتا، میرے ذہن میں کوند اسالیکا اور ایک ایک کر کے میرے ذہن کے تار بک۔ درہنچے جیسے کھلنے لگے۔ جو کچھ بھی میرے ذہن میں آیا تھا، قاتل یقین تھا۔ میں نے سوچا کہ کل نسرین کے پاس جاؤں گا تو اپنے شے کی تصدیق کر لوں گا۔

جس وقت میں اور جی، نومی کے اغوا کے منصوبے پر باتیں کر رہے تھے تب جی نے مجھے ٹوکا تھا کہ میں کل نسرین کے ہاں جا کر جوئے میں حصہ نہ لوں۔ اس لیے کہ نسرین چوٹ کھائی ہوئی تاگن کی طرح مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گی، کیا معلوم وہ اس شخص کو بلائے جس کے ہاتھ اس نے سونا بیچا تھا۔ جی کی بات میری سمجھ میں آگئی تھی اور میں نے نسرین کے ہاں جانے کا پروگرام ملتوی کر دیا تھا۔ مگر اب میرا نسرین کے ہاں جانے کا حد ضروری ہو گیا تھا۔ اس لیے کہ حالات تیزی سے بدلتے اور میرے حق میں ہو سکتے تھے۔ اس کے علاوہ مجھیں ہزار کی وہ رقم ملنے کا امکان بھی پیدا ہو رہا تھا۔

میں نے پیکٹ اچھی طرح صاف کیا اور اسے ایک محفوظ جگہ رکھ دیا۔ میں سہ پہر کے وقت جی کے ہاں پہنچا۔ وہ مجھے خلاف توقع اپنے ہاں دیکھ کر حیران ہوا، وہ یہ سمجھا کہ کہیں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اس نے آج رات نومی کو اغوا کرنے کا پروگرام بتایا ہوا تھا۔ نومی رات آٹھ بجے اپنے باپ کو کھانا پہنچانے کے لیے نسرین کے ہاں سے نکلتی تھی اور رات نو بجے واپس آ جاتی تھی۔ رات وہ نسرین کے ہاں گزارتی تھی۔۔۔ نومی کو اپنے گھر سے نسرین کے

ہاں جاتے وقت اغوا کیا جاتا تھا۔ اس کارنامہ کسی قدر دیران اور تاریک تھا۔ اسے اغوا کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ میں نے جی کو پیکٹ کے کونے پر لگی ہوئی مٹی کے بارے میں بتایا اور اپنے شے کا اطمینان بھی کیا۔ پھر میں نے اسے اپنا وہ منصوبہ بتایا جو میں سارے راستے ترتیب دیتا ہوا آیا تھا۔ گو میرا منصوبہ اس قدر آسان نہیں تھا اور جی اس کی کامیابی کے بارے میں زیادہ پر یقین نہیں تھا۔ مگر اس نے یہ کہتے ہوئے میری تائید کی کہ دیکھنے میں کیا حرج ہے۔ اگر یہ منصوبہ ناکام ہو جاتا تو نومی کے اغوا کا منصوبہ تو بہر حال موجود ہے۔ لہذا اس پہلے منصوبے کو اس وقت تک ملتوی کر دیا گیا جب تک میرے دوسرے منصوبے پر عمل در آمد نہیں ہو جاتا۔

صبح آٹھ بجے میں نسرین کے گھر پہنچا۔ میں نے اطلاعی کھنٹی بجانے کی بجائے دروازے پر دستک دی تو دروازہ پہلی ہی دستک پر اس طرح کھل گیا جیسے کسی کو اسی دستک کا انتظار تھا۔ دروازہ نومی نے کھولا تھا۔۔۔ اس کے لیے سیاہ بال نم آلود تھے۔ اس کا چہرہ کسی پھول کی طرح خلقت اور تروتازہ نظر آ رہا تھا اور لیوں پر دل فریب تسمیم پھیلا ہوا تھا۔ اس نے پیاز کی رنگ کی ساڑھی اور بغیر آستین کا بلاؤز پہنا ہوا تھا۔ میں اندر داخل ہو کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اس کے سر پر اپنی چھتری سی نگاہ ڈال کر پوچھا۔ ”بیگم صاحبہ کیا کر رہی ہیں؟“

”اپنے کمرے میں ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”آپ تشریف رکھیں۔ میں انہیں اطلاع کرتی ہوں۔“  
 میں کمرے میں جا کر سونے پر بیٹھ گیا اور انتظار کرنے لگا۔ میں نے تپائی پر رکھے ہوئے دو دن پرانے اخبارات کا جائزہ لیا۔ اخباروں میں سونے اور مجھیں ہزار کی رقم کی کوئی خبر نہیں تھی۔ معلوم نہیں کیوں اس واقعے کی رپورٹ درج نہیں کروائی گئی تھی۔ یہ کوئی چھوٹی موٹی واردات نہیں تھی جسے نظر انداز کر دیا جاتا، جب کہ چند سو کی جیب کھنے کی خبر بھی اخبارات میں شائع کر دی جاتی ہے۔

جب نسرین آئی تو میں اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ ہر چند وہ بہت سادہ لباس میں تھی مگر اس سادگی میں ایسی پرکاری، ایسی دل فریبی تھی کہ مجھے اس وقت وہی دنیا کا سب سے اعلیٰ فیشن محسوس ہو رہا تھا۔ وہ میرے اندازوں سے بہت آگے کی چیز تھی۔ وہ ایک اداکارہ تھی جس کے ہزار روپ تھے اور ہر روپ پہلے سے زیادہ جاندار اور عمل تھا۔ اس وقت مجھے یقین ہو گیا کہ انداز اس کے غلام ہیں اور او اس کی غلام ہیں۔ وہ جس وقت جسے چاہے اپنا بنالے۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں۔“ وہ زبان سے زیادہ آنکھوں سے بول رہی تھی۔  
 ”اگر ایسا ہی ہے تو یہ خواب تمہارے سامنے بکھرے والا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔  
 ”وہ کیسے؟“

”تمہارا جلدو سر جگہ کر بول رہا ہے۔“  
 ”کیا میں کوئی عجوبہ ہوں؟“ وہ کھنکھاتی سے مسکرائی۔  
 ”تم ایک ساحرہ ہو۔ تمہاری ایک نظر آدمی کو تماشیا بنا سکتی ہے۔ تمہارے ایک اشارے پر لاکھوں گردیں کٹ جائیں۔ تم بہت ظالم ہو۔“

”اچھا میرے معلوم۔“ وہ اک ادا سے بولی۔ ”کیا بیٹھو گے نہیں!“  
 ”کوئی دروازہ دل کا وا کرو، کہیں آنکھوں میں جگہ دو۔“ میں باقاعدہ شاعری کرنے لگا۔ وہ جھپٹ گئی۔ میں



بے حد اصرار کیا اور ایک موقع پر تو مجھے اپنے ہاتھ سے پلانے کی کوشش بھی کی۔ مگر میں نے ایک گھونٹ بھی نہیں پی۔

نسرین ان لوگوں کا ساتھ دینے کی غرض سے پی رہی تھی۔ مگر اس کا پیمانہ پینا برابر ہی تھا۔ بیکری کے مالک کو نسرین نے دوبارہ گلاس بھر کر پیش کیا تو اس نے ترک میں آکر نئی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ نئی جیسے ان باتوں کی عادی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ ایسے موقعوں پر کیا کیا جاتا ہے۔ اس نے براہ منہ کی بجائے منہ پھیر لیا اور شرم و حیا سے گویا اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ نئی نے اپنی نگاہیں نیچی کر لیں۔ بیکری کے مالک نے گویا اس ادا پر قربان ہوتے ہوئے کہا۔ ”نئی اپنے ان سند رہاتھوں سے بلا دو نا۔ کیا آج نہیں بلاؤ گی؟“

نئی نے بڑے تاز سے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے آزاد کر لیا اور جام تیار کر کے اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ سانس لیے بغیر اس نے ساری شراب پی لی اور پھر اپنی جیب سے سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر نئی کی طرف بڑھا دیا۔ نئی نے شرباتے، لباتے اور جھجھکنے ہوئے یہ نذرانہ قبول کر لیا۔ پھر بقیہ افراد بھلا کیوں پیچھے رہے۔ انہوں نے بھی بیکری کے مالک کی تقلید کی۔ نئی کو کچھ ہی دیر میں ایک ہزار کے قریب بخشش مل گئی۔

دو بجے کھانے کا وقت ہوا۔ کھانے کی میز پر طرح طرح کے کھانے پنے ہوئے تھے۔ کھانے بہت لذیذ اور ذائقے دار تھے۔ نسرین نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ہر ہفتے ایسا ہی اہتمام کرتی ہے۔ کوئی ایک گھنٹے بعد نئے سرے سے کھیل شروع ہوا تو اس میں پہلے سے زیادہ گرمی تھی۔ بڑے نشیب و فراز آئے۔ میں جیت کم رہا تھا اور بار زیادہ رہا تھا۔ پھر بھی کھیل رہا تھا۔ زیادہ تر نسرین اور ڈاکٹر جیت رہے تھے۔ شام کے وقت اس کھیل نے میرے حق میں پلٹا کھلایا۔ میں بڑی بڑی بازیاں جیتنے لگا۔ رات گیارہ بجے کھیل ختم ہوا تو میں چالیس ہزار کی رقم جیت چکا تھا۔ ڈاکٹر، نسرین اور چڑے کا بیوی باری ہار میں تھے۔ نسرین کو ٹال میں چھ ہزار کی رقم وصول ہوئی۔

رات بارہ بجے وہ ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی اتنی بڑی رقم نہیں جیتی تھی۔ پانچ پانچ سو کے نوٹوں کی گڈی میں نے جیب میں رکھی تو خوشی سے میرا عجیب عالم تھا۔ ادھر نسرین کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ وہ دس ہزار کی رقم ہار چکی تھی۔ وہ غالباً پہلی بار ہاری تھی اور بہت طویل وافرودہ نظر آ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”مس نسرین آج پہلی دفعہ آپ کو ہار تے ہوئے دیکھا ہے۔“

جب وہ چاروں ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے تو نئی کمرے میں آئی۔ اس کا گندی چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ آنکھوں میں ٹپٹپے روشن تھے۔ وہ ہر ایک کو دروازے تک رخصت کر کے آئی تھی۔ کھیلنے والوں نے اسے خوب نوازا تھا۔ وہ خود بھی تو تاش کا ایک پتا تھی۔

نسرین اپنے کمرے میں گئی ہوئی تھی اور نئی خالی الٹش رے، گلاس اور شراب کی بوتلیں رکھ رہی تھی۔ تب میں نے اس سے پوچھا۔ ”کیا ہر ہفتے اسی طرح تمہارے وارے نیارے ہوتے ہیں؟“

اس نے چپکٹی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر بولی۔ ”جی ہاں۔ آپ کی دعا چاہئے۔“ اس دوران نسرین آگئی۔ نسرین کے آتے ہی نئی کمرے سے نکل گئی۔ اب اس کمرے میں میں اور نسرین رہ گئے تھے۔ میں جانے کے لیے اٹھنے والا تھا کہ وہ صوفے پر میرے پاس آکر بیٹھ گئی اور بولی۔ ”اب کیا ارادہ ہے؟“

”گھر جاؤں گا۔“ میں نے بتایا۔

مزید کچھ کہنا مگر نئی کو آتے دیکھ کر چپ ہو گیا۔

نئی نے اسے بتایا کہ تاش لگا دیا گیا ہے۔ ہم تاش کرنے ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ نسرین نے واقعی بڑا اہتمام کیا تھا۔ اس کا رویہ بڑا دوستانہ تھا۔ اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا کہ کل میرے چلے جانے پر ناراض ہے۔ ہم دونوں تاش کے دوران باتیں بھی کرتے رہے تھے۔

دس بجے جوئے کی محفل کا آغاز ہوا۔ کل چار آدمی تھے۔ ان میں سے ایک تو چیلوری کی دکان کا مالک تھا۔ دوسرا شرکی ایک مشہور بیکری کا مالک تھا، تیسرا چینیو تھا۔ وہ چڑے کا کاروبار کرتا تھا اور چوہا ایک ڈاکٹر تھا جس کا اپنا ہسپتال تھا۔ نسرین نے ان سب سے میرا تعارف کرایا۔ میں ان لوگوں کے لیے نیا تھا۔ یہ لوگ ہر ہفتے باقاعدگی سے نسرین کے ہاں جوا کھیلتے تھے اور اس کے سرپائے آنکھیں سیکتے تھے۔ خدا جانے اور کیا کچھ ہوا تھا۔ ان لوگوں نے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور مجھ سے مل کر خوشی کا اظہار کیا۔ میں سرپا اظہار بن گیا۔

ان شرکاف میں سے ہر ایک کے پاس پچاس ہزار سے کم رقم نہیں تھی۔ بلکہ ڈاکٹر اور چیلوری کے پاس تو ایک ایک لاکھ روپے تھے۔ سب سے کم رقم میرے پاس تھی۔ میں بیس ہزار کی رقم لے کر آیا تھا۔ کھیل میں حصہ لینے کے لیے شرط تھی کہ کھلاڑی کے پاس کم از کم بیس ہزار کی رقم ہو۔

میرے اور نسرین کے علاوہ سب نے چھبیس چھبیس ہزار کی ڈمیاں لیں۔ ایک ڈی پچاس روپے کی تھی۔ میں نے اور نسرین نے پندرہ ہزار کی ڈمیاں لیں۔ کھیل فلیش تھا۔

ابتداء میں کھیل سست رفتاری سے جاری رہا۔ نسرین ہر بازی پر ایک ڈی بطور ٹال نکال لیتی تھی اور اسے ایک الگ ڈبے میں ڈال لیتی تھی۔ وہ بہت محتاط ہو کر کھیل میں حصہ لے رہی تھی۔ اس نے دو ایک اچھی بازیاں جیتی بھی تھیں۔

تاش کے اس کھیل کے ساتھ ساتھ نظروں کا کھیل بھی جاری تھا۔ وہ کچھ اس طرح سے جیتی تھی کہ نظرسن بار بار اس کی طرف اٹھ جاتیں۔ اس نے جو دو ایک بازیاں جیتی تھیں، محض اس وجہ سے جیتی تھیں۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر میں نے اس محفل کا رنگ دیکھ لیا تھا۔ یہاں کے کھیل اور ان کھلاڑیوں کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ یہ سب کچھ سمجھنے کے لیے میں بھی بڑا محتاط ہو کر کھیل رہا تھا۔ کسی بھی جوئے کی محفل میں کھیل اور کھلاڑیوں کو اچھی سمجھ لینا بہت ضروری ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں جیت رہا تھا۔ یوں بھی جوئے میں پیشہ میری قسمت جبری رہتی تھی۔ میں اپنے ہاتھوں کی صفائی دکھا کر بھی جیت سکتا تھا۔ اس لیے مجھے شاربنگ کا فن آتا ہے۔ مگر اس وقت اس کا مظاہرہ بے عمل تھا۔ سبھی ایمانداری سے کھیل رہے تھے۔ یہ لوگ پیشہ ور جواری نہیں تھے۔ کوئی ایک گھنٹے بعد کھیل آہستہ آہستہ زور پکڑنے لگا۔

نسرین نے شراب کا بھی انتظام کیا ہوا تھا۔ نئی اس وقت ایک رے میں دلائی شراب کی دو بوتلیں اور گلاس لے کر آئی۔ جب کھیل اپنے جوہن پر تھا۔ ویسے اس وقت کسی شراب کی ضرورت نہیں تھی۔ نئی اور نسرین کو دیکھ کر لوگوں میں آگ دوڑنے لگی تھی۔ اگر جوئے کا کھیل نہ ہوتا تو شاید یہ لوگ اپنے ہوش و حواس کو بیٹھتے۔ سلقی کے فرائض نئی انجام دے رہی تھی۔ میں نے پینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ نسرین کیوں شراب پلانا چاہتی ہے۔ یہ اس کی ایک چال تھی۔

وہ ہم سب کو مدہوش کر کے کھیل سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ میرے انکار پر نسرین کا چہرہ بگھ گیا۔ اس نے

”کو تو لوری سناؤں۔“ وہ شوخی سے بولی۔ ”میری آواز ایسی ہے کہ تمہیں فوراً نیند آجائے گی۔“  
”اس وقت ایک گھاس دودھ کاٹل جائے تو میری نیند کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ میں روز رات کو دودھ پی کر  
سونے کا عادی ہوں۔“

وہ مسکراتی ہوئی صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”تم نوٹ کرو۔ میں تمہارے لیے دودھ کا بندوبست کرتی  
ہوں۔“

وہ کمرے سے ہوا کے جھونکے کی طرح نکل گئی۔ جس انداز سے اور جس غلٹ سے وہ گئی، اس نے  
میرے شک کو یقین میں بدل دیا۔ وہ مجھے جس انداز اور جس بہانے سے روک رہی تھی، اس کا مقصد یہی تھا کہ رقم  
مجھ سے ہٹا لے۔ اب میں دیکھنا یہ چاہتا تھا کہ وہ اس کے لیے کون سا طریقہ اختیار کرتی ہے۔ میں نے اسے ایک  
موقع فراہم کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے کوئی خواب آور دوا دے گی، بہر حال حتیٰ طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا  
تھا۔ میں چپکے سے اٹھا اور اس کے تعاقب میں چل دیا۔

وہ خواب گاہ میں داخل ہوئی تھی۔ پھر میں نے الماری کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی اور اسے وہاں سے  
نکل کر باورچی خانے کی طرف بڑھتے دیکھا۔ چند لمحوں بعد میں اوھر لپکا۔ وہ باورچی خانے میں پہنچ کر نوبی سے  
سرگوشیاں کر رہی تھی۔ چند لمحوں بعد مجھے ان دونوں کی سرگوشیاں واضح طور پر سنائی دینے لگیں۔  
”اگر وہ مر گئے تو... نہیں... مجھے... مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ یہ نوبی کی آواز تھی۔

”وہ نہیں مرے گا۔ اور نہ ہی میں اسے مارنا چاہتی ہوں۔ میں اس سے اگلے چپھلے بدلے لے رہی ہوں،  
میں ساری کسر نکالنا چاہتی ہوں۔ اس نے مجھے بہت ڈنک لیا ہے۔ وہ ہم دونوں بہن بھائیوں کا شکار لے اڑا۔ مجھے  
اس سے انتقام لینا ہے۔“

”اس کے بعد مجھے کیا کرنا ہو گا؟“ نوبی نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

”تم کمرے میں دودھ بچھا کر مجھ سے کہنا کہ گھر جاری ہوں۔ تم گھر جانے کی بجائے یہیں باورچی خانے میں  
آکر سو جاؤ۔ میں ایک گھنٹے بعد تمہیں جگاؤں گی۔“

میں اگلے قدموں واپس کمرے میں چلا آیا۔ گویا میری چابی و بریادی کے سالن کیے جا رہے تھے۔ نسرین  
دس منٹ بعد آئی اور اس کے چند لمحے بعد نوبی ایک رُے لیے کمرے میں داخل ہوئی۔ رُے میں دو گلاس تھے جو  
دودھ سے لالاب بھرے ہوئے تھے۔ نوبی نے گو خود پر قابو پایا ہوا تھا۔ پھر بھی اس کے چہرے سے گھبراہٹ عیاں  
تھی۔ اس نے جھک کر خاموشی سے رُے کو تپائی پر رکھا۔ پھر سیدھی ہو کر ساڑھی کے پلو سے پسینہ پونچھتے ہوئے  
بولی۔ ”میں گھر جاری ہوں، صبح آؤں گی۔“

”اتنی رات گئے اکیلی گھر جاؤ گی۔“ میں نے اسے ٹوکا۔ ”میں گھر پہنچاؤں؟“

”نہیں...“ نوبی نے فوراً جواب دیا۔ ”باہر بلا کھڑے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔“

”صبح ہی آجاؤ۔“ نسرین نے اسے تاکید کی۔ ”سکندر صاحب ناشتہ کر کے جائیں گے۔“ جب نوبی کمرے

سے نکلی تو نسرین مجھ سے بولی۔ ”میں باہر کا دروازہ بند کر کے آئی ہوں۔“

نوبی کے پیچھے پیچھے نسرین بھی کمرے سے نکل گئی۔ تو میں نے اسے غیبی تاکید سمجھ کر گلاس بدل لیے۔ پھر  
ٹانگیں پٹار کے بیٹھ گیا۔ اور گردن صوفے کی پشت سے ٹکادی۔ چند لمحے بعد نسرین نے آکر میرا شانہ ہلایا۔ ”کیا

”اسے بھی اپنا ہی گھر سمجھو۔“ وہ دل فریب انداز میں مسکرا کر بولی۔  
”صرف گھر کو اپنا گھر سمجھوں یا اس گھر کی ہر چیز کو اپنا سمجھوں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے  
ہوئے دریافت کیا۔

”مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے اگر تم اس گھر کو اور گھر کی ہر چیز کو اپنا سمجھو۔ یوں بھی اس وقت تمہاری  
جیب میں ساٹھ ہزار روپے کی رقم ہے۔ رات گئے اتنی بڑی رقم لے کر گھر سے نکلنا مناسب نہیں ہے... راستے میں  
کوئی حادثہ بھی پیش آ سکتا ہے۔“

”کیسا حادثہ؟“ میں اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈوبنے ہوئے مسکرایا۔ ”کیا کوئی رنگین حادثہ؟“  
”رنگین نہیں سنگین حادثہ۔“ وہ کہنے لگی۔ ”پولیس تمہیں تلاشی لینے کے بہانے روک سکتی ہے۔ اتنی  
بڑی رقم دیکھ کر وہ مشکوک ہو جائے گی۔ تم نہ صرف اس رقم سے محروم ہو جاؤ گے بلکہ ہو سکتا ہے جیل کی ہوا بھی  
کھانی پڑے۔ اگر تم پولیس کے ہاتھوں سے بچ گئے تو چور، خندوں اور بد معاشوں سے نہ بچ سکو گے۔“

”حادثے کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔“ میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ”حادثے کیسے اور کسی وقت بھی پیش  
آ سکتے ہیں۔ یہ بھی تو ممکن ہے رات کے کسی لمحے میں چور بد معاش کلاٹھکوف لے کر گھر آئیں اور سب کچھ  
ہتھیال کر لے جائیں۔ آج کون سا گھر ایسے ڈاکوؤں کی دست برد سے محفوظ ہے۔ کیا تم اس بات کی ضمانت دے سکتی  
ہو کہ یہاں کوئی واقعہ پیش نہیں آئے گا۔“

”ضمانت تو کسی بات کی بھی نہیں دی جاسکتی۔“ اس نے کہا۔ ”آج کل حالات بڑے غیر یقینی ہیں۔“

”اگر یہاں کوئی ایسا حادثہ پیش آیا تو؟“

اس کا چہرہ تھما گیا۔ ”میں اس بات کی ضمانت دیتی ہوں کہ یہاں ایسا کوئی حادثہ پیش نہیں آئے گا۔“

”کیا تم پورے دھوکے سے کہہ رہی ہو؟“

”ہاں...“ اس نے جواب دیا۔ ”اب ایسا اندھیر بھی نہیں چھا ہوا کہ ہم گھر میں بیٹھے ہوئے بھی محفوظ نہ

ہوں۔“

”لیکن میں تو خود کو بہت غیر محفوظ محسوس کر رہا ہوں۔“ میں نے ذہنی انداز میں کہا۔

”وہ کیسے؟“ نسرین حیرت سے بولی۔

”تمہاری آنکھیں...“

”اوہ...“ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”مجھے ڈر ہے کہ تمہاری سرانیاں میری جان ہی نہ لے لیں۔“

”کیوں... یہ کہنے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”کچھ نہیں۔“ میں نے کہا اور جیب سے رقم نکال لی۔ میں نے نسرین کو یہ تاثر دیا کہ اسے گن رہا ہوں۔

میں نے نوٹوں کی گنتی کرنے سے پہلے اس سے کہا ”اگر تمہارا اصرار ہے تو میں رک جاتا ہوں۔“

وہ ایک دم خوش ہو کر بولی۔ ”تمہارا ہسٹر گلوادوں۔“

”شاید تمہیں معلوم نہیں ہے کہ مجھے جلدی نیند نہیں آتی۔“ میں نے کہا۔ ”فی الحال تو میں جاگ رہا

ہوں۔“

دیا۔ اس کے بعد وہ مٹی کو اوپر سے دہانے لگی۔ اس نے رک کر گیلے کا جائزہ لیا پھر دو تین گاس پانی لا کر گیلے میں ڈال دیا۔

نسرین نے اس کارنامے سے فراغت پا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے بہت آہستگی سے آنکھوں کی جھری بند کر لی۔ کہ مہلادہ میری حرکت محسوس کر لے۔ حلال کہ اس وقت زیر و کالباب جل رہا تھا۔ اور میری اداکاری کے پیش نظر ایسا کوئی امکان نہیں تھا۔

”تھینک یو مسٹر سکندر۔“ میں نے اس کی آواز سنی۔ گویا وہ مجھے لوٹ کر میرا مذاق اڑا رہی تھی۔ وہ غالباً اب الماری کی طرف بڑھ گئی تھی۔ کیوں کہ میں نے الماری کھلنے کی آواز سنی۔ اس کے بعد مختلف قسم کی آوازیں میرے کانوں سے گزرتی رہیں۔ پھر ایک دم ہی خاموشی چھا گئی مگر اسٹاٹ۔ میں کافی دیر یوں ہی آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید وہ چپکے سے باہر نکل گئی ہو مگر میں نے اس کے قدموں کی چاپ یا دروازہ کھلنے تک کی آواز نہیں سنی تھی۔ پھر ایک لحظہ اس احساس نے مجھے چوٹا دیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ میرے لیے کوئی اور ہی بندوبست کر رہی ہو یا کوئی آلہ قتل لیے میرے سر پر کھڑی۔ بلاشبہ اس سے کسی بھی بات کی توقع کی جاسکتی تھی۔ میں نے سوچا کہ آنکھیں کھول دوں۔ ویسے بھی اب مگر گناہنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میرا مسئلہ حل ہو چکا تھا۔ مجھے پتہ چل گیا تھا کہ بڑی بڑی رقوم وہ کہاں چھپائی ہے۔ اور اگر اس وقت وہ میرے سامنے بھی آجاتی تو وہ بہر حال میری مجرم تھی اور میں یہ بات ثابت کر سکتا تھا۔

میں تھوڑا سا کسمپاسا جیسے نیند سے بیدار ہو رہا ہوں۔ پھر یکدم آنکھیں کھول دیں۔ میں نے دروازے کی طرف دیکھا جو کھلا پڑا تھا۔ پھر میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

میں نے اوجھر اور دیکھا تو مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ نسرین کمرے کے فرش پر بڑے بے ڈھنگے انداز میں لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے ارد گرد بہت سی چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ الماری کھلی ہوئی تھی۔ اور اس کے سارے خانے خالی پڑے تھے۔ ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔ نسرین کمرے میں مختلف چیزیں بکھرا کر گویا واردات کا سا منظر پیش کرنا چاہتی تھی کہ نشہ آور دوا اپنا کام دکھا گئی۔ دوائے اگرچہ دیر میں اثر کیا تھا مگر اتنا اچانک اور زبردست کہ وہ بیٹھی تھی تو اٹھ نہ سکی۔ میں نے ایک نظر کمرے کا جائزہ لیا، پھر طنزیہ انداز میں ہنس دیا۔

میں بستر سے اتر آیا۔ پھر کونے میں رکھے ہوئے اس گلدان کی طرف بڑھ گیا جس میں میری رقم موجود تھی۔ میں نے نسرین کی تقلید کرتے ہوئے پودا گیلے سے اکھاڑا اور تھیلی میں بند اپنی رقم برآمد کر لی۔ پھر میں دوسرے کونے میں رکھے ہوئے گیلے کی طرف گیا۔ مجھے یقین تھا وہ میچیں ہزار کی رقم بھی نسرین نے ایسے ہی کسی گیلے چھپائی ہوئی ہوگی۔ اس گیلے میں بھی ویسا ہی پیکٹ موجود تھا۔ اس پیکٹ میں سونے کے زیورات تھے۔ معلوم نہیں کس بد نصیب کے ہوں گے۔ میں نے یہ پیکٹ بھی اپنی تحویل میں لے لیا۔ جب انتقام لینا ہی ٹھہرا تو بھرپور انتقام کیوں نہ لیا جائے۔ تیسرے گیلے سے مجھے میچیں ہزار کی وہ رقم بھی مل گئی جس کی مجھے تلاش تھی۔ نسرین کے گھر میں کل آٹھ ایسے گیلے تھے۔ چھ گیلوں سے مجھے چھوٹے بڑے پیکٹ ملے۔ دو پیکٹوں میں بڑی بڑی رقیں تھیں۔

جس وقت میں ان سارے پیکٹوں کا ایک پیکٹ بنا رہا تھا، میرے ذہن میں ایک تدبیر آئی۔ میں نے فوراً ہی اس پر عمل کرنے کی ٹھانی۔

دودھ پئے بغیر ہی نیند آ رہی ہے؟“

”یہ دو گلاس دودھ کیسا۔ کیا تم بھی رات کو دودھ پی کر سوتی ہو؟“

”کبھی کبھی پی لیتی ہوں۔“ اس نے میرے سامنے رکھا ہوا دودھ کا گلاس میری طرف بڑھایا۔ ”ویسے دودھ پینے سے مجھے بڑی گہری نیند آتی ہے۔“

میں نے گلاس لے کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ دوسرا نسرین نے میرے سامنے ہی پی لیا۔ پھر بولی۔ ”اب سونا چاہئے۔“ اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے آرامتہ و پیراستہ خواب گاہ میں لے گئی۔ اس نے ہنسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”چلو تم سو جاؤ۔“

”اور تم؟“ میں نے ہنسی پر لپٹتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم نہیں سوؤ گی؟“

”تم سو جاؤ۔“ اس کے لہجے میں شوخی اور ہونٹوں پر دل کش مسکراہٹ تھی۔ ”میں کچن میں جا رہی ہوں۔“

”کچن؟“ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”کیا تم کچن میں سوؤ گی۔۔۔ نہیں، تم یہاں سو جاؤ۔ میں برآمدے میں جا کر لیٹ جاتا ہوں۔“

”ابھی جناب! میں کچن میں سونے نہیں جا رہی۔“ وہ ہنس پڑی۔ ”وہاں برتن بکھرے پڑے ہیں۔ آخر نوی اکیل کتنا کام کرے گی۔ وہ غریب سارا دن مسلمانوں کی خدمت کرتے کرتے تھک گئی تھی۔ اسی لیے تو میں نے اسے گھر بھیج دیا ہے۔“ نسرین نے کمرے سے باہر جاتے ہوئے کہا۔

باہر نکل کر اس نے دروازہ بھیڑ دیا۔ پھر میں نے اس کے قدموں کی دور ہوتی ہوئی چاپ سنی۔ کوئی چندرہ منٹ بعد نسرین واپس آئی۔ میں نے جیسے ہی دروازہ کھلنے کی آواز سنی، اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے پٹنگ کے پاس پہنچ کر چند ثانوں تک شاید بغور میرا چہرہ دیکھا تھا۔ جیسے وہ تسلی کرنا چاہتی ہو کہ میں سو گیا ہوں یا نہیں۔ ظاہر ہے اس نے اپنے طور پر مجھے خواب آور دوا پلا کر یہی سوچا ہو گا کہ میں جلد از جلد گہری نیند سو جاؤں گا۔ پھر اس نے مجھے تین چار بار آواز دے کر اپنی تسلی کرنا چاہی، مگر میں نہیں بولا تو اس نے میرا شانہ ہلایا۔ پھر بھی میں نے اپنی آنکھیں نہیں کھولیں۔

نسرین نے جب اچھی طرح اپنا اطمینان کر لیا تو اس نے میری جیبوں کو ٹٹولا۔ دوسرے ہی لمحے اس کا ہاتھ میری اس جیب میں رینگ گیا جس میں جیتی ہوئی چالیس ہزار کی رقم کے علاوہ میرے اپنے بیس ہزار بھی تھے۔

اس حرکت کا اندازہ مجھے پہلے ہی سے تھا۔ لیکن مجھے اس پر حیرت ہو رہی تھی کہ نسرین پر ابھی خواب آور دوا کا اثر نہیں ہوا۔۔۔ شاید فوری اثر والا نشہ نہ ہو، ورنہ اب تک نسرین کو نشے کی لیٹ میں ہونا چاہئے تھا۔ اس نے میری جیب اچھی طرح صاف کر لی اور پھر آہستگی سے میرے پاس سے ہٹ گئی۔ وہ نمیل کی طرف بڑھی۔ میں آنکھوں میں باریک سی جھری بنائے اس کی حرکات کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ نمیل میرے پاؤں کی طرف دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی تھی۔ نسرین نے نمیل کے پاس پہنچ کر دراز کھولی اور اس میں سے پلاسٹک کی ایک تھیلی نکالی۔ پھر ساری رقم اس تھیلی میں ڈال کر کمرے کے کونے میں رکھے ایک گیلے کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ اس نے بڑی احتیاط سے دائیں ہاتھ سے پورے کو اوپر کھینچا۔ مٹی کے تودے سمیت پودا اوپر اٹھ آیا۔ میں حیرت سے دیکھتا رہا۔ اس نے رقم سے بھری ہوئی تھیلی خالی گیلے کی تہ میں رکھ دی، پھر پورے کو اسی احتیاط سے واپس گیلے میں رکھ



آتی ہوں۔" وہ فوراً ہی کمرے سے باہر چلی گئی۔ شاید اسے کسی گزیر کا احساس ہو گیا تھا۔  
تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئی تو نوئی اس کے ساتھ تھی۔ وہ میرے سامنے نوئی سے مخاطب ہوئی۔ "نوئی کیا  
رات کو یہاں چور آئے تھے؟ کیا تمہیں کسی بات کا علم ہے؟ تم نے کسی کو دیکھا تھا؟"

نوئی حیرت سے نسرین کی طرف دیکھنے لگی۔  
"کیا...؟" میں نے تعجب سے کہا۔ "نوئی کو بھلا کیا معلوم ہو سکتا ہے۔ یہ تو رات اپنے گھر چلی گئی تھی۔"  
"نہیں۔" نسرین نے پہلے مجھے پھر نوئی کو مٹھوک نگاہوں سے دیکھا۔ "اس کے بابا اسے لینے نہیں آئے  
تھے، لہذا یہ واپس آکر پورچی خانے میں سو گئی تھی۔"

"مگر مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔" نوئی چلائی وہ اس وقت خوف زدہ دکھائی دے رہی تھی۔  
نسرین بے قراری سے کمرے میں ٹٹلنے لگی۔ وہ شاید میری طرف سے مٹھوک ہو گئی تھی۔ اسے یاد آگیا  
تھا کہ نشہ آور دوا دراصل خود اس نے استعمال کر لی تھی۔ وہ شاید اس وقت مٹھوک کی تلاش کے لیے اپنا اطمینان کرنا  
چاہتی تھی مگر ظاہر ہے، میری موجودگی میں ایسا نہیں کر سکتی تھی۔  
"لغت ہے، ہم اس وقت تک سوتے رہے، ہم میں سے کوئی ایک بھی نہیں جاگا اور چور پورے گھر کا صفایا کر  
گئے۔" نسرین بڑبڑاتی۔

"اور میری جیب کا بھی۔" میں نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "نسرین! تم نے مجھے یقین دلایا تھا کہ ایسی کوئی گزیر  
نہیں ہوگی۔ تم نے ضمانت دی تھی لہذا..."

"کیا..." وہ میری بات کٹ کر بولی۔ "کیا تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ میرا لاکھوں کا مال چلا گیا۔ تم مجھ سے  
بہرہ روئی جتانے کی بجائے خود غرضی کا مظاہرہ کر رہے ہو۔"

"یہ خود غرضی نہیں ہے مس نسرین۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کیا میں اپنی رقم بھول کر  
تمہارے نقصان کا رونا روؤں... بہر حال ہمیں فوراً" تھانے میں رپورٹ درج کرانی ہوگی۔ شاید چور پکڑنے جائیں  
اور ہمیں اپنی اپنی رقمیں واپس مل سکیں۔"

"یہ حماقت نہ کرنا۔" نسرین نے کہا۔ "اس کا زیادہ نقصان تمہیں ہو گا۔ آخر تم اپنی رقم کے بارے میں  
پولیس کو کیا بتاؤ گے؟ کیا یہی کہ وہ جوئے میں جیتی ہوئی رقم تھی جو رات کو تم جیب میں ڈال کر سو گئے تھے۔"

"تو کیا اتنی بڑی رقم پر ہم فاتحہ پڑھ لیں۔" نسرین تم بھول رہی ہو کہ تمہارا بھی کتابرا نقصان ہوا ہے۔"  
"مجھے احساس ہے۔" وہ اس دفعہ پرسکون لہجے میں بولی۔ غالباً چند لمحے پہلے اس کے ذہن میں جو مٹھوک  
سرا بھار رہے تھے، میری بھرپور اداکاری نے انہیں دبا دیا تھا۔ "لیکن تمہیں معلوم ہے چوری شدہ مال کبھی واپس  
نہیں ملتا۔ بالفرض چور پکڑے بھی گئے تو پولیس وہ مال ہضم کر جائے گی۔" اس نے کہا۔

میں چند لمحے سوچنے کی اداکاری کرتا رہا، پھر بولا۔ "نسرین! تم نے مجھے ڈوبوایا۔ اگر رات تم میرے یہاں  
رہنے پر اصرار نہ کرتیں تو میں ساٹھ ہزار کی رقم سے محروم نہ ہوتا۔ میں اس کمرے میں بے خبر سویا رہا۔ اگر میں  
جاگ جاتا اور شور مچانے یا ان سے مقابلہ کرنے کی کوشش کرتا تو ہو سکتا تھا وہ مجھے قتل ہی کر دیتے کیا میں نے غلط کیا  
تھا کہ تمہاری یہ مہربانیاں میری جان لے لیں گی۔"

"میں معذرت خواہ ہوں۔" وہ بولی۔ "بہر حال، خدا کا شکر ہے کہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ آؤ باہر

میں نے بڑا سائیکٹ بنایا پھر اسے ایک تولیے میں لپیٹ کر بغل میں دبایا۔ میرا خیال تھا کہ فی الحال چارپانچ  
گھنٹوں تک نسرین ہوش میں نہیں آئے گی، البتہ نوئی کو چپک کرنا ضروری تھا۔ میں کچن کی طرف چلا آیا۔ دروازہ  
بوند کھلا تھا اور اندر لائٹ جل رہی تھی۔ میں نے جھانک کر اپنا اطمینان کر لیا۔ نوئی بے خبر پڑی سو رہی تھی۔ میں  
باہر نکل آیا، کچھ دیر بعد مجھے ایک ٹیکسی مل گئی۔ یہ میری خوش قسمتی ہی تھی کیوں کہ اس وقت رات کے ڈیڑھ بج  
رہے تھے۔ میں ڈرائیور کو ایک سو روپے کا نوٹ دیتے ہوئے کہا کہ وہ مجھے واپس یہاں بھی پہنچائے۔ سو روپے کا  
نوٹ لیتے ہوئے اس نے وعدہ کر لیا۔

میں اپنے گھر مال غنیمت رکھ کر واپس آیا تو نسرین اور نوئی حسب توقع سو رہی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا اب  
صبح نسرین جب ڈاکا پڑ جائے یا چوری ہونے کا سوانگ رچائے گی تو خوب لطف آئے گا۔  
میں بستر پر لیٹا تو کوئی ایک گھنٹے بعد مجھے نیند آگئی۔ پھر صبح مجھے نسرین ہی نے جگایا۔ "غضب ہو گیا سکندر...  
میں لٹ گئی۔" وہ متوحش انداز میں چیختی لگی۔

میں اداکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے گویا کمرے کی حالت دیکھ کر اچھل پڑا۔ "یہ کیا ہوا؟ الماری کس نے  
کھولی۔ اور یہ سارا سامان باہر کیسے بکھرا پڑا ہے؟"

میں اس کے انداز پر حیرت زدہ ہوا تھا۔ میرے خیال میں یہ جوائین کچھ مختلف ہونی چاہئے تھی۔ آخر  
جب نسرین نے صبح اٹھ کر خود کو فرش پر لیٹے پایا ہو گا تو اسے کسی غیر معمولی بات کا احساس کیوں نہیں ہوا۔ کیا  
شروع ہی سے اس کا پروگرام وہیں فرش پر سونے کا تھا۔ بات کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں نے اس کی طرف  
دیکھا۔ وہ صدمے سے بندھال دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ اور جسم کا سارا خون گویا سٹ  
کر اس کے چہرے پر آگیا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ اداکاری نہیں کر رہی۔ ہو سکتا تھا کہ سوچے ہوئے منصوبے کے  
مطابق وہ غیر شعوری طور پر بول رہی ہو اور اسے پورے حالات یاد نہ آ رہے ہوں۔ اس نے بہت تیز اور غالباً کافی  
مقدار میں نشہ آور دوا استعمال کر لی تھی۔ اس نے یہ وقت تمام جواب دیا۔ "سکندر، رات چوری ہو گئی۔ چور  
الماری سے ہزاروں روپے کا سامان، زیورات اور قیمتی کپڑے اٹھا کر لے گئے۔ ذرا سی غفلت سے میں لٹ گئی۔"  
میں نے فوری طور پر اپنی جیبیں ٹٹولیں اور خوف سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے نسرین کی طرف دیکھا۔  
میری رقم بھی غائب ہے، ساٹھ ہزار کی رقم۔" میں نے پاگلوں کے سے انداز میں اپنی جیبیں دوبارہ ٹٹولیں۔ "ان  
چوروں نے ایک روپیہ بھی نہیں چھوڑا۔"

"تمہاری رقم بھی غائب ہو گئی...؟" نسرین اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پاس آگئی۔ "تم نے اپنی رقم کہاں  
رکھی تھی؟"

"جیب میں۔" میں نے جواب دیا۔ "جیب میں نہ رکھتا تو کہاں رکھتا؟"

"جب چور تمہاری جیب سے رقم نکال رہے تھے تو تمہاری آنکھ نہیں کھلی؟"

"میری گہری نیند مجھے لے ڈوبی۔ میں ساٹھ ہزار روپے سے محروم ہو گیا۔" میں نے بے بسی سے کہا۔  
اگر تم نہ جگاتیں تو میں شاید گمراہ بجے تک سوتا رہتا۔"

"میرا خیال ہے چوروں نے ہمیں بے ہوشی کی دوا... وہ کتے کتے رک گئی۔ جیسے اسے کچھ یاد آگیا ہو۔  
"ہاں انہوں نے ہمیں بے ہوشی کی دوا استغھادی ہوگی۔" وہ بڑی مشکل سے بولی۔ "نہرو... میں نوئی کا پتہ کر کے

برآمدے میں چل کر بیٹھیں۔ یہاں تھکن محسوس ہو رہی ہے۔  
میں نے محسوس کر لیا کہ وہ گلوں میں اپنی رقم چیک کرنے کے لیے بے قرار ہو رہی ہے۔ میں خاموشی سے اٹھ کر اس کے ساتھ برآمدے میں آگیا۔ میرا کام اب ختم ہو گیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ چند لمحوں بعد وہ واقعی لٹنے والی ہے، جب وہ ایک کے بعد دوسرا گلا چیک کرے گی تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل جائے گی۔ میں نے سوچا اب یہاں سے نکل جانا ہی بہتر ہے۔ میں نے کہا ”ٹھیک ہے جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ ہم جلدی یہ کسر پوری کر لیں گے۔ اب میں گھر چلا ہوں۔ بہت دن چڑھ آیا ہے۔“  
”ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔“ اس نے جواباً کہا۔

”میرے بیچ جانے پر صدمہ ضرور دے دیں۔“ میں نے چلتے ہوئے کہا۔ بے اختیار میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے میری طرف دیکھتی رہ گئی اور میں باہر نکل کر عیسیٰ کا انتظار کرنے لگا۔ توڑی در بعد مجھے عیسیٰ مل گئی اور میں گھر آگیا۔

میں نے گھر پہنچ کر اس پیکٹ کو نکال کر چیک کیا۔ وہ پچیس ہزار کی رقم جس کے لیے میں نے یہ ساری کاروائی کی تھی، اب میرے ہاتھوں میں تھی۔ بقیہ رقم سو لاکھ کے قریب تھی۔ میرے ساتھ ہزار اس کے علاوہ تھے۔ میں نے زیورات کا جائزہ لیا تو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اصلی بیروں کے جڑواں زیورات کے دو سیٹ تھے۔ میں پچیس تو لے کے زیورات اور بھی تھے۔ گویا نرسن بہت اچھی جاری تھی... محروم یہ بھول گئی تھی کہ ہر سیر کے اوپر سوا سیر بھی ہوتا ہے۔

میں نے ایک ہزار کی رقم جیب میں ڈال لی پچیس ہزار کی رقم اور سو تو لے سونا اکٹھا کر کے الگ رکھ لیا اور باقی چیزیں ایک محفوظ مقام پر اپنے کوارٹر میں چھپا دیں۔ اس وقت دن کا ایک بج رہا تھا اور مجھے بڑے زوروں کی بھوک لگ رہی تھی۔ میں جی کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اس نے آج آنے کا وعدہ کیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ جی آجائے تو اس کے ساتھ کھانا کھایا جائے۔

جی دو بجے کے قریب آیا۔ ہم نے دوپہر کا کھانا مہربان ہوٹل میں کھلایا۔ واپس آکر میں نے اسے کل کا سارا واقعہ سنایا۔ اس نے مشورہ دیا کہ سہ پہر کے وقت جا کر امانت لوٹا دینی چاہئے۔ ہم دونوں عبدالغنی کی تلاش میں فیڈرل بی ایریا پہنچے۔

ہمیں ان کے گھر کا نمبر معلوم نہیں تھا۔ فیڈرل بی ایریا پندرہ نمبر کٹنی ہوا تھا۔ ہمیں امید نہیں تھی کہ ان کا گھر آسانی سے مل جائے گا۔ مگر یہ مشکل توڑی سی تک دو کے بعد حل ہو ہی گئی۔ جی نے گلیوں میں جگہ جگہ کرکٹ کھیلنے والے بچوں سے پوچھ چمچ کی۔ ایک لڑکے سے پتہ معلوم ہو گیا۔ پھر اس نے ہمیں عبدالغنی کے گھر تک پہنچایا۔

جی نے دروازے پر دستک دی تو چند لمحوں بعد اسی لڑکی کا سر لپا ابھرا جو اس روز اپنی ماں کے ساتھ تھی۔ وہ حسرت و یاس کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں اواس تھیں۔ تو چہرہ ستا ہوا۔ وہ یوں غم زدہ نظر آ رہی تھی جیسے اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کسی نے چھین لی ہو۔ وہ اس چاند کی طرح دکھائی دے رہی تھی جو گمنا گیا ہو۔ اس نے ہماری طرف اطمینان سے دیکھا تو میں نے کہا۔ ”ہم آپ کے والد عبدالغنی صاحب سے ایک بے حد ضروری کام کے سلسلے میں ملنے آئے ہیں۔ کیا وہ گھر پر ہیں۔“

لڑکی نے مجھے پہچان نہیں۔ وہ پہچان بھی کیسے سکتی تھی۔ اس کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ اس غم میں اپنے آپ کو بھی بھلا چکی ہے۔ اس نے ایک لمحہ سوچا اور پھر ایک طرف ہٹ کر اندر آنے کا راستہ دے دیا۔ ”ابو گھر پر ہیں۔ آئیے۔“

میں اور جی اس کی راہنمائی میں ایک کمرے میں پہنچ گئے۔ اس کمرے میں دو تین کرسیاں بڑی تھیں اور بنگ بھی تھا۔ ہم دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اس کمرے کے ساتھ ہی ایک دوسرا کمرہ تھا جس کی دہلیز پر پردہ لہرا رہا تھا۔ اس کمرے کے اندر سے کچھ مردوں اور عورتوں کی تیز تیز باتوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ لڑکی نے دھیسے لہجے میں کہا۔ ”ای اور ابو باتوں میں مصروف ہیں۔ کچھ دیر انتظار کیجئے۔ میں ابو کو اطلاع کر دیتی ہوں۔“

لڑکی باہر چلی گئی۔ میں نے دیکھا کہ وہ ساتھ والے کمرے میں نہیں گئی تھی۔ پھر ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔ ساتھ والے کمرے سے آواز گونجی۔ یہ آواز لڑکی کی ماں کی تھی جو میں اس سے پہلے بھی سن چکا تھا وہ منت ساجت کے انداز میں کہہ رہی تھی۔ ”ہم چاہتے ہیں کہ بارہ جنوری کو آپ بارات لے کر آجائیں۔ اس وقت تک جو بھی ہو سکے گا ہم کر دیں گے۔ لڑکی کو خالی ہاتھ نہیں بھیجیں گے غریب سے غریب بھی اپنی بیٹی کو خالی ہاتھ نہیں بھیجتا۔“

”بات گھوم پھر کر دیں آجاتی ہے۔“ یہ کسی دوسری عورت کی آواز تھی۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ چیز پورا نہیں ملے گا۔“

”یہ ہمارا وعدہ ہے کہ شادی کے بعد جیسے جیسے سہولت ہوتی جائے گی، ویسے ہم جیز دیتے جائیں گے۔ جیز پورا ہی دیں گے۔“

”جوڑے کی رقم کا کیا ہو گا؟“

”جوڑے کی رقم بھی بعد میں دے ہی دیں گے۔ ذرا ہمیں سہلت تو دیں۔“

”بابا۔“ یہ لڑکے کی ماں تھی اور اس کا لہجہ سبب جانتا تھا۔ ”میرے بیٹے نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ جب تک ملے شدہ شرائط پوری نہیں ہوں گی وہ شادی نہیں کرے گا۔ شادی لڑکے کو کرنی ہے، بات بھی اسی کی پوری ہو گی۔“

”مگر لڑکا اب کا ہے آپ اسے سمجھا سکتے ہیں۔ ہم پر اتنی بڑی مصیبت نازل ہو چکی ہے۔ کچھ تو اس میں کریں۔“

”احساس... احساس اس سے بڑھ کر کیا ہو گا کہ ہم اس رشتے کو نبھار رہے ہیں۔ ہمارے لڑکے کے لیے رشتوں کی کسی بھی چیز کی۔“ یہ لڑکے کے والد کی آواز تھی۔ ”یہ تو ہماری اعلیٰ طرفی ہے کہ ہم نے آپ کو اولیت دی۔ اسے اولیت دینا ہمارے لیے کسی بھی بڑے خاندان میں شادی ہو سکتی ہے۔“

”آپ لوگ میری بیٹی کو بیاہ کر لے جانا چاہتے ہیں یا دولت کو۔“ یہ لڑکی کے والد عبدالغنی کی آواز تھی۔

جس لڑکے کو جیز کا اتنا لالچ ہو اور وہ یوں دولت کے لیے اندھا ہو رہا ہو، کل وہ ہمارے لیے اور بھی پریشانیاں کھڑی کر سکتا ہے۔“

”بات بنانے کی کوشش کریں۔ جو بھی ہے ٹھیک ہے۔“ غالباً عبدالغنی صاحب کو ان کی پیغم سمجھا رہی تھی۔ ”یوں بات بگاڑنے سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔“

کسی سے مانگ کر لائیں۔ آپ لوگوں میں ذرا بھی انسانیت نہیں ہے۔ آپ لوگ تو مجھے شادی کے نام پر تجارت کرنے والے مظلوم ہوتے ہیں۔ بیٹوں اور بیٹیوں کے تاجر، بے حس۔“ عبدالغنی صاحب کی آواز غصے سے کانپ رہی تھی۔

”رشتوں کی آڑ میں جو لوگ سودے بازی کرتے ہیں انہیں گھر میں قدم بھی نہیں رکھنا چاہئے۔“ جی اہانک اور خلاف توقع بول اٹھا۔ ”ایسے ہی لوگوں سے لڑکیوں کے والدین جہاں ہو جاتے ہیں۔ مغلّس ہو جاتے ہیں۔“

سب نے چونک کر جی کی شکل دیکھی۔ لڑکی کی ماں نے جی کو ٹوکا۔ ”تم ہمارے معاملات میں مت بولو۔ دو برس کا رشتہ ہے، ٹوٹ گیا تو۔“

”معاف کرنا آئی۔ ایسے رشتے کا ٹوٹ جانا ہی بہتر ہے۔“ میں بھی بولے بغیر نہ رہ سکا۔ ”یہ لوگ آدمی نہیں سناپ مظلوم ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اس گھر کو ڈسنے آئے ہیں۔ لڑکی کا سودا کرنے آئے ہیں۔“ ”خدا تمہیں خوش رکھے بیٹا۔ تم نے میرے دل کی بات کہہ دی۔“ عبدالغنی میری تائید میں بولے۔

لڑکے کے باپ نے غصے سے چیخ و نوب کھاتے ہوئے مجھے گھورا۔ ”لڑکی کا رشتہ بغیر لین دین کے اور چیز کے طے نہیں ہوتا۔ ہم دیکھ لیں گے کہ اس لڑکی کی شادی کیسے اور کہاں ہوتی ہے۔“ اس نے اپنی بیگم کو آواز دی۔ ”بیگم چلو اب میں مزید بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا۔“

اپنے شوہر کی آواز سن کر ایک ننگ چڑھی سی بوڑھی عورت کمرے میں آگئی۔ آتے ہی وہ گویا زلزلے۔ ”کر لیں یہ لوگ من مانی۔ بعد میں خودی آٹھ آٹھ آنسو روئیں گے، جب انہیں اپنی لڑکی کے لیے کوئی رشتہ نہیں ملے گا۔“

”یہ سب کیا ہو رہا ہے!“ لڑکی کی ماں ہڈیاں انداز میں چلائی۔ ”جو کچھ بھی ہو رہا ہے۔ ٹھیک ہو رہا ہے۔ میں اس گھر میں لڑکی کسی قیمت پر نہیں دوں گا۔“ عبدالغنی نے پراعتما لہجے میں کہا۔

”آپ کی لڑکی کو لے کر بھی کون جا رہا ہے؟ آپ کے پاس ہے بھی کیا دینے کے لیے۔“ لڑکے کی ماں برہمی سے بولی اور چلنے کے لیے پرتولنے لگی۔

”یہ لوگ جا رہے ہیں۔“ بیگم عبدالغنی چلائیں۔ ”پلیز انہیں روکیں۔ کچھ بات سمجھنے کی کوشش کریں۔“ ”آئی آپ ان لوگوں سے بیک مانگ رہی ہیں جو خود بھکاری ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔“ میں نے اپنی جیب سے پیکٹ نکالا اور اسے کھول کر میز پر رکھ دیا۔ ”یہ دیکھیں، آپ کا سو تولے سونا اور مچکس جڑا روپے۔“

لڑکی کی ماں نے چونک کر دیکھا تو دیکھتی کی دیکھتی ہی رہ گئیں۔ انہیں جیسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ سکتے اور خواب کی سی کیفیت میں کھڑی تھیں۔ یہی حالت عبدالغنی کی بھی تھی۔ وہ اپنی کھوئی ہوئی دولت کو باکرا اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے کوئی مجروحہ رونما ہو گیا ہو۔ ”میرے خدا میں یہ کیا دیکھ رہی ہوں۔“ بیگم عبدالغنی کی آواز فرط مسرت سے کانپ رہی تھی۔ ”تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے مالک۔“ ان کی آنکھیں چمک پڑیں۔

”میں نے لڑکے کے والدین کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں بھی دروازے میں کھڑے یہ حیرت انگیز منظر دیکھ

لڑکے والے آکر لڑکی والوں سے باتیں کر رہے تھے۔ یہ ایک عجیب اتفاق تھا کہ ہم دونوں اس موقع پر پہنچے تھے۔ لڑکے والوں کی باتیں سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں اور جی اجنبی تھے اور ہماری مداخلت کسی لحاظ سے مناسب نہیں تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھ سے برداشت نہیں ہو سکا۔ میں نے عبدالغنی صاحب کو زور سے آواز دی۔ ”عبدالغنی صاحب!“

ساتھ والے کمرے میں ایک دم خاموشی چھا گئی اور پھر چند ہی لمحے بعد ایک ادیبز عمر شخص ہمارے کمرے میں آگیا۔

وہ عبدالغنی ہی ہو سکتے تھے۔ انہوں نے ہمیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ میں اور جی دونوں اٹھ کھڑے ہوئے انہیں سلام کیا پھر بتایا کہ ان کی صاحبزادی ہمیں انتظار گاہ میں بٹھا گئی ہیں۔

”آپ بیٹھیں۔ مگر میں نے... پچھانا نہیں کہ آپ لوگ...“ ”آپ کو زحمت تو ہوگی۔ ذرا اپنی بیگم صاحبہ کو بلا لیں۔ وہ مجھے پہچان جائیں گی۔“ میں بولا۔ مجھے معلوم تھا کہ ان کی بیگم پردہ نہیں کرتیں۔

”ٹھیک ہے... میں بلاتا ہوں انہیں۔“ عبدالغنی صاحب نے کہا۔ لیکن ان کے چہرے سے الجھن کا اظہار ہو رہا تھا۔

پھر جب چند لمحوں بعد ان کی بیگم بھی وہیں آگئیں تو میں نے انہیں سلام کر کے پوچھا۔ ”آپ نے مجھے پہچانا؟“

وہ مجھے حیران نظروں سے دیکھتی رہیں اور پہچاننے کی کوشش کرتی رہیں۔ پھر چند لمحوں بعد نفی میں سر ہلا کر معذرت کی۔ ”نہیں بیٹے، میں تمہیں نہیں پہچان سکی مجھے یاد نہیں آ رہا کہ میں تم سے کہاں ملی ہوں یا تمہیں کہاں دیکھا ہے۔“

میں نے کہا ”دراصل اس وقت ہم ایک ضروری کام کے سلسلے میں حاضر ہوئے تھے۔“ ”ہم لوگ، آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟“ عبدالغنی صاحب نے اپنا تہ بھرے لہجے میں کہا۔ ”آپ لوگ شاید ضروری باتیں کر رہے تھے۔ ہم معذرت چاہتے ہیں۔ آپ مناسب سمجھیں تو پہلے ان لوگوں کو۔“

”ارے چھوڑیں... ایسی فضول باتیں پھر کسی وقت ہو جائیں گی۔“ عبدالغنی صاحب نے بیزار سے کہا۔ ”پتہ نہیں کیسے لاپٹی ہوگوں سے واسطہ پڑا ہے۔“ پھر رک کر بولے ”آپ نے اپنا تعارف نہیں کر لیا؟“ اسی وقت لڑکے کا باپ بھی ہمارے کمرے میں آگیا۔ یقیناً اس نے عبدالغنی کی آواز سن لی تھی۔ وہ غصیلے لہجے بولا۔ ”اب تک جو باتیں ہوئیں، کیا وہ غیر ضروری اور فضول تھیں۔ کیا آپ ان باتوں کو ہنسی مذاق سمجھ رہے ہیں۔“

”مذاق تو آپ ہمارا ازار ہے ہیں۔“ عبدالغنی صاحب نے جواب دیا۔ ”ہماری بے بسی اور مجبوری کا مذاق‘ مذاق تو ہمارے ساتھ قسمت نے کیا ہے۔“

”شادی کے سلسلے میں جو باتیں اور شرائط طے ہوئی تھیں ہم انہیں...“ ”آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہم لڑکی بھی دیں اور مال دولت بھی۔ جب کہ ہمارے پاس کچھ نہیں رہا۔ کیا ہم



میں نے محسوس کیا کہ وہ لوگ یہ مل دولت دیکھ کر اپنے بس میں نہیں رہے۔ ان کی دل ٹپک پڑی تھی۔ میں نے اس لالچی بوڑھے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”بڑے میاں! انسانیت اور شرافت تو بہت اعلیٰ و ارفع درجے ہیں۔ ایک عام سمجھ دار آدمی بھی اس سوارخ میں ہاتھ نہیں ڈالتا جس سے ڈسے جانے کا اندیشہ ہو۔ آپ لوگ محض دولت کے پجاری ہیں ورنہ آپ کو رشتوں کا کچھ احساس نہیں۔ یہ لڑکی ہماری بہن ہے۔ ہم اسے سو تو لے سوتا نہیں دیتے اور چھٹکس ہزار کی رقم بھی نہیں دیتے۔ آپ لوگ اتنے ہی اعلیٰ ظرف ہیں تو اسے پیادہ کر لے جائیں۔“

”یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟“ بڑھاپا ہاتھ نچلاتے ہوئے بولی۔

”تو پھر دوسرا راستہ اس طرف ہے۔“ میں نے انہیں باہر کا راستہ دکھاتے ہوئے کہا۔

”عبدالغنی صاحب!“ بڑے میاں لڑکی کے باپ سے مخاطب ہوئے۔ ”یہ نوجوان کون ہے اور کیا کہہ رہا ہے۔“

”میرا عزیز ہے، میرا محسن ہے، ہے اور جو کچھ یہ کہہ رہا ہے، میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آپ لوگ تشریف لے جاسکتے ہیں۔“ عبدالغنی صاحب نے کہا۔

دوسرے ہی لمحے وہ دونوں بھناتے اور غصے سے بیچ و تاب کھاتے ہوئے چلے گئے۔ ان دونوں کے جانے کے بعد عبدالغنی صاحب اپنی بیگم سے مخاطب ہوئے۔ ”بیگم! خدا کا شکر ہے کہ ہم ان لوگوں سے بال بال بچے۔ اگر ہماری بیٹی اس گھر میں چلی جاتی تو یہ لوگ ہماری زندگی ہمیں لوٹے رہتے۔“

”لیکن اب کیا ہو گا؟ ہم کہاں سے کوئی نیا رشتہ تلاش کریں گے؟“ وہ افسردہ لہجے میں بولیں۔

”میری ماں تو عبید الرحمن سے میری بیٹی کا رشتہ طے کر دو۔ گھر کا لڑکا ہے۔ نیک اور شریف ہے۔ آج وہ معمولی عہدے پر سبھی محکمہ اعلیٰ عہدے پر پہنچ جائے گا۔ میرے مرحوم بھائی کی بھی تو یہی تمنا تھی۔“

میں نے محسوس کیا کہ عبید الرحمن کا نام آتے ہی لڑکی کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔ سرت اور حیا کا رنگ۔ وہ اپنے باپ سے بولی۔ ”ابو! میں اپنے محسنوں کے لیے چائے وغیرہ لے کر آتی ہوں۔“

”صرف چائے ہی نہیں یہ رات کا کھانا بھی کھا کر جائیں گے۔“ عبدالغنی بولے۔

عبدالغنی، ان کی بیوی اور بیٹی نے ہمیں رات کا کھانا کھلائے بغیر نہیں آئے۔ ہم دونوں کو رکنا پڑا اور ہم ان کو خوش دیکھ کر خوش ہوتے رہے۔ دوسروں کو خوشی دے کر جو سرت حاصل ہوتی ہے وہ کوئی بیوی سے بیوی دولت پا کر بھی نہیں ہوتی۔ ہماری اچھی خاطر قاضی کی گئی۔ اس خوشی سے پاگل لڑکی نے ایسا زبردست اہتمام کیا تھا کہ جیسے ہم اس کے لیے دنیا کی عزیز ترین ہستی ہوں۔ اسے دوہری خوشیاں ملی تھیں۔ رقم اور سونا اور عبید الرحمن۔

رخصت ہوتے وقت عبدالغنی صاحب نے ہم سے وعدہ لیا کہ ہم ان کے ہاں آتے رہیں گے اور ٹھیکہ کی شادی میں بھی شریک ہوں گے۔

تیسرے دن مجھے اچانک نرسن کا خیال آیا۔ میں نے سوچا چل کر دیکھ لوں کہ اپنی دولت منوا کر اس پر کیا گزری ہے۔ میں سہ پہر کے وقت اس کے گھر پہنچا۔ اس کے مکان پر ایک بڑا سا کالا لگا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے بیوی حیرت ہوئی۔

رہے تھے۔ وہ بھی جیسے اپنی جگہ کھڑے بت بن گئے تھے۔

”اچانک لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت چمک تھی اور چہرہ خوشی سے گلزار ہو رہا تھا۔ وہ اندر آتے ہی اپنی ماں سے پٹ گئی۔“ خدا نے میرے ابو اور میرے بھائیوں کی برسوں کی کمائی لوٹادی۔ میں نے کہا تھا امانی۔ ہمیں اللہ کی ذات سے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ حلال کی کمائی ایک نہ ایک دن ضرور ملے گی۔ آخر مل گئی!“ اس کی آنکھیں خوشی سے آنسوؤں سے بھر گئیں۔ وہ دوپٹے سے آنسو پونچھ رہی تھی۔ لڑکے کے ماں باپ حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔

”آپ لوگ کون ہیں؟“ عبدالغنی کی آواز خوشی سے بھرا رہی تھی۔ ”یہ دونوں چیزیں آپ کو کہاں سے ملیں اور کیسے ملیں؟“

”ہم لوگ تو خادم ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”جو چیز ملنا تھی سول گئی۔ آپ جان کر کیا کریں گے بھی کیا۔ یہ ایک لمبی کمائی ہے۔“

”مگر آپ لوگوں کو کیسے معلوم ہوا کہ یہ سونا اور رقم ہماری ہے۔ ہم نے اس واقعے کی رپورٹ نہ تو پولیس میں کھسوائی تھی اور نہ ہی کسی کو بتایا تھا۔“

”آپ کو رپورٹ تو درج کرنا چاہئے تھی۔“ جی بولا۔ ”یہ کوئی معمولی واردات تو نہیں تھی۔“

”پولیس رپورٹ کھوانے سے کیا حاصل ہوتا ہے! پولیس دن میں کتنے اصل مجرموں کو پکڑتی اور کتنے لوگوں کو ہاں کا ہاں دیا کرتا ہے۔“

”ابو۔۔۔۔۔۔ لڑکی اپنے باپ کے پاس جا کھڑی ہوئی۔“ اب مجھے یاد آ رہا ہے کہ میں نے انہیں کہاں دیکھا تھا۔ اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”میں نے انہیں اس روز دکان میں دیکھا تھا۔ جس عورت نے ہمارا پرس چرایا تھا، یہ لپک کر اس کے پیچھے بھی گئے تھے مگر وہ عورت ان کے ہاتھ نہیں آئی تھی۔“

”آپ لوگ تو ہمارے لیے فرشتہ رحمت ثابت ہوئے ہیں۔“ عبدالغنی صاحب ممنونیت کے لہجے میں بولے۔

”خدا تم دونوں کو ہمیشہ سلامت رکھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تمہارا کمن الفاظ میں شکریہ ادا کروں۔“ وہ توقف کے بعد میری اور جی کی باتیں لینے لگیں۔

”چلے مبارک ہو۔“ لڑکے کی ماں عبدالغنی صاحب سے مخاطب ہوئی۔ ”اب تو آپ کو کوئی شکایت نہیں رہی نا۔ اللہ نے آپ کی مشکل آسان کر دی ہے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔۔“ عبدالغنی صاحب نے خشک لہجے میں جواب دیا۔ ”لیکن اب آپ لوگ اپنی مشکل کہیں اور جا کر آسان کیجئے۔“

”کیا مطلب۔۔۔۔۔۔ لڑکے کے باپ نے تیز و تند لہجے میں پوچھا۔ ”کیا آپ لوگ رشتہ ختم کر رہے ہیں؟“

”جی ہاں!“ عبدالغنی صاحب بولے۔ ”آپ کہیں اور جا کر رشتہ تلاش کریں۔ میں اپنی بیٹی آپ لوگوں کو نہیں دوں گا۔“ عبدالغنی صاحب پیار سے اپنی بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

ان دونوں میاں بیوی کا چہرہ قحط ہو گیا۔ تاہم انہیں یقین ہو گیا کہ اب بات نہیں بنے گی۔ بڑے میاں ٹھوکر لہجے میں گویا ہوئے۔ ”دیکھ لیا بھئی، دیکھ لیا۔ یہ ہے ان لوگوں کا ظرف۔ اللہ نے میری کر دی اور مل مل گیا تو اپنی اوقات ہی بھول بیٹھے۔ اور اس سے پہلے ہمیں انسانیت اور شرافت کا درس دیا جا رہا تھا۔“

چوتھے روز صبح سے شام تک میں نے تین چار پتھر لگائے۔ مگر ہر دفعہ گیٹ پر تلاعی ملا۔ پانچویں روز۔ ”مکان کرائے کے لیے خالی ہے“ کی سختی نظر آئی۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ نسرین آخر کئی کمال؟ آخر اس کے ساتھ ایسا کون سا واقعہ پیش آیا جس نے اسے مکان چھوڑنے پر مجبور کر دیا؟ مجھے نئی کاکر نہیں معلوم تھا اور نہ ہی میں اس کے باپ کو جانتا تھا۔ ورنہ نئی یا اس کے باپ سے مل کر نسرین کے بارے میں معلوم کیا جاسکتا تھا۔ جی بھی کچھ دنوں کے لیے حیدر آباد گیا ہوا تھا۔ ورنہ اس کے ذریعے نئی سے ملا جاسکتا تھا۔

چھ دن جی حیدر آباد سے آیا تو میں نے اسے نسرین کے بارے میں بتایا۔ وہ نئی کے ہاں جا کر معلوم کر آیا اور بتایا کہ نسرین نے چھ دن پہلے اچانک اپنا فرنیچر اور سلاٹن بچ کر نئی کا حساب کر دیا تھا۔ نسرین کمال گئی کیوں گئی؟ نئی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ نسرین کا اچانک اور غیر متوقع طور پر غائب ہونا میرے لیے کسی معنی سے کم نہیں تھا۔ میں ساتویں دن بوہری بازار اور زیب النسا سیٹ پر نسرین کو تلاش کرتا پھر۔ میں ایک جیولری کی بڑی دکان میں داخل ہوا۔ اس دکان پر عورتوں کی بیڑگی ہوئی تھی جیسے زیورات مفت بٹ رہے ہوں۔ ان عورتوں میں برقع پوشوں کی اکثریت تھی۔ مجھے شبہ سا ہو رہا تھا کہ نسرین بھی اسی جھگڑ میں ہوگی اور اس نے اپنے آپ کو برقعے میں چھپایا ہوا ہو گا۔ مجھے ایک برقع پوش کا سر ہلانا نسرین کی طرح کا نظر آیا اس کا چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ میں اس عورت کے قریب پہنچا تو اس نے ایک لمحے کے لیے اپنا نقاب اٹھا۔ وہ نسرین نہیں کوئی اور تھی۔

میں اچھی طرح سے اپنی تسلی کر کے دکان سے باہر آگیا۔ دکان سے باہر آیا تو شوکیں میں رکھے ہوئے مرے کے ایک سیٹ کو دیکھ کر ٹھنک گیا۔ بڑا خوبصورت سیٹ تھا۔ اس نے میری پوری توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ میں اس سیٹ کی خوبصورتی سے ایسا محو ہوا کہ مجھے دنیا و مافیہا کی خبر نہ رہی۔ میرے ذہن کے تاریک گوشوں سے غم غم کل آئی اور میں تصور میں یہ سیٹ اس کی صراحی دار گردن میں دیکھ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیوں نہ یہ سیٹ خرید کر اسے حقے کے طور پر پیش کر دوں۔ مجھ میں اس وقت اتنی استطاعت تھی کہ سیٹ خرید سکتا۔ میرے پاس روپے کی کوئی کمی نہ تھی۔ کچھ حالات و واقعات نے اور کچھ میرے کارناموں نے مجھے بے حد امیر و کبیر بنا دیا تھا مگر غنیم کو میرا تحفہ پیش کرنا اس کے حق میں بہتر نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے کہ اتنا قیمتی تحفہ غنیم کے شوہر کو شکوک و شبہات میں مبتلا کر دیتا اور غنیم کی ازدواجی زندگی میں تکلیفیں کھل جاتیں۔ یہ مجھے کسی قیمت پر منظور نہیں تھا۔

میں انہی خیالوں میں گم تھا کہ اچانک اپنے شانے پر کسی کا ہاتھ محسوس کر کے مڑا۔ میرے سامنے ایک بلند قامت و جیدہ اور خوبصورت شخص کھڑا تھا۔ اس کی رنگت سرخ اناروں جیسی تھی۔ وہ سرج کے سوٹ میں بڑا سمارٹ اور باوقار نظر آ رہا تھا۔ اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا اور بولا۔ ”ہیلو سکدر! اعظم کیسے ہوا؟“

میں اس کی زبان سے اپنا نام سن کر بہت حیران ہوا۔ میں نے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ ”ٹھیک ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

وہ میرے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے بڑی شائستگی سے بولا۔ ”لگتا ہے کہ تم نے مجھے پہچانا نہیں۔“

واقعی میں اسے پہچاننے میں ناکام رہا تھا۔ حلال کہ اس کی آواز اور چہرہ مجھے مانوس لگ رہا تھا۔ میں اپنے ذہن پر زور دینے لگا۔ پھر اچانک مجھے یاد آگیا میں نے ایک دفعہ اس شخص کی جان بچائی تھی۔ ”سرور صاحب۔“

”آخر تم نے مجھے پہچان لیا۔“ اس کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ ”ویسے ذرا دیر سے پہچانا۔“

”جی ہاں۔“ میں نے اعتراف کیا۔ ”میں اس وقت ذہنی طور پر یہاں موجود نہیں تھا۔“

”کیا نیلم کے تصور میں کھوئے ہوئے تھے؟“

اس کے منہ سے نیلم کا نام سن کر مجھے شدید حیرت ہوئی۔ ”کیا آپ نیلم کو جانتے ہیں؟“

”میں نیلم ہی کو نہیں غنیم کو بھی جانتا ہوں۔“ اس نے مزید کہا۔

میں گنگ سا اس کی طرف دیکھتا رہا۔

”کیوں نہ کہیں چل کر بیٹھ جائیں۔“ وہ بولا۔ ”تم سے بہت ساری باتیں کرنا ہیں۔“

”اس کے پاس فوکسی تھی۔ وہ سڑک کے کنارے پارک کی ہوئی تھی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر نیشنل ریسٹوران میں آگیا۔ اس نے میز پر بیٹھنے کے بعد وینر کو چائے کا آرڈر دیا۔“

وینر چلا گیا۔ تو اس نے مسکرا کر پوچھا۔ ”آج کل دھند اکیسا چل رہا ہے؟“

میں سن ہو کر رہ گیا۔ اس روز میری اس سے بڑی مختصر ملاقات ہوئی تھی۔ پھر میرے ذہن میں اس کی تصویر دھندلی ہو گئی تھی۔ میں نے اسے کچھ اپنے بارے میں بتایا بھی نہیں تھا۔ میں سارے راستے یہ سوچتا ہوا آیا تھا کہ

اسے نیلم اور غنیم کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟ اب وہ میرے دھندے کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ گویا وہ میرے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ لہذا میں نے اس سے کچھ چھپانا بے کار خیال کیا اور کہا۔ ”دھند اوروں پر ہے۔“

”کچھ دنوں سے نسرین اور غنیم ساتھ نہیں دیکھ رہا۔ وہ آج کل کہاں ہے؟“ اس نے ایک اور دھماکا کیا۔

مجھ سے مزید برداشت نہ ہو سکا۔ ”آپ یہ سب کیسے جانتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”جس دن تم نے میری جان بچائی تھی اس دن سے میں تمہارے پیچھے لگا ہوا ہوں۔“

”اس کا مقصد؟“

”یہ میں اپنا فرض خیال کرتا ہوں۔ میرا مقصد محض تمہاری حفاظت کرنا ہے۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ میں نے الجھتے ہوئے کہا ”میں کوئی ایسی اہم شخصیت تو نہیں ہوں جس کی حفاظت میں وقت برباد کیا جائے۔“

”بہت اہم۔“ وہ بخند گئی سے بولا۔ ”اور اس روز تم نے جو کارنامہ انجام دیا تھا۔ اس کی اہمیت کا ابھی تمہیں اندازہ نہیں ہے۔ اگر وہ لوگ گرفتار نہ ہوتے تو ملکی سالمیت کو زبردست نقصان پہنچتا۔“

”گویا بلا انسٹیگ میں مجھ سے ٹیک اور مفید کام سرزد ہونے لگے ہیں۔“ میں خشک لہجے میں بولا۔ ”اصل بات بتائیے مجھے یہ پر اسراریت پسند نہیں ہے۔“

”کیا میری شخصیت تمہیں پر اسرار نظر آ رہی ہے؟“ اس نے حیرت سے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ میں نے خاصی وضاحت کر دی ہے۔“

”مگر میں سمجھا نہیں۔“

”سیدھی سی بات ہے۔“ وہ متانت سے بولا۔ ”تم نے اس روز میری جان بچائی تھی مجھ پر احسان کیا تھا۔ اور میں یہ احسان نہیں بھولا ہوں۔ چوں کہ دن رات خطرات سے کھیلنا تمہارا کام ہے لہذا تمہاری حفاظت کرنا میں نے

اپنا فرض بنالیا۔ اب یہ الگ بات ہے کہ اس کوشش میں مجھے تمہارے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو گیا۔ ویسے ابھی تک مجھے تمہارے کام آنے کا کوئی خاص موقع میسر نہیں آیا۔ چھوٹی موٹی باتوں کا تو خیر کیا ذکر۔ دراصل تم خود بہت کچھ ہو۔ میں تمہیں پسند کرنے لگا ہوں۔“

میں حیرت سے اسے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔ وہ کب اور کس جگہ میرے کام آیا یعنی خفیہ طور پر میری مدد کی۔ سوچتے سوچتے اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ بے ساختہ میری زبان سے نکلا۔ ”تو اس روز تھانے میں وہ فون آپ نے کیا تھا اور پولیس کی قید سے مجھے رہائی دلائی تھی؟“

وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکراتا رہا۔ پھر میرے ہاتھ کی پشت چھتھپاتے ہوئے بولا۔ ”تم بہت ذہین ہو مسٹر سکندر۔ بہر حال وہ تو کوئی قابل ذکر بات نہیں ہے۔“

”آپ کا بہت بہت شکریہ سرور صاحب! میں آپ کا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گا۔“

وہ غرجائے اور ناشتے لے آیا۔ جب وہ چلا گیا تو سرور صاحب نے ناشتے کی پلیٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا دورہ سندھ کیسا رہا؟“

”دورہ سندھ!“ میں نے ناشتے کے دوران ہی اسے سارا واقعہ سنایا اور بتایا کہ نلیم کس طرح قرۃ العین کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئی ہے۔ تنظیم کی سرگرمیاں اور عزائم کیا ہیں۔ وہ بڑے غور اور توجہ سے میری باتیں سنتا رہا تھا۔

جب میں نے اپنی بات ختم کی تو اس نے کہنا شروع کیا۔ ”سکندر! اب تمہیں نلیم یا اس کی تنظیم سے پریشان اور فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ خدا نے چاہا تو وہ لوگ جلد ہی اپنے بھائی انجام کو پہنچیں گے۔ وہ تمہیں یا قرۃ العین کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اس سلسلے میں تم بے فکر ہو جاؤ۔“

”مجھے خود سے زیادہ قرۃ العین کی فکر تھی۔ اب آپ کی تسلی اور تسفی سے میرے دل کی غلغل دور ہو گئی۔“

میں بولا۔ ”آپ نے مجھے اپنے بارے میں نہیں بتایا۔“

”میں ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہوں۔“ وہ اپنا تعارف کرانے لگا۔ ”میرا کام یہ ہے کہ ملک دشمن سرگرمیوں پر نظر رکھوں اور بدخواہوں کا خاتمہ کروں۔ میں بڑی خاموشی سے اور بغیر کسی صلے و ستائش کی تمنا کیے سرگرم عمل رہوں۔ میرے ملک پر سیاہ بادل منڈلا رہے ہیں۔ ہماری محبت، اخوت اور یکجہت کا جذبہ دشمنوں کی آنکھوں میں کلک رہا ہے۔ مگر مجھے خوف اس لیے نہیں کہ ہم کراچی سے پشاور تک سیدہ پلائی ہوئی ایک دیواری طرح ہیں۔ اور سکندر۔“ وہ بڑے غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کیا تم میری مدد کرو گے؟ دشمنوں کی آنکھیں پھوڑنے کے لیے مجھے کسی وقت بھی تمہاری مدد کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔“

”میری مدد کی!“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”کیا میں اس قاتل ہوں، میرا مطلب ہے، آپ مجھے اس قاتل سمجھتے ہیں۔“

”میں تمہیں اس کا اہل سمجھتا ہوں۔ تم ہر لمحہ خود کو میرے لیے نہیں بلکہ ملک قوم کے لیے تیار رکھنا۔“

”حاضر ہوں سائیں۔“ میں نے خوش دلی سے کہا۔ ”میری اس سے بڑی خوش قسمتی کیا ہو سکتی ہے کہ آپ مجھے کسی قاتل سمجھتے ہیں۔“

ہم دونوں کوئی ایک گھنٹے تک ہوٹل ہی میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ وہ مجھے بتاتا تھا کہ اس ملک کے خلاف

دشمن کیسے کیسے جال بچھا رہا ہے۔ پھر وہ مجھے اپنی فوسکی میں لے کر اوپر اوپر گھومتا رہا۔ اس نے رات کا کھانا ڈرگ روڈ پر ایک کھلے رستوران میں کھلایا۔ اس نے مجھے گھر پر لا کر اتار تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔ پھر وہ مجھ سے گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کر کے رخصت ہوا۔

میں دوسرے روز حسب معمول سہ پہر کے وقت طارق روڈ پر پہنچ گیا تاکہ اپنی بے چین اور مضطرب آنکھوں کو قرار پہنچاؤں۔ اور نرسن کی تلاش بھی جاری رکھوں۔ میرا دل کتا تھا کہ نرسن کراچی ہی میں موجود ہے اور وہ اپنی بدترین شکست کے بعد کچھ دنوں کے لیے روپوش ہو گئی ہے۔ مجھ سے انتقام لینے کے لیے وہ کوئی منصوبہ بنا رہی ہو گی۔ اور میرے لیے جال تیار کر رہی ہو گی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھے کسی قیمت پر نہیں بخشے گی۔ اور میں نرسن سے ہر محاذ پر مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا۔ نرسن سے میری غمبیزی نہ ہو سکتی، البتہ وہ تین شکار ضرور ہاتھ آگئے۔

اوپر میں دو ایک روز سے یہ بات محسوس کر رہا تھا کہ کوئی بے حد محتاط اور پراسرار انداز میں میرا تعاقب کر رہا ہے۔ بازاروں میں، گلیوں میں اور سینماؤں میں کوئی سائے کی طرح میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔ پہلے دن تو میں نے اسے واہمہ سمجھ کر ذہن سے جھٹک دیا۔ لیکن دوسرے دن بھی ایسا ہی محسوس ہوا۔ میں سمجھ گیا کہ نرسن مجھ پر نفسیاتی دباؤ ڈال رہی ہے۔ میرے مقابلے پر وہ نئے انداز میں خم ٹھونک کر آ رہی تھی۔ دوسرے نلیم بھی میرے تصور میں آکھڑی ہوتی تھی۔ اس کی تنظیم مجھے آسانی سے معاف کرنے والی نہیں تھی۔ وہ تو میری جان کی دشمن بنی ہوئی تھی۔ ایک ہفتے بعد ایک ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پیتے وقت اخبار کی ایک خبر نظر پڑی تو میں چونک اٹھا۔ یہ خبر نمایاں سرخی کے ساتھ چھپی ہوئی تھی۔ اس خبر میں نلیم اور اس کی تنظیم کی گرفتاری اور اس تنظیم کا قلع قمع کرنے کے بارے میں اطلاعات تھیں۔ اس کے تمام دفاتر سر بہ سر کر دیے گئے تھے۔ اور اراکین کی گرفتاری کے لیے چھاپے مارے جا رہے تھے۔

یہ خبر پڑ کر میرا دواں دواں خوشی سے جھوم اٹھا۔ مجھے سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ قرۃ العین کو اب کوئی خدشہ نہیں تھا۔ اب اس کی عزت پر کوئی آنچ نہیں آسکتی تھی۔ اب وہ بے خوف و خطر عزت کی زندگی گزار سکتی تھی۔ یہ خبر اس کی نظر سے بھی گزری ہو گی اور وہ بے حد خوش بھی ہو گی۔ میں تصور ہی تصور میں اس کا گنار چروہ دیکھنے لگا۔

یہ کارنامہ سرور ملک کے سوا کسی اور کا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے مجھ سے جیسا کہا تھا ویسا ہی کر دکھایا تھا۔ نلیم اور اس کی تنظیم کا مکمل طور پر صفایا کر دیا گیا تھا۔ میں نے سکون کا گہرا سانس لیا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے عالیہ کا خیال بھی آیا۔ گرفتار شدگان میں عالیہ کا نام نہیں تھا۔ گویا عالیہ گرفتار نہیں ہوئی تھی۔ مگر اب مجھے عالیہ سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔

اب یہ بات صاف ہو گئی تھی کہ نلیم اور اس کی تنظیم میرے تعاقب میں نہیں ہے بلکہ نرسن ہے۔ گویا وہ مجھ سے بدلہ لینے پر تل گئی تھی تاہم میں بھی ہوشیار اور چوکنا ہو گیا تھا اور اس کوشش میں تھا کہ اس پراسرار تعاقب کرنے والے شخص کی گردن ناپ لوں جو نفسیاتی طور پر مجھے زیر کرنا چاہتا ہے اور میرے ذہن کو خفتار میں جٹا کر بنا چاہتا ہے۔

میں ایک روز صبح دس بجے مہربان ہوٹل میں ناشتہ کرنے پہنچا۔ ہوٹل تقریباً خالی تھا۔ دو ایک ٹیبلوں پر کچھ افراد بیٹھے تھے۔ میں ایک خالی میز پر جا بیٹھا تو آرڈر لینے آیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کتا۔ وینٹر نے کہا۔ ”

اسی رات میں نیرنگ سینما سے آخری شو دیکھ کر اس گلی سے گزر رہا تھا جو میرے گھر کو جاتی تھی۔ گلی اس وقت سنسان اور ویران تھی۔ خاصی سردی تھی۔ گرمی کے موسم میں رات بارہ ایک بجے تک عموماً چل پھل رہتی تھی لیکن ان دنوں سردی کی وجہ سے دس گیارہ بجے ہی سے سناٹا چھا جاتا تھا۔ میں بل کھاتی اور گھومتی ہوئی گلی سے گزر رہا تھا کہ اچانک ٹھنک کر رک گیا۔ تین بد معاش ایک شخص کو گویا فٹ پال سمجھ کر اس سے کھیل رہے تھے۔ وہ ان تینوں کے درمیان لڑھکتا پھر رہا تھا۔ شاید بد معاش اسے ادھ موا کر کے لوٹ لینا چاہتے تھے۔ بجلی کے کھمبے پر لگے ہوئے بلب کی ملنگجی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں کوئی دس پندرہ گز کے فاصلے پر تھا۔ ان بد معاشوں کے چروں کے خدو خال واضح نہ تھے۔

ایک نیتے اور ترخا شخص کو اس تینوں کے ہاتھوں بے بسی سے پتا دیکھ کر میں چیخا۔ ”نھر جاؤ بد معاشو!“ دوسرے ہی لمحے میں نے اپنی جیب سے چاقو نکال کر فضا میں لہراتا ہوا ان کی طرف لپکا۔ وہ تینوں میری آواز سن کر چوٹے اور انہوں نے میری سمت دیکھا۔ میرے ہاتھ میں چاقو دیکھ کر وہ خوف زدہ ہو گئے۔ انہوں نے اس شخص کو میری طرف دھکا دے دیا۔ وہ کسی گیند کی طرح زمین پر گر گیا۔ پھر وہ تینوں مخالف سمت میں بھاگ کھڑے ہوئے۔

میں اس شخص کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ ان بد معاشوں کا تعاقب میرے لیے بے کار تھا۔ میرا مقصد بھی اس شخص کو بد معاشوں کے نرنے سے نکالنا تھا۔ میں نے جھک کر اس شخص کو اٹھنے میں مدد دی جو درد اور تکلیف سے کراہتا ہوا اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ نیم جاں ہو رہا تھا۔ معلوم نہیں وہ کتنی دیر سے ان تینوں کے ہاتھوں تحت مشق بنا ہوا تھا۔ اس کا سانس بری طرح پھولا ہوا تھا۔ اس نے میرے سارے کھڑے ہو کر پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ ”پانی... پانی...“

میں اسے سنبھالتے ہوئے بولا۔ ”میرا گھر قریب ہے، حوصلہ کرو تو دو منٹ میں پہنچ جائیں گے۔ وہاں چل کر پانی بھی پی لیتا اور آرام بھی کر لیتا۔“

میں اسے سارے گھر کی طرف لے چلا۔ وہ سارے راستے درد سے کراہتا ہوا چل رہا تھا۔ مجھے دکھ اور حیرت اس بات کی ہو رہی تھی کہ کوئی بھی اس ہنگامے اور شور و غل کو سن کر نہیں نکلا تھا۔ میں اسے اپنے گھر لے آیا اور پلنگ پر بٹھا دیا۔ ایک گلاس پانی وہ ایک ہی سانس میں غٹاٹ پی گیا۔ جس وقت وہ پانی پی رہا تھا تو میں نے اس کا جائزہ لیا وہ ایک اوجیز عمر کا صحت مند شخص تھا۔ اس کے چہرے پر فریج کٹ داڑھی تھی۔ اس نے پانی پی کر گلاس واپس کیا۔ میں گلاس واپس رکھ کر آیا تو اس سے پوچھا کہ وہ چائے پیسے گایا کانی؟ میں نے اسے دیکھا تو گھبرا گیا۔ اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ وہ اپنا سینہ دیا کر درد سے جیسے تڑپ رہا تھا۔ میرے پلنگ تک پہنچنے سے پہلے وہ ایک دم اسی حالت میں فرش پر گر گیا۔ میں نے لپک کر اسے سنبھالا۔ اور دوبارہ پلنگ پر بٹھا دیا۔

وہ کسی دے کے مریض کی طرح سانس لیتا ہوا بولا۔ ”میرے دوست! مجھ پر ایک احسان اور کرو میرا دل بیٹھا جا رہا ہے، مجھ پر دل کا درد پڑنے والا ہے۔ تم یہ دوا بھی اور اسی وقت کہیں سے لا کر دے دو۔ اگر مجھے آدھے گھنٹے کے اندر اندر دوا نہیں ملی تو میں...“ اس نے ایک ہی سانس میں یہ سب کہا تھا۔ آخری جملہ اوجھڑا چھوڑ کر اس نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ جیب میں ڈالا اور ایک چھوٹی سی غلی شیشی نکالی اور بولا۔ ”دوا کے پیسے لے لو بھائی!“

میں نے اس کے ہاتھ سے دس کا نوٹ نہیں لیا۔ ایک شخص کی زندگی خطرے میں تھی، میں شیشی لے کر فوراً باہر کی طرف لپکا۔ باہر آیا تو مجھے یاد آیا کہ ڈاک خانے کے پاس جو رحمان میڈیکل سنور ہے، وہ رات گئے تک

سکندر صاحب کل دوپہر ایک شخص آیا تھا۔ اس نے کھانا کھایا۔ پھر وہ آپ کے بارے میں پوچھ گچھ کرتا رہا۔ اس نے آپ کے متعلق بہت ساری باتیں کیں اور جاتے جاتے بخشش کے طور پر دس روپے دے گیا۔ ”دس روپے بخشش!“ میں نے حیرت سے کہا۔

”ہاں... ہاں“ اس نے سر ہلایا۔ ”آپ کو میری بات کا یقین نہیں آ رہا؟“

دس روپے کی بخشش لالو کھیت میں واقع ہوٹل کے بیرے کے لیے یقیناً بڑی رقم تھی۔ ایک تو ایسے ہوٹلوں میں بخشش کا رواج نہیں تھا۔ یہاں جو مستقل گاہک تھے، وہ بخشش نہیں دیتے تھے۔ کوئی بھولا بھٹکا ایک دو روپے دے جاتا تھا۔ معلوم نہیں یہ دس روپے دینے والا کون حاتم طائی تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”وہ شخص میرے بارے میں کیا پوچھ رہا تھا؟“

”وہ آپ کے گھر کا پتہ، آپ کے پیشے اور دوستوں کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ میں نے گھر کا پتہ بتایا مگر یہ نہیں بتا سکا کہ آپ کیا کام کرتے ہیں، دوستوں کے بارے میں بھی میں نے لا علمی ظاہر کر دی۔ مجھے کیا معلوم کہ آپ کے دوست کون ہیں اور کتنے ہیں؟“

نسرین کو میرے گھر کے پتے کی ضرورت تھی۔ وہ شاید میرے گھر پر اپنے ساتھیوں یا اپنی حشر سامانیوں کے ساتھ دھوا بولنا چاہتی تھی۔ میں نے ویٹر سے اس شخص کا حلیہ دریافت کر کے اسے ذہن نشین کر لیا۔ ویٹر نے اس کا جو حلیہ بتایا تھا وہ میرے لیے قطعی اجنبی تھا۔

ناشتہ کر کے ہوٹل سے گھر جاتے وقت طرح طرح کے سوال میرے ذہن میں گردش کر رہے تھے اور مجھے ایک نامعلوم سی تشویش ہو رہی تھی کہ نسرین میرے بارے میں عام معلومات حاصل کر کے کیا فائدہ اٹھانا چاہتی ہے۔ وہ مجھے بلیک میل کرنے سے تو رہی۔ میں انہی سوچوں میں گم اپنے محلے سے گزر رہا تھا کہ انور جنرل سنور کے مالک انور صاحب نے مجھے بلا کر کہا۔ ”سکندر صاحب! مبارک ہو۔“

”کس بات کی مبارک، انور صاحب۔“ میں نے تعجب سے کہا۔

”شادی کی اور کس بات کی؟“ انور صاحب نے جواب دیا۔ ”بھئی، آپ نے ہمیں نہیں بتایا، مگر ہمیں معلوم ہو ہی گیا۔ کل آپ کے سرال والے آئے تھے۔“

”میرے سرال والے!“ میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

”کل شام ایک صاحب بڑی تفصیل سے آپ کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ انہوں نے میرے پوچھنے پر بتایا تھا کہ ان کی بیٹی کی شادی کی بات چیت آپ سے چل رہی ہے۔ لڑکے والوں نے لڑکی پسند کر لی ہے۔ اب ہم لڑکے کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کر رہے ہیں۔“

”آپ نے انہیں میرے بارے میں کیا بتایا؟“

”میں نے انہیں بتایا کہ آپ اس دنیا میں اکیلے ہیں۔ ماں باپ ہیں اور نہ بہن بھائی ہیں۔ قریبی رشتے دار بھی نہیں ہیں۔ تعلیم انٹر تک پائی ہے۔ مزید تعلیم کسی وجہ سے حاصل نہیں کر سکے۔ کسی فرم میں بطور کمیشن ایجنٹ کام کرتے ہیں۔ تنخواہ دو ہزار سے زیادہ ہی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ بن جاتی ہے، اس کے علاوہ میں نے بتایا کہ آپ بے حد شریف اور نیک آدمی ہیں۔“ اس نے توقف کر کے پوچھا۔ ”میں نے غلط تو نہیں کھانا ان سے؟“

”جی نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”شادی کی تاریخ طے ہوتے ہی آپ کی مٹھائی پکی۔“



”میں نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا؟“ وہ میرے قریب آ کر گویا ہوئی۔  
میں نے دل ہی دل میں کہا۔ آپ ساری زندگی مجھے ڈسٹرب کرتی رہیں تو بھی کوئی اعتراض نہیں کروں گا۔  
نہیں... ”میں نے اس سے کہا۔ ”لیکن میں نے آپ کو بچپنا نہیں۔ فرمائیے! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“  
”سکندر صاحب! معافی چاہتی ہوں کہ ناوقت آپ کی مصروفیت میں غل ہوئی۔“ وہ بڑی شائستگی سے بولی۔  
”میں مصروف نہیں بلکہ فرصت ہی فرصت میں ہوں۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”مگر میں نے آپ کو بچپنا نہیں۔“

”میں آپ کو بچپنا ہی ہوں اور آپ کی شخصیت سے بھی اچھی طرح واقف ہوں۔“ اس کے بھرے بھرے  
گدازہ دونوں پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ میرے ہاتھوں کی طرف دیکھنے لگی۔  
میں ٹھک سا گیا۔ کیا سارا شرم میرے بارے میں اچھی طرح سے جاننے لگا ہے، مجھے یوں لگا جیسے میں کوئی تماشا  
بننے والا ہوں۔

مجھے سوچوں میں ڈوبا دیکھ کر وہ بولی۔ ”کیا آپ مجھے اپنے قیمتی وقت میں سے کچھ حصہ دے سکتے ہیں؟“  
”کیا اسی وقت؟“

”جی...“ اس نے دھیرے سے کہا۔ ”میں آپ کے اس نقصان کی تلافی کرنے کے لیے بھی تیار ہوں۔ اگر  
آپ کچھ دیر کے لیے میرے ساتھ چلیں تو تاہم آپ کی احسان مند ہوں گی۔“  
میں نے چند لمحے صورت حال پر غور کیا، پھر اس کے ساتھ چلنے پر رضامند ہو گیا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ  
عورت بھی نرسن ہی کی کوئی چال ہے۔ ”مجھے کہاں چلنا ہو گا؟“

”سینڈ زبٹ!“

”سینڈ زبٹ!“ میں نے تعجب سے کہا۔ ”اس وقت سینڈ زبٹ جا کر کیا کریں گے؟“

”یہ تو میں آپ کو وہیں چل کر بتاؤں گی۔“ وہ بولی۔

”مگر وہ تو بہت دور ہے اور وہاں پہنچنے پہنچتے شام ہو جائے گی۔“

”میرے پاس کار ہے اور میں واپس آپ کو آپ کے گھر پر اتار دوں گی۔“

”آپ پھر ایک بار اچھی طرح سوچ لیں کہ میں ایک نااہل شخص ہوں۔ میرے بارے میں جس کسی نے بھی  
آپ کو بتایا ہے غلط بتایا ہے، یا پھر آپ کو میرے بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔“  
”میں مطمئن ہوں۔“ وہ دل فریب انداز میں مسکرائی۔ ”کسی کے غلط یا صحیح بتانے سے مجھے کوئی فرق نہیں  
پڑتا۔“

میں نے سوچا، بظاہر یہ عورت کتنی نفیس، منہ بے شائستگی اور ٹھیک ٹھاک معلوم ہو رہی ہے، مگر اندر سے شاید  
اس کے برعکس ہے۔ وہ نرسن کی آلہ کار تھی اور نرسن سینڈ زبٹ پر بے چینی سے میری خنجر ہو گی۔ شاید وہ مجھے  
پھیلوں کا چارہ بنانا چاہتی ہو گی۔ میں نے سوچا اگر نرسن کے دل میں یہ حسرت ہے تو اسے بھی پورا کر لینے دو۔ اگر  
میری زندگی باقی ہے تو نرسن ہی کی کوئی بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

چند لمحوں بعد میں اس کی نئی اور قیمتی کار میں بیٹھا سینڈ زبٹ جا رہا تھا۔ میں اس کے ساتھ ہی اگلی نشست پر  
بیٹھا تھا۔ وہ کسی تروتازہ پھول کی طرح محک رہی تھی۔ اس کا حسین چہرہ کسی خیال سے دمک رہا تھا۔ تمام راستے اس

کھلا رہتا ہے۔ میں بھانگ بھانگ پچا۔ دوا لے کر واپس آیا تو کمرہ خالی تھا۔ وہ شخص وہاں نہیں تھا۔  
میں چند لمحے تک بڑی حیرانی کے عالم میں کھڑا رہا۔ پھر اچانک مجھے خیال آیا تو میں بڑی سرعت سے غسل خانے  
کی طرف بڑھا۔ اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اندر جھانکا مگر وہ کہیں بھی نہیں تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا  
کہ کہ وہ کہاں گیا۔ دوسرے کمرے میں بھی نہیں تھا۔ ”معا“ میری نظر میز پر پڑی تو میں چونک گیا۔  
میری تصویر کا خالی فریم میز پر پڑا تھا، لیکن تصویر غائب تھی۔ یہ حرکت اس شخص کے علاوہ کسی اور کی نہیں ہو  
سکتی تھی۔ گویا وہ کوئی بہت بڑا فراڈی تھا۔ میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ کیا یہ ساری کاروائی محض میری تصویر کے  
حصول کے لیے تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ نرسن کا کارندہ ہو اور میرے مال پر ہاتھ صاف کرنے آیا ہو۔ پھر مجھے  
دھوکہ دینے کے لیے تصویر اٹھالے گیا۔ ورنہ تصویر چرا نا تو کوئی اہم بات نہیں تھی۔ یہ خیال آتے ہی میں نے اپنی  
محفوظ جگہ دیکھی۔ رقم اور زیورات موجود تھے، سب چیزیں اپنی جگہ جوں کی توں تھیں۔ کسی چیز کو ہاتھ تک نہیں  
لگایا گیا تھا۔ نرسن کو تصویر کی ضرورت تھی اور اس کے کارندے نے اسی ہاتھ میری تصویر چرا لی تھی۔ میں بستر  
لیٹ کر بڑی دیر تک چاروں طرف ذہن دوڑاتا رہا کہ نرسن میری تصویر لے کر کیا کرے گی۔ آخر وہ اس سے کیا  
فائدہ حاصل کرنا چاہتی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، مگر ایک بات واضح ہو گئی تھی کہ یہی شخص تھا جو گزشتہ چند  
روز سے سائے کی طرح میرے پیچھے لگا ہوا تھا۔

اب اس بات کا امکان پیدا ہو گیا تھا کہ نرسن سے ڈرامائی انداز میں بے بسی ہو گی۔ اس لیے کہ وہ نئی شاطرانہ  
چالوں سے میرے مقابلے پر آمادہ تھی۔ کسی بھی لمحے کوئی غیر متوقع واقعہ پیش آ سکتا تھا۔ میں انہی خیالوں میں گم  
سو گیا۔

اگلی شام نرسن سے ملنے کی خواہش اور تجسس لیے میں صدر آگیا۔ زیب النساء مارکیٹ میں شام کے وقت بڑی  
روشنی ہوتی ہے۔ اس وقت بھی یہ روشنی برقرار تھی۔ سردی کے موسم کے لمبوسات کی خریداری زوروں پر تھی۔  
سب خرام دو میز آؤں اور حینوں کے جسوں سے پھوٹی سینٹ کی خوشبوؤں سے فضا محک رہی تھی۔ ہر سمت  
رنگینی ہی رنگینی نظر آ رہی تھی۔ مجھے چہرے اور مناسب جسم کی لڑکیوں اور عورتوں پر نرسن کا دھوکا ہوتا تھا۔  
میں ان حسین چروں میں نرسن کی تلاش کے ساتھ ساتھ اپنا شکار بھی تلاش کر رہا تھا۔ پھر اچانک مجھے ایک نگرا شکار  
نظر آ گیا۔ اس کی تحویل میں تیس تیس ہزار سے کم رقم نہیں ہو سکتی تھی۔ میں اس شکار کے پیچھے پکا۔ میں نے چند  
قدموں کا فاصلہ بخٹکل طے کیا وہ گا کہ ”دھتا“ جیسے میری ساعت میں شد سا گل گیا۔ ”سکندر صاحب! پلینٹے تو“  
آواز بڑی رسی اور باریک سی تھی۔ مگر غیر مانوس تھی۔ میں چونک کر رک گیا۔ میرے محلے کی بہت سی  
لڑکیاں اور عورتیں مجھے جانتیں تھیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو مجھ پر نشہ سا چھانے لگا۔ وضع قطع سے وہ کوئی امیر و  
کبیر عورت معلوم ہو رہی تھی۔ سفید ساڑھی، سفید بلاؤز اور سفید ہی آستین والے سوئٹریں وہ منہمہ چاندنی سی  
معلوم ہو رہی تھی۔ بال کٹے ہوئے پشت پر لہرا رہے تھے۔ قد بھی نکلتا ہوا تھا۔ جس نے اسے اور پر کشش بنا دیا تھا۔  
اس کے ہاتھ میں جو پرس تھا، وہ بھی سفید تھا۔

میں نے حیرت اور سوالیہ نظروں سے دہش کے مجھے کو دیکھا تو اس نے دل کش مسکراہٹ سے پوچھا۔ ”آپ  
سکندر اعظم ہی ہیں؟“

”جی ہاں“ میں اس اجنبی عورت کی زباں سے اپنا نام سن کر حیران ہوا۔

نے کوئی بات نہیں کی۔

سورج ڈوبنے سے پہلے ہم سینڈ زیٹ پہنچ گئے۔ عام دن تھا اور سردی کا موسم، اس لیے وہاں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے سڑک کے کنارے کار روک لی۔ جہاں اس نے کار روک لی وہاں سے چند قدم کے فاصلے پر بٹس تھیں۔ وہاں پہلے سے کوئی کار کھڑی تھی۔

کار سے اترتے وقت اس نے انگنیشن سے چابی نہیں نکالی اور اپنا پرس منہالے ہوئے نیچے اتر آئی۔ پھر کار کا دروازہ بند کرتے ہوئے بولی۔ ”پہلے ڈوبتے سورج کا نظارہ کرتے ہیں، پھر بات ہوگی۔“

”تو آپ صرف بات کرنے کے لیے مجھے یہاں لائی ہیں۔ آپ کلفٹن یا سفاری پارک چل کر بھی بات کر سکتی تھیں۔“

”بات یہ ہے کہ... وہ بات ہمیں ہو سکتی تھی، اس لیے آپ کو یہاں لائی ہوں۔“

ہم دونوں بٹس پار کر کے اس جگہ آ گئے جہاں سمندر کی لہریں آ رہی تھیں۔ ہم دونوں ریت پر کھڑے ڈوبتے سورج کو دیکھ رہے تھے۔

پھر اسی نے خاموشی توڑی۔ ”یہ منظر اور جگہ آپ کو کیسی لگ رہی ہے؟“

میں دل کی یہ بات زبان پر نہیں لاسکا کہ آپ کی قربت سے یہ منظر اور جگہ بہت حسین ہو گئی ہے۔ اس سنجیدہ اور شائستہ عورت سے یہ بات نہیں کی جاسکتی تھی۔ تاہم میں نے جواب دیا۔ ”منظر بے حد حسین ہے اور یہ جگہ بھی یہاں سے واپس جانے کو جی نہیں چاہتا۔“

”اگر آپ کا دل واپس جانے کو نہیں چاہتا تو نہ جائیں۔“ اس کے لہجے میں عجیب سا تاثر تھا۔

”اگر یہاں میرا گھر ہو تا تو شاید میں کبھی نہ جاتا۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”اگر آپ کو یہاں ایک چھوٹا سا اور خوبصورت گھر بنا دیا جائے تو کیا آپ اس میں رہنا پسند کریں گے؟“ اس کا لہجہ پراسرار ہو گیا۔

”کیوں نہیں۔“ میں نے اس کی بات کو مذاق سمجھتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔

”میں آپ کے لیے ایک ایسا خوبصورت گھر بنا سکتی ہوں کہ جو دیکھے گا، دیکھتا ہی رہ جائے گا۔“ اس کا لہجہ سنجیدہ تھا، حلال کہ یہ باتیں مذاق میں ہو رہی تھیں۔

پھر جیسے میں اس کے لہجے کا ذوق معنی بن محسوس کر کے چونک اٹھا۔ میں نے دیکھا، پہلے اس کے چہرے پر جو نرمی اور گفتگو تھی اس کی جگہ خشونت نے لے لی۔

وہ مجھے اس طرح گھورتے پا کر فوراً ”پیچھے ہٹی، انگلی لہے اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پستول تھا۔ اس نے بڑی بے رحمی سے کہا۔ ”سمندر اعظم“ میں تمہاری خواہش ضرور پوری کروں گی۔ میں تمہیں اسی جگہ دفن کروں گی اور تمہارا مقبرہ تعمیر کروں گی۔“

ریوالور کی ٹال اپنی طرف اٹھی دیکھ کر مجھے اس خشک شام میں پیسے آ گئے۔ یہ ڈرامائی عمل اس قدر اچانک اور غیر متوقع تھا کہ میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ یہ تو میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ وہ حسین ساحرہ، کسی قائد کا روپ دھار لے گی۔ راستے بھر میں یہی سوچا آیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ وہاں نرسین موجود ہوگی اور اسی سے میرا مقابلہ ہو گا۔ اس اچانک صورت حال سے میں گڑبڑا گیا لیکن کچھ دیر بعد میں نے خود پر قابو پائی لیا۔ ”مقبورہ تو کسی اہم

شخصیت کا ہوتا ہے۔“ میں نے قدرے شوخی سے کہا۔ ”مثلاً، نور جہاں کا مقبرہ، ممتاز بیگم کا مقبرہ جو تاج محل کی صورت میں ہے۔ کیا آپ بھی ایسا ہی مقبرہ بنانا چاہتی ہیں۔“ میں باتیں کرتے ہوئے غیر محسوس انداز میں اس کی طرف بڑھا۔

”خبردار، آگے نہ بڑھنا۔“ وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر چیخی۔ ”ورنہ کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گی۔“

”آپ چاہتی کیا ہیں یہ تو بتایا نہیں اور خواہ مخواہ مجھ پر پستول تکن لیا۔“

”میں تمہیں اس دنیا سے نیست و نابود کر دینا چاہتی ہوں۔“ وہ پھر گئی۔

”وہ کس لیے؟ میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے؟“

”اس لیے کہ تم ایک سانپ ہو جو ہم سب کو ڈس لینا چاہتے ہو۔“ اس کی آواز نفرت اور غصے سے کانپ رہی تھی۔

”مگر میں تو اشرف المخلوقات میں سے ہوں۔“ میں اسے باتوں میں الجھا کر کوئی تدبیر سوچنے کے لیے وقت لینا چاہتا تھا۔ اس کے رعبہ زدہ ہاتھوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ زندگی میں پہلی مرتبہ کسی پر گولی چلانے والی ہے، میں نے بذلہ سنجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مزید کہا۔ ”کہیں آپ کی نظریں کمزور تو نہیں ہیں جو ایک شریف آدمی آپ کو سانپ نظر آ رہا ہے۔“

”اگر تم میری بات کو مذاق سمجھ رہے ہو تو یہ تمہاری بھول ہے۔ میرے ریوالور میں چھ گولیاں ہیں۔ ان میں سے ایک تمہارے نام کی ہے۔“ وہ اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے غرا کر بولی۔

”اچھا۔“ میں نے حیرت ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ”تو وہ جو دانے دانے پر آدمی کا نام لکھا ہونے والی ضرب المثل ہے، غلط ہے اور اس کی بجائے گولی گولی۔“

”بکو اس بند کرو۔“ وہ میری بات کاٹ کر بولی۔ ”اور مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔“

”اس مہلت کا شکریہ۔“ میں نے کہا۔ ”میں ابھی اپنے کفن دفن کا انتظام کر کے حاضر ہوتا ہوں۔“ میں یہ کہتے ہوئے ایک قدم آگے بڑھ آیا۔

لیکن جیسے میں نے دو سر قدم بڑھایا، ایک زبردست دھماکہ ہوا اور گولی میرے کان کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ میں ٹھک کر رک گیا اور بے اختیار میرے ہاتھ اوپر اٹھ گئے۔ ”فٹھو۔۔۔ پہلے میری بات سنو۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”لیکن یوں بلا جواز نہیں مروں گا۔ پہلے تمہیں میرا جرم بتانا ہو گا۔“

”تمہارا جرم۔۔۔“ وہ مرتعش آواز میں بولی۔ ”تم سے ایک ایسا جرم سرزد ہونے والا ہے جو میری جانی ویرانی کا باعث بن سکتا ہے۔“

”مجھے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔“ تو گویا تم مجھے میرے متوقع جرم کی سزا میں قتل کرنا چاہتی ہو؟“ میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ”اور وہ بھی قبل از وقت؟“

”ہاں۔۔۔“ اس نے چلا کر کہا۔ ”میں ہمیشہ سے پیش بندی کی قائل ہوں۔ آج بھی اسی اصول کے تحت عمل کرنے جا رہی ہوں۔ نقصان کے بعد جذبہ انتقام کی تسکین سے بہتر ہے کہ نقصان کا احتمال ہی ختم کر دیا جائے۔ کیا میرا یہ جواز تمہاری سمجھ میں نہیں آیا۔۔۔؟“

پہلی بار مجھے احساس ہوا۔ کہ وہ ایک پاگل اور جنونی عورت ہے۔ بظاہر بات مضحکہ خیز تھی لیکن اس پر طاری

گہری سنجیدگی نے مجھے احساس دلایا کہ دراصل میں کس عظیم صورت حال سے دوچار ہو چکا ہوں۔ شاید کسی بہت شدید جذبے نے اس کا دماغ ہلا دیا ہے۔ کوئی امکان حلوے اس انتہائی اقدام کے پس منظر میں ضرور تھا۔ اس پاگل پن کے مقابلے میں میری کوئی تدبیر کارگر ثابت نہیں ہو سکتی، چنانچہ میں نے بھی ایسے ہی پاگل پن کا مظاہر کیا۔ میں نے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی۔

میں اپنی جگہ سے ایسے اچھلا جیسے کسی طاقت ور سپرمن کو دبا کر اچانک چھوڑ دیا گیا ہو۔ فاصلہ زیادہ تھا تاہم کافی حد تک اس کے قریب گرا۔ میرے پائین کی طرف ایک انگارہ سا پکا اور گوشت کو اوجھڑتا ہوا گزر گیا۔ لیکن میں اسی لمحے میرا دایاں مکاس کی کھوپڑی پر پڑ چکا تھا... وہ تورا کر گری اور میں لڑکھڑا گیا... میں نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا اور ریت پر گرے ہوئے ریوانور کو ایک ٹھوکر سے دور کر دیا۔ میری اس حرکت کے دوران وہ اٹھ کھڑی ہوئی، پھر اس نے اندھ اندھ کار کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔

میں نے چاہا کہ اس کے پیچھے بھاگ کر اسے پکڑ لوں، مگر پہلے ہی قدم پر میرے زخمی بازو میں درد کی شدید لہر اٹھی اور میں کراہ کر وہیں بیٹھ گیا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ بھاگنے کے لیے بازوؤں کا سلامت ہونا کتنا ضروری ہے۔ میرا بازو کندھے سے جھول کر میری راہ میں رکھوٹ بن گیا تھا۔ میں وہیں پڑا دیرے دیرے کراہتا رہا۔ میرے کندھے کی تکلیف بڑھتی جا رہی تھی اور اب تو بازو کو حرکت دینا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ اچانک میری نگاہ سڑک کی طرف اٹھ گئی اور میں کانپ کر رہ گیا۔ وہ موٹر سائیکل سوار تھے اور تعداد میں دو درجن سے کسی طرح بھی کم نہیں تھے۔ ان کے موٹر سائیکلوں کی آواز سے فضا لرز رہی تھی میں ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کرنے لگا... لیکن میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا، پھر میرا دماغ پکڑنے لگا اور کائنات نے میری نظروں کے سامنے تیزی سے گھومنا شروع کر دیا۔

☆☆☆

موٹر سائیکل سوار میرے قریب آ گئے۔

میں نے خود کو سنبھالنے کی ایک آخری کوشش کی اور اپنے زخمی بازو کی کھائی کو دانتوں میں دبا کر زور سے کاٹ لیا۔ اس وقت میں اپنے جواس بحال رکھنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ آنے والوں کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ ان کے انداز سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بے فکرے آوارہ گرد ہیں۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر پہنچ کر انہوں نے ایک لخت بریک لگائے، ان کی موٹر سائیکلوں کی بے ہنگم آوازیں اچانک ہی دم توڑ گئیں... وہ نیچے اتر آئے۔

میرا زخمی بازو سن ہو چکا تھا۔ کھائی پر کانٹے سے میرے دانتوں کا حلقہ سا بن گیا تھا، لیکن میری یہ حرکت بے نتیجہ رہی تھی، کندھے کے زخم سے پیدا ہونے والی ٹیسوں کے مقابلے میں مجھے اس تکلیف کا احساس تک نہیں ہوا تھا، البتہ کانٹے سے میری زبان پر سمندر کی ٹمکن ریت کا ذائقہ کھل گیا تھا۔ میں نے منہ بنا کر ایک طرف تھوک دیا۔ میرے جڑے تختی سے کچھ بونے تھے اور میں اپنی دائیں کُمٹی پر اپنے جسم کا بوجھ سارے بے ڈھنگے انداز میں ریت پر پڑا تھا۔

لڑکے چند لمحوں تک حیرت سے میری طرف دیکھتے رہے، پھر انہوں نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا، لیکن خاموش رہے۔ وہ سب اٹھارہ سے بیس سال تک کی عمر کے تھے والے تھے اور ان

سب کا لباس تقریباً ایک جیسا تھا۔

”ارے... یہ تو زخمی معلوم ہوتا ہے۔“ ایک نوجوان نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ وہ ایک بے حد گورا اور بلند قامت نوجوان تھا۔

دوسرے ساتھیوں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا، لیکن وہ سب پک کر میرے ارد گرد جمع ہو گئے۔ میری حالت دیکھ کر ان سب کے چروں پر حیرت پھیل گئی، پھر چند نوجوان میرے پاس دو زانو ہو کر بیٹھ گئے۔ ایک لڑکے نے میرا زخمی بازو تھام لیا اور زخم کا جائزہ لینے لگا۔ ”کیا ہوا بھائی، تمہیں کس نے زخمی کیا ہے؟“

اس کے پچھڑنے سے مجھے بازو میں شدید تکلیف کا احساس ہوا۔ میں نے اپنے جڑے بھیج کر تکلیف پر قابو پانے کی کوشش کی لیکن کراہ کر رہ گیا۔

ان لوگوں نے میری کیفیت بھانپ لی تھی۔ وہ سب اوباش قسم کے نوجوان تھے، تاہم مجھے اطمینان ہو گیا کہ وہ میرے لیے خطرناک ثابت نہیں ہوں گے۔ میرے ساتھ ان کی کوئی دشمنی نہیں تھی، پھر میری حالت ایسی تھی کہ میں کسی بھی انسان کی فطری ہمدردی حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتا تھا۔

مجھ پر ٹپکے ہوئے نوجوان نے بڑی آہستگی سے میرا بازو واپس ریت پر رکھ دیا۔ پھر وہ ایک دوسرے نوجوان سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”ارشد، میرا خیال ہے یہاں ہمارا جادوئی بکس کام آسکتا ہے... ذرا لانا!“

شاید ان کے پاس کوئی فرسٹ ایڈ بکس تھا جسے وہ جادوئی بکس کہہ رہے تھے۔ بھوری آنکھوں والا ارشد بکس لینے چلا گیا۔ ان کی موٹر سائیکلوں کے پیچھے مختلف قسم کا سامان رکھا نظر آ رہا تھا۔ میں سمجھ نہ سکا وہ اس وقت یہاں کیا کرنے آئے ہیں اور فرسٹ ایڈ بکس کے علاوہ دوسرے سامان کی انہیں کیوں ضرورت ہے۔ ظاہر ہے وہ اس سنان ساحل پر میری مدد کرنے کے لیے تو نہیں آئے تھے، یقیناً ان کے پیش نظر کوئی اپنا پروگرام رہا ہو گا۔ وہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ارشد فرسٹ ایڈ کا بکس لے کر آیا۔ جس لڑکے نے ارشد کو ہدایت دی تھی، اس نے بکس کھولا اور ایک شیشی نکال لی، اس میں ٹھیکر تھا۔

”ٹھیکر...“ گورے رنگ والا دراز قامت نوجوان ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”پہلے میں سیبوں کا تھیلہ لے آؤں۔“

”کیوں، زخم پر سیب باندھو گے!“ میرے پہلو میں بیٹھے نوجوان نے اسے گھورا۔

دراز قامت نوجوان کوئی جواب دے بغیر اپنی موٹر سائیکل کی طرف لپکا۔ پھر وہ موٹر سائیکل کے کیریز سے لال رنگ کا ایک تھیلہ اتار کر لایا۔ اس نے تھیلے کا منہ کھولا اور سرخ رنگ کا ایک سیب نکال کر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”اسے اپنی داڑھ کے نیچے رکھ لو، اس سے قدرے افادہ رہے گا۔“ اس نے کہا اور سیب زبردستی میرے منہ میں ٹھونس دیا، اس کے انداز میں شرارت تھی۔

اسی لمحے مجھے اپنے بازو پر تیزاب سا گرم محسوس ہوا۔ دوسرے نوجوان نے ٹھیکر کی پوری شیشی میرے بازو پر اندر مل دی تھی۔ ایک متحرک آگ مجھے بازو سے کھوپڑی کی طرف لہرائی محسوس ہوئی، میں نے بے اختیار لوٹ لگنا چاہی، لیکن اسی لمحے دو جوانوں نے مضبوطی سے مجھے جکڑ لیا۔ میرے منہ میں دبا ہوا سیب اچھل کر ریت پر گر گیا۔ دراز قد نوجوان کے منہ سے ایک قندہ بلند ہوا مجھے اپنی کھوپڑی سے دھواں اٹھتا محسوس ہو رہا تھا۔ بے شک انہوں نے میری بھلائی کے لیے ایسا کیا تھا لیکن ان کا انداز ظالمانہ تھا۔

پھر رفتہ رفتہ میرے زخمی بازو پر ٹھنڈی پڑ گئی، درد کا احساس ہو رہا تھا لیکن زخم کی جلن کافی حد تک ختم ہو گئی

بیوی کے ساتھ کیا سلوک کریں۔" میرے انداز میں غلٹ اور گھبراہٹ تھی۔

"ارشاد..." میری مرہم پٹی کرنے والا نوجوان اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا۔ "انہیں مین روڈ تک چھوڑ آؤ وہاں سے خودی چلے جائیں گے۔"

میں سوچنے لگا کہ خودی گھر کیسے پہنچوں گا؟ جب کہ میرے پاس کوئی گاڑی نہیں ہے۔ توقع تھی کہ وہ کم از کم مجھے کسی بس اسٹاپ تک ضرور پہنچا دیں گے، لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا تھا۔ میں نے اپنے چہرے پر معذرت خواہانہ مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔ "دوستو! تم سب کا بے حد ممنون احسان ہوں، لیکن میں آپ کو تھوڑی سی تکلیف مزید دینا چاہتا ہوں۔ یہ میری مجبوری ہے۔ کم از کم مجھے گلابی کے بس اسٹاپ تک پہنچا دیں۔"

کچھ نوجوانوں نے بے زاری سے میری طرف دیکھا۔ میری کیفیت اس وقت ایسے بھکاری کی سی تھی جسے ہیک دینے سے مقابل چھپا رہا ہو۔ میرے درخواست کرنے پر اس دراز قد نوجوان کو رحم آئی گیا جو سب سے پہلے میری طرف متوجہ ہوا تھا۔ "ٹھیک ہے، میں اپنی موٹر سائیکل پر تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"لیکن..." میری مرہم پٹی کرنے والا نوجوان ابھن آمیز انداز میں بولا۔ "آپ پولیس میں رپورٹ درج کریں گے تو ہمارا تذکرہ بھی کریں گے۔"

"اگر آپ لوگ پسند نہیں کرتے تو میں وہاں آپ کا ذکر نہیں کروں گا۔" میں جلدی سے بولا۔

"ہمارا پروگرام رات کو یہاں رہنے کا تھا، لیکن شاید پولیس جانے واردات پر آئے اور ہمیں خواہ مخواہ..." اس نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔

"آپ اس کی بھی فکر نہ کریں۔" میں نے کہا۔ "جائے واردات کے بارے میں پولیس کو کچھ بتانے کا فائدہ بھی نہیں ہے، مجھے ان بد معاشوں کی گاڑی کا نمبر یاد رہ گیا ہے، اسی کے سارے میں پولیس کو نشاندہی کروں گا اور کسی دوسری جگہ کا نام لے لوں گا۔" میں نے انہیں اطمینان دلایا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ مطمئن ہو کر بولا۔ "دراصل ہم سب دوستوں کا پروگرام پھیلیوں کا شکار کرنے کا ہے، اسی لیے پوری تیاری کے ساتھ آئے ہیں۔" اس نے بتایا۔

"آپ بے فکر ہو کر تفریح کریں۔" میں نے کہا۔ "اور مجھے اجازت دیں۔"

"آئیں، میرے ساتھ آئیں۔" لے لڑکے نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "میں آپ کو گلابی تک چھوڑ آتا ہوں۔"

میں اس کے ساتھ چلنے لگا تو ایک لڑکے نے پرس اٹھا کر مجھے دیا۔ "شاید آپ کی بیوی کا پرس ہے۔"

میں نے پرس لے کر جیب میں رکھ لیا اور پھر جا کر دراز قامت نوجوان کے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھ گیا۔

وہ نوجوان بہت مخلص اور دلچسپ ثابت ہوا۔ گلابی تک وہ بولتا ہی رہا اور میں خاموشی سے سنتا رہا۔ اس نے اپنا نام شاہد بتایا۔ آدھے گھنٹے سے پہلے اس نے مجھے بس اسٹاپ تک پہنچا دیا پھر میں اس کا شکریہ ادا کر کے بس میں جا بیٹھا، اس وقت رات کے آٹھ بج رہے تھے۔

گھر پہنچ کر میں اس عورت کے پرس کا جائزہ لینے لگا۔ جو میری جیب میں تھا۔ پرس میں بائیس سو روپے کی رقم تھی، لیکن کوئی ایسی چیز نہیں ملی جس سے اس عورت کے بارے میں کوئی سراغ ملتا۔

میں نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے زخم کا جائزہ لیا۔ زخم اچھا خاصا تھا لیکن بروقت مرہم میسر آنے کی وجہ سے زیادہ خطرناک نہیں رہا تھا، تاہم میں نے مناسب سمجھا کہ ڈاکٹر کو دکھا دیا جائے۔ قریب ہی ایک ڈاکٹر صاحب

تھی۔

پھر ایک لڑکے کی نظر اچانک تھوڑی دور پڑے ہوئے ریو اور پرس پر پڑی۔ "ارے..." وہ حیرت سے ان چیزوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا، پھر اس نے دونوں چیزیں اٹھالیں۔ سب لڑکے اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

یہ... یہ سب کیا ہے؟" وہ میری طرف پلٹتے ہوئے بولا۔ سارے چہرے سنجیدہ ہو گئے تھے۔

میری میرے لیے ایک مشکل مرحلہ تھا، ان لوگوں کو مطمئن کرنا تھا جب کہ حقیقت حال سے پردہ اٹھانا خلاف مصلحت تھا۔ پھر مجھے ایک تدبیر سوجھ ہی گئی۔ میں اچانک جیسے ہوش میں آنے کی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔

میری بیوی! میں نے حلاشی نگاہوں سے اوپر ادرہ دیکھا۔

"بیوی...؟" دراز قامت حیرت سے بولا۔ "کیا تمہاری بیوی نے تم پر گولی چلائی تھی۔"

"نہیں..." میں نے وحشت زدہ آواز میں کہا۔ "وہ... وہ میری بیوی کو اغوا کر کے لے گئے۔"

"اوہ..." تقریباً سب ہی کے منہ سے یہی آواز نکلی، پھر ایک نے پوچھا۔ "کون لوگ تھے وہ؟"

"میں نہیں جانتا۔" میں نے سر ادا بھرتے ہوئے کہا۔ "میں اپنی بیوی کو سیرو تفریح کے لیے یہاں لایا تھا... یہاں پہلے سے چند افراد موجود تھے، ہمیں نہیں معلوم تھا کہ وہ بد معاش اور لٹیرے ہیں۔ ہم دونوں کو یہاں تھاپا کر انہوں نے اسلحہ نکال لیا، ان کے پاس ریو اور تھے، پھر وہ مجھے زخمی کر کے میری بیوی اور میری گاڑی لے کر فرار ہو گئے۔"

"لیکن وہ اپنا ریو اور یہاں کیوں چھوڑ گئے؟" ایک نوجوان نے اچانک کہا۔ "ظاہر ہے وہ اتنے احمق تو نہیں ہوں گے کہ اپنے خلاف ثبوت چھوڑ جائیں۔"

میں ایک لمحے کے لیے ہلکا سا گھبراہٹ ہو کر رہا تھا اور یہ بات میرے حق میں بہتر نہیں تھی۔ میں اپنا زخمی بازو تھام کر کہا۔ میں کوئی مناسب جواب سوچنا چاہتا تھا۔

ننگر لگانے والا نوجوان پھر سے میرے زخم کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے بکس سے ایک ٹیوب نکال، پھر میرے بازو پر مرہم لگا کر پٹی باندھ دی، اس سے مجھے کافی سکون محسوس ہوا۔ "خدا کا شکر ادا کرو کہ گولی اندر نہیں گئی، ورنہ سرجن کے پاس جانا پڑتا۔" وہ ہمدردانہ لہجے میں بولا۔ "ویسے وہ بد معاش تعداد میں کتنے تھے؟"

"چار۔" میں نے جواب دیا۔ "اور سب کے سب نشتے میں تھے، شاید اسی لیے وہ ریو اور یہاں چھوڑ گئے، یہ ان کے خلاف میرے پاس ایک کافی ثبوت ہو گا مگر..." میں کچھ سوچ کر چوک گیا۔

"کیوں، کیا ہوا؟" جو نوجوان ریو اور اور پرس اٹھا کر میرے پاس لایا تھا بولا۔

میں نے سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "تم نے ریو اور کو ہاتھ لگا کر اچھا نہیں کیا۔ اب تو پولیس اس پر سے تمہاری ہی انگلیوں کے نشانات حاصل کر سکے گی۔"

"اوہ واقعی..." وہ ایک دم خوفزدہ ہو گیا۔

"بہر حال... اب ایسا ہو چکا ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ پریشان نہ ہوں۔ اس ریو اور کو سمندر میں پھینک دیں، ویسے میں آپ سب کا بے حد شکر گزار ہوں۔"

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سب ایک دم چپ ہو گئے تھے۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے وہ میری مدد کر کے بچھتا رہے ہوں۔

میں نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اب میں جلد از جلد شر پختہ چاہتا ہوں۔ نہ جانے وہ لوگ میری



کا ٹیک تھا، میں نے ان کے پاس جا کر دوبارہ پٹی کروائی۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے ایک انجکشن بھی لگایا اور چند کیپسول اور ٹیبلٹس بھی دیں۔  
دوا استعمال کرنے کے بعد مجھے فوراً ہی نیند آنے لگی اور میں سو گیا۔

اگلے چند روز میں گھر پر ہی رہ کر اپنا علاج کرتا رہا۔ اس دوران وہ عورت مسلسل میرے ذہن پر سوار رہی جس نے مجھے زخمی کیا تھا۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اس کی اس جنونی حرکت کے پیچھے کیا چیز کارفرما تھی... بہت کوشش کے باوجود مجھے اپنا کوئی ایسا تصور یاد نہ آسکا جسے اس انتہائی اقدام کی وجہ قرار دیا جاسکتا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ مجھے میرے متوقع جرم کی سزا میں قتل کرنا چاہتی ہے... اور یہ بات جتنی مضحکہ خیز تھی اتنی ہی خلاف عقل بھی... میرے نزدیک اس کا یہ جواز محض ڈرنا بازی تھا۔ میں تھک ہار کر یہی نتیجہ اخذ کر سکا کہ وہ مجھے اپنے طور پر تلوم مرگ بھی قتل کی اصل وجہ سے بے خبر رکھنا چاہتی تھی۔ شاید اس وقت بھی میرے بچ جانے کا امکان اس کے پیش نظر رہا ہو اور اسی امکان کے تحت اس نے احتیاط برتی ہو... یقیناً یہی بات رہی تھی۔ میں اس سے صرف ایک فیصد امکان کے تحت ہی اس کے ہاتھوں ہلاک ہونے سے بچ گیا تھا۔ اب اگر مجھے وہ اپنی اصلیت بتا چکی ہوتی تو میں جوابی کارروائی کے لیے بے آسانی اس تک پہنچ چکا ہوتا، لیکن اس نے کمال احتیاط برت کر خود کو میری جوابی کارروائی سے محفوظ کر لیا تھا۔

میں کافی دنوں تک اس کی شخصیت میں الجھا رہا... بازو کا زخم مندمل ہو چکا تھا، مگر اس منحوس عورت کا پر اسرار ہونا میرے ذہن پر مسلط ہو کر رہ گیا۔ مجھے ایک خیال یہ بھی آیا کہ وہ نرسن کی آلہ کار رہی ہو۔ نرسن کے پاس میرے خلاف اس انتہائی اقدام کا جواز بھی تھا اور اس عورت نے میرے بارے میں جن معلومات کا دریا بہایا تھا، ان سے بھی نرسن واقف تھی، وہی اس عورت کو میرے بارے میں اتنی معلومات فراہم کر سکتی تھی، اس کے علاوہ نرسن، حسین عورتوں سے متعلق میری کمزوری سے بھی واقف تھی۔ اگر نرسن کو اصل مجرم تصور کر لیا جاتا تو وہ حسین قادی بھی کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگتی تھی۔

اب میں کافی حد تک محتاط ہو گیا تھا۔ حسین چروں پر تو مجھے اب بھی پیار آتا تھا، لیکن میں نے حسن کی اندھی تقلید چھوڑ دی۔ میں نے اس عورت کو کراچی کے تمام بڑے بازاروں، ہوٹلوں اور تفریح گاہوں میں تلاش کیا، لیکن وہ مجھے کیس نظر نہیں آئی۔ نرسن کے متعلق میرا گمان، یقین میں بدلتا جا رہا تھا۔ وہ اس واقعے سے چند روز پہلے غیر متوقع طور پر اپنا مکان چھوڑ گئی تھی اور پھر اب تک نظر نہیں آئی تھی۔ وہ خصوصاً ان حالات میں غائب ہوئی تھی جب اسے میرے ہاتھوں زبردست نقصان اور ذلت آمیز شکست اٹھانا پڑی تھی۔ اس اعتبار سے میرے خلاف اس کا سازش کرنا بالکل منطقی اور عین ممکن فعل تھا۔

ایک روز میں صبح کوئی دس بجے اٹھا۔ اس روز میرا پروگرام جی کے پاس جانے کا تھا۔ میں نماز کو فارغ ہوا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو ایک اجنبی کو اپنے سامنے دیکھ کر چونک پڑا۔ اس نے نہایت مذہب اور شائستہ لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔ ”کیا میں اندر آسکتا ہوں؟“

میں ایک لمحے کے لیے اسے گھور کر رہ گیا۔ وہ اپنی وضع قطع سے کوئی اعلیٰ افسر نظر آ رہا تھا، لیکن میں اس سے قطعی باواقف تھا۔ تعارف کرائے بغیر اس کا یہ بے تکلفانہ انداز مجھے کھل رہا تھا، بلکہ جی بات تو یہ ہے کہ میں اب اجنبیوں سے کھڑے نہ لگا تھا۔

”میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔“ میں نے خشک لہجے میں کہا۔ میں چاہتا تھا کہ پہلے وہ اپنا تعارف کرائے۔

”مجھے آپ اپنا دوست ہی تصور کیجئے۔“ اس کے چہرے پر ایک دلاور مسکراہٹ بکھر گئی۔ میں نے دیکھا کہ اس کے دانت سفید موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ عمر چالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی لیکن اس کا جسم نوجوانوں کی طرح نحوس و مضبوط تھا۔ میں اس کی دلکش مسکراہٹ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔  
”کیا اندر آنے کا راستہ نہیں دیں گے... وہ پھر بولا۔“ کچھ اچھا نہیں لگتا کہ یہاں دروازے پر کھڑے کھڑے ہی گفتگو کی جائے۔“

میں نے باہل خواست ایک طرف ہٹ کر اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔  
جب وہ کمرے میں داخل ہو کر کرسی کی طرف بڑھا تو میں محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ وہ کوئی فوجی ہے۔ وہ کمرے نیلے رنگ کے دھاری دار سوٹ میں تھا اور پیروں میں غیر ملکی چرمی بوت تھے۔  
وہ کرسی پر بیٹھ گیا، میں اس کے پیچھے چلا ہوا جب اس کے قریب پہنچا تو پہلی بار اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ”مجھے کرمل نیاز احمد کہتے ہیں۔“  
میں نے مصافحہ کیا۔ اس نے بڑی گرم جوشی اور محبت سے میرا ہاتھ دلیا اور پھر ایک دل کش مسکراہٹ مجھ پر بھاری کر۔

”غریبے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“ میں نے جواباً ”مسکرا کر کہا۔  
”سکندر صاحب۔“ اس نے یوں کہا جیسے میرا کوئی بہت بے تکلف دوست رہا ہو۔ ”حقیقت یہ ہے کہ ہمیں آپ کی خدمتوں کی ضرورت ہے اور خدمت میں بھی ایسی جو سکندر اعظم کے شایان شان ہوں۔“  
میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ میں سوچنے لگا کہ کہیں وہ سرور صاحب کا تو کوئی آدمی نہیں ہے؟ لیکن میں نے فی الوقت سرور صاحب کے حوالے سے بات کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ”اگر آپ کا مطلب کسی خاص خدمت سے ہے تو میں ایک معمولی آدمی ہوں، میں بھلا کس کام آسکتا ہوں۔“ میں اٹھارے بولا۔

اس نے جواب دینے سے پہلے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو میں چونک پڑا۔ سب سے پہلا خیال مجھے یہ آیا کہ کہیں وہ اپنی جیب سے کوئی ہتھوڑ تو نہیں نکال رہا، غیر ارادی طور پر میرا ہاتھ جیب میں پڑے چاقو کو ٹٹولنے لگا۔ وہ کرمل نما شخص بظاہر کتنا ہی مذہب کیوں نہیں نظر آ رہا تھا لیکن اب میرے لیے کوئی بھی اجنبی قاتل بھروسہ نہیں رہا تھا... پھر اس کا ہاتھ جیب سے باہر آیا تو مجھے حیرت کا ایک شدید جھکا لگا۔ اس کے ہاتھ میں ایک طلائی سگریٹ کیس تھا جس کے سامنے والے حصے میں ایک خوب صورت ڈیزائن میں چھوٹے چھوٹے دھتکے تھکے تھکے ہیرے بڑے ہوئے تھے... ایک کرمل اس عیاشی کا متحمل نہیں ہو سکتا، میں نے سوچا۔ ایسی شان و شوکت تو کسی کروڑ پتی سرمایہ دار یا کسی اسمگلر کے ہاں ہی ہو سکتی ہے اس نے مجھے سگریٹ پیش کرنا چاہا لیکن میں نے معذرت کر لی۔ پھر اس نے خود سگریٹ سلگایا اور پوری فضا خوشبودار دھوئیں سے معمور ہو گئی۔ یہ سگریٹ بھی بہت قیمتی اور نفیس قسم کا تھا۔ میں اس کے بارے میں الجھن کا شکار ہونے لگا۔

وہ ایک گمراہش لینے ہوئے بولا۔ ”عام آدمی ایسے نہیں ہوتے۔ عام آدمی آپ میں بڑا فرق ہے۔“

میں خاموشی سے اس کی صورت دیکھنے لگا۔

اس نے اپنی آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال دیں اور سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ”اگر ملک و قوم کو آپ کی ضرورت پڑے تو آپ پیچھے ہٹ جائیں گے؟“

”اپنے وطن کے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے۔“ میں نے محتاط لہجے میں کہا۔

باخری کے کیا کہنے!

"کون عورت... بھی کون؟" وہ اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھا۔  
"آرام سے بیٹھیں، میں آپ کو بتاتا ہوں۔" میں نے کہا اور اس عورت کا حلیہ مع واقفے کی تحصیل کے بتانے لگا۔

ایک ایک اس کی مسکراہٹ کا نور ہو گئی اور اس کے چہرے پر فکر مندی کے سائے لہرائے گئے۔ چند لمحوں بعد اس نے مجھ سے پوچھا۔ "آخر اس عورت کو تمہارے بارے میں کیسے معلوم ہوا۔" اس نے سگریٹ الٹیں ٹرے میں مسل دیا اور میری صورت دیکھنے لگا۔

"جس طرح آپ کے علم میں بہت ساری باتیں آگئی ہیں اسی طرح اس نے بھی معلوم کر لیا ہو گا۔"

"مگر... اس نے بے چینی سے پلو دلا۔ "یہ تو بہت برا ہوا۔"

"جی ہاں۔" میں نے جمل کر کہا۔ "میرے حق میں تو بہت سی برا ہوا ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں۔" اس نے مجھے تسلی دی۔ "اب آپ کا کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔"

"آپ نے میری کسی بات کا جواب نہیں دیا اور نہ ہی یہ بتایا کہ یہ کیا پکڑ ہے؟ وہ عورت کون ہے؟"

"آپ کے ان سوالوں کے جواب تو کسی اور ہی وقت دے سکوں گا۔ اس وقت بتانا مناسب نہیں۔ ویسے ہم پوری طرح سے چوکتا ہیں اور ہر طرح سے آپ کی حفاظت کر رہے ہیں، آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا، مجھے پھر بھی آپ کو ہوشیار رہنا ہو گا۔ بہت جلد آپ کو اپنے سوالوں کا جواب مل جائے گا۔"

"تو کیا آپ مجھے بھی کچھ بتانے کے لیے آئے تھے؟" میں نے خشک لبے میں کہا۔

"میں حاضر تو کسی اور ہی کام سے ہوا تھا۔" وہ اپنی اضطراری کیفیت پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ "آپ سے ایک عاجزانہ درخواست ہے، امید ہے آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔"

"درخواست... کیسی درخواست؟" مجھے اس کے ملتبیانہ لبے پر حیرت ہوئی۔

"میں اپنے مشن میں آپ کو پوری طرح شامل کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے مجھے آپ کے تعاون کی اشد ضرورت ہے۔ میں آپ سے ایک وعدہ لینا چاہتا ہوں۔"

میرا ذہن فوراً منشیات کے بین الاقوامی اسمگلروں کی طرف گیا۔ یہ لوگ ایسے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو ترجیح دیتے ہیں جو ذہین و فطین، خوش شکل، نڈر اور بے حد ضرورت مند بھی ہوں۔ وہ ان کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر ان کو آگے کار بناتے ہیں۔ ان سے نہ صرف اسمگلنگ بلکہ اور بھی بہت سے کام لیے جاتے ہیں، چند لمحوں تک متذبذب رہا، پھر میں نے صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کیا اور پوچھا۔ "کیا آپ مجھے منشیات کی اسمگلنگ کے لیے اپنا آگے کار بنانا چاہتے ہیں؟"

"جی نہیں، ہرگز نہیں۔" وہ میری بات پر چونک کر بولا۔ "میں نے بتایا کہ میں ایک فوجی افسر ہوں۔ وطن کی پاسبانی میرا پیشہ ہے۔ میں اور اسمگلنگ...؟ خدا صاف کرے۔ میں تو وطن عزیز کے لیے آپ سے ایک اہم کام لینا چاہتا ہوں۔"

میں اس کی باتیں سن کر خوش ہو گیا۔ "اس کے لیے تو مجھے ہر لمحہ تیار ہائیں گے۔"

"تو پھر آپ چلنے کی تیاری کریں۔ ہمیں بہت دور جانا ہے۔" اس نے کہا۔

"اتنی جلدی!" میں متعجب رہ گیا۔ "کیس چلنا ہے؟"

"مجھے ایسے نوجوانوں کی تلاش ہے جو ستاروں پر کند ڈال سکیں۔"

"آج کا نوجوان تو ایسا نہیں ہے۔"

"کیوں نہیں ہے۔" ڈھونڈنے سے ایک نہیں ہزاروں نوجوان مل جائیں گے۔"

"لگتا ہے آپ کو آج کے نوجوانوں سے بہت زیادہ توقعات ہیں؟"

"ہاں۔" وہ سگریٹ کا ایک سٹل لے کر بولا۔ "ملک کے نوجوان ہی کامیابیوں کے قریب ہوتے ہیں۔ ان میں دشمنوں کے خلاف ایٹم بم سے کہیں زیادہ طاقت ہوتی ہے۔"

"کیا آپ مجھے فوج میں شامل کرنا چاہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"کیا آپ فوج میں بھرتی ہونا پسند کریں گے؟"

"فوج میں بھرتی ہونا کون پسند نہیں کرتا، مگر میں کیسے بھرتی ہو سکتا ہوں؟"

"آپ بھرتی کیوں نہیں ہو سکتے، کس نے روکا ہے؟" وہ مخصوص انداز میں مسکرایا۔ "فوج کے دروازے ہر ایک کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔"

"میرا خیال ہے میرے بارے میں آپ کافی کچھ جانتے ہیں، کیا پھر بھی آپ یہ بات کہہ سکتے ہیں؟"

"آپ کو کیسے اندازہ ہوا کہ میں آپ کے بارے میں جانتا ہوں؟" اس کے ہونٹوں پر کھینچتی ہوئی مسکراہٹ اور

سہمی ہو گئی۔ "ویسے میں آپ کو فوج میں بھرتی کرنے کے ارادے سے نہیں آیا ہوں۔"

"آپ میرے بارے میں کیا کچھ جانتے ہیں؟" میں نے بات آگے بڑھانے سے قبل اس کی معلومات کا اندازہ

کر لیتا تھا۔

"میں آپ کے بارے میں کچھ زیادہ ہی جانتا ہوں۔" میری بات کے جواب میں وہ کہنے لگا۔ "آپ کے

والدین کا آپ کے بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ آپ کا کوئی بھائی بہن نہیں۔ آپ نے انٹر تک تعلیم حاصل کی۔

حالات نے آپ کو کلکتہ، ممبئی، دہلی اور کراچی کی مختلف پابندیدہ تنظیموں میں شامل کر دیا۔ آپ نے بد معاشوں سے

بہت کچھ سیکھا، مگر آپ نے صرف ایک فن پر خصوصی توجہ دی۔ دو انگلیوں کے فن میں وہ مہارت حاصل کی کہ

آج آپ کا کوئی غلطی نظر نہیں آتا۔ آپ اس فن کے بے تاج بادشاہ ہیں اور زندگی میں ایک بار بھی اس جرم کی

پاداش میں گرفتار نہیں ہوئے۔ محلے اور معاشرے میں بھی عزت بنی ہوئی ہے۔ آمدنی بے پناہ ہے اور پھر آپ کے

سینے میں جو دل دھڑکتا ہے وہ جرائم پیشہ لوگوں سے قطعاً مختلف ہے اور آپ اپنے نام کی طرح عظیم انسان ہیں۔"

میں اس کی معلومات پر ششدر رہ گیا۔ میں چند لمحوں تک اسے حیرت بھری نظروں سے دیکھتا رہا... پھر میں

نے چونک کر پوچھا۔ "تو کیا وہ لوگ آپ ہی کی اٹھیلی جس کے تھے جو کچھ عرصے سے میرے بارے میں پوچھتے پھر

رہے ہیں اور غیر محسوس انداز سے میرا تعاقب کر رہے ہیں۔"

"جی ہاں۔" اس کے لبوں کی مسکراہٹ معنی خیز ہو گئی۔ "آپ کا تعاقب نہیں کیا جا رہا تھا بلکہ غیر محسوس

انداز میں آپ کی حفاظت کی جا رہی تھی۔"

"کس لیے؟" میں نے تعجب سے کہا۔

"اس لیے کہ آپ کی جان کو سخت خطرہ لاحق ہو چکا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"مگر اس حسین عورت کو بھی آپ ہی نے میری خدمت پر مامور کیا تھا تو میں آپ کا بے حد احسان مند

ہوں۔" میں نے طعنے لہجے میں کہا۔ "اور اگر وہ آپ کی اجازت کے بغیر ہی میری جان لینے والی تھی تو آپ کی

گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔“

”وطن عزیز کے لیے میں بغیر کسی تنخواہ، مراعات اور سہولتوں کے کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے تنخواہ نہیں چاہیے۔“

”میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔“ وہ بولا۔ ”آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میری اس پیش کش سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا، جیسا کہ آج کل ایک روایت بن چکی ہے۔ اور پھر وہ آپ کی طرح غلط نہ ہوتا۔“ اس نے توقف کر کے جب سے ایک پھولا ہوا لٹافہ نکالا اور میری طرف بڑھایا دیا۔ میں نے غیر احتیاری طور پر اپنا ہاتھ بڑھایا تو اس نے لٹافہ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ ”اس لٹافے میں ایک ماہ کی تنگی تنخواہ ہے۔ مری بیٹی پر آپ کو نقرر نامہ ملے گا۔“

میرے پاس روپے پیسے کی افراط تھی لیکن یہ دس ہزار روپے پا کر مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی اس لیے کہ یہ جائز کمائی کے طور پر ملے تھے۔ مجھے کسی جیب کی صفائی نہیں کرنا تھی۔ میں مسرت سے اس لٹافے کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنی نظریں دیوار پر لگے ہوئی کیلنڈر پر مرکوز کر دیں۔ ”آج یکم نومبر ہے۔ آپ پندرہ نومبر کو آخری فلائٹ سے اسلام آباد پہنچ جائیں۔ میں انرپورٹ پر آپ کا منتظر ہوں گا۔ آپ آج یا کل جاکر ٹکٹ بک کرالیں۔ آج کل ہزارش ہوتا ہے۔“

”آپ زحمت نہ فرمائیں۔ مجھے مری کا پتہ دے دیں میں خود ہی پہنچ جاؤں گا۔“

میں نے یک لخت اس کی آنکھوں میں اضطراب کی ایک لہر مچھلتے دیکھی جس پر اس نے جلدی ہی قابو پایا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور گزر گیا۔ ”اس میں زحمت کی کیا بات ہے۔“ میں نے اس کی آواز میں ارتعاش سا محسوس کیا۔ ”مجھے اس روز ایک بے حد ضروری کام ہے، مری سے اسلام آباد آنا ہے۔ شام تک اس کام سے فارغ ہو جاؤں گا۔ ہم دونوں رات کسی ہوٹل میں ٹھہریں گے اور علی الصبح مری کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ اسلام آباد سے مری کے سفر کا صحیح لطف تو سویرے سویرے ہی آتا ہے۔“ اس نے بات ختم کی۔

وہ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر دفعتاً اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ ”اچھا، اب مجھے اجازت دیں۔ اس نے اپنا ہاتھ دوستانہ انداز میں مصالحتی کے لیے میری طرف بڑھایا۔ میں اس کی بغیر متوقع رخصت کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔ میں اس کی خاطر مدارات کرنا چاہتا تھا۔ باتوں میں کچھ خیال ہی نہیں آیا تھا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا آپ مجھے خدمت کا موقع نہیں دیں گے؟“

”بہت بہت شکریہ۔“ اس نے اپنی آستین ہٹائی تو اس کی کلائی پر ہیرے کی قیمتی گھڑی دکھائی دی۔ اس نے وقت دیکھتے ہوئے بڑی شائستگی سے کہا۔ ”اس وقت بارہ بج رہے ہیں۔ میں ایک بجے کرمل قاضی شریف احمد کے ہاں دوپہر کے کھانے پر مدعو ہوں۔ میرے پاس وقت بالکل نہیں ہے اور پھر مجھے چار بجے کی فلائٹ سے اسلام آباد روانہ ہونا ہے اور ہوٹل جاکر سالانہ بھی پیک کرنا ہے۔“

”آپ کون سے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں؟“ میں نے غیر ارادی طور پر پوچھا۔

”انٹر کائی نینٹل۔“

میں اسے رخصت کرنے نیچے تک آیا۔ وہ ایک پرائیویٹ ٹیکسی میں آیا تھا۔ جو گلی میں کھڑی تھی۔ اس نے ٹیکسی میں سوار ہونے سے پہلے ایک بار پھر گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور دوسرے ہاتھ سے میرا شانہ تھپ تھپایا۔ ”میں آپ کی آمد کا بے چینی سے منتظر ہوں گا۔“

”ہاں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”مری تک۔“

”کیا آپ میری تلاش میں مری سے کراچی آئے ہیں؟“ مجھے اس پر مزید حیرت ہو رہی تھی۔

”جی ہاں! اس پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔“

”مگر ایسی کون سی خدمت ہے وطن عزیز کی جس کے لیے میرا انتخاب کیا گیا؟“ میں نے تجسس سے پوچھا۔

”کچھ عرصے سے مجھ میں خاص دلچسپی لی جا رہی ہے مگر میں خود اپنے مصرف سے لاعلم ہوں۔“

”جلدی آپ کو معلوم ہو جائے گا۔“ وہ مسکرایا۔

میں خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی، وہ بولا۔ ”اس خدمت کے عوض میں آپ کو ہر ماہ دس ہزار کی رقم پیش کروں گا۔“

”دس ہزار روپے۔“ میں نے چونک کر اس کی صورت دیکھی۔ اس کے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ سچ بول رہا ہے۔ میں جیب تراشی کرتے کرتے ویسے ہی اکتا چکا تھا۔ اس میں ہر وقت جیل جانے کا خوف دامن گیر رہتا تھا۔ ہر چند کہ میں اپنے طور پر محتاط سی، لیکن جس کی جیب خالی ہو جاتی ہے اسے احساس بھی ہو جاتا ہے، میں آخر کب تک قانون کے ہاتھوں سے بچ سکتا تھا، کبھی اتفاقات بھی لے ڈوبتے ہیں۔ سرین کی مثال میرے سامنے تھی۔ اس نے مختلف مواقع پر کئی کامیاب وارداتیں کیں لیکن محض میری اتفاقیہ موجودگی نے اسے ہر بار ذلت آمیز شکست سے دوچار کر دیا۔ ایسا کوئی اتفاق میرے ساتھ بھی پیش آسکتا تھا۔ جب کہ کرمل کے بقول مجھے نہ صرف دس ہزار کی بلانہ رقم مل رہی تھی بلکہ وطن عزیز کی خدمت کا موقع بھی میرا آ رہا تھا۔

مجھے سوچوں میں گم پا کر اس کی بڑی بڑی آنکھیں مسکرانے لگیں۔ ”آپ کو طعام و قیام کی سہولتیں مفت میں حاصل ہوں گی۔ رہائش کے لیے بنگلا ذاتی استعمال کے لیے کار اور ہمہ وقت خدمت کے لیے تیار ملازم بھی ہوں گے۔ اس کے علاوہ سالانہ ترقی بھی ملے گی۔“

”واقعی...“ میں خوشی سے نمل ہو گیا۔ مگر دوسرے لمحے میری خوشی پر حیرت غالب آگئی تھی اس نے جن مراعات کے بارے میں بتایا تھا اس سے میں شلک میں مبتلا ہو گیا تھا۔ دس ہزار کی تنخواہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ خاص کر مجھ جیسے شخص کے لیے۔ اتنی تنخواہ تو شاید گورنر کو بھی نہ ملتی ہوگی۔ اس لئے یہ شخص مجھے پر اسرار سالک۔ اس نے مجھے متذبذب دیکھ کر پوچھا۔ ”آپ کس سوچ میں پڑ گئے، مسٹر سکندر؟“

میں نے سوچوں کے گرداب سے نکلنے ہوئے جواب دیا۔ ”مجھے اس فرارِ دلانہ پیش کش پر یقین نہیں آ رہا ہے۔“

وہ میری صاف گوئی پر بے اختیار مسکرا دیا۔ ”کیا آپ کے ذہن میں کچھ شکوک ابھر رہے ہیں؟“

”جی ہاں۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”کچھ نہیں، بلکہ بہت سارے اور پھر آپ کی شخصیت میرے لیے...“

”یہ فطری بات ہے۔“ وہ بات کٹ کر بولا۔ ”میں آپ کی جگہ ہوتا تو میں بھی شکوک کی لپیٹ میں آ جاتا۔ میں آپ کو یقین دلانا ہوں کہ آپ کو کسی گھمبائے کاروبار میں ملوث نہیں کروں گا۔ اگر مجھے کسی گورکھ دھندے کے لیے کسی شخص کی ضرورت ہوتی تو میں مری سے کراچی کیوں آتا۔ دوسرے شہروں میں ایک نہیں بیٹنگروں لوگ مل جاتے۔ مگر میں جس کام کے لیے جیسے آدمی کو چاہتا ہوں وہ آپ ہیں صرف آپ۔ میں نقل از وقت آپ کو یہ بتانا نہیں چاہتا کہ کام کیا ہے اور آپ کی ضرورت کیوں ہے۔ بہر حال میں مری پہنچ کر میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔“

محفوظ رکھنے کی کوشش کروں۔ بارش اور سردی کی وجہ سے گلی ویران پڑی تھی اور نیم تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ دور دور تک کسی سواری کا پتہ نہ تھا۔ نہ میرے پاس برساتی تھی جو میں بارش میں بیٹھتا ہوا سڑک تک چلا جاتا اور کوئی سواری لے لیتا۔ مجھے وہاں کھڑے ہوئے کافی دیر ہو گئی۔ بارش تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ رات کے نو بجے میں دس منٹ باقی تھے اور مجھے فلائٹ سے کم از کم آدھ گھنٹہ قبل انٹرپورٹ پہنچنا تھا۔

دفعہ گلی میں ایک کار نمودار ہوئی اور پورا ماحول تیز روشنی میں نہا گیا۔ ایک لحظے میں میری آنکھیں چندھیا گئیں، کچھ دیر بعد جب میں دیکھنے کے قابل ہو تو کار بالکل میرے سامنے رک چکی تھی۔ وہ نیلے رنگ کی ٹیوٹا کار تھی۔ کار میں صرف ایک شخص ڈرائیور سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ کار رکتے ہی اس نے لائٹیں ڈم کر دیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ دروازہ کھول کر نیچے اترا آیا اور پھر تیز قدم اٹھاتا ہوا میرے سامنے آکھڑا ہوا۔ وہ جس انداز سے میرے سامنے آیا تھا اس نے اسے پر اسرار بنا دیا تھا۔ اس کے جسم پر اوئی کپڑے تھے، جن پر اس نے برساتی پانی ہوئی تھی۔ اس نے مجھ پر اپنی سی نگاہ ڈال کر فوجی انداز میں سلام کیا۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور اس کے سلام کا جواب دیا۔ وہ مزید میرے قریب آکر بڑی شائستگی سے بولا۔ ”آپ سکندر اعظم ہیں؟“

میرا سر مشقی انداز میں اثبات میں ہل گیا، لیکن میں حیران تھا کہ یہ شخص کون ہے اور اس نے مجھے کیسے پہچانا! اس نے مجھے زیادہ سوچنے کا موقع نہیں دیا اور میرے اٹھتی کیس کی طرف بڑھا۔ ”جناب، آپ اٹھتی کیس مجھے دے دیں۔ میں آپ کو انٹرپورٹ لے جانے کے لیے آیا ہوں۔“

میں نے اسے اٹھتی کیس دینے میں پس و پیش کیا۔ اور درشت لہجے میں پوچھا۔ ”کون ہو تم؟“  
”اڑہ! معاف کیجئے گا جناب“ اسے فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ ”میں غلط میں اپنا تعارف کرانا بھول گیا۔ میرا نام عبدالقادر ہے، میں کرنل نیاز احمد کا آدمی ہوں۔ یہیں رہتا ہوں۔ آج صبح ان کاراولپنڈی سے فون آیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ اگر شام تک بارش کا سلسلہ جاری رہے تو میں گاڑی لے کر آپ کے گھر پہنچ جاؤں اور آپ کو انٹرپورٹ تک پہنچا دوں تاکہ فلائٹ نہ نکل سکے۔ مجھے افسوس ہے آپ کے ہاں پہنچنے میں آدھے گھنٹے کی دیر ہو گئی۔ دراصل موسم کی خرابی کے باعث کوئی ایڈریس بتانے والا نہیں ملا۔“

”مگر تم نے مجھے اتنی آسانی سے کیسے پہچان لیا؟“ میں نے متحجب ہو کر پوچھا۔  
وہ میرے سوال پر سٹپٹا گیا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا، لیکن اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پایا۔ اور ہنستے ہوئے بولا۔ جناب آپ کی شناخت میں کسی کو کوئی دشواری پیش نہیں آسکتی ہے۔“

”وہ کیسے؟“  
اس نے میرے سر پر ایک اپنی سی نگاہ ڈالی اور کہا۔ ”کرنل صاحب نے فون پر آپکا جو حلیہ بتایا تھا اس کے پیش نظر میں نے آسانی سے آپ کو شناخت کر لیا۔“

میں اس کی بات سن کر بے اختیار مسکرایا۔ وہ ایک ذہین اور تیز فہم شخص تھا۔ اگرچہ وہ مجھے مشکوک سا آدمی لگ رہا تھا مگر مجھے اس سے خائف ہونے کی ضرورت نہیں تھی اور پھر مجھے دھوکا دینا اور نقصان پہنچانا اس قدر آسان بھی نہیں تھا۔ میں نے اٹھتی کیس اس کے حوالے کر دیا تو وہ تیزی سے گھوم کر کار کے پیچھے دروازے کی طرف بڑھا۔ میں بھی مجھے سے نکل کر اس کے پیچھے چل دیا۔ میرے کار کے نزدیک پہنچنے سے پہلے ہی اس نے اٹھتی کیس کار کی پیچلی نشست پر رکھ دیا تھا۔ میں ایک کر اندر داخل ہوا اور دروازہ بند کر لیا۔ کار اندر سے برف خاں کی طرح سرد ہو رہی تھی۔ وہ تیزی سے گھوم کر اسٹیرنگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ وہ بھی سردی سے بری طرح کانپ رہا تھا۔

جب میں اپنے کمرے میں آیا تو معاہدہ میری نگاہ اس کے سگریٹ کیس پر پڑی جو وہ میز پر بھول گیا تھا۔ میں نے ایک کردہ سگریٹ کیس اٹھا لیا اور بجلی کی سی تیزی سے نیچے آیا۔ اس خیال سے بھی کہ شاید وہ سگریٹ کیس لینے واپس آئے۔ دس پندرہ منٹ گزر گئے۔ وہ نہیں آیا تو میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ پہلے میں نے یہ سوچا کہ جب میں پندرہ نومبر کو مری جاؤں گا تو یہ سگریٹ کیس اسے لوٹا دوں گا۔ لیکن پھر مجھے اتنی قیمتی چیز کو اپنے پاس رکھتے ہوئے ایک نامعلوم سا خوف محسوس ہونے لگا۔ اگر یہ سگریٹ کیس کسی وجہ سے واپس لے جانا بھول گیا تو وہ کیا خیال کرے گا۔ بعد میں میں نے فیصلہ کیا کہ اس کا سگریٹ کیس بھول لے جا کر اسے پہنچا دینا چاہیے پھر میں دوبارے بھول پھینچا۔ استقبالیہ کاؤنٹر پر جا کر میں نے کرنل نیاز احمد کے کمرے کے بارے میں پوچھا تو مجھے بتایا گیا کہ اس نام کا کوئی شخص ہوٹل میں نہیں ٹھہرا ہے۔

میں چکر اٹھا۔ کیس ایسا تو نہیں کہ ہوٹل کا نام سننے میں کوئی غلطی ہوئی ہو۔ میں اتنی بڑی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے سوچنے میں وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں ہوٹل سے سیدھا انٹرپورٹ پہنچا۔ چار بجے کی فلائٹ کی روانگی تک رکا رہا۔ ایک ایک مسافر کو دیکھا، مگر ان میں کرنل نہیں تھا۔ میں اپنی داستان میں یہی سمجھا کہ کرنل قاضی نے اسے روک لیا ہو گا۔ میں ٹرمینل پر ایک فوجی افسر کو دیکھ کر اس کی طرف مڑا اور دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔ ”کیا آپ کرنل قاضی شریف احمد کو جانتے ہیں؟“

”انہیں کون نہیں جانتا ہے؟“ اس نے جواب دیا ”وہ پنجاب رجمنٹ کے آفیسر ہیں۔“

”کیا آپ مجھے ان کا پتہ بتا سکتے ہیں؟“

”وہ جی ایچ کیور راولپنڈی ہی میں مل سکتے ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”وہ آج کل چین کے سرکاری دورے پر ہیں۔ پاکستانی وفد کے ساتھ گئے ہیں۔“

کرنل نیاز احمد کی شخصیت میرے لیے بڑی پر اسرار سی بن گئی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ معہ کیا ہے؟ میں جتنا اس کے بارے میں سوچتا میرا ذہن اتنی الجھتا جا رہا تھا۔ کرنل نیاز احمد مجھے عجیب شش و پنج میں مبتلا کر گیا تھا۔ ایک لحظے کے لیے مجھے اس کی شخصیت پر غلوس محسوس ہوتی تو دوسرے لمحے میں اس کے بارے میں تردد کا شکار ہو جاتا۔ ایک طرف مجھے اس کی پیش کش قبول کر لینے میں عافیت نظر آتی تو دوسری طرف اس کی پھیلائی ہوئی اسراریت سے مجھے ڈر لگنے لگتا۔ اس نے مجھے جان کی حفاظت کے لیے تسلی بھی دلائی تھی اور کچھ نا معلوم دشمنوں سے محتاط رہنے کی تلقین بھی کی تھی۔ میں دیر تک سوچتا رہا۔ پھر گھر پہنچنے ہی میں نے فیصلہ کر لیا کہ مقررہ تاریخ کی مری ضرور جاؤں گا اور کچھ نہیں تو میں کرنل کے بارے میں کسی حتمی رائے پر ہی پہنچ سکتا تھا ایک الجھن سے چٹکارا حاصل کر سکتا تھا۔

میں نے گھر پہنچ کر اس کا سگریٹ کیس اور رقم محفوظ جگہ پر رکھ دی۔ بستر پر لیٹ کر میں اپنے ذہن میں ایک منصوبہ ترتیب دینے لگا۔ اور وہ یہ کہ مری پہنچنے کے بعد مجھے کیا کرنا ہو گا!

بلاخر پندرہ تاریخ بھی آگئی۔ راولپنڈی جانے والی آخری فلائٹ کا وقت دس بجے تھا۔ میری روانگی سے ایک دن پہلے سے موسم خراب ہو گیا۔ پہلے بارش شروع ہوئی، پھر کوند کی برفانی ہوائیں چلنے لگیں۔ سردی بے پناہ تھی، جسم پر لوئی سوٹر کے باوجود میں قہر قہر کانپ رہا تھا۔

آٹھ بجے میں گھر سے نکلا۔ اپنا اٹھتی کیس اٹھائے میں بیڑھیوں میں آکر رک گیا۔ سڑک پر کھڑے ہو کر بارش میں بیٹھنے سے بتر تھا کہ جب تک کوئی غلی غلیسی یا رکشا نظر نہیں آتا، بیڑھیوں کی جھٹ کے نیچے کھڑا کر خود کو



ممکن ہے۔“

”خیال تو نیک ہے مگر فلائٹ نکل جائے گی۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے ہی ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔“

”فلائٹ بارش کی وجہ سے دو تین گھنٹے کی تاخیر سے جائے گی۔ ہم دو گھنٹے بعد ایئر پورٹ پہنچیں تو بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ اس نے کہا۔ ”ممکن ہے فلائٹ مزید لیٹ ہو جائے۔“

”وہ کس لیے؟“

”اس لیے کہ راولپنڈی سے وہ فلائٹ ہی نہیں آئی جو یہاں آکر واپس جائے گی۔“

”تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“

”میں نے ٹیلیفون کر کے معلوم کیا تھا۔ پٹی آئی اے والوں نے کہا ہے کہ رات دس بجے راولپنڈی سے فلائٹ آئے گی اور دو گھنٹے بعد جانے کا امکان ہے۔“

”ٹھیک ہے کافی پیٹے چلو مجھ سے سردی برداشت نہیں ہو رہی ہے۔“

ہم لوگ شہید ملت روڈ سے گزر رہے تھے۔ اس نے گاڑی کا رخ محمد علی سوسائٹی کی طرف کر دیا۔ چند لمبے خاموش رہنے کے بعد وہ بولا۔ ”نو کری بڑی ذلیل شے ہوتی ہے جناب! آپ بہت اچھے ہیں۔“

”وہ کیسے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”باعزت نو کری میں کیا برائی ہے؟“

”دیکھیے گا“ وہ دُور سے جھجھکتے ہوئے بولا۔ ”اگر میں نو کری نہ ہوتا تو گھر پر بیٹھا ہوتا۔ یہ موسم کوئی گھر سے نکلنے کا ہے۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”وہ شخص کس قدر بد نصیب ہو گا جس کی نئی نئی شادی ہوئی ہو اور وہ باہر کی خاک چھان رہا ہو۔“ اس کے لمبے میں جھنجھلاہٹ تھی۔

میں نے اسے بغور دیکھا۔ اس کی عمر چالیس سے کسی طرح کم نہیں تھی مگر وہ صحت مند اور توانا دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اس کے جملے کئے لمبے سے اندازہ لگایا کہ یہ باتیں وہ اپنے ہی بارے میں کہہ رہا ہے۔ میں نے پوچھا۔

”کیا تم نے شادی کی غلطی کر ڈالی ہے؟“

اس نے اپنا سر کھپایا اور کسی قدر جھینپ کر بولا۔ ”میں نے دو مہینے پہلے تیسری شادی کی ہے۔“

”تیسری شادی...!“ میں حیرت سے اچھل پڑا۔ یہاں تو ابھی پہلی شادی کی نوبت نہیں آئی اور یہ کم بخت تیسری شادی کیسے بیٹھا ہے۔ اس دور میں ایک شادی کرنا عملاً تھا اور اکثر لوگ پہلی ہی غلطی پر عمر بھر کے لیے سبق سیکھ لیتے ہیں اور اوپر ہی غصے میں...! میں نے اشتیاق سے پوچھا۔ ”کیا تیسری بیوی بہت خوبصورت ہے؟“

”اگہ... ہاں۔“ وہ آہستہ سے ہنسا۔ ”میں تصویر دکھا سکتا ہوں۔“ اس نے بے تکلفی سے کہا اور ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ سنبھالتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے جیب سے ایک تصویر نکال کر میری طرف بڑھائی۔ میں نے تصویر لے لی تو اس نے اندر کا لائٹ جلا دی۔ پوسٹ کارڈ سائز میں یہ ایک بھرپور اور نوجوان لڑکی کی تصویر تھی۔ لڑکی بلاشبہ حسین و جمیل تھی۔ ہاں کا اسٹائل اور تصویر میں نمایاں چہرے کا میک اپ دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا تصویر کھینچوانے کا اندازہ۔

”اگرل... ہاں۔“ وہ آہستہ سے ہنسا۔ ”میں تصویر دکھا سکتا ہوں۔“ اس نے بے تکلفی سے کہا اور ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ سنبھالتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے جیب سے ایک تصویر نکال کر میری طرف بڑھائی۔ میں نے تصویر لے لی تو اس نے اندر کا لائٹ جلا دی۔ پوسٹ کارڈ سائز میں یہ ایک بھرپور اور نوجوان لڑکی کی تصویر تھی۔ لڑکی بلاشبہ حسین و جمیل تھی۔ ہاں کا اسٹائل اور تصویر میں نمایاں چہرے کا میک اپ دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا تصویر کھینچوانے کا اندازہ۔

”اگرل... ہاں۔“ وہ آہستہ سے ہنسا۔ ”میں تصویر دکھا سکتا ہوں۔“ اس نے بے تکلفی سے کہا اور ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ سنبھالتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے جیب سے ایک تصویر نکال کر میری طرف بڑھائی۔ میں نے تصویر لے لی تو اس نے اندر کا لائٹ جلا دی۔ پوسٹ کارڈ سائز میں یہ ایک بھرپور اور نوجوان لڑکی کی تصویر تھی۔ لڑکی بلاشبہ حسین و جمیل تھی۔ ہاں کا اسٹائل اور تصویر میں نمایاں چہرے کا میک اپ دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا تصویر کھینچوانے کا اندازہ۔

”پہلی کہاں ہیں؟“

”پہلی لاہور میں اور دوسری سیالکوٹ میں۔“

وہ اپنے دونوں ہاتھ آپس میں رگڑتے ہوئے بولا۔ ”کراچی کے لوگ اس قدر شدید سردی کے عادی نہیں ہیں۔ یہ تو عذاب الہی ہو گئی ہے۔ کیوں جناب!“ اس نے گردن گھما کر میری جانب دیکھا۔

”ایسے چھوٹے موٹے عذاب نازل ہوتے رہتا چاہیے۔“ میں نے جواب دیا۔

اس نے جیب سے چالی نکال کر انکیشن میں ڈالتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ ”وہ کس لیے جناب؟“

”اس لیے کہ لوگوں کے دلوں میں خوف خدا پیدا ہو گا۔“

”خوف خدا۔“ اس کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے گاڑی کا انجن اشارت کر کے میٹر بدلتے ہوئے کہا۔ ”انسانوں کو خدا کا خوف ہو جائے تو پھر بات ہی کیا ہے۔ سچ پوچھتے تو جناب، ہم خدا سے نہیں انسان سے ڈرتے ہیں۔ مثلاً ایک ڈرائیور پولیس سے ڈرتا ہے۔ ایک ملازم اپنے مالک سے، ایک دولت مند انکم ٹیکس آفیسر سے، شوہر بیوی سے اور باپ اولاد سے۔“

”اس دنیا میں بہت سے لوگ اپنے خدا سے بھی ڈرتے ہیں۔“ میں اس کی دلچسپ باتیں سن کر مسکرا دیا۔

”جو لوگ خدا سے ڈرتے ہیں وہ اس دنیا میں سب سے اچھے ہیں اور سب سے مزے میں ہیں۔ مگر جناب!“ وہ گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”ہم لوگ خدا کو بھول گئے ہیں، لہذا خدا بھی ہم سے ناراض ہے۔ پہلے ہم دشمنان اسلام اور دشمنان ملک سے لڑتے تھے۔ اب ہم اپنے بھائیوں سے لڑ رہے ہیں، ہم یہ بھول گئے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں۔ ہم منشیات فروش اور اسلحہ فروش بن گئے ہیں۔ ہمارے گھروں میں کلام پاک کی بجائے ٹیلی ویژن اور وی سی آر کی صدا آئیں گوتی ہیں اور پھر ہم اس ملک کو توڑنے کے درپے ہیں جو صدیوں کی جدوجہد اور قربانیوں سے بنا ہے۔ کتنی ہی لیکس، انجنیں اور تحریکیں عصبیت کی بنیاد پر قائم ہو رہی ہیں۔“ وہ کسی قدر جذباتی ہوا جا رہا تھا۔

میں اس کی باتوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ سانس لینے کے لیے رکاوٹ میں نے اسے چھیرنے کی غرض سے کہا۔ ”لگتا ہے تم کسی مسجد کے مولوی ہو۔“

”مولوی نہیں ہوں محب وطن ہوں۔ اس آزادی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“

”کون سی آزادی؟“

”یہی جو آج کل چل رہی ہے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“

”میرا خیال ہے ہم چھوٹی چھوٹی باتوں پر جذباتی ہو رہے ہیں اور غیر ملکی اشارے پر ناچ رہے ہیں۔ جو ملک ہمیں توڑنے کے درپے ہے وہاں بے انتہا مگنکی ہے بے روزگاری ہے، کھانے کو نہیں ملتا ہے، جب کہ یہاں خوش حالی اور آسودگی ہے۔“

”مگر اس انداز میں کتنے لوگ سوچتے ہوں گے؟ ویسے ہم بڑے ناقدری اور ناشکری کر رہے ہیں۔ خدا ہمیں معاف کرے۔“ میں نے کہا۔

”جناب آپ نے تو میرے دل کی بات کہہ دی۔ میں بھی یہی کہنا چاہتا تھا۔“ اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”خدا ہے وقت بڑا بے رحم ہوتا ہے جو غلطی کرتا ہے وقت اسے کبھی معاف نہیں کرتا مگر لوگوں کی عقل پر تو پردہ لگتا ہے۔“ وہ اندھے ہو کر رہ گئے ہیں۔“ اس نے مجھے سیٹ پر سردی سے ٹھہرتے دیکھا تو بولا۔ ”معاف کرنا جناب! باتوں ہی باتوں میں مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ کیوں نہ ہم رک کر کسی ہوٹل میں کافی پی لیں اس طرح سردی سے بچاؤ

آپ تین چار بار یہ چائے پی لیں تو پھر دوسری کوئی چائے آپ کو اچھی نہیں لگے گی۔" اس نے رک کر خود چائے کی ایک چٹکی لی، پھر بولا۔ "موسم کے لحاظ سے یہ نہایت موزوں اور فائدہ مند چائے ہے۔۔۔ ہر حال آپ کچھ کر دیکھیں، اگر ذائقہ پسند نہ آئے تو میں سلاہ چائے لے آؤں گا۔" وہ خود مرے لے لے کر چٹکیاں لینے لگا۔ میں نے بادل خواست ایک چٹکی لی تو دنگ رہ گیا۔ وہ حیرت انگیز حد تک خوش ذائقہ اور بھرپور چائے تھی۔۔۔ وہ سچ کہہ رہا تھا۔ میں تو پہلی چٹکی کے ساتھ ہی قائل ہو گیا کہ میں اب تک جو اچھی سے اچھی چائے پی چکا ہوں، اس کے مقابلے میں بکواس تھی۔

وہ مجھے مطمئن دیکھ کر اس چائے کی خصوصیات اور بنانے کے طریقہ کار کے بارے میں یوں بتانے لگا جیسے کوئی سائنس دان اپنی نئی دریافت کے بارے میں لوگوں کو بتاتے ہوئے داد طلب انداز اپناتا ہو گا۔ ہم چائے پی چکے تو ہوٹل کا ایک ملازم آکر برتن لے گیا۔

"میرا خیال ہے، اب رپورٹ چلیں۔ وہیں بیٹھ کر باتیں کریں گے اور فلائٹ کے متعلق صحیح معلومات بھی مل جائیں گی۔" اس نے کہا اور اسٹیرنگ پر بیٹھ گیا۔ انجن پہلے سے متحرک تھا، اس نے گیسر لگایا پھر گاڑی کھما کر شاہ فیصل روڈ کی طرف لے آیا۔

وہ گاڑی بہت آہستہ چلا رہا تھا۔ روڈ کے درمیانی فٹ پاتھ پر نصب لائٹس کی سفید روشنی میں آسمان سے گرتی پھوار بہت بجلی معلوم ہو رہی تھی۔۔۔ میں اپنے متوقع سفر کے بارے میں سوچتے سوچتے خود کو مری میں بیٹھا محسوس کرنے لگا، جہاں ایسے قدرتی مناظر بہت عام ہیں، فلک بوس پہاڑ، اونچی چوٹیوں والے سرسبز درخت اور جسم کو چھو کر گزرتے ہوئے بادل۔ پھر مجھے خیال آکا کہ آج کل تو وہاں شدید سردی ہو گی، ہر طرف سفید سفید برف جی ہو گی۔ لوگ عموماً ایسے سرد مقامات پر گرمیوں میں جانا پسند کرتے ہیں، مگر کسی ماحول کی حقیقت سے آشنا کی تو وہاں کے موسموں کی سختی اور شدت برداشت کرنے کے بعد ہی حاصل ہوتی۔ موسموں کی سختیاں برداشت کرنے میں بھی ایک لطف ہوتا ہے۔

یگانگ میں نے اپنا جسم بہت زیادہ ٹھنڈا ہوتا ہوا محسوس کیا، جیسے میں سچ جگہ کسی برف پوش پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھا ہوں، مجھے اپنا سر ٹھنڈا ہوتا محسوس ہوا۔ میں نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔

کار اس وقت ڈرگ روڈ سے اسٹپل پر چڑھ رہی تھی اور میرا پورا جسم بخ ہو رہا تھا۔

اجانگ مجھ پر آشرف ہوا کہ میں درحقیقت کسی شدید ترین نشے کا شکار ہو چکا ہوں۔

لیکن اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی، میرا سر پیچھے کی طرف ڈھلکا جا رہا تھا۔ "ڈبل، کیپن۔۔۔ کار روکو۔" میں نے چیخا چلا، لیکن آواز میرے حلق میں اٹکنے لگی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر آگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ڈرائیور کو گدی سے پکڑنا چاہا جس نے مجھے ہلکے دلی چائے کے بہانے کوئی شدید ترین نشہ آور چیز پلا دی تھی۔۔۔ لیکن میرا ہاتھ اس تک پہنچنے سے پہلے ہی بے جان ہو کر میری گود میں آ رہا، پھر میرا ذہن گہری دھند میں ڈوبتا چلا گیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ایک بڑے اور خوبصورت کمرے میں پایا۔ ایک بے حد لمبے چوڑے بنگ کے نرم و گداز بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ میں چند لمبے تک غفلت الذاہنی سے چھت کو گھورتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد قدموں کی آہٹ سن کر میں نے دروازے کی طرف دیکھا وہ ایک اویز عمر کی عورت تھی۔ اس کے چہرے کی رنگت گہری تھی اور چہرے کے نقوش جیسے تھے۔ اس عورت نے نازک ہاتھوں سے ساراوے کر مجھے ہلو کے بل لٹا دیا۔ اس وقت میرے جسم کے مختلف حصوں میں درد کی شدید لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میں بری

"اس تیسری شادی پر آپ کی پہلی بیویوں کو کوئی اعتراض نہیں ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"ان میں سے ہر ایک میری تین شادیوں سے بے خبر ہے۔" وہ قہقہہ لگا کر بولا۔

"مگر تم نے یہ تین شادیاں کیوں کیں؟" میں نے کہا۔ "کیا پہلی بیویوں میں کوئی کمی تھی؟"

"یہ شادیاں ضرورت اور مجبوری کے تحت ہوئی ہیں۔" وہ ہنسنے لگا۔ "میں ہوٹل کا کھانا اور وہاں ٹھہرنا بالکل پسند نہیں کرتا، پھر ہوٹل کے اخراجات میرے بس سے باہر تھے۔ میں نے کھانے اور رہائش کے لیے پہلی شادی لاہور میں کی۔ سیالکوٹ میں ملازمت ملی تو وہاں دوسری شادی کر لی۔ اب کراچی میں آیا ہوں تو میں نے کراچی میں تیسری شادی کر لی۔ میری پہلی اور دوسری بیویاں بھی حسین اور نوجوان ہیں، سکھڑ اور سلیقہ مند ہیں۔"

"تو گویا تم گھر وادار بننے رہے ہو؟"

"جی ہاں جناب۔" وہ بولا۔ "گھر وادار بننے میں بڑے فائدے ہیں۔ وادار آکر رہیں تو خوب آؤ بھگت ہوتی ہے۔ میں تو بڑے مزے میں ہوں۔"

"تم تینوں گھروں کے اخراجات کیسے برداشت کر لیتے ہو؟"

"ابھی تک اس کی نوبت نہیں آئی جناب۔ اتفاق سے تینوں سسرال والے بے حد شریف لوگ ہیں۔ وہ مجھے اکثر رقم بھیجتے رہتے ہیں اور میری بیویاں بھی میرا بڑا خیال رکھتی ہیں۔"

اس نے کار اچانک ایک ایسے سنگین مقام پر روک لی جہاں ایک چار منزلہ عمارت زیر تعمیر تھی۔ اس نے جہاں کار روکی تھی وہاں سے کوئی پچاس گز کے فاصلے پر ایک بڑی سی جھونپڑی نظر آ رہی تھی۔ اس جھونپڑی میں شاید مزدوروں کے لیے ہوٹل بنایا گیا تھا۔ میں نے ہوٹل سے نظرسن بنا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ "کیا یہاں کافی ملے گی؟"

"جناب یہاں کافی تو نہیں البتہ دودھ پتی ضرور ملے گی۔ میرا خیال ہے ہمیں سے پی لیتے ہیں۔ یہ اسے ون ٹی اسٹل ہے۔" اس نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ "ایسی چائے آپ نے کبھی نہیں پی ہو گی۔"

وہ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر گاڑی سے اتر گیا اور تیز قدم اٹھاتا ہوا ہوٹل کی طرف بڑھ گیا۔ بارش تھم چکی تھی لیکن آسمان پر کالے کالے بادل تیر رہے تھے ہر طرف گھپ اندھیرا تھا۔ نو تعمیر شدہ اور بغیر رنگ و روغن کی عمارتیں، اندھیرے میں بڑے ہیبت ناک دکھائی دے رہی تھیں۔ اس ہوٹل کے دروازہ سے لائٹس کی روشنی جھانک رہی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ خود ہی ایک ٹرے اٹھائے ہوئے چلا آیا۔ ٹرے میں ایک بڑا سا گگن تھا اور ایک خوبصورت سی پیالی تھی۔ اس نے پیالی میری طرف بڑھا دی اور خود گگن لے کر چائے پینے لگا۔ میں اس کے انداز پر چونکے بغیر نہ رہ سکا اور شکوک بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ میری طرف دیکھ کر عجیب انداز سے مسکرایا۔ پھر بولا۔ "ناراض نہیں ہونا جناب۔۔۔ چائے میں تھوڑی سی بھگت کی آمیزش ہے۔"

"بھگت؟ مگر کیوں؟" میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔ "کیا تم مجھے ایسا سمجھتے ہو؟"

"نہیں، جناب نہیں۔" وہ کھسیا ہٹ آمیز انداز میں ہنسنے ہوئے بولا۔ "یہ اتنی خفیف مقدار میں ہوتی ہے کہ اس سے نشہ قطعاً نہیں ہوتا، یہاں تو یہی اس چائے کی خوبی گنی جاتی ہے اور یہ معمولی ہوٹل اسی خصوصیت کی بنا پر شہر بھر میں مقبول ہے۔ جاننے والے دور دور سے اس چائے کے شوق میں یہاں آتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ

طرح زخمی ہوں۔ میرے سر سینے اور چہرے پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اس عورت کے چہرے پر میرے لیے ماتا کا عکس نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے محبت کی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ میں اس کے مہربان رویے کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔

میں نے محسوس کیا کہ کسی اسپتال کی بجائے کسی خواہگاہ میں ہوں۔ وہ مہربان عورت بھی نرس نہیں تھی بلکہ گھریلو عورت دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا کہ یہاں مجھے کون لایا تھا اور یہ عورت کون ہے۔

”معا“ مجھے یاد آیا کہ میں گاڑی میں کیسے جا رہا تھا۔ کس کے ساتھ... کہاں جا رہا تھا... یہ یاد نہیں آیا۔ ذہن ابھی پوری طرح ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

”کرگل نیاز احمد!“ اس عورت نے بڑے نفیس لب و لہجے میں کہا۔ ”اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“

کرگل نیاز احمد... میں نے حیرت سے اپنے ذہن میں دہرایا۔ پہلے تو میں نے سمجھا کہ کرگل نیاز احمد میرے سرہانے کھڑا ہے... مگر نہیں... وہ مجھے ہی کرگل نیاز احمد سمجھ کر مخاطب کر رہی تھی۔ اس کی نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ کیا میں کرگل ہوں؟ میں نے سوچا۔ میں نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا اور اس سے کچھ کہنا چاہا تو میرے حلق سے آواز نہ نکل سکی۔ فہمت سی محسوس ہو رہی تھی... میرے ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔

وہ عورت مجھ پر جھک گئی۔ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”کیا آپ کو درد محسوس ہو رہا ہے؟“

میں نے بے اختیار اپنا سر ہلاتا تو میرے سر کے زخموں میں درد کی ایسی شدید لہر اٹھی کہ اس نے میرے سارے بدن کو جھنجھٹا کر رکھ دیا۔ باوجود ضبط کے میرے ہونٹوں سے کراہ نکل گئی۔

”پلیز!“ عورت کے لہجے میں مٹھاس تھی۔ ”دس پندرہ منٹ صبر کر لیں۔ میرے شوہر آپ کے لیے دوائیاں لے کر آتے ہی ہوں گے۔“

”درد... ناقابل... برداشت ہے۔“ میں نے کراہتے ہوئے ایک ایک کر کہا۔

”اچھا!“ عورت سیدھی ہو کر کھڑی ہو گئی۔ وہ فکر مند سی نظر آ رہی تھی۔ ”ایک منٹ صبر کریں۔ میں ابھی آئی۔“

وہ ایک دم سے گھومی اور تیزی کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھ گئی، پھر دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ معلوم نہیں یہ عورت کون تھی... اس کا شوہر کون تھا... میں کہاں تھا کچھ نہیں جانتا تھا۔ میں جس خواب گاہ میں لیٹا تھا اس کی آرائش و تزئین دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں کسی عالی شان ہنگلے میں ہوں۔ وہاں کی ہر ایک چیز سے امارت جھلک رہی تھی۔

چند لمحوں بعد وہ عورت دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں سرنج تھی۔ سرنج میں کسی انجکشن کا محلول نظر آ رہا تھا۔ اس نے میرے پاس آ کر میرا بازو آہستگی سے تھام لیا۔ ”میں یہ انجکشن لے کر آئی ہوں اس کے لگنے کے بعد درد میں افادہ ہو جائے گا۔“

اس نے بڑی آہستگی کے ساتھ میرے بازو میں سوئی چھو دی۔ ہلکی سی بھین محسوس ہوئی جو اس درد کے مقابلے میں کچھ نہ تھی۔ انجکشن دینے کے بعد اس نے کسی شفیق ماں کے انداز میں میرا شانہ تھپ تھپایا۔ ”کرگل“ واقعی آپ کرگل ہیں۔ میں نے زندگی میں آپ جیسے سخت جان مریض بہت کم دیکھے ہیں۔

میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ عورت کے مشفقانہ کلمات سن کر جواب دینے کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ میرے ذہن میں صرف ایک احساس جاگ رہا تھا کہ یہ عورت میرا نام غلط لے رہی ہے۔ کیوں؟ اسے یہ غلط فہمی

کیسے ہو گئی ہے کہ میں کرگل ہوں۔ میں نے سوچا اسے بتا دوں کہ میں کرگل نیاز احمد نہیں ہوں۔ سکندر ہوں سکندر اعظم ہوں، جیب تراش ہوں، مجھے کرگل مت کہا جائے۔ مجھ پر ایک غلبہ ساحاری ہو رہا تھا۔ میں باوجود کوشش کے آنکھیں نہیں کھول سکا، وہ ہماری ہو رہی تھیں۔ انجکشن شاید سرنج الاٹھ تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایسا محسوس ہوا جیسے خوابوں کی پریاں مجھے بالوں میں اڑائے لیے جا رہی ہوں۔ میرا وجود لمحہ بہ لمحہ ہلکا ہوتا جا رہا تھا، پھر میں دنیا دانیسا سے بے خبر ہو گیا۔

جب نیند سے بیدار ہوا تو میرے کانوں میں چڑیوں کے چھمانے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ ان آوازوں کو سن کر ایسا محسوس ہوا کہ صبح کا وقت ہے۔ میری نگاہ کھڑکی کی طرف اٹھی۔ کھڑکی کا پردہ ہٹا ہوا تھا۔ باہر کسی درخت کی شاخیں نظر آ رہی تھیں۔ یہ درخت ہنگلے کے لان میں واقع تھا۔ یہ خواب گاہ ایک ہنگلے کی تھی اور میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔

یوں بھی جاڑے کی صبح بہت حسین اور پیاری ہوتی ہے۔ چاروں طرف پھیلے ہوئے کمر کا جال توڑ کر سورج کی کرنیں جیسے سونا تار رہی تھیں۔ مجھے اپنی حالت کافی بہتر محسوس ہو رہی تھی۔ زخموں کا درد کم ہو چکا تھا۔ ذہنی طور پر بھی میں خود کو نارمل محسوس کر رہا تھا۔

مجھے یاد آیا کہ میں چھانے پی کر بے ہوش ہوا تھا، جب ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو زخمی حالت میں اس کمرے کے بستر پر پایا تھا، ایک انجینی گھریلو عورت کو دیکھا تھا جس نے مجھے دو تین بار کرگل نیاز احمد کے نام سے مخاطب کیا تھا۔ اس نے میرے سامنے اپنے شوہر کا ذکر بھی کیا تھا۔ جو میرے لیے دوائیں لینے گیا تھا۔ میں نے اس عورت کو اپنے ناقابل برداشت درد کے بارے میں بتایا تو اس نے ایک انجکشن لاکر لگایا تھا۔ مجھے فوراً نیند آ گئی تھی اور اس کے بعد اب آنکھ کھلی تھی۔

اس عورت اور اس کے شوہر سے متعلق میرے ذہن میں طرح طرح کے سوالات کی پلخاڑ ہونے لگی۔ وہ عورت بھی ڈاکٹری معلوم ہو رہی تھی۔ اب میں ذہنی طور پر اس قاتل تھا کہ اس عورت سے کچھ پوچھ سکوں اور اسے اپنے بارے میں بتا سکوں، مگر اس کمرے میں میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ دروازہ بھی بند تھا۔ میں ابھی اس قاتل نہیں تھا کہ اپنی جگہ سے جنبش کر سکوں۔ میں اپنے بدن کے کسی حصے کو حرکت تک نہیں دے سکتا تھا۔ میری آنکھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس کا نام لے کر پکاروں۔ میں اس عورت کے نام سے بھی واقف نہیں تھا۔

میں ایسی شخص کش میں جلتا تھا کہ کمرے میں کا دروازہ بغیر کسی آواز کے کھلا، اسی عورت کا سر پایا بھرا۔ اس کے چہرے پر شفقت چھائی ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں سے متانمایاں تھیں۔ وہ کسی لیڈی ڈاکٹر کی طرح سفید براق لباس میں لبوس تھی۔ سفید ساڑھی اور بلاؤز نے اسے پروقار بنا دیا تھا۔ وہ پر تقدس نظر آ رہی تھی۔

اس نے مجھے بیدار دیکھا تو اس کا چہرہ دھکے لگا۔ اس کی آنکھوں میں چمک سی آ گئی تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی میرے بستر کے پاس آکھڑی ہوئی۔ اس کے ہونٹوں پر مشفقانہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے اپنائیت سے پوچھا۔ ”اب آپ کی طبیعت کیسی ہے۔ درد تو نہیں ہے نا!“

”میں کل بہت بہتر ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”درد تو ہے، مگر کم کم۔“

”ویسے آپ رات بھر گہری اور پرسکون نیند سوتے رہے ہیں۔“

”کیا آپ ساری رات جاگتی رہی ہیں؟“ میں نے حیرت سے اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کر دیں۔

”صرف میں نہیں بلکہ میرے شوہر بھی ہم دونوں باری باری آپ کی نگہداشت کرتے رہے تھے اور آپ کو

بچالیا۔ اگر آپ کار سے باہر نہیں آتے تو پھر اس حیرت انگیز ٹرک کے نیچے آجاتے جس سے ٹکرا کر آپ کی کار کے پرچے اڑ گئے تھے۔ "اس نے بتایا۔

"یہ باتیں آپ کو کس نے بتائیں؟ کیا آپ کے شوہر حادثے کی جگہ پر موجود تھے۔"

"وہاں پر موجود کچھ لوگوں نے بتایا ہے۔" وہ کہنے لگیں۔ "میرے شوہر اپنے ایک دوست کو رخصت کر کے گھر آ رہے تھے کہ انہوں نے راستے میں بل پر بھیڑ دیکھی تو اپنی کار روک لی۔ انہوں نے لوگوں کو بتایا کہ وہ ڈاکٹر ہیں، پھر وہ آپ کو کلینک لے جانے کی بجائے گھر لے آئے کیونکہ کلینک میں کوئی بستر خالی نہیں تھا۔ ہم دونوں نے مل کر آپ کی مرہم پیٹی کی۔ آپ پورے دو دن بے ہوش رہنے کے بعد کل رات ہوش میں آئے تھے۔"

"میں دو دن بے ہوش رہا ہوں۔" میں بھونچکا رہ گیا۔ "تو کیا دو دن سے آپ ڈیوٹی دے رہی ہیں۔"

"اس لیے کہ آپ کے دماغ پر چونٹیں آئی تھیں اور آپ کی جان سخت خطرے میں تھی۔ دن میں ڈیوٹی پر ایک نرس بھی ہوا کرتی تھی۔ اب آپ خطرے سے باہر ہیں۔"

"آپ نے میرے لیے جو کچھ کیا ہے میں تو اس احسان کو عمر بھر..."

"اور ہاں۔" بقیہ باتوں کو جیسے کچھ یاد آیا۔ "پولیس بھی دو ایک بار تفتیش کے سلسلے میں آئی تھی۔ میرے شوہر کے اس علاقے کے پولیس افسران سے گھرے مراسم ہیں۔ انہوں نے کہہ دیا تھا کہ وہ بار بار زحمت نہ کریں، جیسے ہی مریض کو ہوش آئے گا اطلاع دے دی جائے گی۔" وہ گہری سانس لے کر بولی۔ "پولیس بھی خوب چڑ ہے۔ بس انہیں تو اپنی کارروائی مکمل کرنے کی ہڈی رہتی ہے۔"

"آپ کو کس نے بتایا کہ میں کرل نیاز احمد ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"حادثے پر موجود لوگوں نے۔" اس نے کہا۔ "ویسے بھی آپ فوجی وردی میں تھے۔"

"فوجی وردی میں تھا؟" مجھے اس کے کہنے پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں بھلا فوجی وردی میں کیسے ہو سکتا تھا۔ میں نے اپنا شک دور کرنے کی غرض سے پوچھا۔ "کیا میں واقعی کسی کرل کی وردی میں تھا؟"

"ہاں... اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟"

میں اسے کیسے بتانا کہ یہ میرے لیے کس قدر حیرت ناک بات ہے۔ ایک شخص جس کا فوج سے کبھی تعلق نہیں رہا ہو، جو عام لباس میں تھا، اس کے بدن پر وردی کماں سے آگئی۔ اس کے علاوہ اس کے شوہر نے یہ بھی کہا تھا کہ میں نے شراب بہت زیادہ پی رکھی ہے، اس لیے کار بے قابو ہو کر بجلی کے کھمبے سے جا ٹکرائی۔ میں کار میں اکیلا تھا اور اسے خود ہی چلا رہا تھا۔ مجھ پر سننے سے انکشاف ہو رہے تھے۔ میں نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔ "کیا میں اس قدر معروف و مقبول ہوں کہ لوگوں نے مجھے فوراً ہی پہچان لیا تھا؟"

"آپ کی شناخت آپ کے فوجی شناختی کارڈ سے ہوئی۔"

"میرا فوجی شناختی کارڈ...؟" یہ انکشاف اور بھی حیرت انگیز تھا۔

"شناختی کارڈ نہ بھی ہوتا تو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ آپ کی وردی ہی آپ کی شناخت تھی۔"

"میری وردی کماں ہے؟" میں نے اپنے کپڑوں پر نظر ڈالی میں اس وقت عام لباس میں تھا۔

"آپ کی وردی میں نے دھلا کر رکھی ہوئی ہے۔ کیا آپ ابھی وردی پہننا چاہتے ہیں۔" اس کے لیے میں ہلکی سی شوفی تھی۔

"جی نہیں۔" میں مسکرا دیا۔ "میں اس لیے پوچھ رہا تھا کہ مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا۔ میں کس لباس میں تھا اور

رات وقفے وقفے سے دو اجتماعیں بھی دے چکے تھے۔"

"آپ دونوں کا بہت بہت شکریہ۔" شدت جذبات سے میری آواز مغلوب ہو گئی۔ "آپ نے اور آپ کے

شوہر نے میری ذات پر جو احسان کیا ہے، وہ میں ساری زندگی فراموش نہیں کر سکوں گا۔"

"اگر ایک شخص دوسرے کے کام آتا ہے تو اس میں احسان کی کوئی بات نہیں ہے۔"

"کسی کے ساتھ ایک چھوٹی ٹکلی بھی کی جائے تو یہ ایک بڑا احسان ہے اور پھر آپ..."

"یہ ایک انسانی فریضہ تھا جو ہم نے ادا کیا، بہر کیف آپ ہمیں شرمندہ نہ کیجئے۔" اس نے قطع کلائی کی۔

"آپ کے شوہر کہاں ہیں؟"

"وہ اپنی ڈیوٹی کچھ دیر پہلے ختم کر کے سوئے ہیں۔" وہ گفتگو سے مسکرائی۔ "اب میں اپنی ڈیوٹی پر آگئی ہوں۔"

"وہ کوئی نوجوبے جا نہیں گئے۔"

"میں کہاں ہوں؟"

"میرے گھر میں۔" اس نے میری نبض پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"کیا میں اپنے محسنوں سے متعارف ہو سکتا ہوں؟"

"ہم محسن نہیں۔" وہ میری نبض سے ہاتھ ہٹا کر بولی۔ "میں آپ سے اپنا اور اپنے شوہر کا تعارف کرائے دیتی

ہوں۔ میرا نام بقیہ باتوں ہے اور میرے شوہر کا محمد غنی... ہم دونوں میاں بیوی ڈاکٹر ہیں۔ ڈرگ کالونی میں ہمارا

ایک چھوٹا کلینک ہے، جہاں ہم دونوں مریضوں کی خدمت کے لیے ہر وقت کوشاں رہتے ہیں۔"

"کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ میرے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا تھا؟ میری یہ حالت کیسے ہوئی؟"

"آپ کو کچھ یاد نہیں؟" اس نے انا مجھ سے سوال کیا۔

"جی نہیں۔" مجھے کچھ یاد نہیں ہے اور ذہن پر زور دینے سے بھی کچھ یاد نہیں آ رہا۔"

"اچانک اور غیر متوقع طور پر جو حادثے پیش آتے ہیں وہ عموماً یاد نہیں رہتے۔" وہ کہنے لگے۔ "آپ کی

گاڑی کو ٹھیک حادثہ پیش آیا تھا اور "عجرائی طور پر آپ بچ گئے۔ آپ زیادہ فکر مند نہ ہوں۔ آپ کے سر پر کچھ ہلکی

سی چونٹیں آئی ہیں، خدا کا شکر ہے کہ کوئی گمراہ زخم نہیں ہے۔ چوٹ بیرونی ہے۔ اگر اندرونی ہوتی تو نایاب مسئلہ کھڑا

ہوتا۔"

"میرے چہرے اور سینے پر یہ پٹیاں کیسی ہیں؟"

"آپ شدید زخمی ہو گئے تھے اور چہرے پر خراشیں بھی آئی ہیں۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ آپ جلد صحت

یاب ہو جائیں گے۔" اس نے کہا۔

"میرے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟"

"کوئی اور بھی کیا مطلب...؟" بقیہ باتوں نے کہا اور پھر اس نے نئی کے انداز میں سر ہلایا۔ "آپ کار میں

اکیلے تھے اور کار خود چلا رہے تھے۔"

"جی...؟" میں نے تیز زہ لے کر کہا۔ "میں کار میں اکیلا تھا؟"

"جی ہاں۔ آپ کی انتہائی تیز رفتار کار بجلی کے ایک کھمبے سے جا ٹکرائی تھی، اس کھمبے سے جو پیل پر لگا ہوا تھا

کار لڑھکتی جا رہی تھی کہ اتفاقاً اس کار کا دروازہ کھل گیا۔ آپ اچھل کر گر پڑے تھے باہر چلا گیا لگا

دی تھی۔ میرے شوہر کا خیال ہے کہ سردی کی وجہ سے آپ نے ضرورت سے زیادہ پی رکھی تھی۔ خدا نے آپ کو



کھل جا رہا تھا۔

”کرل!“ وہ کہنے لگی۔ ”آپ کو رفتہ رفتہ ساری باتیں یاد آجائیں گی۔ آپ ناشتہ کر لیں۔ آپ پورے تین دن سے بھوکے پیاسے ہیں۔ آواز میں کتنی تھکت اور کمزوری محسوس ہو رہی ہے۔ جب آپ ناشتہ کر لیں گے تب میں آپ کو شناختی کارڈ اور وردی لاکر دکھاؤں گی۔ میں نے باتوں ہی باتوں میں آپ کا وقت ضائع کر دیا۔ وارڈ ہوائے آگیا ہو گا۔ میں اسے بھیج رہی ہوں، وہ آپ کو تیار کر دے گا۔ آپ اسی طرح لیٹے رہیں۔“

کرل! کرل!... میرے ذہن پر یہ لفظ ہتھوڑے کی ضربیں بن کر لگ رہا تھا۔ میرا جی چاہا... کہ میں پوری قوت سے چیخ کر کہ دوں کہ میں کرل نیاز احمد نہیں ہوں معلوم نہیں کس نے میرے ساتھ یہ سنگین غلطی کیا ہے۔ میں تو سکندر ہوں، سکندر اعظم لیاقت آباد میں رہتا ہوں۔ میرے محلے کے تمام لوگ مجھ سے اچھی طرح واقف ہیں۔

دوسرے ہی لمحے مجھے احساس ہوا کہ میں کس قدر غلط سوچ رہا ہوں۔ اگر میں انہیں سچ بتا دیتا کہ سکندر ہوں، ایک ماہر اور تعلیم یافتہ جیب تراش... تو یہ لوگ مجھے کوئی فراڈی سمجھ کر پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ میری بہتری اسی میں تھی کہ میں مکمل صحت یاب ہونے تک اپنی زبان بند رکھوں اور جب پلٹے بھرنے کے قابل ہو جاؤں تو یہاں سے نو دو گیارہ ہو جاؤں۔ معلوم نہیں قدرت کو میری کون سی نیکی بھائی تھی کہ اس نے مجھے ان نیک لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچا دیا۔ ورنہ اس دنیا میں آج کل ایسا کون بے غرض ہے جو محض انسانیت کے ناطے اتنا کچھ کرے۔ اور ڈاکٹر لوگ تو خصوصاً آج کل ڈاکوؤں کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ کتنی کے چند ڈاکٹر ہیں جو غریب پرور ہیں اور صحیح معنوں میں انسانیت کی خدمت کر رہے ہیں۔

مگر ایک بات میری سمجھ سے بالاتر تھی کہ میرے جسم پر فوجی وردی کیسے آگئی؟ جائے حادثہ پر موجود لوگوں نے ڈاکٹر محمد غنی سے کیسے کہہ دیا کہ میں کرل نیاز احمد ہوں۔ کیا بیڑ میں پہلے ہی سے کسی نے میری شناختی لے لی تھی؟ میرا فوجی شناختی کارڈ دیکھا تھا، مگر شناختی کارڈ میں تصویر تو لگی ہوتی ہوگی۔ میں نے کبھی کوئی فوجی شناختی کارڈ نہیں دیکھا تھا۔ اس کے باوجود محلے پر موجود لوگوں کو کیسے غلط فہمی ہو گئی تھی کہ میں کرل ہوں، کارڈ دیکھ کر بھی کیسے یقین کر لیا اس لیے کہ مجھ میں اور کرل نیاز احمد میں نمایاں فرق ہے۔ ذرہ برابر بھی مشابہت نہیں ہے۔ صرف ہماری قد و قامت ایک جیسی تھی اور محض اس پر لوگوں کا دھوکا کھانا بڑا مشکلہ خیر تھا۔

دوسری طرف میں یہ سوچ رہا تھا کہ آخر مجھے کس لیے بے ہوش کیا گیا اور فوجی وردی کیوں پہنائی گئی۔ اس نامعلوم دشمن نے مجھے شراب بھی پلا دی، پھر اس نے مجھے ایک سنگین حادثے سے دو چار کر دیا تاکہ میں موت کے منہ میں چلا جاؤں۔ میری زندگی کے دن ابھی پورے نہیں ہوئے تھے اور میرا ملک مجھ پر مہربان تھا جو میں سچ گیا تھا۔ اگر میں خدا نخواستہ دشمن کے منصوبے کی نذر ہو جاتا تو اخبارات میں کرل نیاز احمد کی موت کی خبر ہوتی اور دنیا کو میرے بارے میں کبھی پتہ نہ چلتا۔ یہ ڈراما کس نے اور کیوں کھیلا تھا، میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

میں انہی سوچوں میں غلطالٹ تھا کہ دس منٹ بعد بلیٹس بانو میرے لیے ایک ٹرے میں چار سلاکس، مکھن، دو ابلے ہوئے انڈے اور کافی لے کر آئی۔ اس نے مجھے سارا دسے کراٹھیا اور تکیوں کے سارے بٹھادیا۔ میں نیم دراز تھا۔ پوری طرح نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ پھر میں خود سے کھانے پینے کے قابل بھی نہیں تھا۔ وہ مجھے بغیر کسی جھجک اور تکلف کے اس طرح کھلانے لگی جیسے میں چھوٹے بچوں کو کھلاتی ہے۔ اس نے کھانے کے دوران گفتگو کا آغاز کیا۔ ”یہ بات بڑی حیرت انگیز ہے کہ آپ اتنی کم عمری میں کرل بن گئے۔“

”خدا کی مہربانی ہے، ورنہ یہ بندہ کس لائق تھا۔“ میں نے بات بنائی۔

”اگر آپ کی ترقی کا یہ سلسلہ جاری رہا تو آپ جلد ہی جنرل بن جائیں گے۔“

”آپ دعا کرتی رہیں... مجھے آپ میں مائتگی جھلک دکھائی دے رہی ہے۔“ میں نے فوراً ہی موضوع بدلا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ کوئی ایسی بات نہ پوچھ لے جس کا میرے پاس کوئی جواب ہی نہ ہو۔ میں نے کہا۔ ”آپ مجھے ڈاکٹر تو بالکل نہیں لگتیں بلکہ آپ بالکل ایک شفیق ماں کی طرح ہیں۔“

بلیٹس بانو کے دیکتے ہوئے چہرے پر کرب کے سائے لرا گئے اور آنکھوں میں گہری اداسی چھا گئی۔ ”میرا بھی ایک لڑکا تھا جو... اس کی آواز حلق میں پھنسے لگی اور آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔“

میری بات پر وہ دل گرفتہ ہو گئی تھی۔ مجھے بہت افسوس ہوا شاید میں ٹوا اننگی میں اس کے کسی گھرے زخم کو چھیز بیٹھا تھا۔ میں نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔ ”معاذی چاہتا ہوں کہ میری بات سے آپ کے دل کو...“

وہ اپنی سازش کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ”اس میں معافی کی کیا بات ہے؟ آپ کی بات سے میرا دل نہیں دکھا۔“

”پھر آپ روکیوں رہی ہیں۔ آپ ایک دم غمگین سی ہو گئی ہیں۔“

”مجھے تو اپنا دکھ رلا رہا تھا۔ آپ کو پہلی بار دیکھ کر ہی میرے دل کا زخم ہرا ہو گیا تھا۔“

کیسا زخم؟ آپ کے زخم سے میرا کیا تعلق؟ میں نے پوچھا۔

”بڑا گہرا تعلق ہے کرل!“ اس کا لہجہ اور غمگین ہو گیا۔ ”بعض زخم ایسے ہوتے ہیں جو کبھی نہیں بھرتے۔ میرا...“ اس کی آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ وہ اپنے ہونٹ کانٹے ہوئے بولی تو اس کے ہونٹ پکپکاتے لگے۔ ”میرا ایک جوان بیٹا تھا، بالکل آپ کی طرح، آپ ہی کی عمر کا... آپ کو دیکھ کر میں سمجھی تھی کہ میرا بیٹا وہاں آگیا ہے۔“

”آپ کا بیٹا کہاں ہے؟“ میں نے تحیر ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک جوان بیٹے کی ماں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ تیس سال کی ہو سکتی ہے۔ لیکن ہے چھوٹے جسم اور اچھی صحت کی بنا پر اس کی اصل عمر ظاہر نہ ہو رہی ہو۔

”ہمارا ایک ہی بیٹا تھا وہ وطن عزیز پر قربان ہو گیا، شہید ہو گیا۔“

”کیسے... کب؟“

”گزشتہ جنگ میں۔“ وہ غمگین لہجے میں بتانے لگی۔ ”وہ انزفوس میں تھا... پائلٹ۔ وہ گزشتہ جنگ میں اپنا جہاز لے کر دشمن ملک میں گھس گیا۔ وہ کئی ہوائی جہازوں کو تباہ کرنا ہوا اور ہوائی اڈوں پر بمباری کرتا ہوا واپس آ رہا تھا کہ دشمن طیاروں نے اسے زخمی میں لے لیا اور اسے قیدی بننے پر مجبور کیا مگر اس نے ذلت پر عزت اور غلامی پر آزادی کو ترجیح دی۔ یہ سب پانے کے لیے جان کو کھونا پڑا تھا، سو اس نے اپنی جان کی قربانی دے دی۔ وہ اس وقت یہ بھول گیا تھا کہ وہ ماں کے پیچھے کی گھٹک ہے، باپ کی آنکھوں کا نور ہے... اسے شاید اتنا یاد رہ گیا تھا کہ وہ وطن عزیز کا ایک سپاہی ہے۔ اس طرح وہ اپنے فرض پر قربان ہو گیا۔ مجھے اس کے جذبے پر فخر ہے اور اپنی محرومی کا دکھ۔“

بلیٹس بانو بے حد جذباتی ہو گئی تھی۔ اس لیے کہ وہ ایک ماں تھی۔ مگر اسے دکھ کے ساتھ ساتھ اس بات پر فخر بھی تھا کہ اس کا بیٹا وطن عزیز کی سلاحتی کے لیے شہید ہو گیا۔ اس وطن عزیز کے لیے جولاکھوں قربانیوں سے وجود

میں آیا تھا۔ اور ایک بیٹے نے شہادت کا درجہ پاکروطن میں اور عورت کی عظمت پر چار چاند لگا دیے تھے۔ کتنا عظیم بیٹا تھا! اور اس کی ماں بھی اتنی عظیم ہو گئی تھی۔ کسی کی عظمت میں ایسے ہی تواضع نہیں ہو جاتا ہے۔

مجھے ماں اور بیٹے دونوں ہی پر رشک آ رہا تھا۔ میرا دل اور رولوں رولوں اس ماں کو سلام کر رہا تھا جس نے اپنے لخت جگر کو وطن کی جگہ کے لیے جلا وطن بھیجا تھا۔ میں نے سوچا کہ کاش میں ایک پاکت مار نہ ہوتا، اس عورت کے بیٹے کی جگہ ہوتا۔ مجھے خاموش اور سوچ میں ڈوبا پا کر وہ بولی۔ ”راولپنڈی سے میرے بیٹے کا سامان آیا تو اس میں اس کی وردی بھی تھی۔ میں نے اس کی وردی بڑی حفاظت سے نہ کر کے رکھی ہوئی ہے۔ جب آپ زخمی اور بے ہوش حالت میں لائے گئے تو وردی میں تھے۔ میں نے آپ کی وردی اپنے ہی ہاتھوں سے دھوئی تھی۔ جب میں آپ کی وردی دھو رہی تھی تو مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں اپنے بیٹے کی وردی دھو رہی ہوں۔“

”تو آپ مجھے بھی اپنا بیٹا ہی سمجھیں۔ یہ بات میرے لیے بڑے فخر اور خوشی کی ہوگی۔“

”ہر فوجی جوان میرا بیٹا ہے۔ آپ بھی میرے بیٹے کی طرح ہیں کرل۔ میں نے بیٹا سمجھ کر ہی آپ کو گھر میں رکھا ہے۔“

”جب آپ مجھے اپنے بیٹے کی طرح سمجھ رہی ہیں تو پھر اسی طرح مخاطب کریں۔ آپ کہہ کر مخاطب نہ کریں۔“

”میں اپنے بیٹے کو بھی آپ کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔ اس میں تکلف نہیں اپنائیت محسوس ہوتی ہے۔“

”پندرہ سولہ برس گزر جانے کے بعد آپ کے سینے میں بیٹے کی یادیں اسی طرح زندہ ہیں۔ جب کہ وقت جو بہت پرانہ ہو گیا ہے، سنا ہے زخم بھرتا ہے۔“

”شاید ایسا ہوتا ہے، مگر میں تو ابھی بھگتی ہوں جیسے یہ زخم مجھے کل ملا ہے۔“

میں نے بقیں ہاتھوں کو عقیدت بھری نظروں سے دیکھا اور سوچا۔ ایک طرف یہ ماں ہے جو اپنے جوان بیٹے کو وطن پر قربان کر کے فخر محسوس کر رہی اور دوسری طرف وہ والدین ہیں جو اپنے بچوں کو وطن کی علیحدگی، دشمنی، فقر، مصیبت اور خون ریزی پر اکسارہے ہیں۔

اس نے گرم گرم کلنی میری طرف بڑھائی۔ ”کرل، کلنی ٹھنڈی ہو رہی ہے، جلدی سے پی لیں۔ کلنی پینے سے جسم میں توانائی اور جستی آجائے گی۔“ وہ مجھے کلنی پلانے لگی۔

بقیوں ہاتھ مجھے کلنی پلا بھی تو برتن اٹھا کر لے گئی۔ کچھ دیر بعد والہیں آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک بڑی سی پوٹلی تھی۔ اس نے پٹنگ پر پوٹلی رکھ کر کھولی تو اس میں ایک بڑا بڑا لٹری، میروں والا قیمتی سکرٹ کیس، فوجی شناختی کارڈ اور میری رقم کے علاوہ بولی جہاز کا ٹکٹ بھی تھا۔ اس ٹکٹ پر کرل نیاز احمد کا نام درج تھا۔ یہ ٹکٹ کراچی سے راولپنڈی کا تھا! اس پر پندرہ نومبر کی تاریخ درج تھی۔

”یہ سب کچھ آپ ہی کا ہے۔“ بقیں ہاتھ نے کہا۔ ”تین ہزار کی رقم ہے۔ اٹیچی میں سات ہزار کی رقم رکھی ہے۔“

میں حیرت سے ان ساری چیزوں کو دیکھ رہا تھا۔ تعجب خیز بات یہ تھی کہ حادثے کے باوجود یہ چیزیں محفوظ تھیں جب کہ ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ جائے حادثہ پر لوگ زخمی اور مرنے والوں پر ترس کھانے کی بجائے ان کی جیبیں صاف کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ساری قیمتی چیزیں بالکل محفوظ تھیں، مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ لوگ اتنے نیک ہو گئے ہیں۔

”آپ اپنی چیزیں دیکھیے۔ میں ابھی آتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ کمرے سے چلی گئی۔

یہ رقم، بڑا بڑا بڑا بڑا کارڈ، میں نے دوبارہ جائزہ لیا۔ یہ چیزیں میری نہیں تھیں۔ پھر سب سے پہلے میں نے شناختی کارڈ اٹھایا۔ اس کے اوپر لکھا تھا پاکستان آرمی، اس کے نیچے بریکٹ میں ’ٹائیگر رجمنٹ‘ کے الفاظ درج تھے۔

میں نے شناختی کارڈ کھولا تو اچھل پڑا۔ میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس شناختی کارڈ پر جو تصویر لگی ہوئی تھی، وہ میری تھی اور میں فوجی وردی میں تھا، سر پر کپ بھی تھی۔ اس شناختی کارڈ میں میرا نام نیاز احمد لکھا تھا اور میرا عہدہ کرل کی حیثیت سے درج تھا۔

سکرٹ کیس وہی تھا جو میں لے کر چلا تھا۔ یہ کرل کی امانت تھی جو اسے والہیں کرنی تھی۔ یہ قیمتی گھڑی بھی میں کرل کی کلائی پر دیکھ چکا تھا۔ جو کچھ پیش آ رہا تھا وہ میرے لیے غیر متوقع تھا اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میں الجھ کر رہ گیا۔

میں حیرت میں غرق تھا کہ بقیں ہاتھوں نے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں نہ کی ہوئی فوجی وردی اور جوتے تھے۔ اس نے دونوں چیزیں مجھے دکھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ ہے آپ کی وردی اور جوتے۔ میں نے دونوں چیزیں سنبھال کر رکھی ہوئی تھیں۔“

”انہیں لا کر دکھانے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ وہیں رہنے دیتیں۔“

”میں تو آپ کو ایک ضروری بات بتانا بھول ہی گئی۔“ بقیں ہاتھ نے ایک دم چونک کر کہا۔ ”اس غریب نے دو دن میں آپ کی خیریت معلوم کرنے اور آپ سے بات کرنے کے لیے کوئی پیاسا ٹیلی فون کیسے ہوں گے؟“

”کون؟؟؟“ میں نے پوچھا تو گویا اس ڈرامے میں کوئی نیا کردار شامل ہو رہا تھا۔

”اس نے اپنا نام ذکیہ خانم بتایا ہے۔“ بقیں ہاتھ نے ہنسنے پر ایک دلکش مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”وہ آپ کے لیے بڑی بڑی فکر مند ہو رہی ہے۔“

”ذکیہ خانم!“ میں حیرت میں ڈوب گیا۔

”ہاں۔“ وہ کہنے لگی۔ ”آواز سے کوئی نوجوان لڑکی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ حیدر آباد سے بار بار ٹیلی فون کر کے آپ کی خیریت دریافت کر رہی تھی۔ علی الصبح بھی اس کا فون آیا تھا۔ اس نے مجھے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ آپ کی قریبی عزیز ہے، کسی وجہ سے کراچی نہیں آ سکتی، اس لیے فون کر رہی ہے۔“

”ذکیہ خانم میری قریبی عزیز ہے؟“ میں چکر اٹھا۔ یہ کون کم بخت اچانک اور بے موقع میری عزیز ہو گئی۔ وہ جو کوئی بھی تھی میرے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔ میں اپنی اصلیت چھپا کر مہیاں پڑا ہوا تھا، اگر وہ کوئی ایسی بات کر دیتی جس سے میرا پول کھل جاتا تو میں اس کا مقصد بھی کچھ ایسا ہی ہو۔ میرا ذہن سنسنائے لگا، پھر مجھے اچانک ایک خیال آیا تو میں نے پوچھا۔ ”اسے حادثے کی خبر کیسے ہوئی؟“

”اس نے آپ کے حادثے کی خبر اخبار میں پڑھی تھی۔ خبر پڑھ کر بہت پریشان اور مضطرب ہو رہی تھی۔ وہ آپ سے بات کرنے کے لیے بہت بے چین ہے۔ پہلے دن اس کی آواز ٹیلی فون پر یوں بھرا رہی تھی جیسے وہ روٹی رہی ہو۔ اس کے شہ اور صاف لب دلچسپ نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اس کی آواز بہت اچھی تھی۔“

اچانک دروازہ کھلا، ایک شخص اندر آیا۔ وہ اپنے بالوں اور چہرے سے پچاس برس کا لگ رہا تھا مگر صحت مند۔ وہ گون پٹے ہوئے تھا۔ اس کے سر کے بال بکھرے ہوئے تھے اور شیو بھی بڑھا ہوا تھا۔ چہرے پر گہری سنجیدگی

چھائی ہوئی تھی۔ اس کی بھوری آنکھوں میں نیند کا خمار بھرا ہوا تھا۔ جب وہ بستر کے پاس آکر کھڑا ہوا تو بلقیس بانو نے اس کا تعارف کر لیا۔ ”کرئل“ آپ ہیں میرے شوہر ڈاکٹر محمد غنی!“

”ہیلو کرئل! آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“ اس نے مجھ پر جھکتے ہوئے پوچھا۔

”جی بہت بہتر ہوں اور آپ دونوں کا بے حد ممنون ہوں۔“

اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ ”خدا کا شکر ہے کہ بروقت طبی امداد ملنے کی وجہ سے آپ کی جان بچ گئی۔ حادثہ بڑا ہولناک تھا۔“ وہ میری نبض پر ہاتھ رکھ کر میری دھڑکنیں گنتے لگا۔ ”مجھے امید ہے کہ آپ بہت جلد مکمل طور پر صحت یاب ہو جائیں گے۔“ اس نے کہا۔

”شکریہ ڈاکٹر صاحب۔“ میں نے احسان مندی سے کہا۔ ”آپ لوگ میرے لیے جو کچھ کر رہے ہیں اس کا اجر تو آپ کو خدا ہی دے گا۔“

”اچھا اب مجھے اجازت دیں۔“ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور پھر دھیمے لہجے میں بولا۔ ”میرا کلینک جانے کا وقت ہو رہا ہے، ورنہ میں آپ کے پاس رکتا۔ آپ فکر مند نہ ہوں، کل تک کسی نرس کا ہندوست ہو جائے گا“ آج کے دن بانو بیس رہیں گی۔“ اس نے مسکرا کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور پھر اس سے مخاطب ہوا۔ ”رات میں جو دوایاں لے کر آیا تھا... وہ انہیں آج سے شروع کرانی ہیں۔“

ڈاکٹر غنی کمرے سے نکل گیا۔ کچھ دیر بعد بلقیس بانو نے اپنے ساتھ لائی دو انیوں میں سے دو کیسپول اور دو گولیاں کھلائیں۔ چند لمحوں بعد اس نے مجھے ایک انجکشن لگایا۔ ”آپ کو گہری نیند آجائے گی بلکہ یوں سمجھئے کہ غشی طاری ہو جائے گی۔“ اس نے بتایا۔ ”اس حالت میں آپ کی پٹیاں بدل دی جائیں گی۔“

”لوکے۔“ میں نے رضامندی ظاہر کی۔

”کرئل!“ بلقیس بانو نے تعجب سے کہا۔ ”سوائے ایک ذکیہ خانم کے کسی اور نے“ میرا مطلب ہے آپ کے رشتے داروں اور دوستوں نے ہم سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ حالاں کہ حادثے کی خبر پڑھ کر ان سب کو دیکھنے کے لیے آنا چاہیے تھا۔“

”کیا میرے حادثے کی خبر سارے اخبارات میں چھپی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”تقریباً تمام اخبارات میں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”وہ اخبارات میرے پاس موجود ہیں۔ اس خبر ہی کو تو پڑھ کر ذکیہ خانم نے رابطہ قائم کیا تھا۔“

”ان لوگوں کو خبر نہیں ہوگی کہ میں کہاں زیر علاج ہوں!“ میں نے بات بتائی۔

”خبر کیوں نہیں ہوگی!“ بلقیس بانو نے کہا۔ ”ہم نے نہ صرف اپنے گھر کا بلکہ ٹیلیفون کا نمبر بھی دیا تھا۔“

”پھر تو افسوس ناک بات ہے۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے اپنے لوگوں سے ایسی توقع نہیں تھی... اب یہی ممکن ہے

کہ وہ خبر ان لوگوں کی نظروں سے نہ گزری ہو۔ کیا لاہور اور راولپنڈی کے اخبارات میں بھی یہ خبر چھپی ہے؟“

”اوہ...“ وہ چونک کر بولی۔ ”ایسا ہی ہو گا۔ اگر آپ کے عزیز پنجاب میں ہیں تو یقیناً انہوں نے یہ خبر نہیں پڑھی ہوگی، ہمیں تو اس کا خیال ہی نہیں آیا۔ بہر حال آپ کہیں تو پنجاب کے اخبارات میں بھی یہ خبر دے دی جائے، اور آپ کے دفتر میں بھی ایسی خبر پہنچانی ضروری ہے۔ اس کے متعلق بھی ہدایت دے دیں۔“

”نہیں نہیں اس کی قطعاً ضرورت نہیں۔“ میں نے گہرا کر کہا۔

”کیوں؟“ بلقیس بانو نے متحجب ہو کر پوچھا۔ ”کیا آپ نہیں چاہتے کہ آپ کے گھروالوں اور رشتے داروں کو

اتنے بڑے حادثے کی خبر ہو۔ کم از کم گھروالوں کو تو خبر ہونی چاہیے۔ وہ آپ کے نہ پہنچنے پر سخت پریشان ہوں گے۔“

”گھروالوں کو پتا ہے کہ میں ایک مہینے کے لیے سیر وغیرہ کی غرض سے نکلا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”دوستوں اور رشتے داروں کو پتا چل گیا تو یہاں ان لوگوں کا تانا باندھ جائے گا اور فون کی بھرمار ہوگی۔ آپ کا ناک میں دم آجائے گا۔“

”مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ میں ان سب کی خوب آؤ بھگت کروں گی۔“ وہ خوش دلی سے بولی۔ ”آپ کو جو دیکھنے اور ملنے آئیں گے وہ میرے لیے اپنوں ہی کی طرح ہوں گے۔ مجھے خدمت کا بڑا شوق ہے۔ میرے بیٹے کے بھی بہت سے دوست تھے۔ روز چار پانچ دوست گھر آتے تھے اور بچوں کی طرح دھماچو کڑی چلاتے تھے۔ مجھے بڑی خوشی ہوتی تھی۔ اس لیے کہ گھر میں رونق آجاتی تھی۔“

”میرے دوستوں کا تانا لگ گیا تو پھر مجھے آرام نہیں کرنے دیں گے۔ کیا معلوم رجنٹ کی رجنٹ آدھکے۔“

”یہ بھی ٹھیک ہے۔“ وہ ہنس پڑی۔ ”دیے واقعی آپ کو آرام کی سخت ضرورت ہے۔ اچھا کچھ دیر بعد میں دوبارہ آؤں گی۔ آپ آرام کریں۔“

بلقیس بانو چلی گئی اس کے جاتے ہی میں نے ایک گہری سانس لی۔ میں دل میں خوفزدہ ہو رہا تھا کہ اگر پنجاب کے اخباروں میں خبر چھپ گئی تو میرے لیے ایک مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔ کرئل نیاز احمد کے گھروالے اور دوست احباب سبھی بھاگے بھاگے چلے آئیں گے، پھر میری جو بے عزتی ہوگی، وہ الگ، دوسری طرف میں نیل جاؤں گا۔ میں اس بات پر بھی حیران تھا کہ اپنی کے اخبارات میں خبر چھپنے کے بعد سوائے ذکیہ خانم کے کسی اور نے خبر نہیں لی۔ کیا کرئل نیاز احمد کے گھروالوں کو ذکیہ خانم نے میرے حادثے کی اطلاع نہیں دی ہوگی، اگر دی تو پھر وہ لوگ آئے کیوں نہیں!... پھر مجھے ایک خیال آیا۔ کیس ایسا تو نہیں کہ اس کا کوئی گھری نہ ہو، یعنی اس کا اس دنیا میں کوئی نہ ہو۔ بہر حال یہ میرے حق میں اچھا ہی ہوا تھا۔ میں دعا مانگ رہا تھا کہ کوئی مجھ سے یہاں ملے نہ آئے اور میں جلد از جلد صحت یاب ہو کر یہاں سے نکل بھاگوں۔

کچھ دیر بعد میری آنکھ لگ گئی۔

میں بیدار ہوا تو سہ پہر ہو رہی تھی۔ بلقیس بانو آرام سے کرسی پر بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ مجھے جانتا ہوا پاکر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پاس آئی اور مانتا بھری مسکراہٹ مجھ پر بھجوا کر بولی۔ ”گلتا ہے کہ انجکشن نے اپنا اثر کچھ زیادہ ہی دکھایا ہے۔ آپ خوب سوتے رہے۔ گہری نیند لینے سے آنکھوں اور چہرے پر بشاشت نظر آ رہی ہے۔“

”اب میں اپنے آپ کو صبح سے بہتر محسوس کر رہا ہوں۔ درد میں لفاقت ہو گیا ہے۔“ میں نے اپنے سینے پر نظر ڈالی۔ میری پٹیاں بدلی ہوئی تھیں۔ نیند میں میری ڈریسنگ ہو گئی تھی۔ میں نے سر گھما کر دیکھا تو مہا“ میری نظریں پڑی ہوئی پوٹلی پر پڑی۔ یہ وہی پوٹلی تھی جس میں رقم گھڑی، بٹوہ اور سگریٹ کیس تھا۔ میں نے بلقیس بانو سے پوچھا۔ ”آپ نے یہ پوٹلی یہاں کیوں رکھ چھوڑی ہے؟“

”یہ ساری چیزیں میں نے آپ کی بیوی کو دکھائی تھیں، پھر میں اسے الماری میں رکھنا بھول گئی۔“

”میری بیوی؟“ میں حیرت سے اچھل پڑا۔

کرتل کہاں ہے؟

میرے ذہن میں اس عورت کا چہرہ اُبھر آیا۔ جو مجھے قتل کرنے کی غرض سے سینڈزپٹ کے ساحل پر لے گئی تھی۔ اس کے بارے میں سنتے ہی کرتل نیاز احمد کی طرح چونکا تھا۔ اگر یہ منصوبہ اس عورت کا بنایا ہوا تھا تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ اسے اتنا لبا چکر چلانے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر اس کا مقصد مجھے قتل کرنا ہی تھا تو وہ نہایت آسانی سے ایسا کر سکتی تھی۔

”کرتل!“ بلقیس بانو کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ”کیا بات ہے آپ پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔ بات بات پر آپ سوچ میں ڈوب جاتے ہیں کوئی پریشانی ہے تو مجھے بتائیں۔“ اس نے تشویش سے کہا۔

”کوئی خاص بات نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”دراصل میں نہیں چاہتا کہ میرے بچے مجھے اس حالت میں دیکھیں۔ وہ بہت پریشان ہوں گے۔ میں بچوں کو پریشان نہیں دیکھنا چاہتا۔“

”آپ فکر نہ کریں۔ میں انہیں سمجھا بچا کر روک لوں گی۔ اور اندر نہیں آنے دوں گی۔“ بلقیس بانو نے مجھے تسلی دی۔ ”کتنے بچے ہیں آپ کے؟“

میں اس سوال پر سٹپٹا گیا لیکن جواب دینا ضروری تھا۔ میں نے سوچا کرتل نیاز احمد چالیس کے پٹے میں ہے اتنی عمر میں اکثر افراد کے چھ سات بچے تو ہوتے ہی ہیں۔ ”چھ ہیں۔“ میں نے کہا۔

”چھ بچے ہیں!“ اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ جیسے چھ بچے ہونا کوئی ناممکن بات ہو۔

”آپ حیرت زدہ کیوں ہیں؟“ میں نے بے اختیار پوچھا۔ مجھے خدشہ ہونے لگا تھا کہ کہیں کرتل کی بیوی اسے بچوں کی تعداد کے بارے میں بتانہ چکی ہو۔

”میں جہاں اس لیے ہوں کہ آپ کی بیوی چھ بچے تو کہا دو بچوں کی بھی ماں نہیں لگتی۔“

میں ہنس پڑا۔ اسی اثنا میں کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک ملازمہ نما عورت اندر داخل ہوئی اور بولی۔ ”حیدر آبا سے ٹینک کال آئی ہے کیا کون؟“

”ذکیہ خانم کا فون آیا ہو گا۔“ بلقیس بانو بھٹ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ”میں فون پیس لے آتی ہوں۔“

بلقیس بانو ملازمہ کے ساتھ کمرے سے نکل گئیں۔ میرا دل سینے میں دھک دھک کرنے لگا۔ میں ذکیہ خانم سے فون پر بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن میرے نہ جانے سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ بلقیس بانو فون اٹھائے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ میرے بستر کے سرہانے فون کا پوائنٹ لگا ہوا تھا۔ اس نے اس میں پلگ لگایا اور تھوڑی ہی دیر بعد جب دوسری طرف سے دوبارہ نمبر ڈائل کیے گئے تو کھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر میرے ہاتھ میں دے دیا۔ مرنے کیانہ کرتا۔ میں نے مردہ لیے میں کہا۔ ”ہیلو!“

”کرتل!“ دوسری طرف سے باریک ریلی آواز نے مجھے مخاطب کیا۔ ”کیا آپ کرتل نیاز احمد بول رہے ہیں؟“

”ہاں۔“ میں نے بہ دقت جواب دیا۔ ”میں کرتل ہی بول رہا ہوں۔“

”کرتل! میں ذکیہ خانم بول رہی ہوں۔ آپ میری بات توجہ سے سنیں۔ کیا آپ کو میری آواز صاف سنائی دے رہی ہے؟“ دوسری طرف سے کہا گیا۔

”میں سن رہا ہوں۔ آواز صاف سنائی دے رہی ہے۔“

”کرتل!“ دوسری طرف سے آواز یک دم چیخ کی صورت اختیار کر گئی۔ ”آپ کی جان سخت خطرے میں

”وہ دو بچے لاہور سے کراچی پہنچ گئے۔“ بلقیس بانو کہنے لگی۔ ”انہیں آپ کے حادثے کی اطلاع کراچی میں مقیم ایک سسلی نے دی تھی۔ وہ لاہور میں نہیں بلکہ قصور گئی ہوئی تھیں وہ اطلاع ملتے ہی فوراً ہی یہاں پہنچی ہیں۔“

”جی۔۔۔“ میرے حلق میں کانٹے سے چبھ رہے تھے۔

”آپ کی کیفیت دیکھ کر ان کی حالت غیر ہو گئی تھی۔۔۔ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھیں۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ آپ کو اس قدر چاہتی ہیں۔“

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کون۔ میں نے خاموشی ہی بستر کجی۔ اس خبر سے میرے وجود میں ایک دھماکا سا ہوا تھا میں ذکیہ خانم کو رو رہا تھا کہ ایک عدد بیوی بھی ٹپک پڑی۔ میں نے جواب میں سر کو خفیف سی جنبش دی۔

”ان کی محبت نے مجھے برا متاثر کیا۔ آپ بڑے خوش نصیب ہیں فی زمانہ آپ کو ایسی چاہنے والی بیوی ملی۔“

مرگے بنا سکندر، میں نے اپنے دل میں کہا۔ اصلی کرتل نیاز احمد کی بیوی چلی آئی تھی۔ اب کسی بھی لمحے میرا بھانڈا پھوٹ سکتا تھا۔ وہ شاید اس لیے مجھے پہچان نہ سکی تھی کہ میرا سر اور چہرہ بچوں میں چھپا ہوا تھا اور اس نے مجھے پہچاننے سے پہلے ہی رونے دھونے شروع کر دیا تھا۔ میرا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ اب کیا ہو گا مجھے کیا کرنا چاہیے اس صورت حال سے کیسے نمٹا جائے۔

”آپ کی بیوی بہت حسین، پرکشش اور بے حد لطیف ہیں۔“ بلقیس خانم نے گویا تیسرا وار کیا۔ ”میں ان سے بہت متاثر ہوئی۔ وہ بہت سلیقہ شعار اور شائستہ اطوار ہیں۔ پہلی ملاقات ہی میرے دل پر نقش ہو کر رہ گئی۔ وہ صرف دو گھنٹے میرے ساتھ رہی ہیں لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ برسوں سے ہماری شناسائی رہی ہے۔“

”وہ ہیں کہاں؟“ میں نے مری مری آواز میں پوچھا۔

”وہ بچوں کو لینے انزپورٹ گئی ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”بچے اپنے انکل کے ساتھ دوسری فلائٹ سے پہنچ رہے ہیں۔“

”بچے اور انکل!“ میرے سر پر دھماکا سا ہوا۔ معلوم نہیں اس قتل کے کتنے بچے تھے۔ وہ عورت جو کرتل کی بیوی تھی اسے میں نے نہیں دیکھا تھا۔ بیوی اور بچوں کے ساتھ کرتل کا بھائی بھی پہنچ رہا تھا۔ ان کے بچنے کے بعد یہاں جو ڈراما ہوا تھا اس کے تصور ہی سے میں لرزہ برآمد تھا۔

دھنسا۔ مجھے خیال آیا کہ یہ جو کچھ ہوا ہے اور ہو رہا ہے یہ میرے خلاف ایک سازش ہے۔ یہ سب کچھ کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا جا رہا ہے۔ میں واقعات کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینے لگا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ جب کرتل میرے گھر آیا تھا تو اپنا انتہائی قیمتی سگریٹ کیس بھول گیا تھا۔ یہ حرکت یقیناً دانستہ تھی ورنہ کوئی لاکھوں کی چیز بھی اس طرح بھولتا ہے۔ پھر اس نے اپنے قیام کے متعلق جس ہوٹل کے بارے میں بتایا تھا وہ دھوکا

دی اور غلط بیانی ثابت ہوئی تھی تیسرا وہ اس فلائٹ سے راولپنڈی روانہ نہیں ہوا تھا جس کے بارے میں اس نے مجھے بتایا تھا۔ اور وہ شخص کون تھا جس نے مجھے کرتل کے حکم پر انزپورٹ لے جانے کے بہانے اس حال تک پہنچایا کیا وہ واقعی کرتل ہی کا آدمی تھا کہیں ایسا تو نہیں کرتل کو اغوا کر لیا گیا ہو اور مجھے ایک حادثے میں زخمی کر کے دنیا کو یہ باور کرائے کی کوشش کی گئی ہو کہ کرتل میں ہوں۔ میرا ذہن اس وقت مختلف زاویوں سے واقعات کا جائزہ لینے لگا۔ میری شکل کرتل سے بالکل مختلف تھی، صرف ایک چیز مشترک تھی یعنی قد۔۔۔ خدا ہی بہتر جانتا تھا کہ اصل



کر آہستہ آہستہ میری طرف بڑھا۔ انداز ایسا تھا جیسے وہ کسی محسوس بچے کو محض ڈرانے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ میرے قریب آیا تو میں نے اس کی نقاب سے جھانکتی ہوئی آنکھوں میں دیکھا... اس کی آنکھوں میں درنگی کی بجائے ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ ”ہیلو کرل! کیسے ہو؟“ اس نے اس انداز سے پوچھا جیسے میری عبادت کو آیا ہو۔

میں جواباً خاموش رہا۔

”ان لوگوں کا سلوک آپ کے ساتھ کیسا رہا؟“ اس بار میں نے محسوس کیا کہ اس کا لہجہ استعزایہ تھا۔ ”آپ نے یہاں آکر اپنے آپ کو کیسا محسوس کیا... ایک مریض یا جانور؟ ڈاکٹر لوگ مریض کو آدمی کم اور جانور زیادہ سمجھتے ہیں۔“ اس نے کہا۔

”یہاں مجھے جو آرام ملا ہے، وہ شاید اپنے گھر میں بھی نہ ملا۔“ میں نے خشک لہجے میں کہا۔ ”لیکن تم کون ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“

”ہم تو آپ کے خدمت گزار ہیں۔“ وہ ایک دم ہنس پڑا۔ ”ہم آپ کو اس سے کہیں زیادہ آرام و سکون پہنچائیں گے۔“

”میرا خیال ہے تم کوئی انتہائی گھٹیا درجے کے بد معاش ہو۔ میں تم سے کسی اچھے سلوک کی توقع نہیں رکھتا۔“ میں نے زہر خند سے کہا۔

میری بات پر وہ بے ساختہ قہقہہ لگا کر بولا۔ ”کم از کم امید تو اچھی رکھنی چاہیے، آگے...“ وہ اپنی بات پوری نہیں کر سکا تھا کہ ایک بار پھر کمرے کا دروازہ دھڑ سے کھلا۔ سب سے پہلے نوجوان خادم نمودار ہوئی، اس کا چہرہ سفید چادر کی طرح ہو رہا تھا اور آنکھیں دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ خادمہ کے پیچھے ڈاکٹر محمد غنی تھے۔ انہیں دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے انہیں گہری نیند سے جگایا گیا ہو، وہ بھی حد درجہ سراسیمہ نظر آ رہے تھے۔ ان دونوں کے پیچھے چار نقاب پوش کا شکوف لیے ہوئے تھے جب کہ دو نقاب پوشوں کے ہاتھوں میں اسٹریچر اور نالکون کی موٹی ڈوری کے گولے تھے۔

ڈاکٹر غنی نے اپنی بیوی کو بے ہوش دیکھا تو بے اختیار صوفے کی طرف لپکے لیکن جو نقاب پوش مجھ سے باتیں کر رہا تھا، سرعت سے ان کی راہ میں حائل ہو گیا۔ وہ ٹھٹھک کر رکے تو نقاب پوش نے اپنا ریوالت ان کے سینے پر رکھ دیا، پھر اس نے بڑے نرمی اور گفتگوئی سے کہا۔ ”گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کی بیوی صرف بے ہوش ہوئی ہیں، لہذا آپ یہیں بیٹھ کر رہیں۔“

ایک نقاب پوش جس کے ہاتھ میں کلا شکوف تھی وہ ان سب کا لیڈر معلوم ہوتا تھا، اس نے فضا میں کلا شکوف لہراتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”جلدی کرو۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔“

کوئی دس منٹ کے اندر اندر بے ہوش بلیس بانو، نوجوان ملازمہ اور ڈاکٹر غنی صاحب کی مشکلیں کس دی گئیں۔ پھر انہوں نے خادمہ اور ڈاکٹر غنی صاحب کے منہ پر ٹیپ چپکایا۔ جب یہ کارروائی مکمل ہو گئی تو نقاب پوشوں کے لیڈر نے کلا شکوف کی ٹال ڈاکٹر غنی کے سینے پر رکھ دی۔ ”آپ سمجھ دار اور تعلیم یافتہ ہیں، لہذا عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ اپنی زبان بند رکھیں۔ اگر آپ نے پولیس کی مدد لینے کی کوشش کی تو ہم آپ کے گھر کے تمام افراد کو گولی کا نشانہ بنادیں گے۔ ہمارے لیے کسی کی جان لینا اتنا ہی آسان ہے جتنا کسی جینو کی کو مسلما۔ ہم کرل کو لے جا رہے ہیں۔ انکو کاراز کسی کو معلوم نہ ہو، سمجھئے!“

ہے۔ آپ جتنا جلد...“ دھتلا لائن کٹ گئی جیسے کسی نے اس کے ہاتھ سے ریسیور پھینک لیا ہو۔ ”ہیلو... ہیلو...“ میں چیخا، لیکن دوسری طرف انگریج لائن کی ٹون سنائی دے رہی تھی، پھر تھوڑی دیر بعد یہ آواز بھی ختم ہو گئی۔

ذکیہ کی وارننگ سن کر مجھے سکتہ سا ہو گیا۔ اس کے کہنے کے مطابق، حقیقی کرل نیاز احمد کی جان خطرے میں تھی یا بحیثیت کرل نیاز احمد خود میری جان کو خطرہ لاحق تھا، میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا، لیکن عقل مندی کا تقاضا یہ تھا کہ اس غیر واضح وارننگ پر بھی مجھے ہوشیار ہو جانا چاہیے۔ کسی وضاحت کا امکان بہت بعد کی بات تھی، جب کہ خطرہ نزدیک تر تھا۔ میں نے بلیس بانو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آواز نہیں آرہی۔ لائن ایک دم ڈیڈ ہو چکی ہے۔ میں ابھی اس کی پوری بات سن بھی نہیں سکا تھا۔“

بلیس بانو نے ریسیور میرے ہاتھ سے لے کر کان سے لگا لیا۔ چند لمحے وہ کرلڈل پر ہاتھ مارتی رہی، پھر مجھ سے بولی۔ ”ہاں ہیلی ٹون ایک دم ڈیڈ ہو گیا ہے۔“

”میں حیران ہوں... تھوڑی دیر تک انگریج ٹون بھی سنائی دی تھی جیسے کسی نے ڈاکل گھما کر نمبر گزیر کر دیے ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اور پھر ایک دم ٹون ڈیڈ...“

میرا جملہ ابھی پورا نہیں ہوا تھا کہ ایک دھماکے سے دروازہ کھلا۔ کمرے میں دو مسلح نقاب پوش داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں دو خوفناک ریوالت چمک رہی تھے۔ بلیس بانو نے دھماکے کی آواز سن کر پلٹ کر دیکھا۔ اس کی نظر جیسے ہی نقاب پوشوں پر پڑی، اس کے ہاتھوں سے ریسیور پھوٹ کر فرش پر گرا۔ دہشت سے اس کا چہرہ بیلا پڑ گیا۔ نقاب پوش دو قدم آگے بڑھے تو بلیس خانم کا جسم تھر تھرا لگا، وہ خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹی تو اس کا ایک پاؤں ٹیلی فون کی تار سے الجھ گیا اور وہ فرش پر پھسلتی ہوئی گر پڑی، پھر اس میں اٹھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

دونوں نقاب پوش دھیمی آواز میں ہنس پڑے، پھر ایک نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے دوسرے سے کہا۔ ”یہ رہے کرل صاحب۔“

دوسرے نقاب پوش نے مجھ پر ایک اچھتی سی نگاہ ڈالی، پھر اس نے تسخیر کے انداز میں کہا۔ ”خوب! یہ ہیں وہ حضرت اور وہ پڑی ہیں ان کی میزبان... خیر تم ان دونوں کا خیال رکھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

اگر ذکیہ خانم سے بیلیفون پر وہ مختصر سی گفتگو نہ ہوئی ہوتی اور اشارہ نہ ملا ہوتا تو میں یہی سمجھتا کہ وہ دونوں بد معاش و کمپنی کے ارادے سے آئے ہیں، مگر اس وقت ان لوگوں کو سامنے دیکھ کر مجھے ذکیہ خانم کے وہ الفاظ بھی یاد آئے۔ کرل آپ کی زندگی سخت خطرے میں ہے، مجھے اس بات کا زیادہ افسوس ہو رہا کہ میں بلیس بانو کو اس خطرے سے آگاہ نہیں کر سکا تھا۔ جو مملکت ہمیں میرا آئی تھی وہ چند لمحوں سے زیادہ نہ تھی۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی خطرہ سر پر آپہنچا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرا نامعلوم دشمن اس طرح میری بے بسی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے گا۔ میں اس قدر بے بس تھا کہ مقابلہ تو کجا، مزاحمت کا بھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں اپنی جگہ پوری طرح ہلنے چلنے کے قتل بھی نہیں تھا۔

پسلا نقاب پوش میرے بستر کے پاس آکر رک گیا۔ پھر اس نے ریوالت اپنی جیب میں رکھا اور جھک کر بیہوش بلیس بانو کو اپنے دونوں ہاتھوں پر اس طرح اٹھالیا جیسے وہ کوئی پانچ چھ سال کی بچی ہو، نقاب پوش نے اسے لے جا کر بہت آہستگی سے صوفے پر لٹا دیا اور دوبارہ میرے بستر کے پاس آکر ریوالت نکال لیا۔ پھر وہ مجھے نشانے کی زد میں لے

ڈاکٹر غنی سرہلا کر رہ گیا۔ وہ اس کی تقریر کے جواب میں کہہ بھی کیا سکتے تھے۔ ان کے منہ پر تو نیپ چکی ہوئی تھی۔

لیڈر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”کرئل کو اسٹریچر پر ڈالو۔ بڑی احتیاط سے اور سنبھال کر اٹھانا۔ وہ اس قابل نہیں ہیں کہ اٹھ کر بیٹھ سکیں۔ ان کے زخم ابھی کچے ہیں۔ تکلیف نہ ہونے پائے۔“

میں لیڈر کی اس بدایت پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ گویا فی الوقت وہ مجھے قتل کرنے نہیں آئے تھے بلکہ اغوا کر کے کہیں لے جانا چاہتے تھے۔

دو نقاب پوش پبلک سے اسٹریچر لگا کر کھڑے ہو گئے اور باقی دو نے مجھے بڑی احتیاط اور آہستگی سے اٹھا کر اسٹریچر پر لٹا دیا۔ غیر ضروری احتیاط کے باوجود میں کراہے بغیر نہ رہ سکا۔ میرے زخم ابھی کچے تھے۔ بدن میں حرکت سے زخموں میں درد کی لہر اٹھی تھی۔ پھر وہ اسٹریچر کو دھکیلتے ہوئے باہر لائے اور کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر لیا۔ وہ لوگ مجھے نشست گاہ میں لے کر آئے اور وہیں رک گئے۔ ایک نقاب پوش نے کاٹھکوف کو اس چادر میں لپیٹ لیا جو صوفے پر پڑی تھی۔ وہ شاید پے چادر ساتھ لائے تھے۔ جن کے پاس ریو لور تھے، انہوں نے ریو لور اپنی جیبوں میں رکھ لیے، پھر انہوں نے اپنے نقاب اتار کر چھپا لیے۔ اب ان کے بے نقاب چہرے میرے سامنے تھے۔ وہ اپنے چہروں مڑوں سے تو بد معاش ہی نظر آتے تھے لیکن ان کا رویہ بڑا مہذب اور شائستہ رہا تھا۔

وہ لوگ میرا اسٹریچر اٹھائے مکان کے عقبی راستے کی طرف بڑھے۔ باہر آکر مجھے احساس ہوا کہ یہ بہت بڑا بنگلا تھا۔ کوئی ہزار گز پر پنا ہوا ہو گا۔ جب وہ عمارت سے باہر آئے تو احاطے میں ایک ایمبولینس کھڑی تھی جس کا انجین اشارت تھا۔ ایمبولینس کا عقبی دروازہ کھول کر اسٹریچر کو اندر دھکیل دیا گیا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ میرے زخموں سے اٹھنے والی نیسیس اب ناقابل برداشت ہوئی جا رہی تھیں۔

چند لمحوں بعد ایمبولینس چل پڑی تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔ ایمبولینس کے اندر اسٹریچر کے بائیں طرف ایک لمبی نشست تھی۔ اس نشست پر تین بد معاش بیٹھے ہوئے تھے۔ باقی دو بد معاش شاید آگے تھے۔ ایک بد معاش نے سیٹ کے نیچے سے درمیانے سائز کا ایک ڈبا نکالا، پھر ڈبے سے ایک سرنج اور انجکشن کی شیشی نکال کر ڈھکی سرنج میں بھر لے گا، پھر مجھ سے بولا۔ ”کرئل! ستر زیادہ لمبا نہیں ہے لیکن آپ کو زخموں کی وجہ سے تکلیف محسوس ہوگی۔ کراچی کی سڑکوں اور راستوں میں بنے ہوئے اسپڈ بریکرز کی وجہ سے ایمبولینس اچھلتی کودتی رہے گی اور آپ کی جھپٹن نکل جائیں گی، لہذا ہم چاہتے ہیں کہ آپ کو بغیر کسی تکلیف کے لے جائیں۔“

میں نے خاموشی بہتر سمجھی۔ میں مکمل طور پر ان کے رحم و کرم پر تھا، اگر میں کچھ کتا بھی تو وہ میری بات نہ سنتے۔ میں کسی قسم کی مزاحمت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے میرے بازو کی پٹیوں کے درمیان انجکشن لگا دیا۔

جب اس نے سوئی نکال کر سرنج دوبارہ ڈبے میں رکھی تو میں نے اس سے پوچھا۔ ”تم لوگ مجھے کیوں اور کہاں لے جا رہے ہو؟“

”جنت ارضی میں۔“ اس نے ڈبا بند کر کے سیٹ کے نیچے کھسکاتے ہوئے کہا۔ ”لوگ جنت میں کیوں جاتے ہیں؟“

”لیکن مجھے تو تم جنم کے داروئے معلوم ہوتے ہو!“

وہ میری بات پر بے پروائی سے مسکرایا، پھر بولا۔ ”اس جنت ارضی میں وہ شخص بہترین صلے کا حق دار ہوتا ہے جو ہم سے بھرپور تعاون کرتا ہے۔ اگر آپ بھی تعاون کریں گے تو بہترین صلہ دیا جائے گا۔ اس جنت ارضی کی

زندگی بڑے عیش کی زندگی ہوگی۔“

میں نے محسوس کیا کہ میرا تہ لہجہ اس پر بے اثر ہو رہا ہے۔ اسے میری تیز باتوں پر قطعاً غصہ نہیں آ رہا تھا اور وہ اپنے طور پر یکو اس کیے جا رہا تھا۔ پھر میں نے اپنے لہجے کو قدرے ہموار بناتے ہوئے کہا۔ ”تم سیدھی طرح بات کیوں نہیں کرتے؟ کیا تم مجھے کبھی مجرم تنظیم میں شامل ہونے کی دعوت دے رہے ہو؟“

”حیرت کی بات ہے کہ آپ جیسا سمجھ دار شخص میری سیدھی سادی باتوں کو خواہ مخواہ پیچیدہ مفہوم دے رہا ہے۔“ وہ عجیب انداز میں بولا۔ ”یعنی میرا مطلب واقعی اس جنت ارضی سے ہے جو انسان اپنے لیے خود تخلیق کرتا ہے، جہاں حوریں ہوتی ہیں اور عیش و طرب کا پورا سہارا۔ ایک حور شامل آپ کے انتظار میں بھی دیدہ و دل فرس راہ کیے بیٹھی ہے۔“

میں الجھ کر رہ گیا۔ ”مجھے کسی حور شامل کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں بغیر حور کے بھلا۔“

”مگر وہ آپ کے بغیر بھلی نہیں لگتی۔“ اس نے کہا۔ ”اسی لیے تو آپ سے شادی کر رہی ہے۔“

”شادی...؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”یعنی مجھے اس لیے اغوا کیا گیا کہ میری شادی کر دی جائے۔“

”جی ہاں کرئل، آپ کی شادی۔“ اس نے شوخ لہجے میں کہا۔ ”وہ آپ ہی ہیں جس پر آکر اس کی نگاہ انتخاب ٹھہری ہے، اور کرئل... آپ بڑے خوش قسمت ہیں۔“

”بدرو!“ اس کے دوسرے ساتھی نے اچانک غرا کر کہا۔ ”کیا تم اپنی زبان کو لگام نہیں دے سکتے؟ ہم نے کیا کیا تھا؟ کیا تم بھول گئے؟“

”یہ بتانے سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ بدرو جواباً غرایا۔ ”کیا دو لمبا میاں کو اس کی دلہن سے بے خبر رکھا جاسکتا ہے؟“

”کچھ بھی ہو جنہیں اپنی زبان بند رکھنی چاہیے۔“

بدرو خاموش ہو گیا اور مجھ پر انجکشن لے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا۔ مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے نیند کی جھونک میں ان کے تیسرے ساتھی کی آواز سنی۔ وہ پوچھ رہا تھا۔ ”بدرو، ہم کرئل کو کہاں لے جا رہے ہیں؟“

”ندیم انکسری سینٹر وہاں ان کا انکسری لیا جائے گا۔“ بدرو نے جواب دیا۔

”اس کے بعد ہمارا کام ختم ہو جائے گا؟“ دوسرا ساتھی سوالیہ لہجے میں بولا۔

”نہیں، اصل کام تو اس کے بعد شروع ہو گا۔ ہم کرئل کو وہاں...“

میں اس کا جملہ پورا نہیں سن سکا تھا، شاید اس وقت میں بے ہوش ہو گیا تھا۔

میری آنکھ کھلی تو میں نے اپنے آپ کو ایک کمرے میں فوم کے نرم و گداز بستر پر لیٹا ہوا پایا۔ کمرے میں زیرو پاور کے بلب کی نینگوں روشنی نکھری ہوئی تھی۔ میرے جسم پر پوائنٹس اور عمدہ قسم کا کبل پڑا ہوا تھا۔ کھڑکی سے باہر گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا، ہر سمت رات کا سا ناٹاری تھا۔ میری طبیعت بوجھل بوجھل سی ہو رہی تھی، سر بھاری تھا اور میں کمزوری محسوس کر رہا تھا۔

میں نے چند لمحوں بعد کمرے کا جائزہ لیا۔ یہ ایک شاندار قسم کا آراستہ و پیراستہ کمرہ تھا، اس کا ماحول بڑا خواب ناک تھا۔ دفعتاً مجھے یاد آیا کہ کچھ بد معاشوں نے مجھے اغوا کیا تھا، پھر ہم ایک ایمبولینس میں سفر کر رہے تھے۔ ان بد معاشوں نے میرے سامنے کسی عورت کا تذکرہ کیا تھا جو مجھ سے شادی کرنا چاہتی تھی، لیکن وہ کون تھی اور اسے

مجھ میں کیا خوبی نظر آئی تھی، میں کچھ نہ سمجھ سکا، البتہ ایک بات ممکن تھی کہ وہ کرل کے دھوکے میں ایسا کر رہی ہو۔ کرل میں یہ خوبی تھی کہ وہ بے حد دولت مند تھا اور وہ اپنی دولت کی نمائش بھی کرتا تھا، کوئی بھی عورت اس کی دولت کے پکر میں ایسا سوچ سکتی تھی... مگر اس عورت کو شاید معلوم نہیں تھا کہ کرل پہلے سے شادی شدہ ہے اور کئی بچوں کا باپ بھی ہے۔ یہ سارا ڈر لانا کرل سے شادی کے لیے رچایا گیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ جب وہ کرل کی بجائے مجھے دیکھے گی تو اس کی کیا حالت ہوگی۔ وہ اپنا سر پیٹ لے گی۔ اس کے بعد وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرے گی۔ اس کے سلوک کا تصور میرے لیے برا پریشان کن تھا۔

کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے "معا" میری نظر فلنگ کے ساتھ والی میز پر پڑی۔ اس میز پر وہ پولی رکھی ہوئی تھی جو بلیس بانو، کرل کی بیوی کو دکھانے کے بعد میز سے الماری میں رکھنا بھول گئی تھی۔ وہ نقاب پوش اس پولی کو بھی اٹھالائے تھے جو اس وقت تک میز پر پڑی ہوئی تھی۔

اس وقت مجھے شدید بھوک لگ رہی تھی اور کھانے کی طلب بڑی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ اتنی رات گئے کس کو بلاؤں، میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، پھر مجھے خیال آیا کرل کے سگریٹ کس سے ایک سگریٹ نکال کر ہی دل بھلایا جائے۔ اب میں اپنے بازو کو آسانی سے حرکت دے سکتا اور کوئی تکلیف نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے اپنا ہاتھ پولی کی طرف بڑھایا یہ تھا کہ خاموش فضا میں اچانک کلک کی ایک ہلکی سی آواز گونجی۔ میری نگاہ بے اختیار اس آواز کی سمت اٹھ گئی، "اوہ کمرے کا دروازہ تھا۔"

کمرے کے دروازے پر لگا ہوا پنڈل غیر محسوس انداز سے گھوم رہا تھا جیسے کوئی چور کسی کے جاگ جانے کے خوف سے بہت محتاط انداز میں پنڈل تھم رہا ہو۔ میرا فلنگ "ببتا" اندھیرے میں تھا۔ بیڈ لپ کی روشنی دروازے کی جانب پھیلی ہوئی تھی۔ میں اندر داخل ہونے والے کی حرکات و سکنات پر آسانی سے نظر رکھ سکتا تھا۔

دروازے کا پنڈل پوری طرح گھوم کر رک گیا۔ چند لمحوں کے بعد دروازہ آہستہ آہستہ اور بے آواز کھلا۔ جب دروازہ کھل گیا تو مجھے دروازے کے باہر اندھیرے میں ایک بیولا نظر آیا۔ اس بیولے نے سرعت سے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کیا تو میری نظروں کے سامنے ایک کوند سا لپکا۔ اب وہ بیولا نیلگوں روشنی کی زد میں تھا۔ میں نے غور سے دیکھا وہ ایک نوجوان لڑکی کا سراپا تھا جو روشنی میں نمایا ہوا تھا۔ وہ کالی قمیص اور کالے رنگ کی پتلون میں ملبوس تھی۔ اس کے چہرے کی رنگت سرخ و سفید تھی اور چہرے کے نقوش تیکھے تھے۔ پھر میری نگاہ اس کے گورے گورے ہاتھوں میں موجود چیزوں پر جم کر رہ گئی اور میں لرز گیا۔

اس کے بائیں ہاتھ میں ایک چھوٹی سی نارنج تھی جب کہ دائیں ہاتھ میں پستول تھا۔

"معا" اس نے نارنج روشن کی اور روشنی کا محدود ہالہ کمرے میں بھٹکتا ہوا میرے بستر کی طرف آہستہ آہستہ گھوم رہا تھا۔ میں نے فوراً ہی اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ روشنی کا دائرہ میرے چہرے پر آکر ساکت ہو گیا۔ پھر آہستہ آہستہ روشنی تیز ہوتی گئی... گویا وہ لڑکی میری طرف بڑھ رہی تھی۔ شاید یہ وہ حسین قاصد تھی جس کے متعلق بد محاشوں نے کہا تھا کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے... اب غالباً اسے میری بے ہوشی کے دوران معلوم ہو گیا تھا کہ میں اصل کرل نہیں ہوں اور وہ مجھے فراڈی سمجھتے ہوئے شاید قتل کے ارادے سے آئی تھی... میں بے تصور تھا مگر شاید میں کبھی اسے اس بات کا یقین نہ دلا سکتا۔

اچانک اس نے میرے قریب پہنچ کر میرے جسم سے اونٹنی کھینچ لیا۔ میرے سارے جسم میں سنسنی دوڑ گئی اور میرے رگ و پے میں خون جیسے منجمد ہو کے رہ گیا، پھر مجھے اس کی ایک غصیل چھنکار سنائی دی اور میں نے

محسوس کیا کہ پستول کی تال جو بے حد سرد تھی، میرے رخسار کو چھو رہی ہے۔

☆☆☆

پستول کی تال شاید نادانستہ گئی میں میرے رخسار کو چھو گئی تھی۔ اس لیے کہ اس کی زبان سے بے ساختہ نکلا تھا۔ "اف! میرے خدا! خالوں نے کیا حال کر دیا۔" میری حالت دیکھ کر اسے صدمہ ہوا تھا۔ اگر وہ دانستہ یہ حرکت کرتی تو میری ہمدردی میں "اس کی زبان سے یہ جملہ ادا نہ ہوتا۔ بلکہ وہ پستول سے میری کھوپڑی بجا دیتی۔ یا پھر خوبصورت سا سوراخ کر دیتی۔ یہ کون بلا ہے؟ میرا ذہن تیزی سے سوچنے لگا۔ یہ میری دشمن نہیں تھی، دشمن ہوتی تو اس کے لیے میں میرے لیے ہمدردی نہ ہوتی۔

میں اس کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ایک مانوس سی سرگوشی میرے کانوں میں رس گھونسنے لگی۔ "کرل... کرل... خدا کے لیے آنکھیں کھولو، کرل!" اس کے لیے میں التجا تھی۔

یہ آواز میں نے کب اور کہاں سنی تھی؟ میں آنکھیں بند کیے ذہن پر زور دیتا رہا۔ دفعتاً "یاد آیا کہ میں نے یہ ریلی آواز نیلی فون پر سنی تھی۔ کیا یہ لڑکی ذکیہ خانم ہے؟ میں نے دوسرے ہی لمحے اس کا نرم ہاتھ اپنے شانے پر محسوس کیا۔ وہ شاید میرا شانہ ہلا کر مجھے جگانا چاہتی تھی۔ اگر میرا شانہ ہلاتی تو میرے زخموں سے نیکیس آنکھیں میں نے اسی میں بہتری سمجھی کہ اپنی آنکھیں کھول دوں۔

میری نظر جیسے ہی اس کے حسین چہرے پر پڑی تو اس کے چہرے پر افسردگی کا پرت دکھائی دیا۔ گودہاں تار کی پھیلی ہوئی تھی۔ مگر ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے۔

میری آنکھیں اس سے چار ہوئیں تو اس کے چہرے پر بے بسی کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے فرط مسرت سے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "کیسے ہو کرل؟" میں نے جواب نہیں دیا اور حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ تو وہ آہستہ سے بولی۔ "کرل تم نے مجھے پہچانا نہیں؟ میں ذکیہ ہوں... ذکیہ خانم"

"ذکیہ!" میرے لبوں میں جنبش سی ہوئی۔ اس کی آمد سے مجھے مسرت سی ہو رہی تھی۔ جیسے وہ میری دوست ہو، مصیبت کی ساتھی۔ میں نے نقابت سے کہا۔ "میں کہاں ہوں؟"

"آپ جنت میں نہیں ہیں کرل!" وہ دہلی زبان میں بولی۔ "اس ڈائن کے گھر میں ہیں۔ اس کے قہقہے میں ہیں۔"

"ڈائن...؟ کون ڈائن؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"آپ کے لیے اس دنیا میں ایک ہی تو ڈائن ہے۔ وہ کتنا... اس نے نفرت سے کہا۔ "یہ وی ہے جو کبھی آپ کی بیوی تھی۔ میں نے سنا ہے کہ اس نے اپنے دوسرے شوہر سے بھی طلاق لے لی ہے۔"

"مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میرا ذہن میرا ساتھ نہیں دے رہا ہے۔ مجھے کوئی بات ٹھیک سے یاد نہیں آ رہی ہے۔" میں نے بے چارگی ظاہر کی۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔" اس نے مجھ پر ایک اچھتی سی نگاہ ڈالتے ہوئے مجھے تسلی دی۔ "آپ جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔"

میں نے اپنی آنکھیں ایک لمحے کے لیے بند کر لیں۔ میں اسے یہ تاثر دے رہا تھا کہ میں کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ دوسرے لمحے اس نے مجھے مخاطب کیا میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور اس سے پوچھا۔ ”تم یہاں کیوں آئی ہو ذکیہ؟“

”میں آپ کو اس ڈائن کے قید خانے سے نکل کر لے جانے کے لیے آئی ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”مگر ذکیہ خانم۔“ میں نے اپنے مجروح جسم پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال کر کہا۔ ”یہ کیسے ممکن ہے؟“

”ممکن تو نہیں اسے ممکن بنانا ہے کرل۔“ وہ جھک کر کہنے لگی۔ ”آج قدرت نے آپ کے فرار ہونے کے لیے ایک سنہراموقع فراہم کیا ہے۔ ایسا موقع پھر کبھی ہاتھ نہیں آئے گا۔“

”ذکیہ خانم! میں اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھا سکتی۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ میں...“

”کرل!“ اس نے قطع کلامی کی۔ ”اگر آج اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا تو پھر موت آپ کا مقدر بن جائے گی۔“

”مگر ذکیہ۔“ میں نے بے بسی سے اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”تم مجھے اپنے ساتھ کس طرح لے جاسکو گی؟“

”آپ کو ساتھ لے جانا کون سا مشکل ہے۔ میں نے اس کا عمل بندوبست کیا ہوا ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔“

”تم میرا مطلب نہیں سمجھیں۔“ میں نے اسے بتایا۔ ”مجھ میں تو اتنے کرٹینے کی بھی ہمت نہیں ہے۔ زخم بہت مملک آئے ہیں۔“

”کسی نہ کسی طرح چلنا ہو گا۔ کوشش کرنی ہو گی۔“ وہ بولی۔ ”اس کے لیے آپ کو عزم و حوصلے کی ضرورت ہے سوچنے کی نہیں۔ آپ میرے سارے تو چل سکتے ہیں نا؟ میں آپ کو سہارا دے کر چلوں گی۔ اٹھئے۔“

”چلنے کا قصور ہی میرے لیے سوہاں روح ہے۔“

آپ کو صرف ذینے تک چلنا ہو گا۔ اس کے بعد آپ مجھ پر چھوڑ دیجئے۔“

ذکیہ خانم پر تو بخون سوار تھا۔ وہ میری بات سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہی تھی نہ ہی اسے میری کیفیت کا کوئی اندازہ تھا۔ میں زخموں سے چور چور تھا۔ اور وہ مجھے وہاں سے لے جانے کے لیے بھند... میں نے ایک بار پھر روہانے لہجے میں کہا۔ ”تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ میں زخموں سے چور چور ہوں۔ خدا نے مجھے ایک نئی زندگی دی ہے۔“

”میں آپ کو سہارا دے کر بھاتی ہوں۔ میرے سارے دو ایک قدم چل کر تو دیکھیں۔“ اس نے اصرار کیا۔

”تم اصرار کر رہی ہو تو میں کوشش کر کے دیکھتا ہوں۔“ میں بولا۔ ”اگر کوئی جاگ گیا تو پھر کیا ہو گا؟“

”اس گھر میں وہ ڈائن اور اس کی ملازمہ کے علاوہ شاید ہی کوئی ہو؟“ اس نے کچھ سوچ کر کہا۔

میں اپنے جسم کی قوت مجتمع کر رہا تھا کہ ایک ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی ہے۔ نیچے سے کسی کے ہاتھ کی آواز سنائی دی۔ ذکیہ خانم لپک کر بے آواز قدموں سے دروازے تک گئی۔ وہ چند لمحوں تک دروازے سے کان لگائے کھڑی رہی، پھر لڑنے قدموں میرے پاس آئی۔ ”کرل“ اوپر کوئی آ رہا ہے۔ سوتے بن جائیں۔ کوئی آواز بھی دے تو آنکھیں نہ کھولے گا۔“

”تم کیا کرو گی؟“ میں نے تشویش سے پوچھا۔ ”تم نے میرے لیے اپنی جان بھی خطرے میں ڈال لی ہے۔“

”آپ میرے... کرس۔“ اس کا لہجہ پر سکون تھا۔ ”میں اس کمرے سے لمحہ غسل خانے میں جا کر چھپ

جاتی ہوں۔ اگر کسی نے غسل خانے کا رخ کیا تو اس کی خیر نہیں۔“

وہ تیزی سے غسل خانے کی طرف لپکی اور اندر جا کر اس نے دروازہ بند کر لیا، مگر چنچنی نہیں چڑھائی۔

ذکیہ خانم کا قیاس درست ثابت ہوا۔ چند لمحوں بعد کوئی اوپر آیا۔ قدموں کی آہٹ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ایک نہیں بلکہ دو آدمی آ رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد دروازے کا پینڈل گھمایا گیا، پھر دروازہ کھلا۔ دلہیز کے پاس دو سائے تھے۔ ان میں سے ایک عورت تھی اور دوسرا مرد۔ عورت ذینے پر کھڑی تھی۔ وہاں اندھیرا ہونے کی وجہ سے میں اس کے خدوخال نہ دیکھ سکا۔

ذکیہ خانم نے چند لمحے پہلے مجھے بتایا تھا کہ اس گھر میں جو ڈائن موجود ہے، وہ اپنے دوسرے شوہر سے طلاق لے چکی ہے۔ وہ کرل کی بیوی بھی رہ چکی تھی۔ میرے دل میں اسے دیکھنے کا ایک اشتیاق سا جاگ۔ معلوم نہیں کیوں وہ ذینے پر رک گئی تھی۔ وہ کمرے میں آئی تو اس شوق کی تکمیل ہوئی۔

مرد نے دلہیز کے پاس آ کر کمرے میں جھانکا۔ وہ پچاس برس کا ہو گا۔ مگر تھاکت مند اور توانا... اس نے پلیٹ کر عورت سے کہا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا کہ تمہیں وہم ہو گیا ہے۔ اس کمرے میں تمہارے ہونے والے دولہا کے سوا کوئی نہیں ہے۔“

”مگر اس کمرے سے کھڑ پھر کی آوازیں کیسی آ رہی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی مرد اور عورت آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔“

”وہ تمہاری سماعت کا ثور تھا۔ باہر برفانی ہوائیں چل رہی ہیں۔ وہ ہوائوں کی سرگوشیاں ہوں گی۔“ مرد نے جواب دیا۔

”میرے کان دھوکا نہیں کھا سکتے۔ پھر میری چھٹی حس فوراً“ بے دار ہو جاتی ہے۔“ عورت کے لہجے میں تندی تھی۔

”تو پھر کرل ہڈیاں بک رہا ہو گا۔ جب کوئی تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے تو وہ ہڈیاں بکنا ہے چلو... چل کر سو جاؤ۔ میں بھی سونے جا رہا ہوں۔“

”کیا کسی مرد کے حلق سے عورت کی آواز نکل سکتی ہے؟“ عورت نے تعجب سے پوچھا۔ ”کیا ہڈیاں کی کیفیت میں آواز بھی بدل جاتی ہے؟“

”دور سے سنائی دیتی ہوئی کسی آواز پر نسوانی آواز کا گمان ہوتا ہے۔“ مرد نے جواب دیا۔ ”تم خواہ خواہ وہم کا شکار ہو رہی ہو۔“

”خیر چلو، لیکن مجھے تسلی نہیں ہوئی ہمیں اپنے گرد و پیش سے غافل نہیں رہنا چاہئے۔“

مرد نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ بند کر دیا۔ گہرے سکوت میں ان دونوں کے قدموں کی چاپ سیڑھیوں پر گونجتی ہوئی معدوم ہوئی۔ دور بہت دور دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی، پھر گہرا سکوت چھا گیا۔

کوئی دس منٹ بعد ذکیہ خانم نے غسل خانے کا دروازہ بڑے غیر محسوس انداز میں کھولا اور باہر آ کر اسے بند کر دیا، پھر دبے قدموں میرے پاس آئی۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ”خدا غارت کرے اس ڈائن کو، سارا منصوبہ چوہٹ ہو گیا۔“

”خدا نے ہمیں ایک بڑی مصیبت سے بچالیا۔ اگر ہم پکڑے جاتے تو معلوم نہیں ہمارا کیا حشر ہوتا؟“

”حشر ہمارا نہیں، اس کا ہوتا۔ آپ کے زخموں کی وجہ سے مجھے یہ راستہ اختیار کرنا پڑا، ورنہ اس ڈائن کی کیا



”وہ صرف زخمی ہوا ہے۔“ عورت بولی۔ ”ہاتھ پیر تو نہیں ٹوٹے جو فرار نہ ہو سکے۔ کیا ضروری ہے کہ انجکشن کا اثر صبح تک قائم رہے۔ کچھ لوگوں پر انجکشن زیادہ دیر تک اثر انداز نہیں رہتا۔“

”تمہارے آدمیوں نے اس کے ساتھ کچھ زیادہ ہی بے رحمی کا ثبوت دیا ہے۔ یہ مرتے مرتے بچا ہے۔ اس کے سر پر اتنی شدید ضربیں لگنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے سر میں کس قدر شدید چوٹیں آئی ہیں۔ میں تو سمجھا تھا کہ کھوپڑی کی ہڈی ٹوٹ گئی ہوگی مگر ایک سرے سے معلوم ہوا کہ یہ معجزانہ طور پر بچ گیا۔ اگر کوئی اندرونی چوٹ آجاتی تو پھر تم اس سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔“ اس نے سانس لینے کے لیے توقف کیا۔ پھر اپنی بات جاری رکھی۔ ”اس کے سر اور چہرے کے زخم اب تیزی سے مندر ہونا شروع ہو جائیں گے۔ ناک کی ہڈی میں جو تھوڑا سا خم آیا ہوا ہے وہ رفتہ رفتہ ٹھیک ہو جائے گا۔ اسٹیرنگ دھیل کی ضرب لگنے سے مریض کے سینے پر چوٹ تو نہیں آئی مگر شدید دباؤ پڑا ہے۔ پمپاں ٹوٹنے سے بچ گئیں ہیں۔“

”یہ تم ناوقت کیا کمائی سنانے بیٹھ گئے۔“ عورت چڑکربولی۔ ”تفصیل میں جانے کا یہ کون سا موقع ہے؟“

”میں اس لیے جا رہا ہوں کہ ایسا مریض فرار ہونے کی کوشش نہیں کر سکتا۔“ مرد نے کہا۔ ”کیا اس کے ساتھ وحشیانہ سلوک نہیں ہوا؟“

”اس کے ساتھ جو زیادتی ہوئی ہے، اس کا مجھے بھی احساس ہے۔“ عورت کہنے لگی۔ اس کے لیے میں تاسف تھا۔ ”اگر یہ اس قدر زخمی نہ ہوا ہوتا تو ڈاکٹر کے ہاں سے کب کا جا چکا ہوتا۔ پھر ہمارے ہاتھ نہیں لگتا۔ جو کچھ ہوا محض تمہاری وجہ سے ہوا۔ تم خاصی تاخیر سے جائے واردات پر پہنچے اور ڈاکٹر اسے اپنے گھر لے گیا۔ اگر اخبار میں خبر شائع نہ ہوئی ہوتی تو ہم احتقوں کی طرح اسے تلاش کرتے رہتے۔“

”میں تو صحیح وقت پر پہنچا تھا مگر منصوبے پر وقت سے پہلے ہی عمل کر دیا گیا۔ اس میں میرا کیا قصور؟“

”قصور تمہارا تھا نہ میرا، سارا قصور تو بارش کا تھا۔ اس بارش کی وجہ سے ساری گڑبڑ ہو گئی۔“ عورت نے کہا۔

”چھوڑو ان فضول باتوں کو، جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب ہمیں اپنی آنکھیں کھلی رکھنا ہیں۔۔۔ سمجھیں؟“

پھر قدموں کی آہٹ گونجی۔ بھاری پن سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ مرد تھا جو کھڑکی تک گیا تھا۔ اس نے چند لمحوں بعد کھڑکی کھولی۔

جیسے ہی کھڑکی کا پٹ کھلا، سرد ہوا کا ایک شدید جھوٹا آیا اور میرے چہرے کو چھو تا ہوا گزر گیا۔ اس کی ٹھنڈک میرے زخموں میں پھیلی چلی گئی۔ انہیں میری کوئی پرواہ نہیں تھی اور نہ میری تکلیف کا کوئی احساس۔ خدا معلوم وہ کھڑکی سے باہر جھانک کر کیا دیکھ رہے تھے۔

چند لمحوں بعد عورت ہدائی انداز میں چیخی۔ ”اکمل! وہ دیکھو، بوٹ جاری ہے۔ کوئی بوٹ چلا تا ہوا جا رہا ہے، زرا دیکھنا تو۔۔۔“

”بوٹ کہاں ہے؟“ مرد نے چونک کر پوچھا۔ ”اگر وہ بوٹ ہے تو اس کا انجن بند کیوں ہے۔ وہ چل کیسے رہی ہے؟“

”بوٹ کو کوئی چپو سے چلا رہا ہے۔“ عورت نے ایک لمبے کے توقف سے جواب دیا۔ ”وہ دیکھو۔۔۔ ادھر، اس نے سیاہ لباس پہن رکھا ہے۔ اور اس کی پشت نظر آ رہی ہے۔ بوٹ زیادہ دور نہیں گئی ہے۔“

”چلو ہم اس کا تعاقب کرتے ہیں۔“ مرد نے کہا۔ پھر ایک دم سے کھڑکی کے پٹ بند کر دیے۔ ”میرے پاس

مجال۔۔۔“

”میری حالت تو مردے سے بھی بدتر ہے۔ ورنہ میں ابھی اور اسی وقت تمہارے ساتھ چلتا۔“ میں نے کہا۔

کاش! میں اتنا فستہ حال نہ ہوتا۔

”اس وقت یہاں سے نکلنے میں خطرہ ہے۔ ہم کسی مصیبت سے دوچار ہو سکتے ہیں۔“ وہ بولی۔ ”دو چار دن بعد پھر آؤں گی۔ اس عرصے میں آپ بھی قدرے بہتر ہو جائیں گے، چلنے پھرنے لگیں گے۔ آپ گھبراہٹیں نہیں۔“

اس نے مجھے اس طرح سے تسلی دی جیسے میں کوئی چھوٹا سا بچہ ہوں۔ ”میں رات دن کسی نہ کسی طرح آپ کی خبر گیری کرتی رہوں گی۔“

پھر وہ جیسے آئی تھی، اسی طرح دبے پاؤں چلی گئی۔ مجھے کچھ اندازہ نہ تھا کہ یہ ذکیہ خانم کون ہے۔ کرمل کی رشتہ دار یا محبوبہ، اس نے مجھے جن محبت بھری نظروں سے دیکھا تھا، اس سے یہ گمان ہوتا تھا کہ وہ اس کی محبوبہ ہو گی۔ اس بات کا بھی امکان تھا کہ وہ کرمل کی پر خلوص دوست ہو۔ وہ کرمل کی جو کوئی بھی تھی، اس نے کرمل کی خاطر اپنی جان تک خطرے میں ڈال دی تھی۔ اسے شاید اچھی طرح معلوم تھا کہ میں کن خطرات میں گھرا ہوا ہوں۔ مگر یہ بات میرے لیے حیران کن تھی کہ ذکیہ خانم دھوکا کیسے کھا گئی کہ میں کرمل ہوں۔ کیا وہ میری آواز و لب و لہجے سے نہیں پہچان سکتی تھی۔ کیا اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں نقلی کرمل ہوں۔

میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ دھنسا، ”نچلے حصے سے کچھ شور سنائی دیا“ جیسے دروازے اور کھڑکیاں تیزی سے کھولی اور بند کی جاری ہوں۔ کچھ دیر بعد زینے پر قدموں کی چاپ کچھ اس انداز سے سنائی دی جیسے کوئی بدحواسی کے عالم میں بیڑیاں چڑھ کر آ رہا ہو۔ میں نے کچھ سوچ کر فوراً ہی اپنی آنکھیں بند کر دیں۔ اور چہرہ کھڑکی کی سمت کر لیا تاکہ اگر کمرے میں بلب چلایا جائے تو اس کی روشنی براہ راست میری آنکھوں پر نہ پڑ سکے۔ پھر گہری گہری سانس لینے لگا جیسے گہری نیند سو رہا ہوں۔

کمرے کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا، دوسرے ہی لمحے پورا کمرہ روشنی سے نہا گیا۔ مجھے اسی مرد و عورت کی موجودگی کا احساس ہوا۔ جو کچھ دیر پہلے زینے پر آئے تھے۔ وہ چند لمحوں تک کمرے کا جائزہ لیتے رہے۔ پھر ان میں سے کوئی غسل خانے کی طرف بھی گیا۔ غسل خانے کا دروازہ بند ہونے کے بعد سناٹا چھا گیا۔ چند لمبے بعد خاموش فضا میں عورت کی تیز و تند آواز گونجی۔ ”میں نے تم سے کہا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے یہاں کوئی داخل ہوا ہے۔ قدموں کی آہٹ سن کر تمہیں یقین آیا ہو گا۔“

”ہاں! میں نے بھی کسی کے قدموں کی چاپ سنی تھی۔“ مرد تشویش سے بولا۔ ”رات کے دو بجے کون آیا تھا۔ چور تو نہیں ہو سکتا۔ اگر چور ہوتا تو وہ کیسے چھپا ہوتا۔ ہم نے سارا گھر چھان مارا ہے کوئی بھی تو نہیں ہے۔“

”کیسے کرمل نے تو فرار ہونے کی کوشش نہیں کی؟“ عورت نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”کرمل! مرد کالجیہ استہزاء کا ہے۔“ لگتا ہے کہ تم نیند کی حالت میں ہو جو ہنسی ہنسی باتیں کر رہی ہو۔“

”کرمل نہیں تو اور کون ہو سکتا ہے۔ اس گھر میں یہی ایک شخص تو ہے جو فرار ہونے کی کوشش کر سکتا ہے۔“

”وہ دیکھو، تمہارا کرمل گہری نیند سو رہا ہے۔“ مرد کہنے لگا۔ ”اسے جو انجکشن لگایا گیا ہے، اس کا اثر صبح تک رہے گا۔ وہ اس پوزیشن میں بھی نہیں ہے کہ اپنی جگہ سے حرکت کر سکے۔ اس لیے کہ وہ شدید زخمی ہوا ہے خدا کا شکر اوار کرو کہ وہ جانبر ہو گیا۔“

پستول ہے۔ احتیاطاً تم بھی اپنا پستول لے لیتا۔ ہم اسے چند ہی لمحوں میں جالیں گے۔ جلدی کرو۔“  
 ”اکمل اس میں کوئی شک نہیں کہ تم بلا کے ذہین ہو مگر بعض اوقات بچوں کی سی باتیں کر جاتے ہو۔“  
 ”کیوں کیا ہوا؟“ مرد کے لیے میں حیرت تھی۔ ”کیا ہم اس کا تعاقب نہیں کریں گے جو رات دو بجے یہاں گھس آیا تھا۔ یہ کوئی چور یا ڈاکو نہیں تھا۔ یہ ہمارے دشمنوں ہی کا کوئی آدمی تھا۔ وہ یقیناً یہ دیکھنے آیا تھا کہ کرل کہاں ہے۔ وہ لوگ کرل کی تلاش میں ہوں گے۔“  
 ”اس کے علاوہ ہو بھی کون سکتا ہے؟“ عورت نے تائیدی لیے میں کہا۔ ”وہ چھ چلا تا ہوا بوٹ میں آیا ہو گا اور اب اسی طرح جا بھی رہا ہے۔ اس لیے کہ انجن کی آواز سے ہماری آنکھ نہ کھل جائے اور اس کے فرار کی خبر نہ ہو جائے۔ وہ چپکے سے آیا اور چپکے سے واپس جا رہا ہے۔ اگر ہم نے اس کا تعاقب کیا تو وہ اپنی بوٹ کا انجن شارت کر دے گا اور ہم اس کی گرد کو بھی نہیں پائیں گے۔“  
 ”تم آج کل بڑی ذہن ہوتی جا رہی ہو۔ یہ میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں کہ حسن اور ذہانت یکجا ہوتے جا رہے ہیں۔“

”تم میری ذہانت پر خاک ڈالو۔“ عورت نے شک کر کہا۔ ”اب ایک نئی مصیبت کھڑی ہو گئی ہے۔ وہ یقیناً ہمارے ہاں کرل کی موجودگی کی تصدیق کرنے آیا ہو گا۔ شاید وہ کرل کو دیکھ کر بھی گیا ہو۔ وہ کرل کو شاید اپنے ساتھ ہی لے جاتا اگر کرل بے ہوشی کی نیند سو نہیں رہا ہوتا۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ میں نے زینے پر قدموں کی آہٹ سنی تھی۔“ عورت نے گہری سانس لی۔ ”اگر کوئی کرل کو لینے آیا تو؟“  
 ”یہ تو بہت برا ہو گا۔“ مرد کھٹ افسوس ملتے ہوئے بولا۔ ”اب تو ایسا لگ رہا ہے کہ بنایا منصوبہ چوہٹ ہو جائے گا۔ ساری محنت پر پانی پھر جائے گا۔ ہم تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔“  
 ”کاش اس وقت میرے پاس گن ہوتی۔ میں اس کا میس سے نشانہ لے کر خاتمہ کر دیتی۔“ وہ طیش کے عالم میں بولی۔

”اس کا میاں سے زندہ بچ کر نکل جانا ہمارے حق میں اچھا نہیں ہوا۔ اگر وہ مل جاتا تو میں اسے زندہ واپس نہیں جاتے دیتا۔“

”تو اب ہمیں کیا کرنا چاہئے؟“ عورت نے تشویش آمیز سنجیدگی سے پوچھا۔  
 ”کچھ سوچتے ہیں۔“ مرد بولا۔ ”آؤ نیچے چلیں۔ میں اتنے بڑے منصوبے کو اتنی آسانی سے ناکام ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔“

وہ روشنی بجھا کر اور دروازہ بند کر کے چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی میں نے آنکھیں کھول دیں اور ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ان دونوں کی گفتگو سے چند باتوں کی وضاحت ہو گئی تھی۔ مگر بہت سی باتیں ابھی وضاحت طلب تھیں۔ ان کا منصوبہ کیا ہے اور وہ مجھے کس حیثیت سے استعمال کرنا چاہتے ہیں؟ اس سوال کا جواب معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ البتہ یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ میں ان کے منصوبے کا ایک اہم ترین کردار ہوں، حتیٰ کہ میرے بغیر ان کا پورا منصوبہ چوہٹ ہو کر رہ جائے گا۔ شاید ذکیہ خانم کو بھی اس منصوبے کی بھٹک ہو گئی تھی۔ جیسی وہ میری مدد کے لیے آئی تھی۔ اس کے علاوہ یہ بات سامنے آئی تھی کہ مجھے کسی ساحلی علاقے میں رکھا گیا ہے۔

میں کافی دیر تک بستر پر بے حس و حرکت لیٹا سوچتا رہا تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ بے کار لیٹے رہنے سے تو بہتر ہے کہ اٹھ کر بیٹھ جاؤں۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی اور۔۔۔ لیٹے لیٹے بے زاری ہونے لگی تھی۔ اس خیال کے تحت میں

نے اپنے جسم کی ساری طاقت مجتمع کی اور اٹھ بیٹھا۔ ہاتھ پیر نہ صرف بے جان محسوس ہو رہے تھے بلکہ بے حد تکلیف بھی ہو رہی تھی۔ میں نے بہت آہستگی اور احتیاط سے اپنے پاؤں پٹنگ سے نیچے نکالے اور پھر فرش پر کھڑا ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے اپنے پاؤں اٹڑے ہوئے لگ رہے تھے۔ اور آپ ہی آپ لرز رہے تھے۔ میں پٹنگ کا سارا لے کر بہت دقت تمام فرش پر کھڑا ہو گیا تو زخموں میں درد کی ایک شدید لہر اٹھی میں نے اپنے جڑے سختی سے بھیج لیے۔ اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھانے لگا۔ میں بمشکل چند قدم چلا ہوں گا کہ سانس اس طرح پھول گئیں کہ جیسے میلوں دوڑ کر آ رہا ہوں۔ کمزوری سے سر جھکانے لگا اور کمر گھومتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ میں نے بے اختیار پٹ کر پٹنگ کا سارا لے لیا۔ اور بری طرح اپنے لگام دوبارہ پٹنگ پر چڑھنے میں مجھے سخت جدوجہد کرنا پڑی تھی۔ جب میں دوبارہ بستر پر لیٹا تو میرا پورا جسم پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ مجھے نارمل ہونے میں کافی دیر لگی تھی اور خاصی دیر تک نیند بھی نہیں آئی، پھر کب آنکھ گلی کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔

میں بیدار ہوا تو صبح ہو چکی تھی۔ نرم دھوپ کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ دروازے کی طرف سے کسی کے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے اوھر دیکھا، دروازہ کھلا ہوا تھا۔ نیچے والے زینے پر کوئی باتیں کر رہا تھا۔ میں نے غور کیا، یہ اسی مرد کی آواز تھی جو رات میرے کمرے میں آیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”میں دوبارہ اوپر جا کر دیکھ آیا ہوں۔ وہ ابھی تک گہری نیند سو رہا ہے۔“  
 ”تم جا کر اسے اب جگا کیوں نہیں دیتے۔ وہ کب تک سو رہا ہے گا؟“ یہ رات والی عورت کی آواز تھی۔  
 ”نیند اس کی صحت یابی کے لیے بہت ضروری ہے، وہ جب تک سو رہا ہے اسے سونے دینا چاہئے۔“  
 ”میرا خیال ہے کہ اب تشویش کی کوئی بات نہیں ہے۔ تم اسے ایک نظر دیکھ آؤ نا؟“  
 ”نہیں۔۔۔ میں اب چل رہا ہوں۔ پہلے ہی اتنی دیر ہو گئی ہے۔“ وہ بولا۔ ”اور تم ذرا ہوشیاری سے کام لیتا۔ ظمیر رحمان کے چپختے ہی شادی کا پروگرام بنالیا۔ وہ کل پہنچ جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ کرل کو اس شادی پر اعتراض نہیں ہو گا۔“

”اعتراض۔۔۔“ وہ شوخ لہجے میں بولی۔ ”وہ تو یہ خبر سن کر خوشی سے پاگل ہو جائے گا۔“  
 ”ہاں، تم ہو بھی مردوں کو پاگل کر دینے والی خاتون۔“ اکمل نائی آدمی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”بہر حال میں اس موقع پر موجود نہیں ہوں گا۔ لہذا میری طرف سے پیشگی مبارکباد قبول کر لو۔“  
 ”اگر کرل کا معاملہ کسی وجہ سے الجھ گیا تو میں تمہیں بذریعہ تار مطلع کر دوں گی، پھر تم فوراً پہنچ جانا۔ ایک لمحے کی تاخیر بھی نہیں ہونی چاہئے۔“  
 ”میرا خیال ہے کہ گزربو نہیں ہو گی۔“ مرد نے گویا اسے تسلی دی، پھر شوخ لہجے میں پوچھا۔ ”کیا خیال ہے ہنی مون ستانے مری جاؤ گی یا۔۔۔“

”تم نے پھر وہی اطمینان باتیں شروع کر دیں۔“ عورت اس کی بات کاٹنے ہوئے خٹکی سے بولی۔ ”اگر میں اسے مری لے گئی تو وہاں اس پر قانونا مشکل ہو جائے گا۔“  
 ”جب وہ اپنی یادداشت سے محروم ہو جائے گا تو کتنے کی طرح تمہارے پیچھے دم ہلاتا پھرے گا۔“ اکمل نے کہا۔  
 ”پھر نہبتا جھٹھے لہجے میں بولا۔ ”تمہیں جلد ہی ظمیر رحمان کی صلاحیتوں کا اندازہ ہو جائے گا۔“  
 ”اکمل! وہ تیز لہجے میں بولی۔ ”ملازمہ سرونٹ کو رٹرز سے آنے والی ہے۔ کہیں وہ یہ باتیں سن نہ لے۔ اپنی زبان بند رکھو۔“

”اچھا بلایا! اکمل نے ہنس کر کہا۔ ”میں جا رہا ہوں تم باقاعدگی سے اپنی رپورٹیں بھیجتی رہنا۔ کامیاب ہو جاؤ گی تو ساری زندگی میٹ کر دی اور کامیابی کا دارودار اب صرف اور صرف تم پر ہے۔“

”میں یقیناً کامیاب ہو جاؤں گی۔“ عورت بولی۔ ”بس اب تم جاؤ مجھے بہت سارے کام منانے ہیں۔“

گھر سے سکوت میں ان دونوں کی چائیں گونجیں اور معدوم ہو گئیں۔ کوئی پانچ سات منٹ بعد میں نے موٹر بوٹ کے انجن کے شاربٹ ہونے کی آواز سنی۔ اکمل غالباً موٹر بوٹ سے جا رہا تھا۔ جس جگہ تھا شاید وہاں سے خشکی کے لیے آدھو رفت موٹر بوٹ کے ذریعے ممکن تھی۔ جیسی ذکیہ خانم بھی موٹر بوٹ ہی کے ذریعے آئی تھی۔

یہ سوچ کر میری نس نس میں سنسناہٹ دوڑ گئی کہ یہ غیبیٹ لوگ اپنے منصوبے کی کامیابی کے لیے مجھے میری یادداشت سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ان کا منصوبہ اس قدر گھٹاؤنا ہو گا۔ ”اوہ میرے خدا! میں کیا کروں۔“ غیر ارادی طور پر میرے منہ سے نکلا۔ میں نے دہشت زدہ ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ میرا دل بیٹھا جا رہا تھا اور رگوں میں خون جم رہا تھا۔ میرا جسم جیسے برف کی سل ہو کر رہ گیا تھا۔

سوچتے سوچتے میری ذہنی رو ظہیر رحمان کی طرف چلی گئی۔ یہ ظہیر رحمان کون ہے، کیا بلا ہے۔ یہ سوچ سوچ کر میرا ذہن مایوس ہوا جا رہا تھا۔ وہ کس طرح مجھے میری یادداشت سے محروم کر دے گا؟ آخر یہ سب کچھ میرے ساتھ کس لیے کیا جا رہا ہے؟ کیا اسرار ہے؟ ان ذلیل لوگوں کا کیا منصوبہ ہے؟ میں اپنی بے بسی پر اندر ہی اندر کڑھ رہا تھا۔ آج سکندر اعظم مجبور ہو گیا تھا اور ان خون آشام بھیڑیوں کے ہاتھوں کھلوانا بن گیا تھا۔ اگر میں صرف چلنے پھرنے کے قابل بھی ہوتا تو ان خبیثوں کے چنگل سے کسی نہ کسی طرح نکل جاتا۔

کافی دیر تک میں انہی خیالوں میں الجھا رہا پھر نہ جانے کب مجھے نیند آ گئی۔

نیند سے میں اس احساس کے ساتھ جاگا کہ کوئی آہستہ آہستہ میرا شانہ ہلا رہا ہے اور ایک کھٹکتی ہوئی آواز میرے کانوں میں رس گھول رہی ہے۔ ”کرئل... کرئل جاگو، دیکھو صبح ہو گئی ہے۔ کب تک سوتے رہو گے دو دن سے تو سو رہے ہو۔“

ایک دم میری آنکھ کھل گئی۔ ایک عورت مجھ پر جھکی ہوئی تھی۔ مجھ سے نظریں چار ہوتے ہی وہ سیدھی ہو کر کھڑی ہو گئی۔ اس بد معاش نے شاید اسی عورت کو حور ثانی قرار دیا تھا اور جو مجھ سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ اسے دیکھ کر اندازہ ہوا کہ اس بد معاش نے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ واقعی بہت حسین تھی، قدرت نے اسے بے مثال حسن سے نوازا تھا۔ اس کے چہرے میں بے پناہ دلکشی کا سبب اس کے نقوش میں غیر معمولی ٹیکھا پن تھا۔ ایسے خدا خال والا چہرہ میں نے شاید ہی دیکھا تھا۔ چھوٹی سی پیاری سی ناک جس میں لونگ دک رہا تھا۔ بھرے بھرے سرخ گداز ہوٹ خون سے تر محسوس ہو رہے تھے۔ لیکن یہ لب لعل کا کمال نہیں تھا۔ اس کے ہونٹوں کی یہ رنگت قدرتی تھی۔ اور اس کے چہرے کی جلد آئینے کی طرح شفاف تھی... چہرے کے علاوہ وہ پوری کی پوری ایک خوبصورت شعر کی مانند تھی۔ سوزوں اور متناسب اعضا کی مالک، اس کا حسن تنقید سے ماورا اور تعریف سے بے نیاز لگتا تھا۔ بس دیکھتے رہو اور مرعوب ہوتے رہو۔ وہ تیس برس کی ایک مکمل اور بھرپور عورت تھی۔ کسی پرانی شراب کی مانند جس کا شمار ذہن و دل سے نہیں اترتا۔ وہ بکھی رنگ کی سوتی ساڑھی اور اسی رنگ کا بلاؤز پہنے ہوئے تھی۔ ایک لمحے کے لیے میرا جی چاہا کہ اپنی شخصیت کے بارے میں اس کی غلط فہمی سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اور اپنا ذہن و دل اس کے تصرف میں دے دیا جائے مگر پھر مجھے اس کی وہ گھٹاؤنی شخصیت یاد آ گئی جس سے میں اس کی بے خبری میں آگاہ ہو چکا تھا۔

”کرئل میں وہی ہوں، تم اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیوں دیکھ رہے ہو!“ اس نے شوفی سے کہا۔ میں چونک کر خیالوں کی دنیا سے نکل آیا۔ اس نے مجھے اس طرح مخاطب کیا تھا جیسے اس سے میرا کوئی بہت پرانا اور گہرا رشتہ ہے۔ میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اور پچھنی پچھنی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔ میری قوت گویائی سلب ہو چکی تھی۔ یہ حسینہ میرے لیے کسی عذاب سے کم نہیں تھی... وہ میرے لیے ایک ایسی مصیبت بننے والی تھی جس سے چھٹکارہ پانا ناممکن تھا۔ میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر اس نے پوچھا ”اب تمہاری طبیعت کیسی ہے کرئل؟ زخموں سے تیسیس تو نہیں اٹھ رہی ہیں؟“

میں بدستور خاموش رہا۔ دراصل میں اسے یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ میرا دماغ اور میری زبان میرا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ اس خاموشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں ذہنی طور پر بے حد مصروف تھا اور کوئی تدبیر سوچ رہا تھا۔

”میں تمہارے لیے ناشتہ لے کر آتی ہوں۔“ وہ بڑے دلکش انداز میں مسکرائی۔ ”تم نے کئی دنوں سے کھانا نہیں کھایا ہے۔ بس چند رہ منٹ اور انتظار کر لو۔“

اس بار اس نے میرے جواب کا انتظار نہیں کیا اور ایڑیوں پر گھوم گئی۔ پھر دروازے کی طرف بڑھی۔ وہ ایک صحت مند اور توانا عورت تھی۔ اس کے چلنے سے ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے لباس کی شکنوں پر بجلیاں کوند رہی ہوں۔ میں چاہتے ہوئے بھی اس کے سراپے سے نظریں نہیں ہٹا سکا۔ وہ کمرے سے نکل گئی تو میں سوچنے لگا کہ ایسی حسین عورت اتنے گھٹاؤنے عزائم کیوں رکھتی ہے۔ آخر اسے کیا ملے گا۔ وہ یہ سب کچھ کیوں کرنا چاہتی ہے؟ کوئی چند رہ منٹ بعد ایک نوجوان لڑکی ٹرے میں ناشتہ سجائے اس عورت کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ شکل و صورت سے چینی لڑکیوں جیسی تھی مگر چینی نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں سے شوفی جھلک رہی تھی۔ اور ہونٹوں پر معنی خیز تبسم تھا۔ پلنگ کے پاس والی میز پر ٹرے رکھتے ہوئے کن انکھوں سے اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرا دی۔ جب وہ ٹرے رکھ چکی تو اس عورت نے کہا۔ ”جلدی سے گرم گرم بنا کر لے آؤ۔ کرئم کافی۔“

وہ لڑکی کسی شلخ کی طرح لبراتی ہوئی چلی گئی تو اس عورت کی نظر میری بڑی ہوئی پوٹلی پر پڑی جو میرے اغوا کنندگان میرے ساتھ ہی اٹھا کر لائے تھے۔ اس نے پوٹلی کو اٹھا کر کھولا، ایک لمحے میں اس نے اندر کی چیزوں کا جائزہ لیا۔ پھر اس میں سے سگریٹ اور لائٹرننگل کر میز پر رکھ دیا۔ وہ پوٹلی کا منہ بند کرتی ہوئی مجھ سے بولی کہ ”میں یہ پوٹلی الماری میں رکھ رہی ہوں تمہیں ان میں سے کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھ سے مانگ لینا۔“ وہ اٹھ کر میری پوٹلی اس کمرے کی دیوار میں نصب الماری میں رکھنے لگی۔ الماری کا اندرونی منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ الماری کافی بڑی تھی۔ وہ حرائد ملبوسات سے بھری ہوئی تھی۔ ڈیگروں میں فوجی وردیوں کے علاوہ نفیس اور قیمتی سوٹ لگے ہوئے تھے۔ اس نے الماری کا خفیہ خانہ کھول کر پوٹلی اس میں رکھ دی پھر واپس آکر پلنگ پر میرے قریب بیٹھ گئی۔ اس نے ٹرے کو اپنے قریب کیا اور بیسکن کو اپنی گود میں پھیلا لیا پھر ٹرے میں سے نوٹ کیا ہوا سلاٹس اٹھا کر اس پر کھن لگاتے ہوئے بولی۔ ”میں تمہارے لیے ناشتہ میں سلاٹس، انڈے اور چوزے کا سوپ لے کر آتی ہوں۔ خوب ڈنٹ کرنا۔ جیسی تمہاری کمزوری دور ہوگی۔“

میں نے تو چپ کار روزہ رکھا ہوا تھا اور پھر یہ بات کوئی ایسی نہیں تھی جس کا جواب ضروری ہوتا۔ وہ دوسرے سلاٹس پر کھن لگاتے ہوئے اپنی دو میں کستی رہی۔ ”دوسرے کو میں تمہیں بکمرے کے پائے کی نیچنی بنا کر پلاؤں گی۔ کیا تم اس کے ساتھ پرائیوٹ کھانا پسند کرو گے؟“

میں خاموشی سے اس کے حسین چہرے اور گداز سراپے کو تنکا رہا۔ اس کا حسن و جمال میرے خوف پر غالب آ رہا تھا۔ اس نے میری مسلسل خاموشی سے آگاہ کر پوچھا۔ ”تم خود سے اٹھ کر بیٹھ سکتے ہو یا مجھے سارا دے کر بیٹھنا ہو گا۔“

میں نے اس کی جھیل سی گہری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پہلی بار زبان کھولی۔ ”نہیں! مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ خود اٹھ کر بیٹھ سکوں۔“

”خدا کا شکر ہے تم بولے تو سہی۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”میں تو سمجھ رہی تھی کہ تم قوت گویائی سے محروم ہو چکے ہو۔“

”تم نے مجھے بولنے کا موقع ہی کب دیا ہے؟“ میں نے غصے سے کہا۔

”اچھا! اس نے سلائس ٹرے میں رکھ کر زیب کن سے ہاتھ صاف کیے۔“ ”چلو! میں تمہیں سارا دے کر بٹھاتی ہوں۔“ وہ پلنگ سے اتر کر کھڑی ہوئی تو ایک دم سے ٹھک گئی۔ ”یہ تم مجھے اس طرح گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہو جیسے میں...“ اس کے حسین چہرے پر گہرا استعجاب بکھ گیا تھا۔

”تم کون ہو؟ میں تمہیں نہیں جانتا۔“ میں نے اپنے شک ہو تلوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

”میں کون ہوں؟“ اس نے اپنے سینے پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ پھر ایک شوخ مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”میں تمہاری ہونے والی...“

”لیکن مجھے تم سے کوئی سروکار نہیں ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے تیز دند لہجے میں کہا۔ ”میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ میں کہاں ہوں؟ مجھے یہاں کون لایا ہے؟ میرے ساتھ کیا ہوا ہے؟“

”کیا واقعی تم مجھے نہیں پہچان پارہے؟“ اس کے چہرے پر یقین کی شہیدگی چھا گئی۔

”نہیں۔“ میں نے بھلاہٹ سے کہا۔ ”میں اپنی زندگی میں پہلی بار تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ اسی لیے تم سے پوچھ رہا ہوں کہ تم کون ہو؟ مجھے اس حالت میں کہاں سے لایا گیا ہے اور اس کا ذمہ دار کون ہے؟“

”تمہیں کیا ہو گیا ہے جان من!“ اس نے حیرت زدہ ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ ”تم آخر مجھے کیوں نہیں پہچان رہے ہو؟“

”تم مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہی ہو۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔

”بے وقوف تو تم بن رہے ہو۔ تم مجھے پہچاننے سے انکاری ہو۔“ اس کے لہجے کی حیرت برقرار تھی۔ ”کیا یہ پاگل پن نہیں ہے!“

”میرا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں تمہیں صرف اتنا جان سکا ہوں کہ تم ایک مکار اور گھٹنونی عورت ہو۔“ میں نے نفرت انگیز لہجے میں کہا۔

”اوہ میرے خدا!“ وہ اپنے کھلے منہ پر ہاتھ رکھ کر ایک قدم پیچھے ہٹی۔ ”لگتا ہے کہ تمہارے حواس ابھی بحال نہیں ہوئے ہیں۔ میں تمہاری بچپن کی ساتھی اور سنگیتر ہوں۔ تم میرے ہونے والے شوہر ہو۔ ہم دونوں شادی کی شاپنگ کر کے آرہے تھے کہ راستے میں جیب الٹ گئی۔ میں نے تمہیں حد سے زیادہ پیسے سے منع کیا تھا، مگر تم نے میری ایک نہیں مانی۔ اس حادثے میں، میں جزائی طور پر بیچ گئی اور تم شدید زخمی ہو گئے۔ میں تمہیں ہسپتال لے جانے کی بجائے گھر لے آئی، اس خیال سے کہ ہسپتال میں بہتر نگہداشت نہ ہو سکے گی۔“ وہ سانس لینے کے لیے

رکی تو میں نے جواب میں کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا۔ ”مجھ سے زیادہ

تمہارا خیال کون رکھ سکتا ہے۔ دیکھو تاہم دو راتوں سے برابر جاگ رہی ہوں۔ ایک پل کے لیے بھی نہیں سوئی ہوں۔“

”مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ عورت جس قدر حسین ہے، اتنی ہی عیار اور مکار بھی ہے۔ میں اس کی باتیں سن کر بھڑک اٹھا۔“ ”تم جھوٹ بول رہی ہو۔ نہ تم میری بچپن کی ساتھی اور نہ ہی سنگیتر! تم دھوکے باز ہو، مجھے اغوا کر کے لائی ہو۔“

”سر میں شدید ضربیں لگنے سے تمہارے دماغ پر اثر پڑا ہے۔“ وہ پرتشویش انداز سے بولی۔ ”کیا تم جانتے ہو کہ تم کون ہو؟“

”میں اپنے بارے میں نہیں جانتا! تم مجھے بالکل سمجھ رہی ہو کیا؟“

”ہیہ نہیں...“ وہ عجیب انداز سے بولی۔ ”لیکن اگر تم اسی طرح ہنسی ہنسی باتیں کرتے رہے تو میں صدمے سے ضرور پاگل ہو جاؤں گی۔“

”تم کیا پاگل ہو گی۔“ میں نے زہر خند سے کہا۔ ”تم مجھے پاگل بنانے کی سازش کر رہی ہو مگر میں تمہاری ہٹاک سازش کا مایاب نہیں ہونے دوں گا۔“

”اچھا تو... یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟ تمہارا نام کیا ہے۔ اور تمہیں کون سا حادثہ پیش آیا تھا؟“ وہ منہ پر آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔

اس کی بات پر اچانک میرے ذہن میں ایک تدبیر پیدا ہوئی... کیوں نہ میں بھی اسے دھوکا دوں۔ بالکل اسی طرح جیسے یہ مجھے دھوکا دینا چاہتی ہے۔ یہ میرے حق میں بہتر ثابت ہو گا۔ اس سے بہتر اداکاری تو میں بھی کر سکتا تھا۔ اگر اس موقع پر میں اپنی اصلیت ظاہر کر دیتا تو اگلے دن ظہیر رحمان نامی شخص آکر مجھے میری یادداشت سے محروم کر دیتا۔ میں نے سوچا کیوں نہ اس کی نوبت ہی نہ آنے دوں۔ میں اس عورت اور اس کے ساتھیوں پر یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ میں اپنی یادداشت کھو چکا ہوں۔ اس طرح میں ظہیر رحمان کا تختہ مشق بننے سے بچ سکتا تھا اور اسی میں میری بہتری بھی تھی۔

میں اپنے ذہن پر زور دے کر چند لمحے سوچتا رہا اور بولا۔ ”میرا نام... میں... میں تو خود ہوں۔ مجھے نام کی کیا ضرورت ہے بھلا؟ میرا نام... میرا کوئی نام نہیں ہے۔“

”اوہ... کیا واقعی؟“ وہ شدید حیران ہو کر بولی۔ ”کیا واقعی تمہیں اپنا نام بالکل یاد نہیں آ رہا ہے... پلیز! ایک بار پھر ذہن پر زور دے کر سوچو! آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ میں نے محسوس کیا کہ کسی خاص جذبے کے تحت اس کی سانسیں بہت تیز ہو گئی تھیں۔ غالباً ”میری یادداشت کھو جانے پر وہ بھلائی کیفیت سے دوچار ہو رہی تھی۔“

میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور سوچنے کی اداکاری کرنے لگا۔ چند لمحوں بعد میں نے کہا۔ ”مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا۔ شاید میرا کوئی نام ہو گا ہی نہیں۔“

میں نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی حسین آنکھیں اس کے دل کی غمازی کر رہی تھیں۔ یہ یادداشت سے میری محرومی پر بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ میرے سر سے ایک بوجھ اتر گیا تھا۔ میری تدبیر کامیاب رہی تھی۔ ظہیر رحمان جو مجھے یادداشت سے محروم کرنے آ رہا تھا، اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اور اس طرح میری جان بچ گئی تھی۔

”تمہیں اپنا نام تک یاد نہیں آ رہا حیرت ہے۔“ وہ بولی۔ ”ایسا تو یادداشت کھو جانے کی صورت میں ہوتا



بچے کمرے ہی میں بٹھانا اور مت جانے دینا۔ ان سے کہنا کہ وہ میرے واپس آنے کا انتظار کریں۔ ان دونوں کو کافی بنا کر دے دینا۔

ایک لمحے کے لیے میرے دل میں ایک آوارہ سا خیال آیا تھا کہ میں کمرے کی دہلیز کے پاس کھڑے ہو کر دروازے کی جھری سے جھانک کر اندر دیکھوں، پھر سوچا کہ سرگم نے مجھے کھڑے دیکھ لیا تو کچھ جانے گی کہ میں یادداشت کھو جانے کا ڈھونگ کر رہا ہوں۔ فرار کی راہیں تلاش کر رہا ہوں۔ میں اسے کسی بھی قسم کے شک و شبہ سے کامو ق دے کر اپنے پیروں پر خود کھلاڑی مارنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اس وقت مہربان اور تحمل کی ضرورت تھی۔ اس دن تک انتظار کرنا تھا جب تک میرے زخم مندمل نہ ہو جاتے اور میں چلنے پھرنے کے قابل نہ ہو جاؤں۔ پھر مجھے فرار ہونے کا منصوبہ بھی بنانا تھا۔ یہ ممکن شاید کسی جزیرے یا نیلے پر واقع تھا۔ بغیر موٹر بوٹ کے میں یہاں سے فرار نہیں ہو سکتا تھا۔

مجھے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا دشوار ہو رہا تھا۔ میں واپسی کے لیے گھوما۔ پلنگ کی جانب بڑھا تو میرے پیر من من کے بھاری ہو رہے تھے۔ چند قدموں کا فاصلہ میلوں کا فاصلہ محسوس ہو رہا تھا۔ دیوار بھی دور لگ رہی تھی۔ ورنہ آگے بڑھ کر اس کا سارا لے لیتا۔ میں کمرے کے وسط میں تھا۔ میں پلنگ کی جانب اس طرح بڑھا جیسے میں کوئی بچہ ہوں اور چلنے کی مشق کر رہا ہوں۔ ابھی میں بست کمزور تھا۔ میں نے چند قدم طے کیے ہوں گے کہ کسی شرابی کی مانند لڑکھلائی۔ میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ میں فرش پر گر رہا تھا۔ کہ اچانک ہی عقب سے مجھے نرم و نازک ہاتھوں نے مضبوطی سے تھام لیا۔ مجھے بجلی کا سا سنسان دینے والا جھٹکا لگا۔ بجلی کی روئس نس میں اترتی چلی گئی۔ دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ آخر میں رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سرگم چوروں کی طرح میری آزمائش کرنے کے لیے اچانک کمرے میں آجائے گی اور اس نے غیر محسوس انداز میں میری حرکات و سکنات پر نظر رکھی ہوئی ہے۔ وہ شاید ننگے پاؤں آئی تھی۔ اسی لیے زینے پر اس کے قدموں کی آہٹ محسوس نہیں ہوئی تھی۔ میں نے خوف، شرمندگی اور فحاشات سے پلٹ کر دیکھا تو اچھل سا پڑا۔ وہ سرگم نہیں سونیا تھی۔ اس کے ہنسنے جیسے گلابی گلابی ہونٹوں کے گوشوں میں دل کش مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور آنکھوں میں معنی خیز چمک تھی۔ وہ مجھے سارا دے کر پلنگ تک لائی۔ جب میں بستر پر لیٹا تو شدید سردی کے باوجود پسینے سے بدن بھیک رہا تھا۔ سونیا نے کچھ زیادہ ہی بے تکلفی اور اپنائیت کا ثبوت دیا تھا۔ وہ خادمہ نہیں بلکہ گھر کی فرد محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے دوپٹے میں میری پیشانی اور چہرے پر ابھرے ہوئے پسینے کے قطروں کو جذب کیا اور سرگوشی میں بولی۔ ”گھبرائیے نہیں۔ میں بیگم صاحبہ سے کچھ نہیں کہوں گی۔“

میں چونک پڑا اور حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے جیسے علم ہو چکا تھا کہ میں دروازے کے پیچھے کھڑا ان کی باتیں سنتا رہا ہوں۔ اس کا لہجہ بڑا نفیس اور شائستہ تھا۔ اس نے جس انداز سے یہ بات کہی تھی، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ وہ نوکرائی بالکل نہیں لگتی تھی۔ میں نے پہلے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ جب وہ پہلی دفعہ کمرے میں آئی تھی تو اسے دیکھنے کی خواہش اس لیے پیدا ہوئی تھی کہ وہ نوجوان اور پر شباب تھی۔ اس کے چہرے کے جاذب نظر نقش و نگار بے اختیار اپنی طرف کھینچتے تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ اس قدر سمجھدار بھی ہے اور حالات پر اتنی گہری نظر بھی رکھتی ہے۔

دھتّا ”میرے دل میں ایک خیال آیا کہ شاید اسے میرے بارے میں معلومات ہوں گی، کیوں نہ اسے اعتماد میں لے کر معلومات حاصل کروں۔ شاید وہ میری حالت پر ترس کھاتے ہوئے مجھے ساری باتیں بتا دے۔ میں نے سوچا

ہے۔ اب! کیا تمہاری یادداشت کھو چکی ہے؟“ اس نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

”یادداشت... ہاں، میرا کوئی نہ کوئی نام تو ہونا چاہئے۔“ میں نے گھبرا کر کہا۔ ”اب کیا ہو گا! میں کیا کروں؟“

وہ چند لمحے میری آنکھوں میں دیکھتی رہی، پھر میرے قریب ہی پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے نرم و نازک ہاتھوں میں لے لیا اور مجھے تسلی دیتے ہوئے بولی۔ ”گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ممکن ہے، وقتی طور پر تمہیں یاد نہ آ رہا ہو اور تھوڑی دیر بعد تمہاری یادداشت ٹھیک ٹھاک ہو جائے۔“

”اگر میری یادداشت واپس نہیں آئی تو کیا ہو گا؟“ میں نے خوف زدہ لمحے میں پوچھا۔

”اگر ایسا ہوا تو میں تفصیل سے تمہیں تمہارے بارے میں بتا دوں گی۔ میرا خیال ہے، کچھ باتیں جاننے کے بعد تمہاری یادداشت خود بخود کام کرنے لگے گی۔“

اس نے مجھے سارا دے کر بٹھایا پھر بڑی اپنائیت اور محبت سے مجھے ناشتہ کرانے لگی۔ جب میں ناشتہ ختم کر چکا تو نوجوان خادمہ کافی لے آئی۔ خوب سیر ہو کر ناشتہ کرنے سے مجھ میں توانائی آگئی تھی کہ میں خود بخور سے کافی پی سکتا۔ گرم گرم کافی پینے سے میں خود کو بہتر محسوس کرنے لگا۔ سردی کا احساس یکھٹ زائل ہو گیا تھا۔

جب میں کافی پی چکا تو وہ بولی۔ ”میں نہانے جا رہی ہوں پھر ناشتہ کرنے کے بعد دوبارہ تمہارے پاس آؤں گی۔ میں صبح سے تمہاری فکر میں لگی رہی تھی۔“

”تو تم مجھے میرے بارے میں نہیں بتاؤ گی؟“ میں نے پوچھا۔ ”تمہاری واپسی تک میں ایک اذیت میں مبتلا رہوں گا۔“

”اس میں اذیت کی کیا بات ہے۔ تم اتنی دیر میں اطمینان سے اپنے بارے میں سوچو۔ شاید تمہیں یاد آ جائے۔“ وہ برتن نرے میں رکھتے ہوئے بولی۔ ”ظہیر ریحان ایک نرس اور دوایاں ساتھ لے کر آ رہا ہے۔ نرس تمہاری چیٹیاں بدل دے گی اور مرہم لگا دے گی۔“ اس نے توقف کر کے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے آواز دی۔ ”سونیا! ادھر آؤ۔ آکر برتن لے جاؤ۔“

دوسرے لمحے سونیا تیزی سے آئی اور برتن اٹھا کر لے گئی۔ وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے جانے لگی تو دھتّا ”مجھے خیال آیا کہ اس عورت نے مجھے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔ اس حسین بلا کا نام جاننے کی غرض سے میں نے اسے آواز دی۔“ ”ذرا سناؤ۔“

اس نے رک کر میری طرف دیکھا۔ ”کسی چیز کی ضرورت ہے کیا؟“ اس نے پوچھا۔

”میں تمہارا نام پوچھنا چاہ رہا تھا۔ میں تمہارا نام بھی بھول گیا ہوں۔“

”میرا نام؟“ وہ ہنسی تو کمرے میں جیسے جل ترنگ بیجے۔ ”میرا نام سرگم ہے۔ تم مجھے پیار سے سرگم کہہ کر پکارتے ہو۔ مگر تم شاید اپنی یادداشت کے ساتھ ساتھ اپنی سرگم بھی بھول چکے ہو۔ خیر کوئی بات نہیں۔ سر پھر یاد آجائے گی۔ تمہارے من میں گونجتے لگے گی۔“

جب وہ چلی گئی تو میں چند لمحے تک بے حس و حرکت سا بیٹھا رہا۔ میں نے دروازے کی طرف دیکھا، وہ پوری طرح بند نہیں ہوا تھا۔ نیچے سے سرگم کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ شاید اپنی خادمہ سے کچھ کہہ رہی تھی۔ میرے دل میں اشتیاق پیدا ہوا کہ ان کی باتیں سنوں۔ میں اپنے تجسس پر قابو نہیں پاسکا اور پلنگ سے اتر پڑا۔ فرش پر قدم رکھا تو پہلے جیسی کمزوری محسوس نہیں ہوئی۔ اب میں بغیر کسی تکلیف اور سہارے کے چل سکتا تھا۔ میں دروازے کے پاس پہنچا تو مجھے سرگم کی آواز سنائی دی۔ ”اور ہاں، اگر ظہیر ریحان صاحب اور نرس آئے تو، نہیں

کہ اتنی جلد بازی کی کیا ضرورت ہے۔ ذرا صبر سے کام لوں۔ آج نہیں تو کل اس سے یہ باتیں اگلائی جاسکتیں تھیں۔

وہ کمرے کی صفائی اور بھاڑ پونچھ میں مصروف ہو گئی۔ مگر میری نگاہیں بدستور اسے اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھیں۔ اس کا قد درمیانہ تھا۔ معمولی لباس میں بھی اس کا حسن پھوٹا پڑ رہا تھا۔ وہ جب تک کمرے میں مصروف رہی، مجھے کسی ترو تازہ پھول کی طرح مشکئی محسوس ہوتی رہی۔ جب بھی میری نظریں اس سے چارہ تو میں یا وہ میری نظروں کی چوری پکڑ لیتی تو بے اختیار مسکرا دیتی۔ مجھے اس کی ہر نگاہ معنی خیز لگتی تھی۔ اس نے کمرے سے نکلنے سے پہلے پوچھا۔ ”سردی آج بہت زیادہ ہے، کہتے تو آپ کے لیے گرم گرم کافیا بنا کے لاؤں۔“

”کچھ دیر پہلے ہی تو کافی پی چکا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ہاں کچھ دیر بعد مل جائے تو پی لوں گا۔“

”کافی کچھ دیر بعد ہی مل سکے گی۔“ وہ بولی۔ ”اس لیے کہ صفائی کا کچھ کام باقی ہے۔“

”جب دل چاہے بنا کر لیتی آتا۔ میں تمہارے ہاتھوں کی بنی کافی کا انتظار کروں گا۔“

وہ میرے جھٹے کی معنی خیزی محسوس کر کے مسکرا دی۔ ”آپ دوپہر کے کھانے میں کیا پسند فرمائیں گے؟“

”جو مل جائے گا اسی کو من و سلوی سمجھ کر کھا لوں گا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مریض کی سستا کون ہے اسے تو پرہیز کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔“

”آپ کے ساتھ ایسا نہیں ہو گا۔ میں آپ کو آپ کی پسند کی چیز چوری سے پکا کر کھاؤں گی۔“ وہ آہستہ سے بولی۔ ”بتائیے آپ کیا کھانا پسند کریں گے؟“

”بس تم جو بھی کھلا دو وہ منظور ہے۔“ میں شوخی سے بولا اور اس کا چہرہ نکلنے لگا۔

”آپ کرمل صاحب ہیں نا؟“ وہ تنکی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

یکبارگی میرا دل دھڑک اٹھا۔ اس کے لیے میں ایسا اثر تھا جیسے وہ میرے کرمل ہونے کے بارے میں مشکوک ہو۔ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں میرے کرمل ہونے پر شک ہے یا کرمل تمہیں اچھے نہیں لگتے؟“

”نہیں...“ وہ بولی۔ ”میں آپ کو جانتی نہیں تھی نا۔ اب تو یہ گھر آپ ہی کا ہے اور آپ ہی کا حکم چلے گا یہاں۔“

”میں تو صرف تم ہی پر حکم چلاؤں گا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بندی آپ کا ہر حکم بجالاے گی۔“ وہ میرے پٹنگ کے پاس آ کر رکی اور سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔ ”کرمل صاحب! میں کمرے کا دروازہ کھلا چھوڑ کر جا رہی ہوں حالاں کہ بیگم صاحبہ کی تاکید ہے کہ دروازہ بند کر آؤں۔ دروازہ کھلا رہنے سے آپ پٹنگ پر بیٹھے بیٹھے نیچے باتیں کرنے کی آوازیں سن سکتے ہیں۔ اب آپ کو دروازے تک جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“

سونیا چلی گئی۔ اس سے باتیں کرتے ہوئے مجھے بہت اچھا لگا تھا مگر جانتے جانتے وہ جو بات جس انداز سے کہہ گئی تھی اس نے مجھے چونکا دیا تھا۔ سونیا مجھے کسی معے کی طرح لگ رہی تھی اس معے کو حل کرنے کے لیے کچھ وقت درکار تھا۔ میں نے سوچا کہ جب وہ کافی بنا کر لائے گی تب اسے ٹول کر دیکھوں گا۔

چند لمحوں کے بعد سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا۔ میں نے ابھی دو تین کش لیے تھے کہ... دور سے موٹر بوٹ کے انجن کا شور سنائی دیا۔ پھر لمحہ بہ لمحہ وہ شور قریب ہوتا گیا۔ شاید اس موٹر بوٹ میں ظمیر رحمان اور نرس آ رہی تھی۔ سرگرم کو میں نے خادمہ سے کہتے سنا تھا کہ وہ دونوں آنے والے ہیں۔ موٹر بوٹ گھر کے قریب آ

کر رک گئی۔

کوئی دس منٹ بعد وہ تینوں اوپر آئے۔ نرس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا بکس تھا۔ نرس اوجھڑ عری صحت مند اور توانا تھی۔ ظمیر رحمان کو میں نے دیکھا تو میرے دل میں نفرت کی شدید لہر اٹھی۔ اگرچہ وہ شرفانہ لباس میں تھا مگر چہرے مرے سے ایک کینہ صفت محض دکھائی دے رہا تھا۔ چالیس اور خوشامد پسند آدمی نظر آ رہا تھا۔ اس کی سبز آنکھوں سے عیاری نپک رہی تھی۔ اس نے میرے بستر کے قریب آ کر مجھے بڑے پتاک سے سلام کیا اور پوچھا۔ ”کرمل کیسے ہو؟“

”ٹھیک ہوں۔“ میں نے اسے جواب دے کر پر خیال نظروں سے سرگم کی طرف دیکھا تو اس نے آگے بڑھ کر مجھ سے کہا۔ ”یہ مسٹر ظمیر رحمان ہیں، ایسٹ ویسٹ لاپز ریور سکیم کے چیئرمین۔“

ظمیر رحمان نے چونک کر سرگم کی طرف دیکھا تو اس نے مجھ سے اپنی نظریں چرکے آنکھوں سے ظمیر رحمان کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر بھی ظمیر رحمان کی حیرانی کم نہیں ہوئی۔ وہ کبھی میری طرف دیکھا، کبھی سرگم کی طرف۔ نرس بڑی ماہر اور تجربہ کار معلوم ہوتی تھی۔ اس نے بڑی احتیاط اور کسی قدر تیزی سے میرے بدن اور سر سے بنائیں کھولیں۔ اس اثنا میں سونیا ایک بڑی ڈش میں پانی گرم کر کے لے آئی تھی۔ نرس نے اس گرم پانی میں اینٹی سپٹنگ محلول ملا دیا۔ روٹی کی مدد سے میرے زخم صاف کیے، پھر اس نے اپنے بکس سے اینجری کی بوتل نکال کر اس سے بھی میرے زخموں کی اچھی طرح صفائی کی۔ زخموں پر مرہم لگایا۔ پھر بنی بنیاں باندھیں۔ اس دوران سرگم سونیا اور ظمیر رحمان بھی کمرے میں موجود رہے۔ نرس نے مرہم پنی کرنے کے بعد مجھے التجاشن لگایا۔ پھر وہ تینوں کمرے سے نکل گئے آخر میں سونیا وہ ڈش اور ڈسٹ بن اٹھا کر لے گئی۔ جس میں میرے جسم سے اتاری ہوئی بنیاں پڑی تھیں۔ بنیاں بدلنے سے میں خود کو بڑھال سا محسوس کر رہا تھا۔

کوئی دس پندرہ منٹ بعد سونیا میرے لیے گرم گرم کرم کرم کافیا بنا کے لائی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”باقی لوگ اس وقت کہاں ہیں؟“

”نرس کافی پی رہی ہے، وہ کافی پی کر چلی جائے گی۔“ سونیا نے بتایا۔ ”البتہ مسٹر ظمیر رحمان رکیں گے۔ بیگم صاحبہ نے ان کے لیے بھی بیج تیار کرنے کے لیے کہا ہے۔ آپ کو کچھ سے کوئی کام ہو اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو آدھے گھنٹے کے بعد گھنٹی بجاکر بلا لیں۔“

”آدھے گھنٹے بعد کیوں؟ کیا تم کسی کام سے باہر جا رہی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے میری بات کا فوری جواب نہیں دیا بلکہ بڑے پراسرار انداز سے دروازے تک گئی اور زینے پر بھانک کر اٹھ قدموں واپس آئی، پھر بڑی آہستگی سے بولی۔ ”بیگم صاحبہ کے حکم کے مطابق میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔ وہ وہ دونوں باتیں کرنے کے لیے تھائی چاہتے ہیں۔“

سونیا چلی گئی۔ میں کافی پیچے ہوئے سوچے لگا کہ اتنے بڑے گھر میں راز کی بات کرنے کے لیے جگہ اور کمروں کی کیا کمی ہوگی بڑے تعجب کی بات تھی۔ سرگم شاید ضرورت سے زیادہ احتیاط برت رہی تھی۔ اس لیے وہ سونیا کو سروٹ کو ارنڈز میں بھیج رہی تھی۔ ایسی کوئی اہم بات تھی کہ وہ کسی قسم کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھی۔ میں نے دفعتاً ”موٹر بوٹ کے شمارت ہونے کی آواز سنی۔ شاید نرس واپس جا رہی تھی۔

... میں نے کافی پی کر ایسا محسوس کیا کہ میرے بدن میں نئی جان آگئی ہے۔ میں پٹنگ سے اتر کر دروازے کی جانب بڑھا تو اپنے آپ کو پیسے کی نسبت کسی قدر ہلکا چھلکا محسوس کر رہا تھا۔ دروازہ کھڑا ہوا تھا میں دیوار کے سارے

کھڑا ہو گیا۔ اپنا ایک ہر آہنگی سے دروازے کی طرف بڑھا کر انگوٹھے سے ہٹایا تو جھری پیدا ہو گئی۔ اب سرگم کی آواز صاف سنائی دی۔ جیسے وہ میرے عقب میں کھڑی باتیں کر رہی ہو۔ ”ظہیر راج پوچھو تو ہمیں ایک درد دہری سے نجات مل گئی ہے۔ وہ پوری طرح یادداشت کھو چکا ہے۔“

”میں پوری تیاری کر کے آیا تھا، چلو میرا کام ہلکا ہو گیا۔“ ظہیر راج نے پوچھا۔ ”لیکن تم حالات سے مطمئن تو ہو نا؟“

”حالات ہمارے حق میں جارہے ہیں۔ اب ہمیں دوسرے مرحلے کا آغاز کرنا ہے۔“

اس مرحلے کا آغاز بھی ہو جائے گا۔ جس کے لیے تم بہت بے چین اور بے حد مضطرب ہو۔ میں تین دن کے بعد ایک چھوٹی سی بارات مع قاضی کے لے کر پہنچ رہا ہوں۔ اس دن تمہارا نکاح کرلے سے بڑھا دیا جائے گا۔“

ظہیر راج بولا۔

”مگر ظہیر!“ سرگم کی آواز ایک دم سے بجھ ہی گئی۔ ”معلوم نہیں کیوں ایک خوف ساداسن گیر ہے۔“

”کیا خوف ہے بے لی!“ ظہیر راج چکا۔ ”تم اور خوف تو کبھی یکجا نہیں ہو سکے۔“

”کیسں ایسا تو نہیں کہ کسی حادثے کے نتیجے میں اس کی یادداشت واپس آجائے جیسا کہ فلموں اور ناولوں میں ہوتا ہے۔“

”اوہ، نہیں۔“ ظہیر راج قہقہہ مار کر بولا۔ ”جب کسی کی یادداشت حادثاتی طور پر چلی جاتی ہے تو ہمیشہ کے لیے ہی چلی جاتی ہے۔ فلموں میں تماش بینوں کو خوش کرنے کے لیے مبالغے سے کام لیا جاتا ہے۔“

”ٹھیک ہونے کے بعد وہ نہ جانے کس قسم کا شخص ثابت ہو گا۔ کیسں وہ خلاف توقع ہی نہ ثابت ہو؟“

”تم ابھی سے ان باتوں کی فکر کرنے لگ گئیں۔“ ظہیر راج کہنے لگا۔ ”تمہارا کام یہ ہو گا کہ شادی کے بعد اسے اپنی ٹھنی میں اس طرح دبا لو کہ وہ کسی پالتو کے کی طرح تمہارے پیچھے دم ہلاتا پھرے۔ جب وہ پوری طرح قابو میں آگیا تو سمجھو۔ دوسرے مرحلے چکی بجائے ہی حل ہو جائیں گے۔“

”کیا ایک مرد میرا اس طرح اسیر بن سکتا ہے کہ وہ کھپتی بن کر رہ جائے؟“

”کیوں نہیں۔“ ظہیر راج کا لہجہ معنی خیز تھا۔ ”یہ ساری باتیں تم کہہ رہی ہو۔ تم تو کسی طرح مانتا ہری سے کم نہیں ہو۔“

”مجھے اپنی ذات، اپنے حسن و شباب اور اپنی جسمانی کشش پر بڑا اعتماد ہے۔ مگر بعض اوقات دل کے کسی کونے میں اندھیرا سا محسوس ہوتا ہے۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو، یہ شکارچ کر کہاں جائے گا۔ یہاں چارے کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ہاں تم بتاؤ۔“ وہ تھوڑی دیر توقف کرنے کے بعد بولی۔ ”جو کام تمہارے ذمے لگایا گیا تھا، وہ کیا رہا۔ کوئی دشواری تو پیش نہیں آ رہی ہے۔“

”وہ کام اس قدر آسان نہیں، لیکن مجھے اس کی تکمیل میں کوئی دشواری اس لیے پیش نہیں آ رہی کہ میری راہنمائی کی جارہی ہے۔“

”کیا مکمل سے تمہاری ملاقات ہوئی تھی آج؟ وہ آج ہی ہنگام گیا ہے۔ وہاں سے دہلی جائے گا۔ اس کی واپسی چند روز میں متوقع ہے۔“

”اکمل سے میری ملاقات ایئر پورٹ پر ہوئی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں فوراً جا کر تمہیں مشورہ دوں کہ اپنی ملازمہ سونیا کو فوراً چھٹی دے دو۔ اسے جو اطلاعات ملی ہیں ان کے مطابق وہ ایک مشکوک لڑکی ہے۔“

اس کی موجودگی خطرے کا باعث بن سکتی ہے۔“

”مگر اکمل نے تو مجھ سے کچھ نہیں کہا تھا۔ اس کے بارے میں۔“

”اس نے جو کچھ کہلوا کر بھیجا ہے اس پر عمل کرو۔ اس میں ہماری بہتری ہے۔ وہ ہم سے بہتر جانتا ہے۔“

”مگر ظہیر! سرگم کے لیے میں شدید حیرت تھی۔“ وہ محض... ایک ملازمہ ہے۔ اس کی حرکت و سکنات میرے لیے کبھی مشکوک نہیں رہیں۔“

”اکمل کا کہنا ہے کہ سونیا عام نوکرانیوں سے مختلف ہے۔ اور اس کی موجودگی ہماری سرگرمیوں پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ ہمیں کسی پر بھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ چاہے وہ بھکاری یا نوکری کیوں نہ ہو۔ یہ حکم ہے اس کی تعمیل ہم پر فرض ہے۔“

”کچھ کچھ میری سمجھ میں بھی آ رہا ہے۔“ سرگم بولی۔ ”وہ واقعی عام نوکرانیوں سے مختلف ہے۔ میں اسے کل ہی چھٹی دے دوں گی۔“

”دیری لگد۔“ ظہیر راج کے شننے کی آواز گونجی۔ ”تو کل سے تم گھر کا کام کاج سنبھال لو گی۔ اور اکیلی سارے کام نمٹا سکو گی؟“

”کیوں نہیں؟“ جواب میں سرگم کی ریلی ہی سنائی دی۔ ”میں عورت ہوں اور ایک عورت کے مقابلے میں گھر کا نظام کون چلا سکتا ہے؟ اور پھر دو جانوں کا مسئلہ ہے۔ مجھے کون سا کرل کے ساتھ برسوں زندگی گزارنا ہے۔ ایک دو ماہ کی تو بات ہے۔ جیسے ہی منصوبہ انجام کو پہنچے گا کرل بھی دوسری دنیا میں جا پہنچے گا۔“

”تم اپنے وجہ اور خوب صورت شوہر کے ساتھ ایسا بے رحمانہ سلوک کرو گی؟ اسے اپنے ہاتھوں سے قتل کرو گی؟“

”اس مشن کی خاطر تو ایسے دس شوہروں کو بھی دفن کر سکتی ہوں۔“ اس کا لہجہ بڑا سفاکانہ تھا۔

”تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنے مشن میں کامیاب نہ ہوں۔“

”اوہ ظہیر!“ سرگم اچھل پڑی ”باتوں میں خیال ہی نہیں رہا کہ اوپر والے کمرے میں کرل موجود ہے۔“

”وہ تو سو رہا ہو گا۔ اور پھر ہماری آوازیں وہاں تک کیسے جا سکتی ہیں؟“

”ظہیر! تم ایسا کرو۔“ سرگم سرگوشی کے انداز میں کہنے لگی تو مجھے اپنے کان دروازے سے لگانے پڑے۔ ”تم عقبی راستے سے جا کر دیکھ کر آؤ کہ سونیا سروٹ کوائرٹ میں موجود ہے یا نہیں، میں کرل کو دیکھ کر آتی ہوں۔ اور ہاں سونیا کوائرٹ میں تھا ہے۔ اسے نوکرانی سمجھ کر کوئی ایسی ویسی... حرکت مت کرنا۔“

”بے فکر رہو، تمہیں شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔“

سرگم جلدی سے بولی۔ ”میں جانتی ہوں تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آؤ گے۔ ایسا کرو، کرل کے کمرے میں جا کر دیکھو کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ میں خود سونیا کی طرف جارہی ہوں۔“

میرے جسم میں جیسے بجلی سی بھر گئی ہو۔ اور یہ ان برقی لمبوں کا ہی اثر تھا کہ میں کسی نہ کسی طرح تیزی کے ساتھ پلنگ کی طرف بڑھا۔ تب تو مجھے زخموں کا کوئی خیال تھا نہ ہی درد کا احساس ہوا تھا۔ پلنگ پر چڑھ کر بہتر لیٹا تو جان میں جان آئی۔ ظہیر راج اور سرگم میں گفتگو کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا تھا۔ چند ایک مزید الفاظ جو میرے کانوں میں پڑے، ان سے اندازہ ہوا کہ وہ سونیا کے کمرے میں جانے کے لیے کسی ہمدردی کے لیے کی طرح چل رہا ہے۔ آخر ظہیر راج کو میرے کمرے میں ہی آنا پڑا۔ وہ کوئی پانچ منٹ بعد میرے کمرے میں آیا تھا۔ پانچ منٹ میرے

”کرل!“ اس نے ریلی آواز میں مجھے مخاطب کر کے جیکسی نظروں سے دیکھا۔ ”تمہیں کچھ یاد آیا؟“  
 ”کیا...؟“ آتش فشاں کو قریب پا کر خیال ہی نہیں رہا کہ وہ کس چیز کے بارے میں پوچھ رہی ہے۔  
 اس نے کچھ کہنے سے پہلے ساڑھی کا پلو درست کیا۔ ”تمہیں کچھ یاد آیا۔ میرا مطلب یادداشت سے ہے۔“  
 میں نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے شوخی سے جواب دیا۔ ”تم سامنے ہو تو وہ واپس کیسے آسکتی ہے؟“

”کیا میں کوئی اتنی ہی خوف ناک شے ہوں جو مجھے دیکھ کر تمہیں کچھ یاد نہیں آ رہا۔“  
 ”نہیں... تم اس قدر حسین ہو کہ دنیا میں شاید ہی کوئی عورت تمہاری طرح حسین ہوگی۔“ میں نے دل کھول کر اس کی تعریف کرنا شروع کر دی۔ وہ تھی بھی اس قاتل کہ اس کے حسن کی تعریف میں بگل سے کام نہ لیا جائے۔ ”تمہارے ان... گنت روپ ہیں۔ ہر روپ اتنا حسین ہے کہ میرا دل شاعری کرنے کو چاہ رہا ہے۔ کاش! میں شاعر ہوتا کرل نہ ہوتا۔ تم پر ایک خوبصورت غزل کہتا۔“

عورت چاہے کتنی ہی لذت پسند، عالم، ذہین، سمجھ دار اور اعلیٰ تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو، تعریف اس کی سب سے بڑی کمزوری ہوتی ہے۔ وہ میری زبان سے تعریفی الفاظ سن کر گلہاں ہو گئی۔ جیسے وہ کوئی نئی نوبلی دلن ہو جو جلد عروسی میں بیٹھی اپنی نئی زندگی کے آغاز پر اپنے ہم سفر کی محبت بھری باتیں سن رہی ہو۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں شباب کا خمار چمک رہا تھا۔ ”بس، بس، مرد بیٹہ تعریفیں کر کے عورتوں کو بے وقوف بناتے ہیں۔“  
 ”اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں تو جا کر دیکھ لو۔ آئینہ جھوٹ نہیں بولے گا۔“

”تم کرل کم اور شاعر زیادہ معلوم ہوتے ہو۔ یہ روگ تم نے کب سے پالا ہوا ہے۔“ وہ زیر لب مسکرائی۔  
 ”مجھے کیا معلوم...؟“ میں نے جواب دیا۔ ”مجھے تو اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم مجھے اپنا نام بھی یاد نہیں آ رہا ہے۔ کیسی عجیب بات ہے۔“

”ایک منٹ...“ اس نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کے لیے کہا۔ جیسے اچانک ہی کچھ یاد آ گیا ہو۔ دوسرے ہی لمحے وہ الماری کے خفیہ خانے سے پوٹلی نکال لائی۔ اسے میز پر رکھ کر کھولا۔ اس میں رکھی ہوئی چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”یہ ساری چیزیں تمہاری اپنی ہیں انہیں غور سے دیکھو، پچپانے کی کوشش کرو۔ شاید کچھ یاد آ جائے۔“ اس نے توقف کر کے شناختی کارڈ اٹھا کر میری آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ ”تم کرل نیاز احمد ہو۔ یہ دیکھو، یہ ایک ایسا محسوس ثبوت ہے، جسے تم جھٹلا نہیں سکتے ہو۔“

میں شناختی کارڈ کے بجائے اس کا خوش نما ہاتھ دیکھ رہا تھا۔ اس کی تراشیدہ لمبی لمبی خود ملی انگلیاں... بے اختیار جی چاہ رہا تھا کہ اس کی حسین گلابی تمام لوں۔ اگر میں اس کی گلابی تمام لیتا تو شاید وہ پھرانے کی کوشش بھی نہ کرتی بلکہ خوش ہوتی۔ میں نے دل پر جبر کی سل رکھ کر اس سے شناختی کارڈ لے لیا۔ یہ شناختی کارڈ مجھے یقین پانوں نے بھی دکھایا تھا۔ تاہم میں نے اس کارڈ کو اس طرح دیکھا جیسے وہ مجھے یاد نہیں آ رہا ہے کہ میں کون ہوں۔ ”یہ تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ میں کرل نیاز احمد ہوں۔ اس ثبوت کو کیسے جھٹلاؤں؟“

”اپنے آپ کو پوری طرح کرل نیاز احمد ہی سمجھنے لگو۔“

”کیا اس طرح مجھے بھولی ہوئی زندگی یاد آ جائے گی؟“

”تم فکر مند کیوں ہو رہے ہو۔ ہم دونوں بچپن کے ساتھی ہیں۔ میں تمہیں ماضی کی باتیں یاد دلاتی رہوں گی۔ شاید اس طرح تمہاری یادداشت واپس آ جائے۔ اور پھر تمہیں اپنی زندگی کا آغاز کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔“

لے بہت اچھے تھے۔ اتنی دیر میں میں اپنی پھولی ہوئی سانسوں اور بیجان پر پوری طرح قابو پا چکا تھا۔ میں سوتا بن کر لیٹا مگری سانس لے رہا تھا کہ ظہیر رحمان نے پنگ کے پاس آ کر مجھے دو تین بار پکارا۔ مگر میں نے آنکھیں نہیں کھولیں۔

وہ چند لمحوں کے بعد لائے قدموں چلا گیا اور جاتے... جاتے دروازہ بھی بند کر گیا۔

یہ اتفاق نہیں بلکہ تائید غیبی تھی جو ظہیر رحمان و سرگم کے درمیان ہونے والی گفتگو میں نے صاف اور واضح طور پر سن لی تھی۔ ان دونوں کی گفتگو کا آخری حصہ میرے لیے بڑا سنسنی خیز تھا۔ لیکن ان کا مشن کیا ہے؟ میں اس کی تہ تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ بڑی دیر سوچ بچار کے بعد ایک بات میری سمجھ میں آئی کہ وہ میری ذات کو اور شاید میرے فن کو آکھ کار بنانا چاہتے ہیں۔ اور اس کامیابی کے بعد مجھے صفحہ ہستی سے مٹا دینا چاہتے ہیں۔ پتہ نہیں وہ کون کون شخص تھا جس پر سرگم دس شوہروں کو بھی بھینٹ چڑھانے کے لیے تیار تھی۔ مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ سونیا کی کل چھٹی ہو رہی ہے۔

ادھر میں نے بھی تہہ کر لیا تھا کہ ان دونوں کو کسی صورت نہیں بخشوں گا۔ میں یادداشت سے محرومی کا ڈھونگ رہا کہ ان کا مشن معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔ اور پھر سرگم کے منصوبے کو خاک میں ملانا میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کا مقابلہ کس سے ہے۔ میرے بارے میں کوئی پوری طرح واقف تھا تو وہ صرف کرل تھا اور کرل کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ خدا معلوم اسے آسمان کھا گیا تھا یا زمین نگل گئی تھی۔ اب اس کی جگہ میں کرل بنا ہوا تھا۔

ظہیر رحمان سہ پہر سے پہلے ہی چلا گیا تھا۔ سہ پہر کے بعد سردی میں اضافہ ہونے لگا۔ سونیا میرے لیے دوا بیلے ہوئے انڈے اور چائے لے کر آئی اس نے رُے میز پر رکھ کر آہستگی سے کہا۔ ”آپ کو کل بیگم صاحبہ کے ہاتھوں کپے ہوئے کھانے اور چائے ملے گی۔“

”کیوں؟“ میں نے انجان بن کر پوچھا۔ ”کیا تم ملازمت چھوڑ کر جاری ہو؟ اس کام سے بے زار ہو گئی ہو؟“  
 ”آپ تو انجان نہ بنیں کرل صاحب!۔“ وہ زیر لب مسکرائی۔ ”آپ کو سب معلوم ہے۔ آپ نے ساری گفتگو سنی ہے۔“

”تمہیں کیسے معلوم ہے؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔ ”کیا تم نے بھی ان دونوں کی گفتگو سنی تھی؟“

اس نے جواب میں خوش نما سر ہلایا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ زینے پر قدموں کی آواز سنائی دیں۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور کمرے سے نکل گئی۔ میں اسے نظروں سے اوجھل ہونے تک دیکھتا رہا۔ چند لمحوں کے بعد سرگم کمرے میں داخل ہوئی تو ایک لمحے کے لیے میں اپنے آپ کو بھول گیا۔ میں زائد تو نہیں تھا۔ جو اس طرف نہ دیکھتا۔ لیکن اگر کوئی زائد بھی ہوتا تو اسے دیکھتے کا دیکھنا رہ جاتا۔ وہ آتش فشاں بن کر آتی تھی۔ وہ سیاہ رنگ کی ساڑھی اور آدھی آستین کے سیاہ بلاؤز میں تھی۔ اس کا لباس دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے سخت گرمی پڑ رہی ہو۔ وہ اس لباس میں کوئی فلمی ہیروئن لگ رہی تھی۔ فلمی ہیروئن تماشاویوں کا دل موہ لینے کے لیے ایسے ہی لباس میں سکرپن پر آتی ہیں۔ اس لباس میں وہ بے حد حسین دکھائی دے رہی تھی۔ نگاہ تھی کہ اس کے سراپا سے بچنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ معلوم نہیں کیوں وہ اس عالم میں بجلیاں گرانے چلی آئی تھی۔ وہ بستر کے پاس آ کر روکی تو مجھے ایسے محسوس ہوا کہ فضا منک انھی ہو۔ اس کے لباس سے بھیجی خوشبو پھوٹ رہی تھی۔



پیشہ ور قاتل دکھائی دے رہی تھی۔ وہ زہر بھرے لیے میں بولی۔ ”کرگل صاحب! کیا آپ چند قدم بہادری سے پیچھے ہٹنے کی زحمت فرمائیں گے؟“

میں دو تین قدم پیچھے ہٹا تو اس نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔ اور پستول کی ٹیل کا رخ میری پیشانی کی طرف کرتے ہوئے بولی۔ ”بڑی نوازش ہوگی، اگر آپ کرسی پر تشریف رکھیں۔“

سونیا کے خوش نما ہاتھ میں پستول جیسی خوف ناک چیز دیکھ کر مجھے کچھ عجیب سا بلکہ غیر فطری سا محسوس ہوا۔ پستول ہر ایک کے ہاتھ میں چٹا بھی نہیں ہے... یہ بڑی عجیب، حیرت انگیز اور سنسنی خیز بات تھی کہ مجھے اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات میں جن حسین عورتوں سے واسطہ پڑا تھا ان میں زیادہ تر حسین عورتوں کے ہاتھوں میں پستول ہی نظر آئے تھے۔ جیسے وہ پستول نہ ہوئے کھلونا ہوئے جن سے کھیلنے کے لیے وہ بے چین ہوئی جارہی ہوں۔ سونیا کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس ٹیس لڑکی کے ہاتھ میں پستول بھی ہو سکتا ہے۔ مجھ پر خوف سے زیادہ حیرت غالب تھی۔

میں اپنی جگہ ساکت سا ہو کر اسے بڑی بے بسی، بے چارگی اور پھرائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ بیٹھے بیٹھے سونیا کو یہ کیا سوچھی کہ وہ مجھ پر پستول تانے لگتی ہے۔ کیا وہ چھپ کر میری حرکات و سکنات کا جائزہ لیتی رہی ہے۔ جو عین موقع پر کسی بلائے ناکمالی کی طرح آگئی۔ وہ مجھے پہلے سے بھی زیادہ پر اسرار سی لگی تھی۔ یہ کس ارادے سے آئی ہے؟ مجھ سے کیا چاہتی ہے؟ وہ اس طرح بے خوف نظر آتی تھی جیسے سرگرم کے اشارے پر آئی ہو۔ یا شاید کسی وجہ سے پرہیزگار رہی تھی۔ تب ہی تو اس نے مجھے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا۔

اس نے میرے قریب آ کر اپنا سر میرے سینے پر رکھنے کے بجائے اس پر پستول کی ٹیل رکھ دی۔ ”اتنی رات گئے، آپ کہاں تشریف لے جا رہے تھے؟“

اگر مجھ میں توانائی ہوتی اور میرا دایاں ہاتھ زخمی نہ ہوتا تو میں اس سے پستول چھین لیتا۔ میں اپنے بازو کو زیادہ اوپر تک لے جا نہیں سکتا تھا۔ مجبوری تھی کہ اس کے حکم پر چلا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”میرے لیے تو اس قدم بھی چلنا محال ہے۔“

”جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں۔“ اس کے سنجیدہ چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”چوروں کی طرح کہاں جا رہے تھے؟“

”نیند اچاٹ ہو گئی تو سوچا کہ قید خانے سے نکل کر نیچے جاؤں اور چمچل قدمی کر آؤں۔“

”تو آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ اپنی ہونے والی دلس کو دیکھنے جا رہے تھے؟“ وہ ایک دم سے کل کھلا کر ہنس پڑی۔

”دلس...؟“ میں فوری طور پر اس کی بات نہیں سمجھ سکا اور نہ میرا ذہن سرگرم کے منصوبے کی طرف گیا۔ سرگرم کے منصوبے میں اس سے میری شادی ہونا بھی شامل تھا۔ ”کون ہے، میری ہونے والی دلس...؟“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”سرگرم!“ وہ حلقے لہجے میں بولی۔ ”اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بے حد حسین پرکشش اور فتنہ خیز ہے۔ آج وہ پوری حشر سالنیوں کے ساتھ آپ کے کمرے میں آئیں۔ دو تین گھنٹے بیٹھی رہی تھیں۔ اور آپ پر جلیلی گراتی رہیں تھیں۔ سچ پوچھئے تو آپ واقعی بڑے خوش قسمت ہیں جو دنیا کی اس حسین ترین عورت کے شوہر بننے والے ہیں۔“

میں تمہاری یادداشت بن جاؤں گی۔“

”خدا کرے تمہاری کوشش بار آور ثابت ہو اور میں ایک اچھی زندگی گزار سکوں۔“

”اور ہاں!“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ”ایک اور بات کا خاص خیال رکھنا۔ یہ بات کسی کو بھی نہ بتانا کہ تم اپنی یادداشت کھوپچے ہو۔“

”وہ کیوں؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔

”اس لیے کہ جیسے ہی یہ بات تمہاری رجسٹر میں پہنچے گی، تمہیں فوج سے نکال دیا جائے گا۔ اس طرح تمہارا سارا کیریئر ختم ہو جائے گا۔“

”مگر میں اپنی ڈیوٹی پر جاؤں گا تو اپنے سٹاف کو کیسے پہچانوں گا۔“

”تم اس کی فکر نہ کرو، میں جلد ہی متعلقہ فوجیوں کی تصویریں حاصل کر کے تمہیں ان سب کے بارے میں سب کچھ بتا دوں گی۔ پریشان نہ ہو اطمینان سے رہو۔ کھانا پیو، اپنی صحت کی فکر کرو۔ میں نے تمہارے حادثے کی اطلاع اور پچھلی کی درخواست تمہارے دفتر بھیج دی ہے۔ میرا خیال ہے کہ دو ماہ کی چھٹی منظور ہو جائے گی۔

سرگرم بڑی دیر تک بیٹھی مجھے سمجھاتی رہی۔ ظہیر رحمان اور اکمل کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائی رہی۔ لیکن میں اس کی باتوں سے زیادہ خود اسی پر توجہ دیتا رہا۔ اس کے حسین چہرے اور پرکشش سر پر اپنی نظرس مرکوز کیے کہیں دور چلا گیا تھا۔ اور میرے تصور میں گلاب سے کھل گئے تھے۔ میرا وجود اس کی رفاقت اور باتوں سے ممک تھا۔

رات کا کھانا اس نے مجھے اپنے حسین ہاتھوں سے کھلایا۔ اپنی نشیلی آنکھوں سے بھائی بھی رہی تھی۔ پھر جب وہ کمرے سے گئی تو میں جیسے پوری طرح مدہوش ہو چکا تھا۔ جی تو نہیں چاہتا تھا کہ اسے جانے دوں، بڑی تنہا تھی کہ وہ میری نظروں کے سامنے بیٹھی رہے۔ سوچا بھی کہ کھنٹی بجا کر اسے واپس بلا لوں۔ اور اس سے کہوں کہ تم رات بھر میرے پاس بیٹھی رہو اور کوئی الف لیلو و داستان سناتی رہو۔

سرگرم کے جانے کے بعد میں اپنے آپ کو کوچ کوچ کا کرمل کھینچ لگا تھا۔ وہ مجھ پر جیسے جادو سا کر گئی تھی۔ اس کے جادو کا اثر اتنا گہرا تھا کہ میں سوئے کے لیے لیٹا تو میرے تصور میں بھی اس کا سر اٹھاتا چلتا رہا اور اس کی باتیں کانوں میں رس گھولتی رہیں۔

رات دس بجے سردی پورے شباب پر آگئی تھی۔ میں گرم اور گداز بستر میں دیکھا، سرد موسم کا لطف لیتا رہا۔ پھر جلد ہی نیند نے مجھے دبوچ لیا۔ کوئی دو گھنٹے کے بعد کسی وجہ سے آنکھ کھلی تو پھر لگ نہ سکی۔ نیند اچاٹ ہو گئی تھی۔ میں دن کے واقعات پر غور کرتا رہا لیکن اپنے آپ کو یاد نہ آتا تھا۔ بیٹھا۔ بستر سے نکلا تو محسوس ہوا کہ کمرہ برف کی طرف سرد ہو رہا ہے۔ سردی سے میرے دانت... بجتے لگے۔ میں آہستہ آہستہ دروازے کی جانب بڑھا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر سانس لینے کے لیے رکنا چند قدم چلنے کے بعد میری سانسیں میرا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ میں نے سانسیں کو قابو میں کرنے کے بعد دروازے کے پینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے آہستہ سے گھمایا پھر بے آواز دروازہ کھولا تو میرا دل اچھل کر حلق میں اٹک گیا اور میرے منہ سے سچ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ بدن میں دوڑنا ہوا خون، برف کی مانند منجمد ہو گیا۔

دروازے میں سونیا پستول کی ٹیل تانے لگتی تھی۔ اس کے سرخ سرخ بھرے بھرے لبوں پر استہزائی مسکراہٹ ناچ رہی تھی اور آنکھوں سے سفاکی جھانک رہی تھی۔ وہ یکسر بدلی ہوئی تھی۔ وہ عورت نہیں بلکہ کوئی

مجھے یاد بار کرل کہہ کر مخاطب کرتی رہی تھی۔ اور وہ مجھے نفسیاتی طور پر کرل بنا چکی تھی۔ پھر میں اسے یہ یاد کرنا چکا تھا کہ میں اپنی یادداشت کو چکا ہوں۔ میں مصلحت کی بنا پر اپنے آپ کو کرل ہی تصور کر رہا تھا۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں رہا تھا۔ سرگم نے سونیا کو تاکید کی ہوگی کہ وہ بھی مجھے کرل ہی کہہ کر مخاطب کرتی رہے۔ وہ اسے کبھی میرا اصلی نام لینے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔ پھر سونیا نے میرا اصلی نام کیوں لیا؟ سونیا کے منہ سے میرا اصلی نام بے ساختہ یا غیر اختیاری طور پر بھی نہیں نکلا تھا۔ بلکہ اس نے دانستہ ایسا کیا تھا۔

میرے دل میں شک کی لہر اٹھی، کیسے سونیا مرہو تو نہیں سرگم بڑی تجربہ کار اور گہری عورت تھی۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ مردوں پر حسین و نوجوان لڑکی کا ہتھیار ہی کارگر ثابت ہو تا ہے۔ مگر سونیا نے یہاں آکر کسی نسوانی ہتھیار سے کام نہیں لیا تھا۔ اور نہ ہی ناز و انداز دکھائے تھے۔ بلکہ اس کی باتوں سے اپنائیت اور خلوص ظاہر ہو رہا تھا۔ اس کے لیے میں کمزور فریب کی بو بھی نہیں تھی۔ میں نے اس کی حسین آنکھوں اور دل فریب چہرے کو پڑھتے ہوئے پوچھا۔ ”مجھے کرل نیاز احمد سے سکندر کیوں بنایا جا رہا ہے؟ یہ حضرت کون ہیں؟“

”آپ!“ وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی تو اس کا چہرہ دکھ اٹھا۔ ”آپ سکندر اعظم ہیں، کرل نیاز احمد نہیں، جیب تراشوں کا بے تاج بادشاہ۔ جس کی فتوحات کی نظیر نہیں ملتی ہے اور جس کی فتوحات کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ اب آپ کچھ دیر تک، سرگم کے لیے نہ سہی لیکن میرے لیے تو۔۔۔ سکندر بن جائیں۔“

”تم مجھے جو چاہے بنا دو۔“ میں جذباتی سا ہو گیا۔ ”ایک شخص جو اپنی یادداشت کو چکا ہو اور شتر بے مہار بن کر رہ گیا ہو، اسے تم جیسی حسین لڑکی چاہے سکندر بنا دے یا بھکاری بنا دے۔ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا البتہ تمہاری حسین نظموں۔“

”کیا میں آپ کو بتا رہی ہوں؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے... کہ آپ...؟“

”حقیقت بڑی تلخ ہوتی ہے۔ ذہر کی طرح۔ اسی لیے تو ایک شخص نے ذہر کا پالہ پیا تھا۔“

”آپ قلعی بھی ہیں۔“ اس کے حسین چہرے پر استعجاب چھا گیا۔ ”یہ تو جو نکادینے والا سنسنی خیز انکشاف ہے۔“

”میں نہ صرف قلعی ہو گیا ہوں بلکہ شاعر بھی بننا جا رہا ہوں۔ اگر کچھ دن اور یہاں رہا تو موسیقار بھی بن جاؤں گا۔“

”سہ پہر کے وقت میں آپ کی نثری شاعری سن چکی ہوں۔ سرگم کے پیر زمین پر نہیں نک رہے تھے۔“

”سرگم غزل ہے تو تم بھی کچھ کم نہیں ہو۔ تم ایک ایسی نظم ہو جس کے ہر بند میں رنگینی اور خیال آفریں...“

سونیا حسین ہی نہیں ذہین بھی ثابت ہوئی۔ وہ میرے تعریفی الفاظ سن کر سرخ ہو گئی۔ سردرات کی تمنائی، سناٹے اور کمرے کی ملک جیسی روشنی میں اس کا حسن اور بھی نکھر گیا تھا۔ اس کا چہرہ دکھ رہا تھا۔ وہ تیزی سے میری بات کاٹ کر بولی۔ ”آپ ایک اچھے شاعر ضرور بن سکتے ہیں۔ کیوں کہ آپ کو الفاظ تراشنے آتے ہیں۔ مگر یہ موقع شاعری کا نہیں ہے۔ یہ تو فرصت کی باتیں ہیں۔“

”فرصت ہی فرصت تو ہے۔“ میں نے کسی شاعر کے سے انداز میں کہا۔ ”نظموں کے سامنے چودھویں کا چاند ہو تو ہر شخص کو شاعری ہی سوجھتی ہے۔ اور پھر تمہیں کیا معلوم کہ چاند کو درود دیکھ کر دل کے ماروں پر کیا گزرتی ہے۔ دل میں درد سا جاگ اٹھتا ہے۔ خوابیدہ سینے...“

”اگر سرگم سے میری شادی ہو گئی تو میں اپنے آپ کو دنیا کا سب سے بد قسمت شخص سمجھوں گا۔ وہ عورت نہیں ہے بلکہ ناگن ہے۔“

”عجیب مرد ہیں آپ بھی...“ اس کے چہرے پر گہرا... استعجاب چھا گیا۔ ”لگتا ہے آپ کے سینے میں دل نہیں ہے بلکہ... پتھر ہے۔“

”اس میں پتھر دل کی کیا بات ہے۔ کیا میں آنکھیں بند کر کے کونوں میں کود جاؤں؟“

”کوئی اور شخص ہو تا تو وہ خوشی سے پھولا نہ سنا۔ ایسی حسین عورت کی خاطر تو لوگ اپنی جان تک دے سکتے ہیں۔“

”کیا تم اس فتنہ پرداز عورت کی سفارش لے کر آئی ہو جو مجھ سے محض اس لیے شادی کر رہی ہے کہ مجھے اپنے گھناؤنے مشن کے لیے آلہ کار بنا سکے۔ اور پھر کامیابی کے بعد مجھے عدم آبادی کی طرف روانہ کر دے۔ اور ہاں وہ تمہیں کل چھٹی بھی تو دے رہی ہے۔“

”میں اس کی طرف سے کوئی سفارش لے کر نہیں آئی بلکہ اپنی طرف سے مخلصانہ مشورہ دینے آئی ہوں کہ آپ اس حسین سارہ سے شادی ضرور کر لیں۔ اور اس حسین پر فضا مقام پر جو جنت ارضی کی طرح ہے، عیش و عشرت کے دن گزاریں زندگی کے حسین لمحات سے محفوظ ہوں۔ سچ پوچھئے تو اس کی رفاقت میں گزرا ہوا ایک ایک دن ناقابل فراموش ہو گا۔“

”یہ سب کچھ تو اسی وقت ممکن ہے جب میں اس سے شادی کرنے کے بعد زندہ رہوں۔“

”آپ سکندر ہو کر اتنے مایوس اور دل برداشتہ ہو رہے ہیں۔“ اس کا لہجہ ٹھنک گیا۔ ”خدا نے چاہا تو آپ زندہ و سلامت رہیں گے۔“

”سکندر...؟“ سونیا کے منہ سے اپنا نام سن کر میں اچھل پڑا۔ پھر گویا مجھے اپنی سماعت میں فتور کا احساس ہوا۔ میں تو کرل... کرل... کرل کی روٹ سن کر اپنے آپ کو سچ کا کرل سمجھے پر مجبور ہو گیا تھا۔ سونیا کی زبان سے اپنا اصلی نام سن کر مجھے... جہاں ناقابل بیان حیرت ہو رہی تھی۔ وہاں خوشی کی بھی کوئی انتہا نہیں تھی۔ خوشی اس بات کی تھی کہ یہاں ایک ایسی ہستی بھی موجود ہے جو میرے نام سے واقف ہے۔ جب وہ میرے نام سے واقف ہے تو وہ میری شخصیت کو بھی اچھی طرح سے جانتی ہوگی۔ نیز ان تمام لرزہ خیز واقعات سے بھی آگاہ ہوگی، جو میرے ساتھ پیش آچکے تھے۔ اور ایک سوچے سمجھے گھناؤنے منصوبے کا نتیجہ تھے۔ میرے ذہن میں طرح طرح کے خیالات اور شکوک و شبہات کی پلغار ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا، سونیا تو ایک عام سی جوان ملازمہ ہے۔ اس نے مجھے یہاں پہلی بار دیکھا ہے۔ میں نے بھی اسے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ اسے میرے اصل نام کا علم کیسے ہوا؟ پھر اس خیال سے میری ساری خوشی کافور ہو گئی کہ... سونیا، سرگم کی آلہ کار ہوگی۔ سرگم نے آج اسے کسی وجہ سے اپنے اعتماد میں لے کر اپنے منصوبے اور میرے بارے میں تفصیل سے بتا دیا ہو گا۔ ورنہ سونیا کے لیے ایسا کوئی ذریعہ نہیں تھا جس سے وہ میرا نام معلوم کر سکتی تھی۔ گویا وہ اب تک مجھے ایک طرح سے فریب ہی دے رہی تھی۔ مجھے اپنے اعتماد میں لے کر بے وقوف بنا رہی تھی۔ وہ اس وقت بھی سرگم کے اشارے پر شاید یہ جاننے ہی آئی تھی کہ میں سرگم سے اپنی شادی کی خبر سن کر کس رد عمل کا اظہار کرتا ہوں۔ اور میں اس شادی کے لیے ذہنی طور پر کس حد تک تیار ہوں؟ مگر یہ بات میری سمجھ سے بالا تر تھی کہ سونیا نے مجھے میرے اصلی نام سے کیوں مخاطب کیا؟ سرگم تو کبھی اور کسی قیمت پر بھی نہیں چاہے گی کہ میں اپنی حقیقت سے آگاہ ہو جاؤں۔ جب ہی تو وہ

”ہاں! تم سرگم کی ملازمہ نہیں بلکہ اس کی دوست ہو اور مجھے اپنے جہل میں پھانسنے آئی ہو۔“  
 ”میں سرگم کی دوست نہیں بلکہ دشمن ہوں۔ کیا آپ کو میری حرکات و سکنات سے اندازہ نہیں ہوا۔“  
 ”اگر تم سرگم کی دشمن ہو تو وہ اب تک زندہ کیوں ہے؟ تم اس پستول سے اسے قتل کر کے فرار ہو سکتی تھیں۔“

”حکم نہیں ملا ابھی۔۔۔“

”حکم نہیں ملا کیا مطلب ہے تمہارا۔“ میں نے چونک کر پوچھا۔ ”کیا کسی نے تمہیں منع کیا ہوا ہے؟“  
 ”ہاں مجھے کسی نے منع کیا ہوا ہے۔ اور اس کے حکم کے بغیر کوئی قدم اٹھا نہیں سکتی۔ ورنہ سرگم کو قتل کر کے آپ کو یہاں سے نکال لے جانا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ میں تو ہدایات پر مشینی انداز سے عمل کر رہی ہوں۔“  
 اس لمحے سونیا بڑی پر اسرار اور خوف ناک لڑکی لگ رہی تھی۔ اس کے لمحے اور باتوں نے مجھے چونکا دیا تھا۔  
 میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”تم کسی کی تابع ہو؟ سرگم کی دشمن کیوں ہو؟“  
 ”میں کس کی تابع ہوں؟ یہ تو نہیں بتا سکتی البتہ یہ ضرور کہوں گی کہ وہ آپ کا دوست اور سرگم کا جانی دشمن ہے۔“

”مگر یہ کیسا دوست ہے جسے یہاں سے میری دہلی قصود نہیں ہے۔“

”اس کی دوستی پر کوئی شک نہ کریں اسے آپ کی زندگی اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔“  
 ”پہلی بار ایسے دوست کے بارے میں سن رہا ہوں جس نے مجھے موت کے منہ میں رکھا ہوا ہے اور مطمئن ہے۔“

”کسی مصلحت کی بنا پر آپ کو یہاں رکھا گیا ہے۔“ وہ کہنے لگی۔ ”اسی کے حکم پر میں نے یہاں تک رسائی حاصل کی ہے۔ تاکہ آپ کی حفاظت کر سکوں۔ اگر اس غبیث ظلمیر ریحان نے سرگم کو میرے خلاف نہ اکسایا ہوتا تو میں یہیں رہتی۔“

”ظلمیر ریحان نے تمہارے خلاف سرگم کو کس لیے اکسایا؟ کیا اسے تم پر شک ہو گیا ہے؟“  
 ”نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے اس کے منہ پر ایک زوردار پتھر رسید کر دیا تھا۔“ وہ نفرت اور غصے سے مٹھیاں سمجھتی کر بولی۔

”ایں! میں اچھل پڑا۔۔۔“ تم نے اس کے پتھر رسید کر دیا تھا؟ وہ کس لیے؟“  
 ”اس نے مجھ پر دست دراز کی کو کوشش کی تھی۔ میں نے نہ صرف پتھر رسید کیا بلکہ اس کے منہ پر تھوک بھی دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے میرے خلاف سرگم کے کان بھر دیے۔“

”اس کا چہرہ بگاڑ دینا چاہئے تھا۔ یا آنکھ پھوڑنا چاہئے تھی۔ تاکہ وہ جی کی شہنشاہ کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کے بھی قابل نہ رہتا۔“

”میں کل علی الصبح یہاں سے چلی جاؤں گی۔“ سونیا کہنے لگی۔ ”آپ بالکل نہ گھبراہیں۔ میری غیر موجودگی میں بھی آپ پر کوئی آج نہیں آئے گی۔ خدا آپ کا حامی و ناصر ہو گا۔ اور پھر آپ کا نایاب دوست آپ کی سلامتی کا خیال رکھے گا۔“

”کیا میرا نایاب دوست کرمل نیاز احمد ہے۔ جو مجھ سے ملے آیا تھا۔ اس سے ملاقات کا نتیجہ میرے سامنے ہے۔“

”دل برداشتہ نہ ہوں ایسے شب و روز چند دنوں بعد آپ کی زندگی میں آنے ہی والے ہیں۔“ اس کے چہرے پر اچھلنے تصور کی پرچائیں سرخی بن کر دکھ اٹھی تھیں۔

”تم میرا سپنا ہو۔ کیا میرا یہ سپنا کسی روز حقیقت بھی بن سکتا ہے؟“  
 ”آپ سرگم کی امانت ہیں۔ میں کسی کی امانت میں خیانت کا سوچ بھی نہیں سکتی۔“  
 ”سوچنا ترک کر دو سونیا! محبت کرنے والے کبھی نہیں سوچتے۔ اسی لیے محبت اندھی ہوتی ہے۔ عظیم ہوتی ہے۔“

”خدا کے لیے سنجیدہ ہو جائیں۔ یہ شاعری بند کر دیں۔ اور کچھ دیر کے لیے کرمل کے خول سے نکل کر سکندر بن جائیں۔ مجھے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔ میرے پاس وقت کم ہے۔“  
 ”کچھ دیر کے لیے کیا میں تو ساری زندگی کے لیے سکندر بننے کے لیے تیار ہوں۔ تم سے باتیں کرنے کے لیے زندگی بھر جاگ سکتا ہوں۔“

”لگتا ہے سرگم نے آپ کو کسی قابل نہیں چھوڑا۔ اگر جلد ہی آپ کی شادی نہ ہوئی تو غضب ہو جائے گا۔“ وہ گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”مگر آپ میری ایک شرط مان لیں تو آپ کی شادی جلد از جلد کروا دوں گی۔“

”کون سی شرط...؟ کیسی شرط!“

”شرط تو چھوٹی سی ہے لیکن پوری کرنے کے کی صورت میں بڑی ہے۔“  
 ”خوب!“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”تم میری شادی کسی اور سے کروا رہی ہو لیکن شرط اپنی منواری ہو۔“  
 ”کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔“ اس کے لبوں پر تبسم پھیل گیا۔ ”میری بات غور سے سنیں۔ میں جو کچھ کہوں اس کا صاف صاف جواب دیں، ادھار کی بالکل نہیں چلے گی۔“

”کیا میں ادھار کی کر رہا ہوں؟ کیا یہ میری ذات پر تحمت نہیں ہے؟“  
 ”خدا کے لیے سنجیدہ ہو جائیں سکندر صاحب!“ وہ گڑ گڑائی۔ ”چلتے چل کر پلنگ پر بیٹھ جائیں۔“  
 ”اگر تمہیں سنجیدگی سے محبت بھری باتیں کرنا نہیں تو پستول لے کر آنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”یہ پستول...“ اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ کر مجھے سارا دیا اور پلنگ کی طرف بڑھی۔ میں نے چلتے ہوئے اسے چھیڑا ”کیا یہی اچھا ہوا کہ تم مجھے اسی طرح سارا دیتی ہوئی زندگی بھر چلتی رہو۔ آہ! میں کتنی فرحت محسوس کر رہا ہوں۔“

اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ زیر لب مسکرا کر رہ گئی۔ پھر اس نے مجھے پلنگ پر ٹکیوں کے سارے بٹھا دیا۔ میری جسم پر کپل لپیٹ دیا۔ خود کو اس اونٹنی شمال میں لپیٹ لیا جو اس نے المناری میں سے نکالی تھی۔ پھر وہ ایک کرسی کھینچ کر پلنگ کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ کرسی پر بیٹھی تو پوری طرح میری نظروں کی گرفت میں تھی۔ چند لمحے بعد وہ کرسی میں یوں سکر کر اور سٹ گئی جیسے اسے سردی لگ رہی ہو۔ پھر اس نے سکوت کو توڑا۔ ”آپ کی شاعرانہ باتوں سے تو اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ تیزی سے صحت یاب ہوتے جا رہے ہیں۔“

”قربانی کا جانور صحت مند ہی نظر آتا ہے۔“ میں یک لخت سنجیدہ ہو گیا۔ ”تمہید چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ مجھ سے کیا اگلو آنے آئی ہو؟“

”اگلو آنے آئی ہوں؟ کیا قتل طلب؟“ اس نے حیرانی سے میری طرف دیکھا۔ ”کیا آپ کو مجھ پر کوئی شبہ ہے؟“

کاروائی بھی کی جاسکے۔ یہ ایک بین الاقوامی گروہ ہے۔ جو اس ملک کی سالمیت کے خلاف سرگرم عمل ہے۔  
 ”کیا علیحدگی کی تحریک سے ملتی جلتی کوئی تحریک ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”علیحدگی کی کوئی تحریک نہیں بلکہ یہ کوئی بے حد خطرناک منصوبہ لگ رہا ہے۔“  
 ”مگر تم کون ہو؟“ میں متعجب ہو کر پوچھا۔ ”تمہارا نام سونیا ہے۔ تم شکل و صورت سے مقامی نہیں لگتی ہو۔ میرے نادیدہ دوست نے تم پر اعتبار کیسے کر لیا؟“

”جس طرح آپ کرل نیاز نہیں بلکہ سکندر ہیں اسی طرح میں بھی سونیا نہیں بلکہ جمیلہ ہوں۔ میرے والد نے ایک انڈونیشیا کی عورت سے شادی کی تھی اس لیے میرا نام نقشہ ذرا مختلف ہے۔ والد چٹا گانگ سے لاہور آ گئے کیوں کہ ان کا آبائی شہر لاہور تھا۔ میرے والد بھی فوج میں ملازم رہے۔ میں ایک فوجی کی بیٹی ہونے کے ناتے وطن کی سالمیت کے لیے میدان میں آئی ہوں اور وطن پرستوں کے ساتھ ہوں۔“

”اگر تم وطن پرست ہو تو میں بھی وطن پرست ہوں۔ کیا تم اس نکتے پر ایک احسان نہیں کر سکتیں؟“  
 ”کیسا احسان؟“ اس کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔ ”حکم کریں۔ آپ کی خدمت کرنا میں اپنا فرض سمجھوں گی۔“  
 ”مجھے میرے نادیدہ دوست کا نام یاد دلاؤ تاکہ میرا دل مطمئن ہو جائے۔“  
 ”میں مجبور ہوں، پلیز وہ نام جاننے کے لیے مجھے مجبور نہ کریں۔ نام جاننے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ وقت آنے پر آپ کے دوست خود ہی سامنے آجائیں گے۔“

”مگر میں ذہنی طور پر سرگرم جیسی عورت سے شادی کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔“  
 ”وہ کیوں...؟“ سونیا کے چہرے پر گہرا استعجاب چھا گیا۔

”میں ایسی عورت سے شادی کیسے کر سکتا ہوں جو وطن فروشوں کی ساتھی ہو۔ وہ ایک ظالم اور بے رحم عورت بھی تو ہے۔“

”کوئی مشن سامنے ہو، ملک کی بقا کا سوال ہو تو ایثار کرنا ہی پڑتا ہے۔ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا ہی پڑتا ہے۔“ اس نے کسمار کمر گہرا سانس لیا۔ ”میں اسی لیے جمیلہ سے سونیا بنی ہوں۔ آپ سرگرم ہی کو دیکھ لیں۔ وہ برسوں سے اپنے وطن کے لیے... ماتا ہری بنی ہوئی ہے۔ اس نے اپنے دشمن ملک کو نقصان پہنچانے کے لیے اپنی زندگی، اپنا مستقبل اور اپنی جوانی داؤ پر لگا رکھی ہے۔ اس نے ہمارے ملک کے اہم راز حاصل کرنے کے لیے کرل نجیب سے شادی کی۔ آخر اپنے شوہر کو اپنا ہم خیال اور اپنے ملک کا ایجنٹ بنا لیا۔ پھر ایک منصوبے کے تحت اس سے طلاق لے لی۔ اور پھر وہ ڈاکٹر عبدالغنی اور بلیقہ کے ہاں آپ کی بیوی بن کر جا پہنچی۔ اور آپ کو اغوا کر لیا۔ تاکہ آپ کو مرہو بنا سکے۔ وہ آپ سے شادی اسے لیے نہیں کر رہی کہ آپ پر فریفتہ ہو گئی ہے... یا آپ لاکھوں میں ایک ہیں۔ وہ اس ملک کو جڑ سے کزور کرنا چاہتی ہے۔ کیا آپ اس عورت سے پیچھے رہ جائیں گے؟ اس ملک سے محبت اور دوستی کے خالی خولی دعوے ہی کرتے رہیں گے؟“

سونیا کی باتوں نے مجھے قفل کر دیا۔ ”مجھ سے جیسا کہا جائے گا میں ویسا ہی کروں گا۔ میں شرمندہ ہوں۔“  
 ”اب آپ ہی پر ان کے منصوبے کی ناکامی اور ہماری... کامیابی کا دار و مدار ہے۔ آپ سے بہت ساری توقعات وابستہ ہیں۔“

ایک لحظہ مجھے کچھ احساس ہوا تو میں نے سراپمہ ہو کر... دروازے کی طرف دیکھا۔ اس نے مجھے پریشان دیکھ کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“

”وہ کرل نیاز احمد نہیں بلکہ کرل نجیب الرحمان تھا۔“

”کرل نجیب...؟ یہ کیا بلا ہے؟“

”کرل نجیب سرگرم کا پہلا شوہر تھا۔ ان دونوں کا تعلق اسی شہر سے ہے۔ کرل نجیب ایک ایسے منصوبے کے تحت روپوش ہے جو کسی لمحے ملک کی سالمیت کے لیے خطرے کا باعث بن سکتا ہے۔ کرل نیاز احمد کو کسی سازش کے تحت قتل کر دیا گیا ہے۔ یا پھر اسے قتل کر دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ وہ ان کالی بھٹیوں میں شامل ہونا نہیں چاہتا تھا۔ جو دشمن کے اشاروں پر سرگرم عمل ہیں۔ آپ کو کرل نیاز اس لیے بتایا گیا ہے کہ آپ اس کے ہم شکل ہیں۔“

”میں کرل نیاز احمد کا ہم شکل ہوں؟“ میرا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ ”کیا ایسا ممکن ہے؟“

”قدرت کے کارخانے میں کیا ممکن نہیں؟ اس نے کچھ سوچ کر ہی آپ دونوں کو ہم شکل بنایا ہو گا۔“

”مگر ہم دونوں نہ تو ایک ماں باپ کے بیٹے ہیں اور نہ ہی ایک خاندان کے افراد ہیں۔“

”دنیا میں بڑے عجیب اتفاقات پیش آتے ہیں۔ یہ بھی ایک اتفاق ہی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”سرگرم نے کرل نجیب سے طلاق لی تو یہ بھی اس منصوبے کی ایک اہم کڑی ہے۔ اکل کا اصل نام... بھمل بسواس ہے۔ اکل اور ظہیر رحمان غیر ملکی ایجنٹ ہیں لہذا اب آپ کو کرل بن کر رہنا ہو گا۔“

”وہ کس لیے؟“

”آپ کو ان کے منصوبے کا پتہ چلانا ہے۔ اور یہ دیکھنا ہے کہ وہ آپ کو کرل نیاز بنا کر کیا مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں؟“

”مگر کیا میں ان کے منصوبے کا پتہ چلا سکوں گا؟ یہ لوگ تو مجھے ہوا بھی نہیں لگتے دیں گے۔“

”منصوبے کا پتہ چل سکتا ہے... مگر یہ سب کچھ آپ پر منحصر ہے۔“

”میں کوشش کروں گا۔ لیکن مجھے اپنی کامیابی کی امید نظر نہیں آتی۔ میں سراغ رسائی کے فن سے ناواقف ہوں؟“

”اس کے لیے سراغ رسائی کی نہیں بلکہ اداکاری کرنے اور کسی کو اپنے اعتماد میں لینے کی ضرورت ہے۔“

”اداکاری تو میں ایسی کروں گا کہ دنیا کے بڑے بڑے اداکار بھی عیش عیش کر انھیں گے۔“ میں نے کہا۔

لیکن اعتماد میں کس کو لینا ہو گا؟

”اپنی حسین و جمیل بیوی کو...“ سونیا کے لمحے میں شوخی عود کر آئی۔

”میری بیوی...؟“ میں نے حیرت سے اس کی صورت دیکھی۔ ”میری تو شادی ہی نہیں ہوئی۔ ہاتھ میں شادی کی لکیر بھی نہیں ہے۔“

”آپ کی ہونے والی بیوی سرگرم... آپ کو سرگرم کو اعتماد میں لینا ہو گا۔“ وہ کہنے لگی۔ ”شادی کے بعد اس کا ہر حکم بلا چون و چرا ماننے رہیں۔ اس کے اشاروں پر کچھ بتلی کی طرح ناچیں۔ اور اپنے آپ کو بھول جائیں۔ خود کو کرل نیاز ہی سمجھیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ وہ آپ کو اپنا منصوبہ نہ بتائے۔ آپ کو منصوبہ بتائے بغیر وہ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔“

”منصوبے کا علم ہونے کے بعد کیا کروں؟ کیا میں فراز ہو کر اپنے گھر پہنچ جاؤں۔“

”ہم میں سے کوئی نہ کوئی آپ سے رابطہ قائم کر لے گا۔ تاکہ منصوبے کا علم ہوتے ہی ان کے خلاف کوئی



”ہم اس آزادی سے باتیں کر رہے ہیں۔ یہ آوازیں سرگم کے کمرے تک تو نہیں جاری ہوں گی؟“  
 ”اس کی فکر نہ کریں۔“ سونیا کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”وہ صبح دس بجے سے پہلے بیدار نہیں ہوگی۔“  
 ”وہ کیوں؟“

”میں نے اس کی کافی میں نشہ آور دوا ملا دی تھی۔ وہ مدہوش پڑی ہوئی ہوگی۔ چل کر دیکھو گے۔“  
 ”تم میری نظروں کے سامنے ہو تو اسے دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔“ میں نے اس کے گلابی چہرے پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ”میرے دوست نے تمہارا انتخاب بہت درست کیا ہے۔ مجھے معلوم... نہیں تھا کہ تم اتنی ذہین اور قاتل ہو۔ اس پرستم یہ کہ تم بلا کی حسین بھی ہو۔“

”آپ پر دوبارہ شاعری کا دورہ پڑ رہا ہے۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔ ”آپ نے پھر ہنسی، ہنسی باتیں شروع کر دی ہیں۔ اب میں چلتی ہوں۔“

”اس میں میرا نہیں بلکہ شراب کا قصور ہے۔“

”شراب...؟ شراب کہاں ہے؟“ اس نے معصومیت سے پوچھا۔

”ان آنکھوں میں۔“ میں نے اس کی حسین آنکھوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ آنکھیں مجھے اتنی دیر سے پلا رہی تھیں۔“

”اچھا! وہ کھل کر ہنس پڑی۔“ خدا آپ پر رحم فرمائے۔ سرگم سے شادی ہونے کے بعد تو آپ ہاتھ سے گئے؟“

”وہ کیسے؟“

”سرگم پرانی شراب کی مانند ہے۔ اس کا شمار ذہن سے نہیں اترتا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ اپنے ساتھ ساتھ اپنے مقصد اور وطن کو بھی بھول جائیں۔ حسین عورتیں تو ہزاروں مل سکتی ہیں۔ کھویا ہوا وطن دوبارہ نہیں مل سکتا۔“

”عورت کا جادو مجھ پر بہت کم چلا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”بے فکر رہو۔ میں غافل نہیں رہوں گا۔ اور اس ناگن کا سر پکچل کر رہوں گا۔“

”اچھا سکندر صاحب!“ اس نے اونی شال تیر کر کے واپس الماری میں رکھ دی اور میرے پاس آئی ”آپ سے جلد ہی ملاقات ہوگی۔“

”خدا حافظ!“ میں نے گرم جوشی سے کہا۔ ”میری کامیابی کے لیے دعا کرنا۔“

”سونیا چلی گئی لیکن جاتے جاتے اپنی منک چھوڑ گئی۔ وہ میرے دماغ پر چھا گئی تھی۔ کسی بدلی کی طرح اس لیے نہیں کہ وہ حسین اور جوان تھی۔ بلکہ اس لیے کہ اس کے دل میں... وطن کے لیے گمراہ جذبہ تھا۔ کیسی انمول لڑکی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے میں نے کوئی خواب دیکھا ہو۔ وہ میرے حواس پر چھا گئی تھی۔ اور میں دیر تک اسی کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔“

شبید سردی میں نرم و گرم بستر میں دبا کر رہنے کے باوجود نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میری نیند سونیا کی عظیم شخصیت لے گئی تھی۔ میں نے آگنا کر میز سے سگریٹ کیس اٹھایا۔ چائے اور سگریٹ کی طلب ہو رہی

تھی۔ چائے اور کافی مل سکتی تھی۔ مگر میں سونیا کو زحمت نہیں دینا چاہتا تھا۔ سگریٹ کیس کھولا تو دفعتاً مجھے یاد آیا کہ میں نے سونیا سے ذکیہ خانم کے بارے میں تو کچھ پوچھا ہی نہیں تھا۔ اور نہ یہ دریافت کیا کہ میں کس جگہ ہوں۔ سونیا سے میں ذکیہ خانم کے بارے میں معلوم کر لیتا تو میرے لیے کتنا اچھا ہوتا۔ شاید اسے بھی بتانا یاد نہیں رہا۔ اس میں کچھ غلطی میری بھی تھی۔ جو میں چھٹیڑھاڑ میں لگ گیا تھا۔ ذکیہ خانم کے بارے میں علم ہو جانا تو دوست اور دشمن میں امتیاز آسان ہو جاتی۔ پھر خیال آیا کہ ذکیہ خانم، نیاز کی دوست ہی ہوگی۔ شاید وہ بھی کسی فوجی کی بیٹی ہوگی۔ وہ شاید ان خطرات سے آگاہ تھی۔ جو میرے گرد منڈلا رہے تھے۔ اور اسے سرگم کے ارادوں کا علم ہو گیا ہو گا۔ جیسی تو وہ مجھے ہر قیمت پر یہاں سے نکال لے جانا چاہتی تھی۔

میں سگریٹ کے کش لیتا ہوا سونیا کی باتوں کی روشنی میں غور کرنے لگا۔ کہ مجھے حالات کا کس طرح مقابلہ کرنا چاہئے۔ میں کس طرح اپنے آپ کو اہل ثابت کر سکتا ہوں۔ میں تو ایک جیب تراش ہوں۔ نہ کسی فلم کا ہیرو اور نہ ہی زندگی کے سٹیج کا۔ فوجی بھی نہیں ہوں اور غیر معمولی آدمی بھی نہیں ہوں۔ ایک عام شخص ہوں۔ مجھے سامنے اندھیرا سا دکھائی دے رہا تھا۔ اس اندھیرے میں میرا ناییدہ اور مہربان دوست حوصلے کی کرن بن کر نمودار ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ خدا کی ذات پر... بھروسہ کرنے سے ہر مشکل کام آسان ہو جاتا ہے۔ یہ کام بھی آسان ہو جائے گا۔ اب بہت ساری باتیں میری سمجھ میں آ رہی تھیں۔ کرٹل نجیب جب مجھ سے ملنے آیا تھا تو وہ مجھے دیکھتے ہی کیوں چونکا تھا۔ اسے میرے کرٹل نیاز سے حیرت انگیز مماثلت پر حیرت ہوئی ہوگی۔ مجھے یہاں جس مقصد کے لیے لایا گیا تھا۔ اس کا پس منظر شاید یہ تھا کہ مجھ سے ایک ایسا کام لیا جائے والا تھا جو میرے کرٹل نیاز کے بغیر انجام نہیں پاسکتا تھا۔

مگر اس حسین عورت کا معرہ میں ابھی تک حل نہیں کر سکا تھا۔ جو ساحل سمندر پر مجھے قتل کرنے کے ارادے سے لے گئی تھی۔ میں اس کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ آنکھ لگ گئی۔ جب میں نیند سے بیدار ہوا تو صبح ہو چکی تھی۔ دن خلاصہ چڑھ آیا تھا۔ میں ہاتھ روم جانے کے لیے بستر سے اترتا محسوس ہوا کہ کسی قدر توانائی لوٹ آئی ہے۔ جب میں ہاتھ روم سے آکر لٹاؤ تھکن سی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن اتنی نہیں جتنی پہلے تھی۔

کوئی دس پندرہ منٹ بعد میرے کمرے کا دروازہ کھلا۔ سرگم کا سر لیا نمودار ہوا۔ وہ ہاتھوں میں ٹرے سنبھالے کمرے میں داخل ہوئی۔ ٹرے میں ناشتہ سجا ہوا تھا۔ ناشتے سے زیادہ سرگم نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اس کے ریشمی سیاہ بال شانوں پر بے ترتیب پڑے تھے۔ جس نے اس کے حسن میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ اس کی بڑی بڑی جمیل جھکی آنکھوں کی گہرائیوں میں نیند کا شمار بھرا ہوا تھا۔ مجھ پر نشہ سا چھانے لگا۔ اس کے رخساروں پر شوق کی سرفری دھبہ رہی تھی۔ وہ محل کے گاون میں لمبوس تھی۔ پھر بھی سر لیا اپنی الگ شان دکھا رہا تھا۔

اس نے میز کے قریب پہنچ کر ٹرے رکھ دی۔ پھر میری طرف گھوم کر مسکرائی تو اس کے منہ سے پھول جھرنے لگے تھے۔ ”طبیعت کیسی ہے کرٹل!“

”کل سے تو بہتر ہوں۔ رات نیند بھی خوب آئی۔ کچھ دیر پہلے ہی جاگا ہوں۔“

”آج ناشتے میں بہت دیر ہو گئی معافی چاہتی ہوں۔ کل سے ٹھیک وقت پر ناشتہ مل جائے گا۔“ وہ جھل نظر آنے لگی۔

”تمہاری ملازمہ سونیا کہاں ہے؟ وہ ناشتہ لے کر کیوں نہیں آئی؟ تم نے کیوں زحمت کی؟“ میں نے انجان بن کر پوچھا۔

وہ جتنی دیر میری نظروں کے سامنے رہی میری آنکھوں میں جذب ہوتی رہی۔ وہ اس قدر متاثر کن نظر آ رہی تھی کہ لمبے بھر کے لیے بھی نظریں اس کے سر پہا سے الگ نہیں ہو رہی تھیں۔ اور نہ ہی ان کی پیاس بھگ رہی تھی۔ ناشتے کے بعد وہ کافی پیچ ہوئی بولی۔ ”میں خریداری کے لیے صدر جاری ہوں۔ واپسی میں دو ایک گھنٹے لگ جائیں گے۔ اکیلے گھبراؤ گے تو نہیں؟“

”میں کوئی بچہ تو ڈھائی ہوں جو گھبرا جاؤں گا۔ البتہ... میں نے اس پر ایک اچھٹی سی نظر ڈالی۔

”البتہ کیا؟“ اس نے تجسس نظروں سے دیکھا۔

”میں یہ دو صدیاں کیسے کاٹ سکوں گا؟“

”دو تین صدیاں نہیں صرف دو تین گھنٹے۔“ وہ میری بات نہیں سمجھی تھی۔ ”تین گھنٹے تو پلک جھپکتے میں گزر جائیں گے۔

”غالبوں کے لیے تین گھنٹے تین لمبے بھی ہو سکتے ہیں۔ مگر مجھ غریب کے لیے تین صدیوں سے کم نہیں ہوں گے۔ اب تو تمہارے بغیر ایک لمحہ بھی نہیں کاٹ سکتا یہ تین گھنٹے کیسے گزریں گے؟“

وہ میری بات کی نہ تک پہنچ کر بے اختیار مسکرا دی۔ اس کا چہرہ گلابی ہو گیا۔ ”کرل تمہاری شوخی بڑھتی جا رہی ہے۔“

”ایک تو تم نے مجھے میری یادداشت سے محروم کر دیا اور اب اپنی قربت سے تین گھنٹے کے لیے محروم کر رہی ہو۔“

”میں نے تمہیں یادداشت سے محروم کر دیا؟“ وہ ایک دم سے گھبرا گئی۔ ”وہ کیسے؟ تمہیں کس نے بتایا؟“

”تمہارے اس چہرے اور سر پہا نے مجھ سے میرا حافظہ چھین لیا۔ اگر تم اتنی حسین نہ ہو تیں تو شاید میری یادداشت نہ جاتی۔“

”اچھا! اب میں چلتی ہوں۔“ وہ لجا کر بولی۔ ”تم رونا تک ہو رہے ہو۔ اگر میں بھی باتوں میں بہہ گئی تو کام دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔ میں تمہارے لیے تھرا میں کافی اور پلیٹ میں سینڈو چیز بنا کر رکھ جاؤں گی۔ بھوک لگے تو کھا پی لیتا۔ چلنا پھرنا بالکل نہیں۔ تمہارے زخم ابھی کچے ہیں۔ کل ظہیر رحمان ترس لے کر آئے گا تو تمہاری پٹیاں بدل دی جائیں گی۔“

وہ کسی نازک سی ہری بھری سی ڈال کی طرح چمکتی ہوئی چلی گئی۔ دس منٹ بعد آئی تو اپنے ہاتھوں میں ٹرے لے کر آئی تھی۔ جس میں تھرا میں کافی کا پتہ تھا۔ ایک پلیٹ میں سینڈو چیز تھے۔ جو پلاسٹک تھیلی میں پیک تھے۔ نشوونہو کا ایک ڈبہ بھی تھا۔ وہ اپنا لباس بھی تبدیل کر آئی تھی۔ گہرے بھورے رنگ کی ساڑھی پہناؤ اور اسی رنگ کا اوئی سویٹر جو پوری آستین کا تھا۔ ٹھوس نے بالوں کا جو ڈاباندہ لیا تھا۔ اور کسی اعلیٰ گھرانے کی بیگم لگ رہی تھی۔ پلوکار اور نقیس سی... پھر میرے ٹرے رکھ کر وہ مجھ پر اپنی دل کش مسکراہٹ نچھاور کرتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

کوئی پانچ منٹ بعد میں نے موزیوٹ کا انجن شارت ہونے کی آواز سنی۔ میں فوراً سی پلنگ سے اتر کر کھڑکی کے پاس پہنچا... موزیوٹ کے انجن کی آواز معدوم ہوتی چلی گئی۔ اب میں تھرا میں آنا تھا اور تھلی تھی۔

میں کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر دروازے سے نکل آیا۔ زینے پر قدم رکھا تو آزادی کا احساس ہوا۔ اور ایک نامعلوم سی خوشی محسوس ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی گھر کو اندر سے دیکھنے کی خواہش ایک دم سے بھڑک اٹھی۔

”سونیا...؟ میں نے آج اسے چھٹی دے دی۔ وہ علی الصبح ہی چلی گئی۔“

”وہ کیوں؟“

”وہ کام چور بہت تھی، کابل اور ست بھی تھی۔ پھر حسین اور نوجوان نوکرائیوں کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔“

”گھر کے مردوں پر ڈورے ڈالنے لگتی ہیں؟“

”ہاں!“ اس نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ ”وہ ظہیر رحمان پر ڈورے ڈال رہی تھی تاکہ اس کی جیب صاف کر سکے۔“

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ”میرے ناشتے کی وجہ سے تمہیں اپنی نیند خراب کرنا پڑی۔ تمہاری آنکھوں میں ابھی تک نیند بھری ہوئی ہے۔“

”بستر سے نکلنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔“ وہ بولی۔ ”مہوشی سی طاری تھی۔ جیسے کسی نے منہ کی کوئی چیز گھول کر پلا دی ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم تیار ہو کر ناشتے کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ آئی ایم سوری کرل!“

اس نے میری پشت پر دو ٹکے رکھے تو میں آرام سے بیٹھ گیا۔ پھر اس نے ٹرے میری گود میں رکھ دی۔ ”تم ناشتہ کرو۔ اسٹے میں‘ میں بھی تیار ہو کر اور کافی بنا کر لے آتی ہوں۔ صرف دس منٹ میں۔“

وہ لمراتی ہوئی چلی گئی۔ ناشتے کو دیکھا تو بھوک چمک اٹھی۔ ٹرے میں چکن سوپ، سلاکس، مکھن، دودھ، کارن فلیکس اور ہاف فرائی انڈے تھے۔ چکن سوپ گرم گرم تھا۔ اس میں سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔

میں ناشتہ کر چکا تو وہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی اس بار وہ کالے رنگ کی قیض اور جینز میں تھی۔ اوپر سے کالے رنگ کا چری جیکٹ پہن رکھا تھا۔ اور اس پر کسی امریکی عورت کا گاماں ہو رہا تھا۔

ٹرے میں میرے لیے کافی لے کر آئی تھی۔ اس نے کافی کا گم میری طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ”ناشتہ کم تو نہیں پڑا؟“

”یہ ناشتہ تو مجھے بھوکا مار دے گا۔ اس سے نہ تو پیٹ بھر سکتا ہے۔ اور نہ ہی طبیعت سیر ہو سکتی ہے۔“ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

”ناشتے میں جو کھانا چاہتے ہو تا دو کل سے شکایت نہ ہوگی۔“

”جب تم کسی ملازمہ کا بندوبست کر لو گی تو تب بتاؤں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ تم میری خاطر کچن میں قید ہو کر رہ جاؤ۔“

”میں اب کوئی ملازمہ نہیں رکھوں گی۔ میرے ہوتے ہوئے کسی ملازمہ کی ضرورت بھی کیا ہے؟“

میں نے متوجہ نظروں سے اس طرف دیکھا۔ ”کیا تم خود پلواری جی خانے اور لھر کی صفائی کا کام سنبھال لو گی؟“

”ہاں!“ اس نے اپنا خوش نما سر ہلایا۔ پھر اس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا کہ میری رگوں میں بجلی کی لہریں سی سنسانے لگیں۔ ”میں بیشہ بیشہ کے لیے تمہاری قیدی بن چکی ہوں۔ مجھے آج سے اپنی کینز سمجھو۔ جو کام دو گے وہ میرے سر آنکھوں پر ہو گا۔“

”قیدی تو میں ہوں ملکہ عالیہ!“ میں نے کورنش کے انداز میں کہا۔ ”کیس ملکہ بھی غلام ہوتی ہے۔ وہ تو مردوں کو غلام بنا کر رکھتی ہے۔“

”تم نے مجھے اپنے دل کے قید خانے میں بند کر لیا ہے کرل!“ وہ چمک اٹھی۔ ”نہ تو میں کہیں آ سکتی ہوں اور نہ ہی جا سکتی ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ تمہاری نظروں کے سامنے ہی رہوں۔ ایک لمحے کے لیے بھی دور نہ جاؤں۔“

میں نے زینے پر کھڑے ہو کر نیچے کا جائزہ لیا۔ یہ زینہ ایک بے حد کشادہ کمرے کی طرف جاتا تھا۔ اس کی آرائش و زیبائش جن لوازمات سے کی گئی تھی، ان سے سرگرم کی ادارت، اس کے ذوق کا اندازہ ہوتا تھا۔ نیچے تین کمرے نظر آ رہے تھے۔ ایک لاہوری بھی تھی۔ میں بیڑھیاں اتر کر نیچے آیا تو کمزوری کا احساس ہوا۔ میں ایک سوئے پر بیٹھ کر سستانے لگا۔ چند لمحوں کے بعد اٹھاب سے پہلے ان تین کمروں میں بھانکا جنہیں بطور خواب گاہ استعمال کیا جاتا تھا۔ میں راہ داری کی طرف بیٹھا تو وہ... کچن اور ایک سنور روم پر جا کر ختم ہو گئی، سنور روم میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ کچن میں آیا ہو کسی بڑے ہال سے کم نہیں تھا۔ کچن امریکن طرز کا بنا ہوا تھا۔ ایک پرافرچ اور ڈسپ فریڈز بھی موجود تھا۔ انہیں باری باری کھول کر دیکھا تو وہ کھانے پینے کی چیزوں سے بھرے ہوئے تھے۔

گو میں بہت زیادہ نہیں چلا پھرا تھا، مگر میری سانس اس طرح پھول رہی تھی جیسے میں میلوں سے دوڑنا چلا آ رہا ہوں۔ کچن میں ایک طرف کھانے کی میز اور اس کے گرد چھ کرسیاں تھیں۔ میز پر ایک اخبار پڑا ہوا تھا۔ میں سانس درست کرنے کی غرض سے کرسی پر جا بیٹھا۔ سانس بحال ہوئیں تو میں نے اخبار اٹھا کر دیکھا۔ اخبار کئی دن پرانا لگ رہا تھا۔ اس پر یکم نومبر کی تاریخ درج تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آج کیا تاریخ ہے اور میں کتنے دنوں تک بے ہوشی کی حالت میں رہا ہوں۔

میں نے ایک صفحہ ہٹا دیا۔ میری نظر ایک حسین عورت کی تصویر پر پڑی۔ یہ تصویر دیکھ کر یوں لگا جیسے اس عورت کو میں نے پہلے کبھی دیکھا ہے۔ کمال دیکھا ہے؟ دوسرے ہی لمحے میرے ذہن کے تاریک گوشے روشن ہو گئے۔ یہ وہی عورت تھی جس نے مجھے دیرانے میں لے جا کر قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں اچھل پڑا۔ خبر کی سرفی تھی۔

### بیگم نجمہ نیاز کشتی کے حلوئے میں ہلاک ہو گئیں

کراچی، یکم نومبر (مناحدہ خصوصی) کل شام کیمناڑی میں ایک لالچ اور کشتی کے آپس میں ٹکرا جانے کے باعث کشتی میں بیٹھے ہوئے پانچ افراد ڈوب کر ہلاک ہو گئے۔ ان میں بیگم نجمہ نیاز احمد بھی تھیں جو کرل نیاز احمد کی اہلیہ تھیں۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کشتی میں سیر کر رہی تھیں۔ کہ حادثہ پیش آگیا۔ ان کے شوہران دونوں ملک سے باہر ہیں۔ ان سے کوئی رابطہ قائم نہیں ہو سکا ہے۔

اس خبر میں حادثے اور مرنے والوں کے بارے میں اور بھی تفصیلات درج تھیں۔ مگر میں نے پوری خبر پڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ میرے لیے اتنی ہی خبر کافی تھی۔ اس خبر نے میری نظروں کے سامنے سے ایک پردہ سا ہٹا دیا تھا اور وہ مع آب و آہ، آپ مل ہو گیا تھا۔ جس نے مجھے انھن میں جھلا کر رکھا تھا۔ بیگم نجمہ نیاز نے مجھے اس لیے قتل کرنے کی کوشش کی تھی کہ میں اس کے شوہر کا نام شکل تھا۔ اس کے کانوں میں اس منصوبے کی ہینک بڑھ گئی ہوگی کہ سرگم کا کردہ اس کے شوہر کو قتل کر کے یا غائب کر کے مجھ سے وہ کام لینا چاہتا ہے جو کرل نیاز سے لینا ممکن نہیں ہو سکتا۔ کرل نیاز نے شاید اس سازش میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ جی بیگم نیاز نے سوچا ہو گا کہ کیوں نہ وہ قتل کی اصل جز کو ہی کاٹ کر پھینک دے۔ یعنی میرا پتا صاف کر دے۔ نہ رہے گا بانس اور نہ بچے کی بانسری، مگر وہ اپنے اس منصوبے میں بڑی طرح ناکام ہو گئی تھی۔ بیگم نجمہ نے مجھ پر جو قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ کسی طرح سرگم کو اس کا علم ہو گیا ہو گا۔ سرگم نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت بیگم نجمہ کو کشتی کے حادثے میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ گویا سرگم اور اس کے گردہ نے اپنی راہ کی ہر رکاوٹ کو بڑی آسانی اور مہارت سے ہٹا دیا تھا۔

مجھے کچن میں ٹھکن کا احساس ہوا تو میں نشست گاہ کے دروازے سے باہر آگیا۔ اب میں اس مسئلے پر سوچ

سوچ کر اپنے ذہن کو مزید نہیں الجھانا چاہتا تھا۔ یوں بھی سوچنے کے لیے ابھی بہت وقت پڑا تھا۔ کھلی فضا میں پہنچ کر سانس لیتے ہی ایسا محسوس ہوا جیسے برسوں کی قید سے رہائی مل گئی ہو۔

باہر شدید سردی تھی۔ تیز ہوائیں سنسناری تھیں مگر چٹکی دھوپ نے اس کا اثر کسی حد تک زائل کر دیا تھا۔ دھوپ اچھی لگ رہی تھی۔ میں برآمدے سے نکلا اور ایک ایسی جگہ پہنچا جو اونچی تھی۔ سب سے پہلے اس کا بیج نما گھر کا جائزہ لیا۔ یہ ٹیلا تین ستونوں سے پانی سے گھرا ہوا تھا۔ ایک سمت میں خشکی کا راستہ تھا جو معلوم نہیں کہاں جاتا تھا۔ فرلانگ دو فرلانگ کے فاصلے پر دو ایک ٹیلے اور خاصی دور خشکی پر دو ایک ہٹس نظر آ رہی تھیں۔ اس ٹیلے کے علاوہ کسی اور ٹیلے پر کوئی کا بیج نہیں تھا۔ اور نہ ہی میرے سوا کوئی آدم زاد تھا۔ ہر طرف گھرا ستانا طاری تھا۔ بہت سکون محسوس ہو رہا تھا۔ فضا بڑی خوب ناک تھی۔ نم آلود ہوا میں مٹی کی سوندھی سوندھی ملک رچی ہوئی تھی۔

سامنے ہی گودی تھی جہاں موٹر بوٹ کھڑی کی جاتی تھی۔ اور پھر اسے سی سے باندھ دیا جاتا تھا۔ اس وقت وہاں کوئی موٹر بوٹ نہیں تھی۔ مجھے اپنا کمرہ بھی نظر آ رہا تھا۔ جو پہلی منزل پر واقع تھا۔ جھٹ پر بھی ایک کمرہ بنا ہوا تھا۔ اس کا بیج کے احاطے میں درخت اور پودے بھی تھے۔ کیاریاں بھی تھیں۔ میں تیز ہواؤں سے بچنے کے لیے جھٹبی جھے کی طرف چلا گیا۔ وہاں سروٹ کو اڑتے تھے۔ اس میں شاید سونا یا قیمتی تھی۔

میں کچھ دیر کھڑا دھوپ کھاتا رہا۔ میرے علم میں آچکا تھا کہ میں کراچی ہی کے کسی دور افتادہ ساحلی مقام پر ہوں۔ دور بہت دور ایک آبادی نظر آ رہی تھی۔ شاید وہ منوڑا تھا۔ میں جب چاروں طرف کا جائزہ لے چکا تو اندر چلا آیا۔ اب سردی ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔ زخموں میں درد کی جواہرں اٹھ رہی تھیں ان کی وجہ سے کھڑا ہونا دوبار ہو رہا تھا۔

میں ایک خواب گاہ میں داخل ہوا تاکہ کچھ دیر سستا کر اپنے کمرے میں جاؤں۔ خواب گاہ میں داخل ہوتے ہیں میں اچھل پڑا۔ دہشت کی ایک سرد لہر میرے جسم میں اتری اور ریڑھ کی ہڈی کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ دھیرے سے ہی لمبے میں ہٹس پڑا۔ میں سنگھار میز کے قد آدم آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا تھا۔ میں نے اس گھر میں پہلی بار آئینہ دیکھا تھا۔ نہ تو میرے کمرے میں کوئی آئینہ تھا اور نہ ہاتھ میں تھا۔ ہاتھ روم میں دیوار پر جو نشان تھا، اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہاں آئینہ لگا ہوا تھا۔ جسے کسی وجہ سے نکال لیا گیا تھا۔ مجھے اپنے آپ کو اس حالت میں دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اب جو آئینے میں دیکھا تو اپنی ہیئت کڈائی پر ہنسی آ رہی تھی۔

میرا چہرہ بیٹوں میں چھپا ہوا تھا۔ اور صرف آنکھیں ہی چمکتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ میری حالت کسی نقاب پوش جیسی تھی۔ میں چند لمحوں تک اپنا جائزہ لیتا رہا۔ پھر کمرے کا جائزہ لیا تو ایسا لگا کہ یہ سرگم کی خواب گاہ ہے۔ سرگم کا لباس پینک پر کچھ پڑا تھا۔ اس کے سلپرز سینڈل اور سنگھار میز پر میک اپ کے لوازمات نظر آ رہے تھے۔

اس خواب گاہ میں لکھنے پڑھنے کی ایک میز تھی۔ میز پر انگریزی کے چند ناول اور رسالے نظر آ رہے تھے۔ میں نے ان ناولوں اور رسالوں کو سرسری انداز سے دیکھا۔ اس قسم کی کتابیں، رسالے شریف گھر کی عورتیں بھی نہیں پڑھ سکتی تھیں۔ ان رسالوں اور کتابوں سے اس کے آوارہ مزاج ہونے کا اندازہ ہوتا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ گھر میں ٹیلی ویژن اور وی سی آر نہیں تھا۔

میں نے میز کی دراز کھولی تو اس میں ایک کالج میگزین نظر آیا۔ میں اس میگزین کو دیکھ کر چونک پڑا اور بے انتہا خوشی بھی ہوئی کیوں کہ یہ میگزین میرے کالج کا تھا۔ اس کے سرورق پر... ۱۹۶۳ء-۱۹۶۵ء کا سن چھپا ہوا دیکھا تو

کہ کسی کے ہاتھ لگنا ممکن نہ تھا۔

میں نے اشاراتی پیغام کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے بعد کافز کو دوبارہ پہلے کی طرح سگریٹ کیس کے اندر چمکادیا اور اس کے چاروں کونوں کو اچھی طرح دلیا۔ میں سگریٹ پیٹے ہوئے ان حروف کے بارے میں سوچتا رہا۔ جو کسی معنی سے کم نہیں تھے۔ اور انہیں حل کرنا ناممکن نظر آ رہا تھا۔ مجھے کوئی کام نہیں تھا لہذا یہ معہ میری دل چسپی اور وقت گزاری کا مشغلہ بن گیا۔

سوچتے سوچتے آنکھ کب لگی کچھ پتہ نہ چلا۔ آنکھ کھلی تو سرگرم بستر کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ ابھی ابھی اور پریشان سی ہے۔ اس کے چہرے کی شبابی رنگت پر زردی غالب آگئی تھی۔ اس کے چہرے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ خوف زدہ ہے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے دل کی اضطرابی کیفیت جھانک رہی تھی۔

”کرل!“ اس نے مجھے بیدار دیکھا تو پچھلی سی مسکراہٹ سے پوچھا۔ ”طبیعت کیسی ہے۔“  
”طبیعت تو ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”رات ہوتی تو تمہارے انتظار میں تارے گن کر رات کاٹ لیتا۔ دن تھا“ اس لیے سو گیا۔“

”کرل ڈیر!“ وہ میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”میں تمہاری پسند کا برانڈ لے کر آئی ہوں“ جو بڑی مشکل سے ملا ہے۔“ میں نے تکیے پر گردن گھما کر میز کی طرف دیکھا وہیں ۵۵۵ کے سگریٹ کا ایک کارٹن رکھا ہوا تھا۔ ”میں تمہارے لیے پھیلی اور جھینگے بھی لائی ہوں۔ اب تم اٹھ کر منہ ہاتھ دھو سکتے ہو“ دھو لو، نہیں تو میں دھلا دوں!“

”شکریہ“ میں نے کہا۔ ”تم میرا کتنا خیال رکھتی ہو“ سنا ہے کہ شیرمنہ نہیں دھویا کرتے۔“  
”میں تمہارا خیال نہیں رکھوں گی تو اور کون رکھے گا؟“ پچھلی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ ”میں چائنیز کھانے لے آئی ہوں۔ میں کپڑے تبدیل کر کے انہیں گرم کرتی ہوں۔“  
وہ جتنی بار بھی کمرے میں آئی، میں نے اسے متوحش پایا۔

جیسے جیسے دن ڈھلتا جا رہا تھا، اس کی پریشانی اور اضطراب میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ پریشانی کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اور میں نے پوچھنا بھی مناسب نہ سمجھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ خود ہی کچھ بتائے۔ اس نے دو ایک بار مجھ سے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن کچھ سوچ کر رہ گئی۔ میں خاموش تماشائی بنا اس کی بے چینی کا تماشہ دیکھا رہا۔

دن میں سونے کی وجہ سے رات گیارہ بجے تک میں جاگتا رہا۔ اور جب میری پلکیں خنید سے بھاری ہونے لگیں تو میں نے کہیں دور سے موثر بوٹ کے انجن کی آواز سنی۔ آواز لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جا رہی تھی۔ میری نیند اڑ گئی۔ اور میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔

اتنی رات گئے کون آ رہا ہے۔ شدید سردی تھی۔ اور باہر سنسناتی ہوئی تیز ہوا کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر خیال آیا کہ ظہیر رحمان ہو گا۔ مگر اسے تو کل آنا تھا۔ وہ کل ٹرس کو ساتھ لے کر آنے والا تھا۔ اس بات کا بھی امکان تھا کہ وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر سرگرم کے پاس آ رہا ہو۔ سرگرم کے دیوانوں میں سے رہا ہو گا۔ وہ رنگین مزاج اور عیاش آدمی تھا۔ سرگرم کا حسن بھی تو ایسا تھا کہ کسی بھی مرد کو پاگل بنا سکتا تھا۔

دس منٹ بعد ایک موثر بوٹ گودی میں آ کر رکی۔ پھر چند منٹ تک گھراستا رہا۔ موثر بوٹ کے رکتے ہی انجن بند ہو گیا تھا۔ پھر میں نے باتوں کی آوازیں سنیں۔ سرگرم اور ایک مرد آپس میں تیز لہجے میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک لفظ بھی میرے لیے نہیں پڑا تھا۔ سرگرم دو ایک بار ہڈیانی انداز میں چینی بھی تھی۔ مرد کا لہجہ بھی پھیلی تھا۔

میرا ہاتھ بے اختیار اس کی طرف بڑھ گیا۔ ان دنوں میں اسی کالج میں پڑھتا تھا۔ میں نے اسی سال گھریلو حالات کی وجہ سے اپنی تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔ میں کالج یونین کا جنرل سیکرٹری ہوا کرتا تھا۔ میں رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا تو میری نظر اس صفحے پر جم کر رہ گئی۔ جس میں میری تصویر چھپی تھی۔ میری تصویر کے گرد سرخ روشنی سے ایک دائرہ کھینچا ہوا تھا۔ میری تصویر کے برابر ایک اور تصویر تھی۔ جو الگ سے چسپاں کی ہوئی تھی۔ یہ کرل نیاز کی تصویر تھی۔ اس تصویر کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ زیادہ پرانی نہ ہو۔ جب کہ میری تصویر پرانی تھی۔ لیکن میری تصویر دیکھ کر ہر کوئی بڑی آسانی سے کہہ سکتا تھا کہ وہ کرل نیاز کی جوانی کی تصویر ہے۔ ان دس بارہ سالوں میں مجھ میں کافی تبدیلیاں آگئی تھیں۔ تاہم مجھ میں اور کرل نیاز میں اب کوئی خاص فرق نہیں رہا تھا۔

میں نے رسالے کی ان دو تصویروں کا جائزہ لیا۔ تو میرے ذہن میں کونسا سا پکا۔ میرے ذہن کے گوشوں میں جیسے روشنی پھیلنے لگی۔ اتفاقاً کس سے یہ رسالہ سرگرم یا اس کے گروہ کے ہاتھ لگ گیا ہو گا۔ اور پھر ان کے سازشی ذہن میں کوئی منصوبہ آ گیا ہو گا۔ میں نے رسالہ رکھنے کے لیے میز کی دراز کھولی تو نہ جانے کیسے میرے ہاتھ سے رسالہ چھوٹ کر فرش پر گر پڑا۔ اس میں سے وہ تصویر بھی نکل آئی جسے میرے کمرے سے چرایا گیا تھا۔ میں نے اپنی تصویر فرش سے اٹھائی اس پر ایک نظر ڈالی اور پھر اسے رسالے کے... درمیان رکھ دیا۔ رسالہ دراز میں رکھتے وقت میری نظر ایک پستول پر پڑی جو کونے میں رکھا ہوا تھا۔ میں نے پستول اٹھا کر دیکھا تو وہ روسی ساخت کا بھرا ہوا پستول تھا۔ میں نے پستول کو اسی جگہ واپس رکھ دیا۔

میں نے تجسس کے زیر اثر دوار میں نصب الماری کھولی تو اس میں سرگرم کے لمبوسات تھے۔ انتہائی قیمتی اور بھڑکیلے لمبوسات۔ میں نے الماری کے خفیہ خانے اور درازیں کھولنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن ناکام رہا۔ پھر خیال آیا کہ الماری کی چابیاں اس کمرے میں کسی جگہ چھپا کر رکھی گئی ہوں گی۔ میں چابیوں کی تلاش میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سرگرم کسی وقت بھی واپس آ سکتی تھی۔ میں نے الماری بند کر دی اور واپس اپنے کمرے میں آ کر بستر پر لیٹ گیا۔ کیوں کہ میرا نیچے پایا جانا سرگرم کو شک و شبہ میں مبتلا کر سکتا تھا۔

بستر پر لیٹا تو میں نے اپنے آپ کو بے حد تھکا ہوا اور نڈھال محسوس کیا۔ کچھ دیر سنانے کے بعد سینڈو پز کھائے اور کلٹی پی تو تھکن گسی حد تک دور ہو گئی۔ بدن میں چستی اور توانائی لوٹ آئی۔ میں نے تکیوں کے سارے نیم دراز ہو کر سگریٹ کیس اٹھایا۔ سگریٹ نکالتے وقت میری نظر سگریٹ کیس کے ایک کونے پر پڑی۔ جہاں ایک کافز چپکا ہوا تھا۔ اس کافز کا کونا زرا سا مڑا ہوا تھا۔ اور پوری طرح چپکنے سے رہ گیا تھا۔ میں نے تمام سگریٹ نکال کر اس کافز کے کونے کی پشت کو دیا سلائی کی نوک سے ذرا سا اوپر اٹھایا اور پھر اسے چپکی میں پکڑ کے کھینچا تو کافز نکل آیا۔ یہ دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں کہ اندرونی سطح پر ایک نقشہ سایا ہوا ہے۔ اس پر حروف کندہ تھے۔

م  
س  
ق  
ن

میں نے اس نقشے پر دیر تک داغ کھپایا۔ پھر بھی یہ نقشہ میری سمجھ میں نہ آ سکا۔ اس نقشے میں جو اشاراتی پیغام تھا، میرا ذہن اسے سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس نقشے اور اشاراتی پیغام میں یقیناً ”کوئی راز پوشیدہ تھا۔ میں حیران تھا کہ آخر اس اشاراتی... پیغام کی کیا ضرورت تھی۔ جب کہ اس کافز کو سگریٹ کیس میں اس طرح چھپا کر رکھا گیا تھا



معلوم نہیں کہ وہ دونوں کس بات پر الجھ رہے تھے۔ اچانک سناٹے میں یکے بعد دیگرے دو فائر ہوئے۔ گولیوں کی آوازیں سکوت کا سینہ چیر کر سکوت ہی میں ڈوب گئیں۔

کچھ اندازہ نہ ہو سکا تھا کہ کس نے کس پر فائر کیا ہے۔ کسی کی چیخ بھی نہیں سنی تھی۔ ممکن ہے کہ مرنے والا چیخ ہی نہ سکا ہو۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے چیخ اس کے حلق میں جھنسن جاتی ہے۔ نامعلوم سا خوف میرے دل و دماغ پر مسلط ہو گیا۔ مجھ میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ نیچے جا کر دیکھتا۔ میرا دھڑکنے والا دل خطرے سے غلیظ نہیں تھا۔

مونٹروٹ میں جو شخص بھی آیا تھا وہ سرگم کا دشمن تھا۔ اور شاید اس نے سرگم کی جان لے لی تھی۔ میں حیران تھا کہ آخر ان دونوں میں کس بات پر تکرار ہوئی ہو گی۔ جس کا نتیجہ خون خرابے کی صورت میں نکلا۔ سوچتے سوچتے میں اچھل پڑا۔ کیس ایسا تو نہیں کہ وہ شخص مجھ سے زیادہ آوی ہو اور میری تلاش میں یہاں آیا ہو۔ یہاں چیخ کر اس نے سرگم سے مجھے مانگا ہو۔ سرگم نے انکار کیا ہو گا جس کے نتیجے میں اسے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے ہوں۔

اس خیال سے مجھے جھرجھری سی آگئی۔ خوف کی لہر نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ زخموں اور کمزوری نے مجھے بزدل بنا دیا تھا۔ اگر میں صحت مند ہوتا تو بے دھڑک نیچے جا کر دیکھتا کہ کیا معاملہ ہے۔ دفعتاً "ایک خیال آیا کہ کیس ایسا تو نہیں کہ وہ اب میری تلاش میں اندر آجائے؟ اس خیال کے تحت میں کمبل ایک طرف پھینک کر پیٹک سے اتر اور دروازے کی طرف بڑھا۔ میرے پیچھے کئی من بھاری ہو رہے تھے۔ دروازے کے پاس پہنچنے تک میں پسینے میں بیٹھ چکا تھا۔ حلال کہ اندر بھی شدید سردی تھی۔

میں نے اندر سے جتنی لگادی۔ اور چند لمحوں تک دیوار سے پشت نکالے کھڑا رہا۔ میری سانسیں ابھی تک قابو میں نہیں آئی تھیں۔ پھر میں نے دروازے سے کان لگا دیا۔ اس وقت خیال آیا کہ کاش میں نے سونیا سے پتہ تو مانگ لیا ہوتا۔ آج وہ میرے کتنا کام آتا۔

اس عالم میں کوئی چندہ نہیں منٹ گزر گئے کوئی آہٹ سنائی نہیں دی۔ نیچے ایسا سناٹا طاری تھا جیسے کوئی موجود نہ ہو۔ میں یہ سوچنے لگا کہ وہ دونوں ہی ایک دوسرے کی گولیوں کا شکار ہو گئے ہوں گے۔ جیسی تو آواز نہیں آرہی تھی۔

دفعتاً "میں نے بیرونی دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی۔ نیچے نشست گاہ میں قدموں کی چاپ کو بجنے لگی۔ جیسے کوئی کسی کی تلاش میں ہو۔ پھر میں نے کئی کمروں کے دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں سنیں۔ جیسے کوئی ایک ایک کمرے میں جھانک کر کسی کو تلاش کر رہا ہو۔ شاید وہ شخص سرگم کو قتل کرنے کے بعد میرے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب میں کیا کروں۔ کس طرح اپنی جان بچاؤں۔ یہ خون آشام بھیڑیا میری جان لیے بغیر نہیں جائے گا۔ میں نے حوصلہ جمع کر کے کمرے میں نظر دوڑائی۔ میں کسی ہتھیار کی تلاش میں تھا۔ میں اس آسانی سے کسی کے ہاتھوں مرنا نہیں چاہتا تھا۔ کمرے میں ملگج جیسی روشنی تھی جو زیرو کے بلب کی تھی۔ مجھے کوئی ایسی چیز نظر نہ آ سکی جو میرے کام آ سکتی تھی۔ کرسی اور میز تھی۔ مگر میں اسے اٹھا کر اپنے دشمن پر پھینک نہیں سکتا تھا۔ اس لیے کہ میرے جسم اور ہاتھوں میں اتنی توانائی نہیں تھی اور پھر میرے زخم بھی ابھی کچے تھے۔

پھر وہ جان لیوا لہر آگیا جس کے لیے میں پریشان تھا۔ میں نے قدموں کی چاپ بیڑھیوں پر سنی۔ کوئی اوپر آ رہا

تھا۔ آہستہ آہستہ بے حد مختل انداز میں۔ میں شدت سے دھڑکنے والے ساتھ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اپنے جسم کی بچی بچی طاقت کو جمع کر رہا تھا۔ میرا ذہن تیزی سے کوئی ایسی تدبیر سوچ رہا تھا کہ جس سے میں اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکوں۔

دفعتاً "بیڑھیوں پر قدموں کی چاپ رک گئی۔ چند لمحوں تک سناٹا رہا۔ جیسے وہ اندر داخل ہونے کی کوئی تدبیر سوچ رہا ہو۔

وقت کی نعل جیسے رک گئی تھی۔ اور شاید میرے دل نے بھی دھڑکنے بند کر دیا تھا۔ میرا جسم پیسے سے شرابور ہو رہا تھا۔

جو کچھ ہوا وہ ناقابل یقین تھا۔ وہ شخص سڑھیاں اتر کے زینے کی طرف چل دیا۔ پھر قدموں کی آہٹیں معدوم ہوتی ہوئی۔ بول ناک سناٹے میں ڈوب گئیں۔ چند لمحوں کے بعد بیرونی دروازہ کھلنے اور بند کرنے کی آواز سنائی دی۔ پھر وہی سناٹا چھا گیا۔ میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔

مجھے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا دشوار لگ رہا تھا۔ میں پیٹک کی طرف بڑھا تو چال میں ٹکڑھاٹ آگئی۔ میں بستر پر لیٹا تو بے حد آرام اور سکون محسوس ہوا اور مجھے اپنے اھلب۔ ہلکے پھلکے محسوس ہونے لگے۔ میں آنکھیں بند کر کے گہری سانسیں لے رہا تھا کہ مونٹروٹ کے شارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ دوسرے ہی لمحے وہ چل پڑی تھی۔ قاتل واپس جا رہا تھا۔

اس بات کا تو یہ امکان تھا کہ قاتل سرگم کی لاش کو دروازے کے باہر چھوڑ گیا ہو۔ تاکہ وہ میرے لیے مصیبت کھڑی کر سکے۔ مجھے اس قتل کے کیس میں چھٹا سکے۔ وہ یہی کچھ سوچ کر واپس چلا گیا تھا۔ کل یا کچھ دیر بعد پولیس آکر سرگم کے بارے میں مجھ سے پوچھ سکتی تھی۔ اس کی لاش میرے لیے پریشانی کا باعث بن سکتی تھی۔ میں کسی طرح پولیس کو مطمئن نہیں کر سکتا تھا۔ اس صورت میں جیل کی ہوا کھلتا میرے لیے لازمی تھا۔ اب میرے سامنے بچاؤ کی کوئی صورت نہیں تھی۔

دفعتاً "میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح آیا کہ کیوں نہ یہاں سے فرار ہو جاؤں۔ اب یہاں رکنا فضول تھا۔ کیوں کہ سرگم کی موت کے بعد حالات یکسر بدل گئے تھے۔ یہاں سے نکل جانے میں ہی بہتری تھی۔ میں قانون کے پتے چڑھنے سے بچ سکتا تھا۔

میں اپنے کمرے سے نکل کر زیریں حصے کی طرف جا رہا تھا تو مونٹروٹ کی آواز معدوم ہو کر خاموش فضا میں ڈوب چکی تھی۔ نشست گاہ میں پہنچا تو خیال آیا کہ میں مونٹروٹ چلا سکوں گا۔ اس شدید سردی اور تیز ہواؤں کا مقابلہ کر سکوں گا؟ یہ سوچتا ہوا بیرونی دروازے کو کھولنے کے لیے پڑھا تو پتہ چلا کہ باہر سے کڑی لگی ہوئی ہے۔ گویا مجھے اس جگہ قید کر دیا گیا تھا۔ مجھے چھٹا سانس کا تادیہ چھٹا اپنی گردن کے گرد تنگ ہوتا محسوس ہونے لگا۔ اور زندگی میں پہلی بار میں اندیشہ ہائے دور دراز سے تھر تھرتھانے لگا۔

”اگر تم اپنی یادداشت سے محروم نہ ہوتے تو یہ سوال بھی نہ کرتے۔“ اس نے چند لمحوں کے بعد جواب دیا۔ ”وہ تمہارا بڑا بھائی اور میرا شوہر تھا۔ غدار!“ نفرت اور حقارت سے اس کا منہ بن گیا۔ ”پہلے وہ ہمارے مشن میں شامل تھا، لیکن اب وہ ہمارا دشمن ہو گیا تھا۔ رات یہاں آکر وہ مجھے قتل کرنے اور گرفتاری کی دھمکیاں دے رہا تھا کہ میں نے موقع پا کر اسے جہنم رسید کر دیا۔“

”تمہیں قتل کے الزام میں گرفتار بھی تو کیا جاسکتا ہے؟“ میں نے خوف زدہ لمبے لمبے خدشہ ظاہر کیا۔ اس کے بھرے بھرے گداز ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ ابھر آئی۔ ”مجھے گرفتار تو اس وقت کیا جائے گا جب کوئی ثبوت ملے گا۔ جب لاش کا پتہ نہیں چلے گا تو قتل کا ثبوت کہاں سے ملے گا۔ تم گھومت کرو اور اسے ڈراؤنا خواب سمجھ کر بھول جاؤ۔ اس واقعے کو اپنے سینے ہی میں دفن کر دو۔ ورنہ تم بھی کسی مصیبت کا شکار ہو جاؤ گے۔“

میں نے سوچا کہ اس سے پوچھوں کہ اس نے لاش کا کیا کیا؟ مگر کچھ سوچ کر اپنی زبان بند ہی رکھی اور چائے پینے لگا۔

وہ بستر سے اٹھ کر بولی۔ ”جلدی سے منہ ہاتھ دھو لو۔ میں اتنی دیر میں تمہارے لیے ناشتہ لے کر آتی ہوں۔“ ظمیر ریحان، نرس کو لے کر بیچنے والی ہو گئی۔

گیارہ بجے ظمیر ریحان نرس کو لے کر آپہنچا۔ نرس نے پٹیاں بدلنے کے بعد مجھ سے کہا۔ ”آپ دو اینٹیاں تو لینی جاری رکھیں۔ یہ آخری پٹیاں ہیں۔ دو ایک دن کے بعد انہیں اتار کر پھینک دیں۔ اس کے بعد پٹیوں کی ضرورت نہیں“ البتہ دو تین روز زخموں پر مزمزم لگاتے رہیں۔“

نرس بوٹ میں روانہ ہو گئی۔ تو میں بستر سے نکل کر کھڑکی کے پاس کھڑا ہو گیا اور بوٹ کو اس وقت تک دیکھا رہا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔ میں نے کھڑکی کے پاس سے بہتے وقت ڈاک پر ظمیر ریحان اور سرگم کو دیکھا تو ٹھنک گیا۔ وہ دونوں بھی ایک بوٹ میں سوار ہو رہے تھے۔ سرگم کے ہاتھ میں کدال تھی اور ظمیر ریحان کے ہاتھ میں پیپلہ تھا۔ میں نے جلدی سے کھڑکی کا پردہ کھینچ دیا۔ پھر ایک جھری سے ان دونوں کی حرکات و سکنات کا جائزہ لینے لگا۔ ان کی بوٹ تیزی سے نیلے کی طرف جاری تھی۔ دفعتاً یاد آیا کہ جب سرگم نے الماری کھولی تھی تو مجھے اس میں ایک دوربین بھی نظر آئی تھی۔ میں نے جا کر الماری کھولی تو اس میں دوربین موجود تھی۔

میں دوربین لے کر کھڑکی کے پاس پہنچا تو وہ بوٹ سے اتر کر ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے آہستہ آہستہ نیلے پر چڑھ رہے تھے۔ چند لمحوں کے بعد سرگم، ظمیر ریحان کو تنکوں کے ایک ڈھیر کے پاس لے گئی اور رک گئی۔ اس نے ظمیر ریحان کو اشارے سے کچھ کہا۔ پھر دونوں نے سلمان زمین پر رکھا اور تنکوں کو ہٹانا شروع کر دیا۔ تنکوں کے پھٹنے ہی زمین نظر آئی تو سرگم نے حواس باختہ ہو کر ظمیر ریحان کی طرف دیکھا۔ وہاں انسان کی تو کیا کسی چوہے کی بھی لاش نہیں تھی۔ ظمیر ریحان حیرت بھری اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

سرگم نے ہاتھوں کی طرح نیلے کا ایک چکر لگایا۔ وہاں کرل نجیب کی لاش نہیں تھی۔ لاش غائب پا کر سرگم کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ ظمیر ریحان نے اسے سارا نہ دیا ہو تا تو شاید وہ چکرا کر گر پڑتی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ظمیر ریحان بھی حواس باختہ نظر آ رہا تھا۔ واپسی پر سرگم کی حالت کسی مردے سے بھی بدتر تھی۔ میں نے فوراً ہی دوربین الماری میں رکھی اور کمرے کا دروازہ اسی طرح بند کیا کہ اس میں معمولی سی جھری باقی رہ گئی۔ پھر میں بستر پر لیٹ گیا۔ کوئی دس منٹ بعد وہ دونوں آئے تو میں نے انہوں سے محسوس کیا کہ وہ نشست

زمین سے اٹھ کر دو دروازہ بند کرنے کا شور مچا کر رہ گیا۔ کتنے ہی لمبے گزر گئے۔ نہ تو کوئی اوپر آیا اور نہ ہی کوئی آہٹ محسوس ہوئی۔ ایک ہولناک سناٹا طاری ہو گیا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، ویسے ویسے مجھے یہ یقین ہو گیا کہ سرگم نے اس شخص کو قتل کر کے اس کی لاش نیلے کے قریب دفن کر دی ہے۔ کیا سرگم ایسا کر سکتی ہے؟ میرے ذہن کے ایک گوشے میں یہ سوال پیدا ہوا۔ کیا وہ کسی مرد کی لاش کھینچ کر نیلے پر لے جاسکتی ہے؟ اس کا سر ہلایا۔ میری نظروں میں لارنے لگا۔ اس کا گداز جسم پر کشش ہی نہیں تھا بلکہ اس کا ایک ایک تاروں کی طرح کسا ہوا تھا۔ وہ ایک صحت مند اور توانا عورت تھی۔ اس کے لیے کسی مرد کی لاش کو نیلے تک کھینچ لے جانا مشکل نہیں تھا۔

یہ سب کچھ سوچتے سوچتے میں سو گیا اور جب بیدار ہوا تو صبح ہو چکی تھی۔ کمرے میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے رات کا واقعہ یاد آ گیا۔ میں اس واقعے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور سرگم اندر داخل ہوئی تو میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ کسی تروتازہ پھول کے مانند گفتگو نظر آ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کا خوف یا اضطراب نہیں تھا۔ وہ بڑی پرسکون اور خوش دکھائی دے رہی تھی۔ وہ میرے لیے بھلپ اڑاتی کرم کرم چائے لے کر آئی تھی۔

میں حیرت سے اس عورت کو دیکھ رہا تھا، جو کسی مرد کو موت کی نیند سلا کر اس طرح مطمئن تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اس نے میری حیرت کو بھانپ کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے کرل؟ تم مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو؟“

”رات میں نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔ کہ تم نے ایک آدمی کو قتل کر دیا ہے۔“

”کیا؟“ وہ اچھل پڑی اس کے چہرے کا رنگ خنجر ہو گیا۔ چائے پیالی میں جھلک گئی۔ ”تم نے مجھے کسی کو قتل کرتے دیکھا تھا؟“

”تو کیا وہ خواب تھا؟“ میں انجان بن گیا۔

”دیکھو کرل۔“ وہ چائے کی پیالی میرے رکھ کر بستر پر بیٹھ گئی۔ ”مجھے قریب دینے کی کوشش نہ کرو۔ سچ سچ بتاؤ تم نے یہ واقعہ کہاں کہاں ہو کر دیکھا تھا؟“

سرگم کے لمبے میں تشویش تھی۔ میں نے جواب دینے کی بجائے اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کر دیں۔ جو چاند کے مماثل تھا۔ اس کے شانے پر بے ترتیبی سے نکھری زلفیں ناگن بن گئیں تھیں۔ اس کی تھیر زدہ آنکھوں میں عجیب سا طمع تھا۔ اس نے مجھے اپنی طرف ایک ٹک دیکھتے پایا تو بے اختیار مسکرا دی۔ ”میں نے تم سے کچھ پوچھا تھا۔ فکر مکر صورت دیکھنے کو نہیں کما تھا؟“

”رات میں نے بستر پر لیٹے ہوئے یوں محسوس کیا جیسے کوئی قتل کی واردات ہوئی ہو۔“ میں نے مختصر طور پر اسے واردات کا واقعہ سنا دیا۔

میرا جواب سن کر اس نے ایک گہری سانس لی، میز سے چائے اٹھا کر میری طرف بڑھائی۔ ”لو چائے پی لو۔“

ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“

میں نے پیالی اس کے ہاتھ سے لی تو اس کی انگلیاں میری انگلیوں سے چھو گئیں۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں تو اپنی بات کا جواب مل گیا مگر مجھے میری بات کا جواب نہیں ملا؟“

”یہ سمجھو کہ میں نے تمہیں ایک ناگ کے ہاتھوں مرنے سے بچالیا۔ رات کرل نجیب ہم دونوں کو قتل کرنے آیا تھا۔“

”یہ کرل نجیب کون ہے؟ وہ ہمیں کیوں قتل کرنا چاہتا تھا؟“

گلو کی بجائے خواب گلوں میں چلے گئے ہیں۔ سرگم کو شاید آرام کی ضرورت تھی۔ میں نے دروازے پر پہنچ کر اسے کھولا اور زینے پر قدم رکھا تو میرا خیالی درست ثابت ہوا۔ خواب گلوں سے باتیں کرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں جہ تکی گوش ہو گیا۔

”اب کیا ہو گاریحان...؟“ سرگم پوچھ رہی تھی۔

”اپنے آپ کو قابو میں رکھو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ ظمیر ریحان نے اسے سمجھانے لگا۔

”ہانتے ہو اس کے زندہ بچ جانے کا مطلب کیا ہے؟ ہم سب کی موت درونگ موت۔“

”کیسے ایسا تو نہیں کہ رات تم نے کوئی ڈرائنگ خواب دکھا ہو اور تم نے خواب میں ہی اسے قتل کیا ہو؟“

”تم میرا ہسٹول دیکھ سکتے ہو اسے تم نے ہی لوڈ کیا تھا۔ اب اس میں بچہ کی بجائے چار گولیاں ہیں۔ ذرا چیک

کر کے دیکھو۔ پلیز!“

میں نے میری دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ پھر ظمیر ریحان کی آواز گونجی۔ ”تم ٹھیک کتنی ہو۔ اس میں چار

گولیاں ہیں۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ صرف زخمی اور بے ہوش ہو ا ہو۔ تم نے سمجھا ہو کہ کرنل مر گیا ہے۔

حالاں کہ...“

”میں نے پہلے تو دھوکے سے اس کے سر پر آہنی سرسے سے دلو کیا تھا۔ وہ بے آواز بے ہوش ہو کر گر پڑا

تو میں نے اس کے سینے کا نشانہ لے کر کئے بعد دیگرے دو گولیاں ماری تھیں۔ وہ میری نظروں کے سامنے تڑپ

تڑپ کر ٹھنڈا ہوا تھا۔ پھر میں اسے بوٹ میں ڈال کر نیلے پر لے گئی۔ اسے اوپر لے جانے میں مجھے دانتوں پیچیدہ آ

گیا تھا۔ میں نے اس کی لاش تختوں سے ڈھک دی تھی۔ تاکہ تم آ جاؤ تو قبر کھود کر اسے دفن کر دوں۔ مگر وہ تو

ہمارے لیے ہی قبر کھود گیا۔ میری عقل کام نہیں کر رہی ہے۔ آخر اس کی لاش کون لے گیا؟ وہ اس کی لاش کا کیا

کرتے گا؟“

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ زخمی حالت میں ہو اور تختے پٹا کر نکل بھاگا ہو۔“

”مگر تختے تو جوں کے توں تھے جیسے میں رکھ کر آئی تھی۔“

”اس نے شاید تمہیں دھوکا دینے کے لیے ایسا کیا ہو؟“

”وہ کیا کیسے ہو گا؟ میں صبح پانچ بجے تک جاگتی رہی ہوں۔ میں نے کسی بوٹ کے انجن کی آواز نہیں سنی۔

اتنی رات گئے اور اس قدر شدید سردی میں اور کون آ سکتا ہے۔ اور ہر گزشتی بوٹ بھی شادو بند رہی آتی ہے۔ اگر

کوئی آتا تو میں اس سے بے خبر نہ رہتی۔“

”شاید وہ تھرا ہوا نکل گیا ہو گا؟“

”اس شدید سردی میں کوئی زخمی آدمی تحری نہیں سکتا ہے۔ اچھے اچھوں کی قلمی جم جائے۔“

”ایک بات کا امکان ہے۔“ ظمیر ریحان جیسے اچھل پڑا تھا۔

”کس بات کا امکان؟“ سرگم کے لیے میں حیرت تھی۔

”جس وقت وہ تختوں سے نکل کر نیچے جا رہا ہو وہ پانی میں جا کر ا ہو اور اس کی لاش پانی کی تہ میں پڑی

ہو؟“

”ہاں اس بات کا امکان ہو سکتا ہے۔“ سرگم کے لیے میں جلیں پیدا ہو گئی۔ ”میں اس کی لاش کا پتہ چلانا

ہو گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی لاش اوپر آ جائے۔ کسی نے دیکھ لیا تو مصیبت آ جائے گی۔“

”کیا تمہارے پاس غسل کا مردانہ لباس ہے؟“

”یہ اور والے کمرے کی الماری میں رکھا ہے وہاں سے لے لو میں بھی پیر کی کا لباس پہن کر آتی ہوں۔“

کچھ دیر بعد میں کھڑکی کے پاس کھڑا تھا۔ اور میرے ہاتھ میں دو تین دبی ہوئی تھی۔ میں ان دونوں کو ڈاک

پر دیکھ رہا تھا۔ وہ بوٹ میں سوار ہو رہے تھے۔ پھر بوٹ اس نیلے پر جا چکی۔ انہوں نے پیر کی کے لباس پہن لیے۔

میری نگاہ سرگم پر جم کر رہ گئی۔ وہ پیر کی کے لباس میں تھی۔ شرم دیا ہے بالآخر کسی مغربی عورت کی طرح بے

جلبب۔ دھننا اس نے کسی ماہر پیر کی کی طرح پانی میں چھلانگ لگائی تو مجھے ایسا لگا کہ پانی کی سطح پر بجلیوں سی تڑپ

گئی ہوں۔ وہ کوئی ایک گھنٹے تک پانی میں لاش تلاش کرتے ہوئے ڈوبے اور ابھرتے رہے۔ پھر ناکام واپس آ

گئے۔ سرگم لباس تبدیل کر کے مجھے دیکھنے آئی تو میں سو تباہ گیا۔

اس کے جانے کے دس منٹ بعد میں نے پھر دروازہ کھولا، بھری بنا کر ان لگا دیے۔ وہ دونوں کالی پیتے

ہوئے پاتیں کر رہے تھے۔ سرگم کہہ رہی تھی۔ ”جب تک لاش کا پتہ نہیں چل جاتا مجھے جین نصیب نہیں ہو

سکتا۔“

”دو ایک دن بعد لاش خود اوپر آ جائے گی تو کسی اور مقام پر ہو گی اور اس قدر مسخ ہو چکی ہو گی کہ اس کی

شناخت نہیں ہو سکے گی۔ اگر ہو بھی گئی اور تم پر کوئی آج آئی تو قانون کا ہاتھ پیچنے سے پہلے ہی تمہیں اپنی لالچ کے

ذریعے بڑی ملک میں بچا دوں گا۔“

”تم جاؤ اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ لاش کا پتہ تو نہیں چل گیا۔ کوئی بھی اہم بات ہو تو مجھے فون پر

اطلاع دے دیتا۔ میں انتظار کروں گی۔“

”جو حکم میری سرکار کا۔“ ظمیر ریحان نے بڑے بھونڈے لہجے میں کہا۔ ”کچھ دیر پہلے جو قیامت دیکھی

تھی اسے دیکھنے کے بعد۔“ ظمیر ریحان کا جملہ اوجھڑا رہ گیا۔ دھننا گہرے سکوت میں ایک شور ماسنائی دیا۔

سرگم کی لڑائی ہوئی سی آواز سنائی دی۔ ”یہ تو گشتی پولیس کی لالچ ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان کے ہاتھ کرنل کی

لاش لگ گئی ہو یا وہ کسی نہ کسی طرح ان تک پہنچ گیا ہو؟“

”خود کو قابو میں رکھو سرگم۔“ ظمیر ریحان بولا۔ ”اب جو بھی حالات پیش آئیں ان کا سامنا کرنا ہو گا۔“

میں دروازے سے ہٹ کر کھڑکی کے پاس جا پہنچا۔ سرگم کا خیالی درست ثابت ہوا۔ یہ گشتی پولیس کی لالچ

تھی۔ اس لالچ میں دس مسلح سپاہی اور چند شہری نظر آ رہے تھے۔ ان میں ایک اوجھڑا عمر کا مرد عورت اور نوجوان

لڑکی عرشے پر نظر آ رہی تھی۔ جیسے جیسے لالچ قریب آتی جا رہی تھی ان کے خدو خال واضح ہوتے جا رہے تھے۔

جب لالچ ڈاک پر پہنچی تو میں نے ان تینوں کو پہچان لیا۔ وہ ڈاکٹر غنی، بلقیس اور ذکیر غام تھی۔ ”یہ لوگ کس لیے آ

رہے ہیں؟“ میں نے خیرت سے سوچا۔

کوئی دس منٹ کے بعد میرے کمرے میں ایک ڈرامائی منظر تھا۔ چار مسلح پولیس مین ڈاکٹر غنی، بلقیس اور

ذکیر غام کو لے کر میرے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ ان لوگوں کے ساتھ پولیس انسپکٹر بھی تھا۔ سب سے پیچھے

سرگم اور ظمیر ریحان تھے۔ ظمیر ریحان پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے سرگم کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر

ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے پاپوسی اور خوف کی ایسی کیفیت جھانک رہی

تھی کہ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ اس نے مجھے ایسی جتنی نظروں سے دیکھا جیسے میں کوئی جج ہوں اور اسے پچاسی کا

حکم دینے والا ہوں۔ وہ مجھ سے زندگی کی بھیک مانگ رہی تھی۔



اس وقت وہ پوری طرح میرے رحم و کرم پر تھی۔ میں اس کے کھیل کا خاتمہ کر سکتا تھا۔ اور اسے کرقل نجیب کے قتل کے الزام میں گرفتار کر دیا سکتا تھا۔ میں اس مکان میں قید سے تنگ آ چکا تھا۔ کیوں کہ میں کسی آزاد پنجابی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ میں ملک دشمن عناصر کے ہاتھوں کھٹکنا نہیں بننا چاہتا تھا۔ سرگم کا ارادہ تھا کہ اپنے منصوبے کی تکمیل کے بعد مجھے موت کے گھاٹ اتار دے گی۔ وہ بظاہر بڑی نرم و نازک اور حسین تھی۔ مگر اندر سے ایک سفاک اور بے رحم قاتل تھی۔ مجھے سونیا کی باتیں یاد آ گئیں۔ وطن کی سالمیت کے لیے میرا یہاں رہنا بہتر تھا۔ مجھے یہاں رہ کر اس گھناؤنی سازش کا پتہ چلتا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میرے دل کی نفرت دب گئی۔ یوں بھی اس نے مجھے اپنی حشر سمانیوں سے ایسا امیر بنایا تھا کہ اسے چھوڑ کر جانے کو بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے میں نے اسے جس عالم میں دیکھا تھا اس نے مجھ پر نشہ ساٹاری کر دیا تھا۔ اور وہ نشہ ابھی اترا نہیں تھا۔ میں نجیب کی کش مکش میں جھکا تھا کہ ذکیہ خانم بولی۔ ”انسپکٹر صاحب! یہ کرقل نیاز“ جنہیں ڈاکٹر کے ہاں سے اغوا کیا گیا تھا۔

ذکیہ خانم کو میں نے رات کے وقت مل گئے اندھے میں دیکھا تھا۔ اور اب اسے دن کے اجالے میں دیکھ رہا تھا۔ وہ براؤن قبض اور اسی رنگ کے ظہیر میں تھی مگر اس کا سویٹر گول بند گئے پوری آستین... اور سیاہ رنگ کا تھا۔ وہ دوپٹے سے بے نیاز تھی۔ وہ ایک مسکاتی ہوئی نرم و نازک سی کلی تھی۔ اس کا چہرہ دیکھ کر دل کے ارمان جیسے جاگ اٹھتے تھے۔ اس کا چہرہ آئینہ کو آئینہ دکھا رہا تھا۔ آنکھیں کیف اور جام لٹا رہی تھیں۔ وہ کسی تراشیدہ مجسمے کی طرح تھی۔ ذکیہ خانم اور سرگم حسن و جمال کے دو پیکر تھے۔ ایک ترو تازہ کلی اور دوسرا مسکنا ہوا پھول... مگر دونوں میں جوانی اور حسن کی تباہی یکساں تھی۔ ایک نئی شراب تھی اور ایک پرانی۔ نشہ تو دونوں ہی میں ہوتا ہے۔ فرق ہلکے اور گہرے کا ضرور ہوتا ہے۔ مگر یہاں تو کوئی بھی خمار ذہن سے نہیں اتر رہا تھا۔

انسپکٹر میرے قریب آیا اور اس نے اپنی دونوں ایندیاں ملا کر مجھے سیلوٹ کیا۔ ”سرا! مس ذکیہ خانم نے آپ کے اغوا کی رپورٹ درج کرائی تھی۔ کہ فردوس بیگم عرف سرگم نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے آپ کو ایک جھپٹے پہلے اغوا کر لیا تھا۔“

”اغوا!!!“ میں نے آواز بدل کر یہ تاثر دیا کہ میرا گلا خراب ہے اور زلزلہ زکام سے آواز پر اثر پڑا ہے۔ میرے لمبے میں شدید حیرت تھی۔ ”مجھے اغوا کیا گیا ہے؟ نہیں انسپکٹر! مس ذکیہ خانم کو غلط فہمی ہوئی ہے۔“

ذکیہ لپک کر میرے ہلکے کے پاس آئی۔ اس کی آنکھوں میں شدید حیرت تھی۔ ”کرقل! آپ اسے غلط فہمی کہہ رہے ہیں؟“

”میں کوئی لڑکی تو نہیں ہوں جو مجھے اغوا کیا جائے؟“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

”کیا اس ڈائن نے آپ پر جادو کر دیا ہے...؟“ ذکیہ خانم کے چہرے پر گہرا استغاب چھا گیا۔ ”اگر آپ کو مجھ پر یقین نہیں آ رہا تو ڈاکٹر غنی اور بلقیس سے دریافت کر لیں۔ یہ دونوں گواہ ہیں کہ آپ کو کس طرح اغوا کیا گیا تھا؟“

بلقیس نے بستر کے پاس آکر ذکیہ خانم کی تائید کی۔ ”خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم قانون کی مدد لے کر آئے ہیں۔ ہماری گواہی اور آپ کے بیان پر اس منکار عورت کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ جو آپ کی بیوی بن کر اس روز میرے گھر آئی تھی۔ تاکہ اغوا کا منصوبہ بن سکے۔“

میری نگاہ سرگم کی طرف اٹھ گئی۔ وہ مجھے محبت پاش نظروں سے دیکھ رہی تھی اس کی کشادہ آنکھیں مجھ سے ٹھیک مانگ رہی تھیں۔ وہ میرے فیصلے کی کھنکھرتھی۔ وہ یہ سننا چاہتی تھی کہ میں کیا کہتا ہوں۔ اس لمحے گہرا

سکوت چھا گیا تھا۔ جیسے اس کمرے میں کوئی موجود نہ ہو۔ پھر میں نے اس سکوت کو توڑا۔ ”ڈاکٹر! آپ کو یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے۔ مجھے اغوا نہیں کیا گیا تھا۔ میں اپنی مرضی سے گیا تھا اور میرے دوستوں نے مذاق کیا تھا جس کا آپ لوگ غلط نتیجہ اخذ کر رہے ہیں۔“

”وہ مذاق تھا...؟“ بلقیس اچھل پڑی۔ ”ان لوگوں نے ہماری مشکلیں کس لیے تھیں۔ ہمیں افشائے راز پر قتل کی دھمکیاں دی تھیں۔ اور وہ سب کے سب کلا سکوف اور ریوالتوں سے لیس تھے۔“

”کرقل! آپ کو کیا ہو گیا ہے؟“ وہ حیرت بھرے لہجے میں بولی۔ ”کس ایسا تو نہیں کہ آپ کا برین واش کر دیا گیا ہو؟“

فضا کو اچانک اور غیر متوقع بدلتے دیکھ کر سرگم اور ظہیر کی جان میں جان آئی اور ان کے حوصلے بھی بلند ہو گئے۔ سرگم پیچھے سے نکل کر انسپکٹر کے قریب آ گئی۔ ”میں نے قانون کا احترام کرتے ہوئے اپنا فرض ادا کیا ہے اور آپ کے ساتھ تعاون کیا۔ دراصل خاندانی معاملہ ہے۔ مس ذکیہ خانم نے ذرا سی بات کو افسانہ بنا دیا۔ پلیز! اب انہیں آرام کرنے دیں۔ ڈاکٹروں کی سخت ہدایت ہے کہ انہیں آرام کی ضرورت ہے۔“

”آپ کرقل کو ہسپتال داخل کرانے کی بجائے گھر کیوں لے آئیں؟“ انسپکٹر نے سرگم سے پوچھا۔

”آپ کی سوال ان دونوں میاں بیوی سے کیوں نہیں کرتے کہ یہ کرقل کو شدید زخمی حالت میں اپنے گھر کیوں لے گئے تھے۔ ہسپتال کیوں نہیں لے گئے۔ کیا پولیس بھی ایک شدید زخمی کو ہسپتال کے بجائے کسی ڈاکٹر کے گھر منتقل کر دیتی ہے۔“ ظہیر رحمان کا لہجہ تند تھا۔

”ہمارے کلینک میں کوئی بستر خالی نہیں تھا۔“ بلقیس نے جواب دیا۔ ”ہمارے اپنے گھر میں بھی کلینک ہے۔ جہاں علاج معالجے کی تمام سہولتیں موجود ہیں۔ ہم نے کرقل کے علاج میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اور ان کا پوری توجہ اور اسی جذبے سے علاج کیا جیسے کرقل ہمارا بیٹا ہو۔“

ذکیہ خانم کے سینے میں افسوس کے تلاطم اور چہرے کی حالت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اندر ہی اندر بری طرح کھول رہی ہے۔ وہ بلقیس بانو کا بازو تھام کر بولی۔ ”اس ڈائن نے کرقل کو دوڑ غلایا ہے۔ میں اس سے نمٹ لوں گی۔ آئیے چلیں۔“

”مس ذکیہ! اپنے الفاظ واپس لیں۔“ ظہیر رحمان کو غصہ آ گیا۔

”اگر میں اپنے الفاظ واپس نہ لوں تو کیا کر لوگے؟“ وہ غضب ناک ہو کر اس کی طرف گھوم گئی۔

ظہیر رحمان بوکھلا گیا۔ ”آپ کو زیب نہیں دیتا۔ کہ کسی معزز خاتون کے بارے میں اس قسم کے الفاظ...“

”سٹ اپ!“ ذکیہ نے فرش پر پیر پڑا۔ ”میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ کون معزز ہے اور کون نہیں ہے۔ اور کس کے بارے میں مجھے کیا کہنا چاہیے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم کون ہو اور کیا ہو۔ بہتر ہے کہ اپنی زبان کو لگام دو ورنہ...“

”مسٹر ظہیر رحمان!“ سرگم نے اسے بحث سے روک دیا۔ ”پلیز! آپ ہی خاموش ہو جائیں۔“ پھر وہ انسپکٹر کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”اگر آپ کی نسل ہو چکی ہے تو مجھے شرف لے چلیں۔ مریض کے آرام میں غلط پڑ رہا ہے۔“

”چلیے... ہم لوگ اب چلتے ہیں۔“ انسپکٹر دروازے کی جانب پوچھ گیا۔



”یہ ذکیہ خانم کون ہے؟“ میں نے اچانک پوچھا۔  
 ”... ذکیہ خانم...؟“ اس کا حسین چہرہ مجھ تک پہنچا۔ ”وہ بہت حسین ہے اسی لیے اس کے بارے میں جاننا چاہتے ہو؟“

”اس میں شک نہیں کہ وہ بہت حسین اور پرکشش ہے۔ مگر تم اس سے زیادہ حسین ہو۔ تاہم میں اس کے بارے میں اس لیے نہیں پوچھ رہا تھا بلکہ بات یہ تھی کہ وہ تم دونوں پر خوب گرجتی بدبختی ری لیکن تم خاموشی اور بے بسی سے اس کی باتیں سنتے رہے تھے۔ کیا وہ کوئی اونچی شے ہے؟“

”ہاں!“ سرگم نے گردن ہلاتا کر اقرار کیا۔ ”وہ ایک ریٹائرڈ جرنل کی بیٹی ہے۔ اس کے باپ نے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں سیالکوٹ کے محاذ پر ایک عظیم کارنامہ انجام دیا تھا۔ اسے تمہی شجاعت بھی مل چکا ہے۔ اس کے علاوہ کئی فوجی اعزازات بھی ملے ہیں۔ اس کے باپ کو تمہی کیا مل گیا جیسے اسے مل گیا ہو۔ اگر قی اور ہر ایک پر رعب جاتی بھرتی ہے۔ چھوڑو ان باتوں کو۔“ اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے الگ کیا اور میرے پاس بٹھ گئی۔ ”تم کتنے اچھے ہو کر کرل! تم جیسے نیک لوگ بھی اس دنیا میں موجود ہیں۔ کاش! میں اس کا کوئی اچھا صلہ دے سکتی۔“

وہ اتنی سرشار تھی کہ اس احسان کا صلہ کسی دل کش انداز میں ادا کرنے کے سوا میں نظر آ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر نوازشات کی بارش کرتی۔ دسپے پر ظمیر ریحان کے قدموں کی چاب ستائی دی۔ وہ آہستگی سے پلنگ سے نیچے اتری۔ پھر اپنی وارفتہ نظروں کو میری آنکھوں میں ڈبوتے ہوئے بولی۔ ”تمہارے لیے شان دار کافی بنا کر لاتی ہوں۔“

وہ مجھے کافی لاکر دے گئی۔ جاتے جاتے اس نے جس انداز سے دردناک بنا دیا وہ بہت پر اسرار اور مشکوک سا تھا۔ چند لمحوں کے بعد میں بستر سے نکل کر دروازے پر آیا۔ خواب گاہ سے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ تجسس سے مجبور ہو کر میں نے خطرے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بیڑھیاں ملے کیوں اور ساتھ والے کمرے کی دہلیز پر سانسوں دوکے کھڑا ہو گیا۔ ظمیر ریحان کہہ رہا تھا۔ ”تمہیں ذکیہ خانم کے بارے میں تفصیل سے بتا دیتا چاہے تھا۔ وہ کل پھر کوئی نئی مصیبت لے کر آگئی تو کیا کرو گی؟ اگر اس نے ذکیہ کو بچانے سے انکار کر دیا تو ایک نئی مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔“

”ایسی قسمت نہیں آئے گی، بے فکر رہو۔“

”کسی خوش فہمی میں جھلا نہ رہو۔“ ظمیر ریحان نے تخی سے کہا۔ ”اگر ذکیہ کے علم میں یہ بات آگئی کہ کرل اپنی یادداشت سے محروم ہو چکا ہے تو قیامت آجائے گی۔“  
 ”تم کیا چاہتے ہو؟ میں اسے ذکیہ کے بارے میں کیا بتاؤں؟“ سرگم نے تنک کر پوچھا۔

”صاف صاف بتا دو کہ وہ اس کی گہری دوست بلکہ محبوب ہے۔“  
 ”ناگہ کرل اپنی محبوبہ کے ساتھ چلا جائے اور میں منہ دیکھتی رہ جاؤں۔ اور۔۔۔ اور منصوبہ خاک میں مل جائے۔“

”ریٹائرڈ اور فکر مند کیوں ہو رہی ہو۔“ ظمیر ریحان کے لیے میں شوقی تھی۔ ”ذکیہ خانم لاکھ حسین اور جوان سہمی، عمر وہ شہادی طرح پرکشش نہیں ہے، اور پھر کرل جیسی عمر کے مرد کی لڑکی کے مقابلے میں تم جیسی عورتوں کو پسند کرتے ہیں، ویسے بھی وہ دونوں گہرے دوستوں کی طرح تھے۔ میرے خیال میں ان دونوں نے حد سے بڑھنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔“

”سنئے!“ میں نے پتلیس کو مخاطب کیا۔ ”میں آپ دونوں کا احسان ساری زندگی نہیں بھلا سکوں گا۔ میں اپنی زندگی کی آخری سانس تک دعاؤں میں یاد کرنا نہیں چھوڑوں گا۔ میں جیسے ہی محنت پاب ہوں گا، آپ لوگوں کا شکریہ ادا کرنے حاضر ہو جاؤں گا۔“

”کرل! شکریہ ادا نہیں بلکہ ان لوگوں کا ادا کرنا جو تمہیں موت کے منہ میں پھنسا چاہتے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ یہ دونوں زہریلے ناگ ہیں۔ پھر بھی تم ان کے ہاں رہنے پر مجبور ہو۔ شاید اس ناگ کے...؟“  
 ”ناگز غنی نے ذکیہ کا بازو پکڑ کے کہا۔ ”چلو، بیٹا اپنے غصے کو قابو میں رکھو۔ شاید قدرت کو یہی منظور ہے۔ شاید اسی میں اس کی کوئی پوری شدہ ہو۔“

سرگم کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ذکیہ خانم کے انداز خطاب پر اندر ہی اندر کھول رہی ہے۔ وہ شاید ذکیہ کو کوئی سخت جواب دینا چاہتی تھی۔ ناگز غنی نے ذکیہ سے جو کچھ کہا اس کی وجہ سے سرگم کو کچھ کہنے کا موقع نہیں مل سکا اور پھر ناگز غنی، ذکیہ خانم کو لے کر کمرے سے نکل گئے تھے۔ وہ لوگ کمرے سے نکلے تو سرگم اور ظمیر ریحان بھی ان کے پیچھے چلے گئے۔

مجھے دکھ ہو رہا تھا کہ ان لوگوں کو نامراد واپس جانا پڑا۔ مگر مجبوری تھی کہ میں چاہتے ہوئے بھی ان کے ساتھ نہیں جاسکتا تھا۔ کیوں کہ میں فطری کرل تھا۔ میرا ذہن ان لوگوں پر ظاہر ہو جاتا تو وہ لوگ نہ جاتے میرے ساتھ کیا سلوک کرتے اور پھر مجھے تو اپنے دادیدہ وطن پرست دوست کی ہدایت پر رہنا تھا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ ایک مصیبت سر سے مل گئی۔

ذکیہ خانم ایسی تیز و طرار، نڈر اور بے خوف ہو گئی، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ کوئی بڑی شے تھی... ایک غیر معمولی ہستی ہے۔ جیسی تو سرگم اور ظمیر ریحان اس سے دب رہے تھے۔ اور شاید وہ ان دونوں کی کمزوریوں سے بھی طرح واقف تھی۔ اس لیے ان دونوں کی زبان نہیں کھل رہی تھی۔ اور وہ جواب دینے سے قاصر تھے۔ ذکیہ خانم کی شخصیت کو جاننے کے لیے میرے دل میں تجسس اور اشتیاق پیدا ہو رہا تھا۔

کوئی پانچ پانچ منٹ بعد لالچ واپس جا رہی تھی۔ سرگم میرے کمرے میں آئی۔ اس نے مجھے ممنون نظروں سے دیکھا اور کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی پھر وہ ہٹا کر لالچ کو جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔ پھر وہ دفعتاً ”خیر“ سے گھومی تو اس کا چہرہ سرخ ہو کر دھک اٹھا تھا۔ وہ مجھے پہلے سے کہیں زیادہ حسین لگی اور میرے دل میں ایک عجیب سی دھک دھک بھر گئی۔ اس کی نگاہوں کی زبان میں ایک اٹھلا سا پیام تھا۔ وہ ملی کھاتی ہوئی میرے پلنگ کے پاس آ کر رک گئی۔ ”کرل!“ اس کی آواز بھرا گئی۔ ”تم نے مجھ پر احسان ہی نہیں کیا۔ بلکہ مجھے بین حول خیر لیا ہے۔“

”اس میں احسان کی کیا بات ہے؟“ میں نے اس کی منجھد آنکھوں میں جھانکا۔ ”میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔“

”یہ مجھ پر احسان نہیں تو اور کیا ہے کہ تم نے ان کا کہنا نہیں مانا اور اپنے افواہ کا اقرار نہیں کیا۔“ اس نے میرے ہاتھ کی پشت پر اپنا ہاتھ رکھا تو اس کے ہاتھ کا لمس بڑا اونکھا اور لطیف محسوس ہوا۔ ”تم ان کے حق میں بیان دیتے تو میں جیل کی ہوا کھاتی۔ میری ساری زندگی غارت ہو جاتی۔ یہ احسان نہیں تو کیا ہے؟ میں تمہارے احسان کا بدلہ کیسے چکاؤں؟“ اس کے سینے میں سانسوں کا غلغلہ سمجھنے لگا۔

”ایک کپ گرم گرم کافی پلا کر۔“

صرف ایک کپ کافی... وہ شہنشاہ رہ گئی۔

کے افسران کی تصویریں بائیں دیر تک اس محلے کو محل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ جب یہ محملہ محل نہ ہو سکا تو سرگرم شادی اور ہنی مون کے تصور میں ڈوب گیا۔

اگلے روز سرگرم نے کسی تجربہ کار نرس کے انداز میں میرے بدن کی پٹیاں اتار دیں۔ میں نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ میرے زخم تیزی سے مندمل ہوئے تھے۔ اب صرف زخموں کے نشان، دھبوں کی صورت میں باقی تھے۔ سرگرم نے ان پر مرہم لگا دیا۔ ایک ہی روز میں وہ دھبے بھی مٹ گئے۔ لہجے کے دوران سرگرم نے کہا: ”کرمل کل تم غسل کرو گے۔ اور میں تمہاری صحت کا جشن منائوں گی۔ پرسوں ہماری شادی ہو گی۔ پھر ہم بیٹہ بیٹہ کے لیے ایک دوسرے کے ہو جائیں گے۔“

اگلی صبح میں نیا تو بے حد ہلکا ہلکا ہو گیا۔ نملنے میں آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت صرف کیا تھا۔ گرم پانی سے ایک عجیب سی فرحت محسوس ہو رہی تھی۔ میں اپنے آپ کو ایک نیا اور صحت مندانہ محسوس کر رہا تھا۔ سرگرم نے میرے کمرے میں ایک قد آدم آئینہ دیوار میں نصب کر دیا تھا۔ میں نے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا تو جی خوش ہو گیا۔ میرا رنگ روپ گھر آیا تھا۔ میں پہلے کی طرح وجہ اور خوبصورت لگ رہا تھا۔ سرگرم کمرے میں آئی تو مجھے دیکھتی کی دیکھتی رو گئی۔ اس کا چہرہ دک اٹھا۔ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا: ”کرمل! تم تو شہزادے لگ رہے ہو۔ خدا تمہیں نظرد سے بچائے۔“

”کس ملک کا شہزادہ؟“ میں نے مسکرا کر پوچھا۔

”میرے دل کی دنیا کے شہزادے۔“ سرگرم نے گھمیری پلکیں جھکا لیں۔ اس کا چہرہ گلابی ہو گیا تھا۔ سرگرم بہت خوش تھی، جیسے میں نہیں بلکہ وہ برسوں کے بعد صحت یاب ہوئی ہو۔ میں اسے اس قدر خوش دیکھ کر سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ وہ کتنی بڑی اداکارہ ہے۔ حقیقی زندگی کے سنجے پر اداکاری کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ویسے بھی اسے خوش ہونا ہی چاہئے تھا۔ لوگ قریبی کا اچھا سا جانور خرید کر خوش ہوتے ہیں۔ اس کے لیے عمدہ خوراک کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی کیا جا رہا تھا۔ میری صحت یابی کی خوشی میں سرگرم نے پر تکلف کھانے کا اہتمام کیا تھا۔ وہ کھانے کی میز پر تو ایک بار خوشی اور محبت کے اظہار میں حد سے بھی تجلوز کر گئی۔ مجھے اپنے ہاتھ سے کھلاتی رہی اور آنکھوں سے پلاتی رہی۔

دوپہر کے کھانے کے بعد اپنے کمرے میں آیا تاکہ کوٹ اور ٹوپی پن لوں۔ سرگرم نے مونروٹ میں میرا پروگرام بنایا تھا۔ میں اپنے کمرے میں پہنچا تو اسے بڑی آہستگی سے اور پراسرار انداز میں ٹیلی فون پر باتیں کرتے ہوئے سنا۔ میرا ہاتھ ٹھکا کہ کہیں بوٹ میں میرے کہانے وہ مجھے کسی حادثے کا شکار تو نہیں کرنا چاہتی؟ مگر اب وہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی تھی۔ اب میں پوری طرح صحت یاب ہو چکا تھا۔

ہم دونوں کوئی تین گھنٹے تک سمندروں کی لہروں پر ڈولتے اور گھومتے رہے وہ گزشتہ دو روز سے غیر محسوس انداز میں میرے ملک کے خلاف نفرت انگیز باتیں کر رہی تھی۔ میرا تفریح کے اس موقع پر بھی اس نے میرے کھن خوب بھرے۔ میں اس کی باتیں خاموشی سے سنتا رہا۔ اور ہوں ہاں کرتا رہا، جیسے اس کی ہاں میں ہاں ملا رہا ہوں۔ اس کی کسی بات سے اختلاف نہیں کیا جب کہ یہ ساری باتیں ایک محب وطن کے نزدیک بہت شرمناک تھیں۔

سہ پہر کے وقت ہم خشکی پر اتر گئے۔ سرگرم تھریس میں کافی ساتھ لائی تھی۔ اور کلب بیٹھو پر بھی بنا کر لائی تھی۔ میں دوستوں کے ساتھ منوڑہ کی سیر کو کئی بار آچکا تھا۔ مگر جو لطف اس حسینہ کے ساتھ آ رہا تھا وہ پہلے

”تمہارے خیال میں کرمل کو ذکیہ کے بارے میں بتانا بہتر ہے تو اسے آج ہی بتا دوں گی۔“

”بہتر نہیں بلکہ ہمارے حق میں بہت زیادہ مفید ثابت ہو گا۔“

”آج کا دن بھی کس قدر منحوس ہے۔“ سرگرم نے ایک گہری سانس لی۔ ”ایک مصیبت کا رونا رو رہے تھے۔ کہ دوسری مصیبت گلے پڑ گئی۔ ذکیہ کی مصیبت کسی نہ کسی طرح ٹل گئی تو اب لاش کی مصیبت دور کرنے کے لیے اس کا بیٹہ چلانا ضروری ہو گیا ہے۔“

”پریشان کیوں ہوتی ہو؟ یہ مصیبت بھی ٹل جائے گی۔“

”جلاؤ اور جا کر کوئی اطلاع لاؤ۔ وقت ضائع ہو رہا ہے۔ لمحہ لمحہ قیمتی ہے۔ کیس ایسا نہ ہو کہ یہ تاخیر منصوبہ چھوٹ کر کے رکھ دے۔“

”پہلے تم کرمل کو تو ہم خیال بناؤ۔ اس کے بغیر ہم ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔“

”یہ شخص اپنی یادداشت کھو چکا ہے لیکن پھر بھی اسے منصوبے کے لیے تیار کرنا آسان نہیں ہے۔“ سرگرم کہنے لگی۔ ”اسے پوری طرح اپنا بنانے کے لیے چارہ ڈالنا ہو گا۔ یعنی مجھے اس سے شادی کرنا ہو گی، پھر میں اسے پوری طرح مٹھی میں لینے کی کوشش کروں گی۔ تب وہ خطرناک سے خطرناک مشن کے لیے بھی تیار ہو جائے گا۔“

”یہ کرمل کتنا خوش نصیب ہے کہ اس کی تم سے شادی ہو رہی ہے۔ تم دونوں کسی پر فضا مقام پر ہنی مون منائو گے۔ میرے دل پر۔“

”ظہیر۔“ سرگرم کا لہجہ تند تھا۔ ”یہ تم کیا فضول باتیں لے بیٹھے۔ اور تم تو یوں بھی دو غلے ہو۔ تمہارے دل و دماغ پر تو آج کل ذکیہ خانم چھائی ہوئی ہے۔ حلالا کہ تم اس کے خلاف جال بچھا رہے ہو۔ ایک بات ذہن نشین رکھنا وہ جوڈو کراٹے کی ماہر ہے۔ اس نے کئی بڑے بڑے مقابلے جیتے ہیں۔ کیس ایسا نہ ہو کہ کسی روز تم اپنی گردن ہی تڑوا بیٹھو۔“

”میں اپنی تو بہن کا ایسا خوف ناک انتقام لوں گا کہ وہ دنیا کو اپنی صورت بھی نہیں دکھا سکے گی۔“

”بعد میں اپنی حسرت پوری کر لیتا“ پہلے گھٹشام اور اکمل سے رابطہ قائم کرو۔ گھٹشام کو فوراً ”بلاؤ تاکہ اسے کرمل بنا سکے۔ ان لوگوں کی تصویروں کا بھی بندوبست کرو جو اس ایٹمی پلانٹ کے اعلیٰ افسران ہیں۔ جن سے کرمل کا واسطہ رہتا تھا۔ اور رہے گا۔“

”میرے ذمے جو کام ہیں، وہ میں آج ہی انجام دینے کی کوشش کرتا ہوں۔“ ظہیر ریمان نے کہا۔

گھٹشام دو ایک روز میں پہنچنے والا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جانے سے پہلے ان خوبصورت ہاتھوں کی گرم گرم کافی چٹا جاؤں۔“

ایک لمحے کے لیے سناٹا سا طاری ہو گیا۔ پھر سرگرم خواب ناک لہجے میں بولی ”تم مجھے کافی بنانے دو گے یا نہیں؟“

وہ کمرے سے باہر آنے والی تھی۔ میں فوراً ہی ساتھ والے کمرے میں چلا گیا۔ اور دروازے کے پیچھے کھڑا ہو کر جھری سے جھانکنے لگا۔ سرگرم لہراتی ہوئی باورچی خانے کی طرف جا رہی تھی اور ظہیر ریمان کسی پالتو کتے کی طرح اس کے پیچھے تھا۔ دونوں اندر چلے گئے تو میں اس کمرے سے نکل کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ میرا بدن پیسے میں شرابور ہو رہا تھا۔ میں بستر پر گر گیا۔

میں اس منصوبے کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گھٹشام جو آکر مجھے کرمل بنائے گا۔ ایٹمی پلانٹ

”جی...“ وہ میرے ہاتھوں کو نرمی سے ہلاتے ہوئے بولی۔

میں نیچے آیا تو سرگم کو کمرے میں ہی پایا۔ وہ فرش سے اپنے کپڑے اٹھا کر الماری میں رکھ رہی تھی۔ میں بھی اس کا ہاتھ ٹانے لگا۔ مگر میرا سارا دھیان باہر کی طرف تھا۔

”تمہاری الماری کی کیا حالت ہے؟ سرگم نے مجھ سے پوچھا۔

”میرے کمرے میں تو شاید اس نے قدم بھی نہیں رکھا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اس نے شاید تمہارے کمرے سے ہی پیل کی تھی۔ وہ پوری طرح الماری کی تلاشی بھی نہیں لے پایا ہو گا کہ ہماری بوٹ کی آواز سن لی اور فرار ہو گیا۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔ مگر وہ یہاں پہنچا کیسے ہو گا؟ نہ مونروٹ اور نہ ہی کوئی دوسرا گاڑی۔“ یہی پر نظر آتی ہے۔“ سرگم کی کمری سوچ میں ڈوب گئی۔

”اگر کوئی چیز چوری ہوئی ہے تو فوراً پولیس کو فون کرو۔“

”الماری اور گھڑے تو کوئی چیز چوری نہیں ہوئی۔ مگر ایک ایسی چیز چوری ہو گئی ہے جس کا واپس ملنا بہت ہی مشکل ہے۔“

”پولیس چاہے تو ہر چیز برآمد کر سکتی ہے۔“

”اسے پولیس برآمد نہیں کر سکتی۔ اور نہ ہی اس چور کو پکڑ سکتی ہے۔ مگر وہ گرفتار ہو بھی جائے تو عدالت اسے سزا نہیں دے سکتی۔“

”یہ کیا بات ہوئی؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔ ”وہ کون سی ایسی چیز ہے؟“

”میرا دل...“ وہ کھل کھلا کر فیس پڑی۔ ”دل چاہے والے کے لیے دنیا کے کسی بھی ملک میں کوئی قانون نہیں ہے۔“

وہ میرے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی چہرہ کسی خیال سے بھج گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اسی تیر رہی تھی۔ ”کرل!“ اس کی آواز گھرے کنویں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ ”کیس تم میری محبت کو فراموش تو نہیں کرو گے؟ مجھے دھوکا تو نہیں دو گے؟“

”تمہیں مجھ پر شک کیوں ہو رہا ہے؟“ میں نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھے۔ اور اس کی آنکھوں میں ڈوب گیا۔ ”ہماری محبت ہمیشہ قائم رہے گی۔“

”... تم ذکیہ خانم سے بھی تو محبت کرتے ہو۔“

”کون میں...؟ میں تو اسے جانتا تک نہیں۔“

”تمہاری یادداشت کھو گئی ہے اس لیے تمہیں ذکیہ کے بارے میں کچھ یاد نہیں رہا حالانکہ وہ تمہاری دوست اور محبوبہ ہے۔ اور پھر وہ ترونازہ، مسکیتی کلی ہے۔ جب کہ میں ایک سرخیا ہوا پھول ہوں۔ میں تو یہ سوچ سوچ کر کانپ جاتی ہوں کہ یادداشت واپس آنے کے بعد کہیں تم مجھے ٹھکرانے کے ذریعے کے پاس نہ چلے جلاؤ۔ اگر ایسا ہو تو میں خود کشی کر لوں گی۔“

وہ بہت ہنسنے لگی۔ ”بہت سی اداکاری ہی تھی۔ بلاشبہ وہ کسی عظیم اداکارہ سے کم نہیں تھی۔ اسی نے گردن جھکائی۔ میں نے اپنے ہاتھوں کے پیالے میں اس کا چہرہ تھام کر اسے اور اٹھایا اور ایک تک رہتا رہا۔ پھر اس کی منہ آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ ”میں ذکیہ خانم کو نہیں صرف تمہیں جانتا ہوں۔ تم میری زندگی، میری روح

کبھی نہیں آیا تھا۔ خشکی پر پہنچ کر پہلے تو ہم چل تھی کرتے رہے۔ پھر کچھ کھیل کود اور بھاگ دوڑ ہوئی۔ اس کے بعد ہم نے سینڈو پز کھائے اور کافی پی۔

سورج ڈوبنے میں کچھ دیر باقی تھی۔ کہ ہم دونوں واپس ہوئے۔ ہوا میں خشکی بڑھ رہی تھی۔ شام بے حد سرد ہو رہی تھی۔ ہم اپنے ڈاک پر پیچے تو سورج ڈوب چکا تھا۔ اور شام گہری ہو گئی تھی۔ گھر میں قدم رکھ کر سرگم نے سوچ آج کیا۔ اور اچھل پڑی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کمرے کا جائزہ لینے لگی تو میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت پریشان ہے۔

”خیریت تو ہے؟ تم اس قدر پریشان کیوں ہو رہی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے ہونٹوں کو دانتوں سے چباتے ہوئے جواب دیا۔ ”کرل! ہماری غیر موجودگی میں کوئی یہاں آیا تھا۔“

”کون آیا ہو گا؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”ہم نے کسی بوٹ کو اوپر آتے جاتے نہیں دیکھا۔“

”یہ دیکھو۔“ اس نے انیش ٹرے اور پتائی کی طرف اشارہ کیا۔ جو فرش پر گری ہوئی تھی۔

سرگم نے مجھے نشست گاہ میں چھوڑ کر تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چلی۔ چند لمحوں کے بعد اس نے اپنے کمرے سے مجھے پکارا۔ ”کرل! کرل! اوپر آؤ۔“

میں کمرے میں پہنچا تو وہ الماری کے سامنے کھڑی تھی۔ الماری کھلی ہوئی تھی۔ الماری سے کپڑے اور دیگر چیزیں نکل کر کمرے میں پھینک دی گئی تھیں۔ سرگم کا پرس بھی فرش پر پڑا ہوا تھا۔ وہ کھلا ہوا تھا۔ اس میں سے رقم جھانک رہی تھی۔ گویا جو کوئی بھی آیا تھا رقم کے لیے نہیں بلکہ کسی اور ہی چیز کی تلاش میں آیا تھا۔ سرگم نے میری طرف گھوم کر کہا۔ ”کرل! اپنے کمرے کا جائزہ لے کر آئیے۔“

میں اپنے کمرے میں پہنچا تو اس کی حالت جوں کی توں تھی۔ چور نے یہاں قدم بھی نہیں رکھا تھا۔ میں کمرے کا جائزہ لے کر واپس جانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ میری نظر سامنے پڑی۔ غسل خانے کا دروازہ بے آواز اور غیر محسوس انداز سے کھل رہا تھا۔ میرے جسم میں سسٹنی کی لہر دوڑ گئی۔ میں یہ فیصلہ بھی نہیں کر پایا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے، دروازہ پورا کھل گیا۔ میری نظروں کے سامنے سونیا کا سرایا تھا اور وہ مجھے چپ رہنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ اس نے لپک کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ اس کے کپڑے کپڑے ہو کر بدن سے چپکے ہوئے تھے۔ وہ کانپ رہی تھی۔ اس نے قریب آ کر سرگوشی کی۔ ”میں کچھ کانڈات کی تلاش میں آئی تھی۔ وہ میرے ہاتھ نہیں لگ سکے۔ وہ اداری کے خفیہ خانوں میں ہوں گے۔ اب آپ کو انہیں تلاش کرنا ہے۔“

”کیسے کانڈات...؟“ میں نے گردن ہٹا کر پوچھا۔

”ناپ شدہ کانڈات ہیں۔ اگر وہ ہاتھ لگ گئے تو ایک ہی دن میں یہ ڈرامہ ختم ہو سکتا ہے۔“

”تم یہاں کیسے آئی ہو اور واپس کیسے جاؤ گی؟“

”تیرے...“ اس نے جواب دیا۔ ”میری بوٹ اس نیلے کے عقب میں ہے۔“

”اتنی دور جاؤ گی؟ تیرے مگر تم جاؤ گی کیسے؟ سرگم نے مجھے موجود ہے۔ تم اس کی نظروں میں آ سکتی ہو؟“

”آپ جانیں تو یہ ممکن ہو سکتا ہے...“ وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔ تو اس کا چہرہ کسی اچھلنے خیال سے سرخ ہو گیا۔

میں اس کی بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھامے ہوئے پوچھا۔ ”کیا اس طرح؟“



لوہ میرا وجود ہو۔“

ہم دونوں دیر تک محبت کے عالم میں ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے رہے۔ میں نے سونیا کو نکل جانے کا موقع دے رہا تھا۔ یہ سب کچھ اس کے لیے کر رہا تھا۔ سرگم سمجھ رہی تھی کہ میں اس کا سیرین چکا ہوں۔ جب مجھے یہ یقین ہو گیا کہ سونیا گمر کی عمارت سے نکل چکی ہوگی... تو میں نے پیش قدمی کی لیکن وہ کسی پھلی کی طرح تڑپ کر مجھ سے دور ہو گئی۔

”ایک دن کی قیامت ہے۔ پھر میں پیشہ کے لیے تمہاری ہو جاؤں گی۔ تمہاری ہی دسترس میں تو رہوں گی۔“ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

کھانے اور کافی پینے کے بعد میں اپنے کمرے میں آکر بستر پر لیٹ گیا۔ میں بے حد تھک گیا تھا۔ کیوں کہ آج خوب سیر و تفریح کی تھی۔ اور خشکی پر بھی کتنی ہی دیر سرگم کے ساتھ دوڑ لگا رہا تھا۔ میں آج کی سیر و تفریح سونیا کو اپنی بے باکی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا۔ سرگم دروازے میں کھڑی میری طرف متنی خیر نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں شراب کی سی مستی تھی۔ انجانے پیام تھے۔ چہرے پر شہنشاہی چھوٹی رہی تھی۔ اس کی ناگن جیسی زلفیں شانوں پر تھیں اور اسے دستی ہوئی لگ رہی تھیں وہ جیسے میرا احسان لینے آئی تھی۔

میں نے میرا چہرہ اور آنکھیں پڑھ لیں۔ آخر وہ ایک عورت تھی۔ تجربہ کار اور پختہ۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوئی تو اس کے لیے میں تھک تھی۔ ”شہزادے! نہ دھو رکھو۔ میں باہر سے کنڈی لگا کر جا رہی ہوں۔“

”وہ کس لیے؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔

”میں لیے کہ آج تم اپنے آپ میں معلوم نہیں ہوتے۔“ وہ مجھے تنکھی نظروں سے دیکھ کر بولی۔

”میں ایک شریف آدمی ہوں مجھ پر بھروسہ کرو۔“

”بھروسہ؟“ وہ جیسی اس سردرات کی تھائی میں؟“ وہ اٹھا کر بولی۔ ”تمہارا بھروسہ تو میں نے شام کی سیر کے وقت ہی دیکھ لیا تھا۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں کہ کوئی شرارت نہیں کروں گا۔“

”بھروسہ ہو گا کہ اب سو جاؤ۔ صبح جلدی اٹھنا ہے۔ آپ کے میکے والے صبح بارات لے کر آ رہے ہیں۔“ یہ

کہہ کر وہ دروازہ بند کر کے اور باہر سے کنڈی لگا کر چلی گئی۔

میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ رات دو بجے جا کر کہیں نیند آئی۔

صبح بیدار ہوا تو میں نے ایک نوجوان من موہنی لڑکی کو چنگ کے پاس کھڑے پایا۔ اس نے میرا شانہ ہلا کر مجھے گہری تینو سے بیدار کیا تھا وہ مسکرا رہی تھی۔ وہ وضع قطع اور چہرے مہرے سے کسی اچھے خاندان کی لڑکی لگ رہی تھی۔ میں نے اسے حیرت سے دیکھا تو وہ ترنگ میں آکر بولی۔ ”دو لہا بھائی! جاگ جائیے کیا کوئی شادی کے دن بھی صبح دس بجے تک سوتا ہے؟“ یہ کہہ کر وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی تو اس کا چہرہ دھک اٹھا۔ اس کی ریشمی ہنسی سے جیسے کوئی فخر چھوٹ پڑا تھا۔ کمرے میں سر ہولنے لگے۔ وہ تیز و طرار بھی دکھائی دے رہی تھی۔ میں ہڑباز کر اٹھ بیٹھا اس کی بے تکلفی کے انداز سے مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے جانتی ہو۔ پھر میں نے باتوں کا شور مٹا جو نیچے ہو رہا تھا۔ گمر میں شادی کا سب لگ رہا تھا۔

”کب تک؟“ میں نے لڑکی سے پوچھا۔ ”آپ کون ہیں؟“

لڑکی کے چہرے پر گہرا استعجاب چھا گیا۔ ”آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں پوی ہوں۔“

اسے تو میرے فرشتے بھی نہیں پہچانتے تھے۔ میں نے تعجب سے پوچھا۔ ”کون پوی؟“

”ظہیر بھائی کی چھوٹی بہن۔“ اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔ ”شادی نہیں ہوئی اور ابھی سے بھول گئے۔“

میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے حقیقی کرل سمجھ رہی ہے۔ میں نے بلوں میں پڑھا تھا اور غلوں میں دیکھا تھا کہ

جزواں بھائی ہوتے ہیں۔ مگر میں جزواں نہیں تھا۔ پھر بھی مجھ میں اس کرل سے حیرت انگیز مشابہت تھی۔ ساری

دنیا دھوکا کھا رہی تھی۔ نیچے جو لوگ تھے شاید وہ بھی مجھے جانتے تھے۔ مگر میں انہیں نہیں جانتا تھا۔ اس نے مجھے

سوچ میں ڈوبا پا کر پوچھا۔ ”آپ کیا سوچ رہے ہیں؟“

”میں یہ سوچ رہا ہوں کہ آپ کتنی حسین اور خوش نظر آ رہی ہیں۔ جیسے شادی میری نہیں بلکہ آپ کی

ہو رہی ہو۔“

وہ سرخ ہو گئی دوسرے ہی لمحے بولی۔ ”یہ آپ آج مجھے آپ... آپ سے کیوں مخاطب کر رہے ہیں۔ اور

ہاں! آپ فوراً تیار ہو جائیں۔ میں ناشتہ لے کر آ رہی ہوں۔ سرگم آہنی کا حکم ہے کہ آپ اس وقت تک نیچے

نہیں آئیں گے جب تک ظہیر بھائی آکر نیچے نہیں لے جاتے آپ کو اس کمرے میں نظر بند کیا جا رہا ہے۔“

”جو مرضی میرے صبا کی۔“ میں نے خلاف ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا۔

وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ میں نما کر آیا تو وہ میرے لیے ٹرے میں ناشتہ لے کر آگئی۔ ٹرے میں پر رکھ کر وہ

دروازے تک گئی اور دروازہ بند کر کے چلی تو اس کا انداز بہت پر اسرار تھا۔ اس نے میرے قریب پہنچ کر بڑی

آہستگی سے کہا۔ ”شادی کی خوشی میں سونیا نے آپ کے لیے ایک تحفہ بھیجا ہے۔“

اس کی زبان سے سونیا کا نام سن کر میں اچھل پڑا۔ مجھے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔ ناقابل یقین بات یہ تھی

کہ پوی غدار ظہیر ریحان کی بہن تھی۔ اس شخص کی بہن سے یہ کیسے توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ اپنے بھائی کی ہم

خیال نہ ہو۔ سونیا کو یقیناً اس پر اعتماد رہا ہو گا۔

ناشتے کی ٹرے میں تہ کیا ہوا ایک تولیہ رکھا ہوا تھا۔ تولیہ کچھ پھولا ہوا سا تھا۔ پوی نے تولیہ کھولا تو اس

میں پستول تھا۔ اس نے پستول اٹھا کر میری طرف بڑھا دیا۔ ”کرل! یہ پستول کہیں چھپا دیں۔ سونیا نے یہ تحفہ آپ

کی حفاظت کے لیے بھیجا ہے۔“

”مگر تم اور سونیا...؟“

وہ میری بات کا مطلب سمجھ کر بولی۔ ”میں اپنے بھائی کی دشمن ہوں۔ بھائی جان وطن فروشوں سے ملے

ہوئے ہیں۔ میں سونیا کی ساتھی ہوں۔ کیوں کہ وہ وطن دوست ہے۔“ یہ کہہ کر پوی دروازہ کھول کر چلی گئی۔ اس

نے جاتے جاتے مجھے مشورہ دیا تھا کہ اندر سے دروازہ بند کر کے پستول چھپا دوں۔ کہیں کوئی آنہ جائے۔ میں نے

اس کے نکتے ہی دروازے کو بند کیا۔ اور پستول جوتے کے اس خالی ڈبے میں رکھ دیا جو الماری میں رکھا ہوا تھا۔ پھر

دروازے کھول کر ناشتے کی میز پر بیٹھ گیا۔

میں سہ پہر تک اپنے کمرے میں رہا تھا۔ سہ پہر کے وقت ظہیر ریحان اپنے کسی دوست کے لڑکے اور نور

پوی کے ساتھ اوپر آیا تھا۔ اس کا نام احمد تھا۔ پوی نے الماری سے نیلے رنگ کا سوٹ، پیچنگ ٹائی، سفید قبض اور

ٹائی پن نکال کر مجھے دی۔ وہ نیچے سے کالے رنگ کے نئے جوتے اور موزے لیٹی آئی تھی۔ میں نیچے آیا تو قاضی

صاحب دو مرد تین لڑکیاں اور دو عورتیں موجود تھیں۔ ایک فوٹو گرافر بھی تھا۔ اس نے میری تصویریں انارٹا



شب عوی کر رہی بالکل اسی طرح جیسے وہ کوئی بہت ہی سندر پینا تھا۔ سرگم سوئی تھی۔ رات کا آخری پہر تھا۔ مجھے بھی نیند آ رہی تھی۔ لیکن میں سونا نہیں چاہتا تھا۔ رات کا آخری پہر بھی اسے دیکھتے ہوئے کٹ دینا چاہتا تھا۔ میں کرسی پر اونی شل میں لیٹا ہوا بیٹھا ہوا تھا۔ میری نظروں کے سامنے سرگم کا نور چہرہ تھا۔ میں نے قوسا قوسا چہرہ دل کا آئینہ ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو پھر اس عورت کا چہرہ اس قدر پر نور کھلے ہوئے ہے۔ میری آنکھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کمرہ قریب کی پرچائیں تک نہیں تھیں۔ وہ تو ایک ایسی عورت کا چہرہ تھا جس پر ساگ رات کے کلمات کا رنگین عکس جھلک رہا تھا۔ ایک فائنلہ مجسمہ رقصاں تھے۔ جیسے سادہ دنیا کی دولت اس کے قدموں میں پڑی ہو۔ جیسے یہ دولت ہی اس کے لیے سب کچھ ہو۔ جیسے اس نے یہ ساتتیس صدیوں کی جدوجہد کے بعد پائی ہوں۔

میری زندگی میں یہ رات پہلی بار آئی تھی۔ لیکن میں نے جو کچھ پایا تھا شاید وہ کھونے کے لیے ہی تھا۔ یکبارگی میرے دل میں آیا کہ کیوں نہ میں آگے بڑھ کر اس عورت کا گلا اپنے دونوں ہاتھوں سے کھونٹ دوں۔ جو کل کلاں مجھے اپنے منصوبے پر قربان کر دے گی۔ مگر میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ میں دل کے ہاتھوں بھجور ہو گیا تھا۔ کوئی ایک ہفتے تک میں جیسے جنت کی وادیوں میں ہی کھوتا رہا۔ یہ شب و روز ایک جھپٹے میں ہی گزر گئے۔ باوجود شدید فطرت کے مجھے سرگم سے شدید محبت ہو گئی تھی۔ اس نے میرے دل و دماغ پر جیسے جادو سا کر دیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں نے جو کچھ سنا تھا وہ بھوت تھا۔ اب سرگم اور میں ایک جگہ دو قالب تھے۔ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں ایک دہرے سے جدا نہیں کر سکتی تھی۔

ایک رات میں گری نیند سو رہا تھا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے سرگم کو دیکھا جو دونوں کی طرح دبے پاؤں دروازے کی طرف جا رہی تھی۔ اس نے دروازے کے پاس پہنچ کر پنڈل کے لٹو کو غیر محسوس انداز سے اٹھایا جیسے ہی دروازہ کھلا میں نے اپنی آنکھیں موند لیں۔ اور جب آنکھیں کھولیں تو دروازہ بند ہو چکا تھا۔ میں نے دستی گھڑی میں وقت دیکھا تو رات کے دو بج رہے تھے۔ میرے دل کے گوشے میں شک کی لہر ابھری تو اٹھ کر دروازے کے پاس جا پہنچا مجھے دروازہ کھولنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ زبردستی سے ٹیلی فون پر کوئی نمبر ڈائل کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ سرگم اتنی رات گئے کس کو ٹیلی فون کر رہی ہے۔ میں سوچنے لگا۔

وہ نصف گھنٹے تک وقفے وقفے سے مسلسل ڈائل کرتی رہی۔ مگر اسے مطلوبہ نمبر نہ مل سکا۔ میں بھی دروازے کے پاس کھڑا رہا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ رات گئے کس سے ٹیلی فون کرنا چاہتی ہے۔ جب مجھے محسوس ہوا کہ وہ آ رہی ہے تو میں بستر پر جا کر لیٹ گیا اور کھولے سوتائیں گیلہ وہ آکر بستر پر لیٹ گئی۔ مجھے بڑی دیر تک نیند نہیں آئی میں نے محسوس کیا کہ اس کی نیند بھی اڑ گئی ہے۔ وہ پریشان اور مضطرب تھی۔

اگلی صبح وہ حوش نظر آئی اس کی آنکھیں سوچ رہی تھیں اور نیند سے بھری تھی۔ میں نے اسے کوئی گیارہ بجے ظہیر رحمان آیا تو میں غسل کے سامنے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ میں نماز کا نکلوانے کے لیے زیپے پر قدم رکھا تو ظہیر رحمان کا ایک جملہ سنا دیا۔ ”مجھے دسمبر تک نہیں اپنی تیاری مکمل کرنی چاہیے۔“ ظہیر رحمان لچ کر کے چلا گیا تو ہم دونوں نشست گاہ میں بیٹھے ہوئے بات کر رہے تھے۔ کہ تو کتنا ”سرگم نے پوجا۔“ ”کر قل ایک بات پوچھوں۔“

”مگر میں تمہارا کر قل نہیں بلکہ نیاز احمد ہوں۔ تم مجھے کر قل کے نام سے کیوں مخاطب کر رہی ہو؟“ ”اس لیے کہ میں جو سوال کرنا چاہتی ہوں وہ ذاتی نوعیت کا ہے۔ ایک اہم سوال ہے۔ جو انصافیت کے

شروع کر دیں۔ روائی انداز میں نکاح پڑھایا گیا۔ نکاح سے پہلے نکاح نامے پر دستخط لینے اور دلہن کی رضا معلوم کرنے ایک وکیل اور دو گواہ اس کمرے میں گئے تھے جہاں وہ دلہن کی بیٹھی تھی۔

مجھے اور سرگم کو نکاح کے بعد ایک ساتھ کھڑا کر کے تصویریں کھینچی گئیں۔ سرگم نے اپنا چہرہ گھومتھ میں چھپا رکھا تھا۔ پوری کی شرارتوں کی وجہ سے میں اس کی حالت نہیں دیکھ سکا۔ بس ایک آدھ جھلک ہی نظر آئی تو ایسا لگا جیسے میری نظروں کے سامنے بجلی کی گوند گئی ہو۔ تصویریں اندازے کا سلسلہ ختم ہوا تو سرگم کو اس کے کمرے میں پناہ دیا گیا۔

مہمانوں کی خاطر تواضع پر تکلف کھانوں سے کی گئی۔ مجھے ان مہمانوں میں صرف مرد پر اسرار سے لگے تھے۔ جب کہ لڑکیاں اور عورتیں خالص گھریلو قسم کی لگ رہی تھیں۔ ان عورتوں اور لڑکیوں کے خاندانی افراد شریک نہیں ہوئے تھے۔ اسی طرح ان مردوں کی عورتیں بھی نہیں آئی تھیں۔ یہ شادی ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہوئی تھی۔ اور اس گھناؤنی سازش کی ایک کڑی تھی۔

رات گیارہ بجے مہمان رخصت ہوئے۔ اس دوران میں نے ایک اور بات محسوس کی تھی کہ ان مردوں میں سے کسی نے بھی آنکھ میں بات جیت نہیں کی تھی۔ وہ سارا وقت گونگے بنے بیٹھے رہے تھے۔ ان لوگوں کو رخصت کرنے کے لیے ڈاک پر صرف میں ہی موجود تھا۔ پوری نے تالیاں دہرائیں میرے کمرے میں موجود ہے۔ میں اس وقت تک ڈاک پر کھڑا رہا جب تک کہ لالچ بہت دور جا کر چھوٹی سی نہ ہو گئی۔ اب اس کی رشتہاں انہرے میں جھک کر نظر آ رہی تھیں۔

میں نے اندر آ کر بیرونی دروازے کو بند کر کے چٹنی لگائی۔ اب گھر میں ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ پورا گھر مک رہا تھا۔ یہ ان گلاب کے پھولوں کی جھنپ جھنپ تھی جن کی پتیوں سارے گھر میں بکھری ہوئی تھیں۔ میں نے اپنے پرچہ رہا تھا تو میری عجیب کیفیت تھی۔ اور مجھے یہ سب کچھ کسی خواب کی طرح لگ رہا تھا۔ ایک طرف تو سرگم سے شادی کی خوشی تھی، دوسری طرف اس روز کے تصور سے وحشت ہو رہی تھی جب یہ لوگ مجھے تختہ دار پر چڑھائیں گے۔ میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا۔ ”سکندر ابھی سے کیوں ہلکا ہو رہے ہو۔ جب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا خدا تمہارا حامی و ناصر ہے۔ اس لیے ڈرنے یا گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

مجھے پون محسوس ہوا جیسے بجلیاں کوند رہی ہوں۔ میری آنکھیں چند ہیا کر رہ گئیں۔ چند لمحوں تک میری آنکھوں کے سامنے لندھرا سا چھلایا رہا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ دلہن کے روپ میں اس قدر معصوم نظر آئے گی۔ اس کے چہرے پر پاپیڑی کا نور نہ جانے کہاں سے سمٹ آیا تھا۔ سرخ رنگ کی بھاری ساڑھی میں اس پر کسی دو ٹیڑھ کا کلمن ہو رہا تھا۔ اس بھڑکیے لباس میں اس کا چاند سا چہرہ اور دل کش سر لاپے جد ج رہا تھا۔ اس نے میک اپ نہیں کیا تھا۔ اس کا حسن کسی میک اپ کا محتاج بھی نہیں تھا۔ ہونٹوں پر نہ تو لب تک تھی اور نہ ہی چہرے پر کہیم یا پاؤڈر کی ہلکی سی تہ تھی۔ اس کے بھرے بھرے گالوں اور مونے مونے ہونٹوں پر ایسی سرفی جھلک رہی تھی۔ جیسے قدرت نے اپنے ہاتھوں سے اس کی آرائش کی ہو۔

میں اس تراشیدہ مجسمے کو بہت سا ہو کر دیکھتا رہا اور اپنے آپ کو بھول گیا۔ میرے پاس ہوش و حواس نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی تھی۔ رگوں میں خون کی گردش میں تیزی آ گئی تھی۔ دل بھی اسی رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں واقعی سکندر اعظم ہوں اور وہ میری ملکہ ہے۔

آثرات کو ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”ہم سے کیا مطلب؟ کیا مجھے کوئی اور تربیت دے گا؟“  
 ”ہاں!“ اس نے اپنا خوش نما سر ہلایا۔ ”میرے وہ دوست جو اس ملک کی عوام کے خیر خواہ ہیں۔ ان میں مشتاق احمد ہے جو دو تین دن بعد یہاں پہنچنے والا ہے۔ یہ شخص بھی اس پلانٹ میں کلیدی عہدے پر ہے۔ وہ تمہیں پلانٹ کے تمام افراد کے بارے میں بتا دے گا۔ کیا تم اس ملک کی خاطر یہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہو؟“

”تم کو تو میں سمندر میں بھی چھلانگ لگا سکتا ہوں۔“

”تم کتنے اچھے ہو؟“ وہ بیکام کھل اٹھی۔

”یہ سب کچھ کب اور کس روز کرنا ہو گا؟“

”۲۵ دسمبر کو۔“ وہ بولی۔ ”اس روز یوم قائد اعظم کی وجہ سے عام تعطیل ہوتی ہے۔ تم پلانٹ کے مرکز میں جا کر بڑی آسانی سے اپنا کارنامہ انجام دے سکو گے۔“

”اگر میں گرفتار ہو گیا تو؟“

”اس کی نوبت نہیں آئے گی۔“ سرگم کہنے لگی۔ ”تم جیسے ہی اس اینٹی پلانٹ میں ٹائم بموں کا جال بچھا کر اور اس سائنس دان کو قتل کر کے آؤ گے ہم تمہیں ہوائی جہاز سے پڑوسی ملک میں پہنچا دیں گے۔ پھر تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔“

”کیا ہمیں پڑوسی ملک میں پناہ مل سکے گی؟“

”کیوں نہیں؟“ سرگم نے مجھے تسلی دی۔ ”پڑوسی ملک ہمارا خیر خواہ اور ہمدرد ہے۔ ہم اسی کی مدد سے یہ کارنامہ سرانجام دیں گے۔“

سرگم نے قدرے تفصیل سے منصوبہ بتایا اور دیر تک مجھے سمجھاتی رہی۔ سہ پہر بھی گزر گئی، شام آئی پھر رات بھی آگئی۔ وہ حکومت اور اس کے انٹیلی پروگرام کے خلاف میرے کانوں میں زہرا نغمہ بجاتی رہی۔ میں آٹا کیا مگر اس کی باتیں مستعار رہا۔ ذرے کے بعد ہم باہر چل قیدی کر رہے تھے۔ کہ سرگم نے میرا امتحان لینے کی غرض سے بست سی باتیں پوچھیں اور کئی سوالات کیے۔ میں جواب دیتا رہا۔ ہم سونے کے لیے کمرے میں آئے تو رات کے دس بج رہے تھے۔ وہ ہاتھ روم میں چلی گئی، میں بستر پر لیٹ گیا۔ دس منٹ بعد وہ باہر آئی۔ اور لپک کر دروازے پر پہنچ گئی۔ پھر شونی اور شرارت کے انداز میں بولی۔ ”میرے پیارے شوہر! اب تم ایک ہفتے تک تنہا اس کمرے میں سوؤ گے۔ اس کی ابتدا آج سے ہو رہی ہے۔“

”وہ کیوں؟“ میں اچھل پڑا۔

”مجھے اس منصوبے پر کچھ کام کرنا ہے۔ جس کے لیے سارا دن سرکھپاتی رہی ہوں۔“

”کام کے لیے کل کا پورا دن پڑا ہے۔“ میں نے اپنے بازو فضا میں پھیلا دیے۔ ”ایسا ظلم نہ کرو۔ ہماری نئی نئی شادی ہوئی ہے۔“

”میں کل صبح سے شہر جا کر شام کو واپس آیا کروں گی۔ یہ سلسلہ ایک ہفتے تک جاری رہے گا۔ لذتِ ان میں کام کرنے کا کوئی موقع نہیں ملے گا۔“

میرے لاکھ کہنے کے باوجود اسے مجھ پر رحم نہ آیا۔ اور باہر سے دروازہ بند کر کے چلی گئی۔ میں کچھ دیر اس بھوکے کی طرح غصے سے بیچ و تاب کھاتا رہا۔ جس کے منہ سے نوالہ چھین لیا گیا ہو۔ پھر اس کے خطرناک منصوبے کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں نے دل میں دعا مانگی کہ وہ کسی طرح سونیا سے ملا دے تاکہ یہ منصوبہ اس کے علم میں

جذبے اور وطن پرستی سے تعلق رکھتا ہے۔ جس کا جواب تمہیں بہت سوچ کچھ کرنا ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”تم ایک نہیں دس سوال کر سکتی ہو؟“ میں نے ہنس کر کہا۔

”کیا تمہیں اپنی قوم اور اپنے وطن سے محبت ہے؟ ایسی محبت جو وقت آنے پر قربانی مانگے تو تم پیچھے نہ ہٹ سکو؟“

”ایسا کون شخص ہو گا جو وطن کے لیے اپنی جان قربان نہیں کر سکتا؟ لیکن میری قربانی کی کیوں ضرورت پیش آگئی؟“

”مشکل یہ ہے کہ تم اپنی یادداشت سے محروم ہو۔ ہر کیف میں تمہیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ حکومت اپنے ہیروں پر کھانا ڈی مار رہی ہے۔“

”میں سمجھا نہیں۔“

”حکومت دنیا کی نظروں میں دھول بھونک کر انٹیم بم بیاری ہے۔“

”کیا انٹیم بم پھٹنا کوئی بری بات ہے؟“

”انٹیم بم نہ صرف انسانیت کے لیے بلکہ عوام کے لیے بھی خطرناک ہے۔“

”وہ کیسے؟“ میں نے وضاحت چاہی۔

”انٹیم بم سے لاکھوں جانیں ہل کے ہل میں صفِ ہستی سے مٹ سکتی ہیں۔ اور پھر اس پر اتنا خرچ آتا ہے کہ ہم غریب ملک کے عوام یہ بوجھ برداشت نہیں کر سکتے۔ اگر یہی رقم عوام پر خرچ کی جائے تو یہ ملک جنت بن سکتا ہے۔“

”تو پھر لوگ حکومت کو روکتے کیوں نہیں؟“

”حکومت کسی کی نہیں سنتی۔“

”کیا انہیں کسی اور طریقے سے باز نہیں رکھا جاسکتا؟“ میں نے دل چسپی ظاہر کی۔ ”کوئی راستہ نہیں ہے؟“

”ایک راستہ ہے تو سہی۔“

”مجھے بتاؤ۔“ میں نے اصرار کیا۔

”تم چاہو تو انہیں باز رکھ سکتے ہو۔ انٹیلی پروگرام پر عمل سے روک سکتے ہو۔“

”کون... میں...؟“ میں اچھل پڑا۔

”ہاں تم!“ سرگم بولی۔ ”تم اس شخص کو راستے سے ہٹا کر انسانیت پر احسان کر سکتے ہو۔ جو انٹیم بم پھٹنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اور پھر اس جگہ کو بھی تباہ و برباد کر سکتے ہو جہاں انٹیم بم بنایا جا رہا ہے۔ تم اس اینٹی پلانٹ کے ایک ایسے افسر ہو جو وہاں بے دھڑک جاسکتا ہے۔ اور جو کرنا چاہے کر سکتا ہے۔“

”مگر... مگر... میں تو کچھ بھی نہیں جانتا۔“ میں نے ہونٹوں کو کھینچ کر کہا۔ ”میں یہ سب کچھ کیسے کر سکتا ہوں؟“

”اس کی فکر نہ کرو۔ ہم تمہیں اس کی پوری تربیت دیں گے۔ اور بتا دیں گے کہ تمہیں کیا کرنا ہے؟ کس طرح یہ عظیم کارنامہ انجام دینا ہے۔“

بلی ٹھیلے سے باہر آگئی تھی۔ سرگم کا پروگرام سن کر میں سنائے میں آگیا تھا۔ مگر میں نے اس پر اپنے دلی

بھی لے آؤں۔

صبح نوبت بیدار ہوا تو دروازہ کھلا ہوا تھا۔ نیچے آیا تو سرگم اپنی خواب گاہ میں نہیں تھی۔ وہ باورچی خانے میں تھی۔ اور بڑی تندہی سے کام میں مصروف تھی۔ میں قریب گیا تو وہ کسمسا کر بولی۔ ”سنو پارے! میں نے تمہارے لیے ناشتہ اور دوپہر کا کھانا تیار کر دیا ہے۔ چائے اور کافی بھی موجود ہے۔ میں نے ناشتہ کر لیا ہے اور دس منٹ بعد شہر کے لیے روانہ ہو رہی ہوں۔ سورج ڈوبنے سے پہلے واپس آ جاؤں گی۔ اگر کسی وجہ سے تاخیر ہوئی تو ٹیلی فون کر دوں گی۔ ویسے جلدی آ جاؤں گی۔ میں زیادہ دیر تم سے دور نہیں رہ سکتی۔“

”تم جھوٹ بولتی ہو، کل رات مجھے تمہاری محبت کا اندازہ ہو گیا تھا۔“

”صرف ایک ہفتے کی تو بات ہے۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”ایک عظیم مقصد کے لیے کچھ قربانی تو دینا ہی پڑتی ہے۔“

وہ جلد سے جلد تیار ہو کر چلا جاتی تھی۔ لیکن اب چونکہ میرے رحم و کرم پر تھی۔ لہذا اسے پندرہ منٹ کی تاخیر ہو گئی۔ پھر رہائی پا کر وہ اپنے کمرے میں گئی اور تیار ہو کر آ گئی۔ اس نے مجھے ایک ریو اور دیتے ہوئے تاکید کی۔ ”اندرو سے دروازہ بند کر لیتا۔ ظہیر رحمان کے علاوہ کسی کو اندر مت آئے دیتا۔ اگر کوئی اندر آنے کی کوشش کرے تو بے دریغ شوٹ کر دیتا۔ پھر میں آ کر دیکھ لوں گی۔“

سرگم چلی گئی تو میں نے ناشتہ کیا اور کچھ دیر بعد نشست گاہ میں بیٹھا کافی پی رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسپونڈ نہ کیا۔ میرا خیال تھا کہ سرگم ہوگی لیکن وہ سونیا تھی۔ ٹیلی فون پر اسے پاکر میری خوشی کی انتانہ رہی۔ میں نے اسے مختصر طور پر سرگم کا منصوبہ بتایا۔ اور جب اپنی بات ختم کی تو وہ بولی۔ ”سکندر صاحب! آپ بالکل نہ گھبرائیں، ہم اس کی اور اس کے گروہ کی حرکات و سکنات پر پوری نظر رکھے ہوئے ہیں۔ میں نے سرگم کو ابھی ابھی دیکھا تھا۔ اسی لیے آپ کو فون کیا ہے۔“

”کافذات تلاش کرنے کا سنہرا موقع ہے۔ فوراً آ جاؤ۔ دونوں مل کر کافذات تلاش کریں گے۔“

”آج تو نہیں آ سکتی۔“ سونیا نے جواب دیا۔ ”کسی اور دن سہی، خدا حافظ!“

دن جیسے جیسے گزر گیا۔ سرگم سورج ڈوبنے سے پہلے ہی آ گئی۔ وہ اپنے ساتھ بہت سارا سامان خرید کر لائی تھی۔ جس میں گوشت، مچھلی اور مرغی کے علاوہ بھی بہت سی چیزیں تھیں۔

اس رات بھی وہ مجھے کمرے میں تنہا چھوڑ کر اپنی خواب گاہ میں چلی گئی۔ تمنائی کے ہولناک احساس نے میری نیند اچاٹ کر دی تھی۔ سگریٹ کی طلب ہونے لگی تو میں نے سگریٹ کیس اٹھایا۔ فوراً ہی مجھے اس نقشے کا خیال آیا۔

میں نے سگریٹ کیس خالی کر کے کافذ نکالا اور اس نقشے میں دماغ کھپا تا رہا۔ آخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ

کرئل نیجب نے غالباً اس خفیہ مقام پر دولت چھپا رکھی ہے۔ جو میرے جواہرات یا سونے کی شکل میں ہوگی۔ اس میں جو اشارے تھے شاید اپنی یادداشت کے لیے بنائے گئے تھے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ دولت کسی اور کے ہاتھ لگے۔ شاید اسی لیے وہ سگریٹ کیس اپنے ساتھ ساتھ لیے پھرتا تھا۔ وہ مرگیا مگر یہ راز اشاروں کی زبان میں چھوڑ گیا تھا۔ اس کی لاش کا بھی تک پتہ نہیں چل سکا تھا۔ وہ زندہ تھا یا مر گیا یا پھر اس کی لاش بہتی ہوئی کسی نامعلوم مقام کی طرف نکل گئی تھی۔ اب سرگم اس کی لاش کی طرف سے بے نیاز ہی ہو گئی تھی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

مجھے نیند کے جھوٹے آنے لگے تو میں نے سگریٹ کیس رکھا اور سو گیا۔ رات کو کسی پرگمری نیند میں

محسوس کیا کہ کچھ شور ہو رہا ہے۔ اس شور کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی۔ سرگم میرے کمرے کا دروازہ پیٹ رہی تھی اور خوف ناک انداز میں چیخ رہی تھی۔ ”کرئل! دروازہ کھولو۔۔۔ جلدی کرو۔“

جس وقت میں سگریٹ کیس سے نقشہ نکال کر دیکھ رہا تھا تب میں نے احتیاطاً اندر سے دروازے کی چٹنی لگائی تھی۔ بعد میں چٹنی گرنا بھول گیا تھا۔ میں ہڑبڑا کر بستر سے نکلا اور جیسے ہی دروازہ کھولا وہ کسی سنسناتے ہوئے تیر کی مانند اندر داخل ہوئی اور بجلی کی سی تیزی سے پلٹ کر دروازہ بند کر کے چٹنی لگا دی۔ پھر دروازے سے پشت لگا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ آنکھیں بند کیے شدت سے دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھے اپنی سبے ترتیب سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”سرگم!“ میں نے اس کے چہرے سے پیندہ پوچھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟“

اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ اس کی حالت دل کے اس مریض جیسی ہو رہی تھی جس پر دورہ پڑ گیا ہو۔ چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ رخساروں کی تہماٹ سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ خون کا دباؤ خطرناک حد تک بڑھ گیا ہے۔ میں اس کے دھڑکتے دل کی آواز صاف سن رہا تھا۔ میں اسے اس قدر دہشت زدہ دیکھ کر حیران تھا وہ ایک مضبوط اعصاب کی عورت تھی۔ ایک بے رحم اور سفاک قاتل تھی۔ پھر اس کی حالت اتنی غیر کیوں ہو رہی ہے۔

سرگم نے چند لمحوں کے بعد آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور سسک پڑی۔ میرا سینہ اس کے آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا۔ اسے شب خوابی کے لباس میں دیکھ کر میں سمجھ گیا۔ وہ سو رہی ہوگی کہ کوئی آفت نازل ہو گئی۔ میں سے سارا دے کر بستر تک لے گیا۔ اور ایک گلاس پانی پلایا تو اس کے اعصاب قدرے بحال ہوئے پھر جلد ہی اس نے اپنے آپ پر قابو پایا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا۔ ”میں بستر پر لیٹی کھل کے پروگرام کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ میری آنکھ لگ گئی میری آنکھ کسی آہٹ پر کھل گئی۔ میں نے اپنے کمرے میں میں گھپ اندھیرا دیکھا۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے بی جھانکی نہیں تھی۔ پھر یہ اندھیرا کیسے ہو گیا؟ مجھے تمہارا خیال آیا کہ یہ تمہاری شرارت ہو گی۔ مگر فوراً ہی یاد آ گیا کہ میں تو تمہارے کمرے کی باہر سے کنڈی لگا آئی تھی۔ میں نے وقت دیکھا تو دو بج رہے تھے۔ میں نے سونے کی کوشش کی لیکن چند لمحوں کے بعد ایسا محسوس ہوا جیسے کمرے کی تاریکی میں کوئی چھپا کھڑا ہو۔ تیز تیز سانسیں لے رہا ہو۔ مجھے دیکھ رہا ہو۔ اور اس کی نظریں کسی جھوکی طرح میرے سر پر رہیں۔ میں سن ہی ہو کر رہ گئی۔ شدید سردی کے باوجود میرا جسم پسینے میں بھیگ گیا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے تاریکی میں دیکھا تو دلہیز پر ایک ہیولا دکھائی دیا۔ اس کے خدو خال واضح نہیں تھے چہرے پر سیاہ نقاب تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریو اور تھا۔ لباس اور دستانے سب کچھ سیاہ تھے۔ وہ ہیولا میری طرف بڑھا تو میں نے بچ مارنا چاہی۔ مگر آواز میرے سینے ہی میں گھٹ کر رہ گئی اور میں غش کھا گئی۔ ہوش آیا تو میں نے موٹر بوٹ کے انجن کی آواز سنی۔ جس وقت میں لڑکھائی ہوئی تمہارے کمرے کی طرف آ رہی تھی، میں نے تعجب آمیز ہنسی کی آواز سنی۔ ہنسنے کی یہ آواز زینے تک میرا تعاقب کرتی رہی۔ خدا معلوم یہ میری ذہن کا فتور تھا یا کوئی واقعی مکان کے اندر چھپا ہوا ہے۔“

میں سمجھ گیا کہ ذکیہ خانم آئی ہوگی۔ وہ کس ارادے سے آئی تھی؟ میں نے سوچا کہ شاید وہ سرگم کو خوف زدہ کرنے آئی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ”حوصلہ کرو۔ ابھی چل کر اطمینان کر لیتے ہیں۔“

اس کی آنکھوں سے خوف جھانک رہا تھا۔ وہ چند لمحوں تک مبہوت ہی ہو کر میری صورت دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔ ”چلو۔۔۔ مگر ہوشیار رہنا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں ریو اور دیکھا تھا۔“



لگتا تھا۔

۱۵۔ سمیر کو میری تربیت مکمل ہو گئی۔

اس روز مشتاق کے تین دوست اور بھی آئے تھے۔ ان میں ایک انتھونی نارمن، دوسرا مالونوف اور تیسرا بھل بسواس تھا۔ یہ تینوں انتہائی پراسرار لگ رہے تھے۔ مشتاق اور اس کے دوستوں نے مسلسل چھ گھنٹے تک میرا امتحان لیا۔ مشتاق نے مجھے ایک نقشے کی مدد سے سمجھایا تھا کہ مجھے کہاں کہاں ہم رکھنے ہیں۔ ان بچوں کا تعلق ریویٹ کنٹرول سے تھا۔ جو اس مرکز سے کچھ فاصلے پر بیٹھ کر صرف ایک بین دبائے سے اس پلانٹ کے پڑنے اڑا سکتا تھا۔ میں نے اس امتحان میں ۵۵ فیصد نمبر لیے۔ وہ تینوں بہت حیران اور ششدر رہ گئے تھے۔ انہیں اس بات کا یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اس قدر ذہین بھی... ثابت ہوں گا۔

میری اس کامیابی پر سب سے زیادہ خوشی سرگم کو ہوئی۔ میری کامیابی اور مشتاق کی الوادعی دعوت کے سلسلے میں سرگم نے زبردست اہتمام کیا۔ ظمیر ریحان سہ پہر کے وقت شراب کی بوتلوں کا کرٹ اٹھالایا تھا۔ رات گیارہ بجے دور شروع ہوا۔ میں نے بیٹ درد کا ہانڈہ کر کے پینے سے انکار کر دیا۔ سرگم نے اس محفل میں ان لوگوں کا پورا پورا ساتھ دیا تھا۔ وہ پینے اور پلانے میں بہت پرجوش اور آگے تھی۔ پینے پلانے کی محفل زوروں پر تھی۔ آج مجھے مطلوبہ موقع ملا تھا۔ میں نے جب سے مشتاق کو دیکھا تھا، اس روز سے اس موقع کی تلاش میں تھا کہ کسی طرح اس کا بڑا اڑا لوں۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آخر وہ کون ہے؟ اس کے بڑے سے شاید کچھ کاغذات مل جاتے جو اس کی شناخت کرنے میں مدد دے سکتے تھے۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ غیر ملکی ایجنٹ ہے یا فوج کی کوئی کالی بیٹھڑ ہے۔ رات ایک بجے مشتاق ہاتھ روم جانے کے لیے نشست گاہ سے نکلا تو وہ نشے میں دھند تھا۔ وہ لڑکھاتا ہوا کمرے کی طرف جا رہا تھا کہ ٹھوکر کھا کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے لپک کر اسے اٹھایا۔ میں چاہتا تو پہلے ہی دن اس کا بڑا اڑا لیتا، مگر اسے شک ہو جاتا۔ میں جلد بازی کر کے کوئی حماقت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ شبہ سے میں جھلا ہوا جاتا کہ میں بن رہا ہوں۔ اور ڈبل کر اس کر رہا ہوں۔ میں نے اسے سارا دے کر ہاتھ روم تک پہنچایا تو اس کا بڑا میری جیب میں تھا۔ بڑے کا جائزہ لیا، مگر کرنسی نوٹوں کے سوا کچھ برآمد نہیں ہوا۔ وہ کوئی دس پندرہ منٹ بعد باہر آیا تو میں نے بڑا اس کی جیب میں رکھ دیا۔

رات ایک بجے تک شراب کا دور جاری رہا۔

مشتاق کے تینوں دوست اعتدال سے پی رہے تھے اور بے قابو نہیں ہوئے تھے۔ ظمیر ریحان، مشتاق اور سرگم پر البتہ نشہ کچھ زیادہ ہی چڑھ گیا۔ سرگم دیر تک اول فول بکٹی رہی۔ میں اسے اپنے کمرے میں لایا تو نشے کی حالت میں حد سے تجاوز کر گئی۔ تب میں نے اسے لے جا کر شاور کے نیچے کھڑا کر کے شاور کھول دیا تو سرد پانی نے اس کا نشہ ہرن کر دیا۔

وہ تینوں غیر ملکی، رات دو بجے رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد سرگم اور ظمیر ریحان، مشتاق کو سارا دے کر کمرے میں لے گئے۔ میں اپنے کمرے میں آگیا۔ صبح بیدار ہوا تو سرگم بستر پر نہیں تھی۔ ہاتھ روم سے پانی گرنے کا شور سنائی دے رہا تھا۔ وہ خاصی دیر بعد باہر آئی تو کسی منگتے پھول کی طرح تروتازہ نظر آ رہی تھی۔ میں ناشہ کرنے نیچے پہنچا تو سرگم اور... ظمیر ریحان کے چہرے پر ہوا میاں اڑ رہی تھیں۔ دونوں کے چہرے پہلے پڑ گئے تھے۔ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟“

”مشتاق غائب ہے۔“ اس نے خوف زدہ لہجے میں جواب دیا۔ ”وہ اپنے کمرے میں نہیں ہے۔ لگتا ہے

”تمہارے پاس بھی ہسپتال ہے جو تم نے مجھے شہر جاتے وقت دیا تھا اور وہاں آکر لے لیا تھا؟“  
”وہ ہسپتال میرے کمرے میں ہے۔ چلو چل کر لے لیتے ہیں۔“

سرگم نے اپنے کمرے میں پہنچ کر میز کی دراز سے ہسپتال نکالا اور الماری سے ایک بڑی سی ٹارچ بھی لے لی۔ نشست گاہ میں نائٹ بلب جل رہا تھا۔ جب کہ خواب گاہ میں اندھیرا تھا۔ اس اندھیرے میں ہر چیز پر انسانی بیوے کا دھوکا ہو رہا تھا۔ کمرے میں روشنی کرنے کے بعد میں نے غسل خانے کا بھی جائزہ لیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ پھر ہم دونوں نے مل کر اندر اور باہر کا کچھ چھان مارا لیکن وہاں کسی آدم زاد کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ دوسرے روز وہ شہر نہیں گئی۔ وہ رات کے واقعے سے اس قدر خوف زدہ ہو گئی تھی کہ سارا دن کسی ہرنی کی طرح چونکا اور متوحش سی رہی۔ رات اس نے میرے ہی کمرے میں گزاری اور رات ایک بجے کے قریب سوئی تھی۔ جب تک جاگتی رہی، خوف اور اندیشے سے اس کی حالت غیر رہی رہی تھی۔ ذرا سی آہٹ اور پتہ کھڑکنے پر بھی فوراً ”بچے کے بچے سے ہسپتال نکال لیتی تھی۔“

تیسرے دن ظمیر ریحان اپنے ساتھ مشتاق کو لے کر پہنچا۔ مشتاق ایک بہت قد مگر چھری سے بدن کا مہنجا شخص تھا۔ اس کی آنکھیں بھوری تھیں۔ اور ان میں تیز چمک تھی۔ اس کے چہرے سے ذہانت ٹپک رہی تھی۔ وہ نام کا مسلمان تو تھا مگر چہرے میرے سے ہندو برہمن لگ رہا تھا۔ میں اس ذات کے لوگوں سے خوب واقف تھا کیوں کہ ہندوستان میں میرا ان سے واسطہ پڑ چکا تھا۔ اس نے مجھ سے بڑے ہی مودبانہ انداز اور خوش اخلاقی سے مصافحہ کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ایسی شخصیت کا مالک ہے جو پہلی ہی نظر میں لوگوں کا دل جیت لیتی ہے۔ مجھے ایک ہفتے کے لیے مکمل طور پر اس شخص کے سپرد کر دیا گیا۔

وہ پوری تیاری کے ساتھ آیا تھا۔ اپنے ساتھ ٹیلی ویژن سیٹ، وی سی آر اور ڈیو کیسٹ بھی لایا تھا۔ معلوم نہیں کیوں، سرگم نے ٹیلی ویژن گھر میں نہیں رکھا تھا۔ حالانکہ ایسی جگہ اور تنہائی میں ٹیلی ویژن کی زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

مشتاق نے سب سے پہلے مجھے ایک قلم دکھائی۔ اس قلم کو دکھانے سے پہلے اس نے مجھ سے کہا تھا۔ ”اس قلم کو دیکھ کر شاید تمہاری یادداشت لوٹ آئے۔“

اس قلم میں کرنل نیاز مجھے گھر کے اندر چلا پھرنا، کار میں سیر و تفریح کرتا اور کھانا کھاتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ وہ فوجی وردی میں تھا۔ پھر دوسری قلم دکھائی گئی جس میں اسے اپنے دفتر میں دکھایا گیا تھا۔ اس کے ماتحتوں اور اعلیٰ افسران کو بھی دکھایا گیا تھا۔ اور دفتر کے عملے کو بھی، میں کرنل نیاز سے اپنی حیرت انگیز مماثلت پر دگ رہ گیا۔ مجھے تو ایسا لگ رہا تھا جیسے میں آئینے میں اپنا عکس دیکھ رہا ہوں۔ فرق صرف عمروں کا تھا۔ مگر کوئی بھی شخص مجھے دیکھ کر یہ سوچ سکتا تھا کہ میں حلوئے اور بیماری سے اٹھا ہوں اور میری صحت کسی قدر گر چکی ہے۔ لہذا صحت گر جانے کے باعث میری عمر کچھ کم دکھائی دے رہی ہے۔

مجھے ان تمام لوگوں کے بارے میں بھی بتایا گیا جن سے میرا واسطہ پڑنے والا تھا۔ ان کے نام کیا ہیں، وہ کس عہدے پر ہیں اور کس کس سے میرے مراسم کیسے ہیں۔ دفتری تعلقات کی نوعیت کیا ہے۔ مشتاق واقعی ایک ذہین اور ماہر شخص تھا۔ اس نے مجھے ایک ہفتے کے اندر ماہر بنا دیا تھا۔ میں اپنے دفتر کے ہر شخص کا نام، چہرے اور اس کے عہدے سے پوری طرح واقف ہو چکا تھا۔ اس دفتر کا ہر شخص میرے ذہن پر نقش ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے مجھے کرنل نیاز کی طرح چلنا اور بات کرنا بھی سکھایا تھا۔ میں کبھی کبھی اپنے آپ کو چمچ کا کرنل نیاز احمد سمجھنے



ہے جو اس ملک کے تمام صوبوں کے عوام میں نفرت کے بیج بو کر اس کے کلڑے کلڑے کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا کردار تم سے کبھی ڈھکا چھپا نہیں رہا۔ وہ ہمیشہ دولت حاصل کرنے کے لیے پتیلیوں میں گرتی رہی ہے۔ پھر اس نے نہ صرف میرے اور تمہارے تعلقات کی کمائیاں دنیا کو سنائیں بلکہ نجمہ آئی کو تمہارے کزن سے محبت کی فرسودہ کمائی سنا کر بڑبڑام بھی کیا۔ تم جو اس عورت کی صورت دیکھنے کے بھی رواں دواں نہیں تھے، اس کے جانی دشمن تھے، اسی عورت کو اپنے گلے کا ہار بنالیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ظہیر رحمان سے شادی کرنے والی تھی اور اس کی منظور نظر تھی اور وہ دونوں یورپ کی سیاحت کر کے آئے تھے۔ مجھے تو کل ہی معلوم ہوا کہ تمہاری اس سے شادی ہو چکی ہے۔ ایک رات میں اسے قتل کرنے کے ارادے سے آئی تھی۔ وہ نیچے سو رہی تھی اور تم اوپر۔ میں نے ارادہ بدلتی کر دیا کیوں کہ میں نہیں چاہتی تھی کہ سرگرم کے قتل کا تم پر شک کیا جائے۔ اگر مجھے اس وقت معلوم ہوتا کہ تمہاری اس سے شادی ہو چکی ہے تو... میں تم دونوں کو قتل کر چکی ہوتی۔ اور ہاں، کل ہی میری سمجھ میں آیا تھا کہ تم نے اس روز ہمارے ساتھ چلنے سے کیوں انکار کر دیا تھا۔ اس عورت سے شادی کرنے کے لیے... آخر اس عورت نے تمہیں اپنا اسیر بنایا۔

ذکیہ خانم مسلسل بوٹی رہی میں اپنی جگہ ساکت کھڑا اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کے ہر لفظ سے اتنی شدید نفرت ٹپک رہی تھی، مجھے یہ خوف دامن گیر ہو گیا کہ کہیں وہ مجھے شوٹ نہ کر دے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اسے اعتماد میں لے کر حقیقت سے آگاہ کر دوں۔ میں نے مڑنے کے لیے اپنی جگہ سے جھنجھکی تھی کہ ایک گولی سنسناتی ہوئی میرے سر پر سے گزر کر کھڑکی کے گیس میں سوراخ کرتی ہوئی نکل گئی۔ میری رگوں میں خون برف کی طرح سرد ہو گیا۔ وہ ہڈیانی انداز میں چیخی۔ ”کرئل! مڑنا نہیں۔ ورنہ دوسری گولی تمہاری کھوپڑی میں سوراخ کر دے گی۔“

چند لمحوں تک میری حالت بہت غیر رہی۔ مجھے اپنی نظروں کے سامنے موت کا فرشتہ کھڑا استہزائیہ انداز سے مسکراتا نظر آ رہا تھا۔ میرا چہرہ اور بدن پسینے میں نہا گیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ذکیہ خانم سے کچھ کہوں لیکن اسی لمحے میں نے اپنی پشت پر رہو الور کی نال محسوس کی۔ اس نے میری پشت میں رہو الور کی نال چھوتے ہوئے کہا۔ ”ایک بات کا صاف صاف جواب دو۔ کیا تم بھی وطن فروشوں سے مل گئے ہو؟“

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”نہیں!“ میری آواز حلق میں پھنس رہی تھی۔ ”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔“ ”چوری اور سینہ زوری۔“ اس کے لیے میں غراہٹ تھی۔ ”سرگرم سے شادی کرنے کا مطلب یہی ہے کہ تم غداروں سے مل چکے ہو، یہ جانتے ہوئے بھی کہ سرگرم باضی میں تمہاری دشمن رہی ہے۔ اس نے کار کا حادثہ بھی منصوبے کے تحت ہی کروایا تھا۔ تاکہ زخمی حالت میں تمہیں اپنے ہاں لا کر تمہارا برین واش کیا جائے۔ تم اتفاق سے ڈاکٹر کے ہاتھ لگ گئے۔ پھر وہ تمہیں وہاں سے اغوا کر کے یہاں لے آئی اور تمہیں اپنا چمنوایتا لیا۔ شادی بھی کر لی۔ اور اب وہ تم سے کوئی بدترین حادثہ کروائے گی۔ تمہارے ہاتھوں سے کسی کو قتل کروائے گی اور پھر تمہیں قتل کر کے فرار ہو جائے گی۔“

میں نے کھاکار کر اپنا حلق صاف کیا اور کہا۔ ”تم نے اپنے دل کی بھڑاس نکال لی... مجھے بھی تو کچھ کہنے دو۔“

”اب تمہارے پاس کہنے کے لیے رکھائی کیا ہے۔ کرئل! ایک غدار اپنی صفائی میں لاکھ کسے، وہ غدار ہی کھلائے گا۔ اور رہے گا۔“

کسی نے اسے اغوا کر لیا ہے۔“

”اغوا کر لیا ہے...؟“ میں اچھل پڑا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”مشائق کا سارا سامان جوں کا توں کمرے میں موجود ہے۔ اس کا لباس تک موجود ہے۔ ایسا لگتا ہے اسے فینڈ میں شب خوالی کے لباس میں ہی اغوا کر لیا گیا ہے؟“

”کیوں ایسا تو نہیں کہ وہ نشے کی حالت میں، پانی میں کود پڑے ہوں؟“ میں نے خیال ظاہر کیا۔

”بیرونی دروازہ بند پڑا ہے۔ تمام کھڑکیوں میں گرل لگی ہوئی ہے۔“ سرگرم بولی۔

”کیوں وہ جادو کے زور سے تو غائب نہیں ہو گئے؟“ میں نے مذاق اڑایا۔

”یچن کی کھڑکی میں گرل نہیں ہے۔“ ظہیر رحمان نے کہا۔ ”وہ لوگ اسی راستے سے اندر آئے تھے۔“

کھڑکی کا شیشہ اس جگہ سے ٹوٹا ہوا ہے۔ جہاں چنچی لگی ہے۔ وہ لوگ بیرونی دروازہ اندر سے بند کر کے کھڑکی کے راستے سے نکل گئے۔“

”آپ فوراً پولیس سٹیشن فون کر کے رپورٹ درج کرا دیں۔“ میں نے ظہیر رحمان کو مشورہ دیا۔

”پولیس کو فون کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔“ سرگرم کی ویران آنکھوں سے خوف جھانک رہا تھا۔

پھر بھی ہم دونوں رپورٹ درج کرانے پولیس سٹیشن جا رہے ہیں۔ مشائق ایک اعلیٰ فوجی افسر ہیں۔ ان کی نگہبانی کا ہم پر الزام آگیا تو ایک نئی مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔ ہماری واپسی شام تک ہو گی۔ تم ہوشیار رہنا اور میرا ہسٹول ساتھ رکھنا۔ دشمن کا کوئی بھروسہ نہیں۔ وہ تمہیں اغوا کرنے میں ناکامی کی صورت میں قتل بھی کر سکتا ہے۔“

وہ ناشتہ کیے بغیر ہی چلے گئے۔ وہ اپنی اپنی بوٹ میں گئے تھے۔ مشائق کا اغوا حیران کن بات تھی۔ اسے کس مقصد کے تحت اغوا کیا گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کا اغوا میرے نایاب اور مہربان دوست ہی کا کارنامہ ہو سکتا تھا۔ سرگرم کے دشمن، میرے دشمن تو نہیں تھے، لہذا میں نے یچن میں جا کر ناشتہ کیا۔ جس کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا تھا، اس جگہ سرگرم نے گت لگا رکھا تھا کیوں کہ وہاں سے تیز ہوا اندر آ رہی تھی۔

میں نے اپنا ناشتہ تیار کیا۔ ناشتے سے فراغت پا کر میں چائے بنا رہا تھا کہ ایک تیز آواز نے میرے کانوں میں گرم گرم سیسہ ڈال دیا۔ ”کرئل! خبردار! اپنی جگہ اسی طرح کھڑے رہنا۔ اگر تم نے ہلنے کی کوشش کی تو تمہارا جسم چھلنی کر دوں گی۔“

میرے ہاتھ سے چائے کا چمچ چھوٹ کر گر پڑا۔ میری ریڑھ کی ہڈی کو ایک سردی لہر چھوتی ہوئی گزر گئی۔ یہ آواز ذکیہ خانم کی تھی۔ اس کے انداز مخاطب سے ایسا لگ رہا تھا، جیسے وہ میری جانی دشمن بن کر آئی ہو میں اپنی جگہ ساکت کھڑا ہو گیا۔

”کرئل!“ میں نے ذکیہ خانم کے لیے میں شدید نفرت محسوس کی۔ وہ شاید دروازے میں کھڑی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بڑے مخاطب قدم اٹھاتی دو تین قدم پر آ کر کھڑی ہو گئی ہے۔ جب وہ مجھ سے مخاطب ہوئی تو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ غصے سے کانپ رہی ہو۔ ”میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ تم اتنے گرے ہوئے اور گھٹیا آدمی ثابت ہو گے۔ میں نے ہمیشہ تمہاری عزت کی، ایک بہادر سپاہی سمجھ کر تعظیم کی، تمہارے لیے میرے دل میں احترام کا جو جذبہ تھا، وہ کسی اور کے لیے کبھی پیدا نہ ہو سکا۔ مگر تم نے وہ سب کچھ خاک میں ملا دیا۔ اس لیے آج تمہیں عزت و احترام کی بجائے نفرت و حقارت سے مخاطب کر رہی ہوں۔ تم نے نجمہ آئی کا کفن میلا ہونے کا بھی انتظار نہ کیا۔ شام، فجر، کی تو اس ڈائن سے جو تمہارے کزن کی بیوی رہ چکی ہے۔ اور ان لوگوں سے ملی ہوئی

”مگر تم وہ نہیں ہو جو تم سمجھ رہی ہو۔ میں تمہیں اپنے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔“

اس نے ریو الوور کی ٹال سے ٹھوکار دیتے ہوئے میری بات ٹکائی۔ ”ہاں“ میں جانتی ہوں کہ تم وہ کرمل نہیں ہو جس نے اس ملک کی حفاظت کے لیے اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں کی تھی۔ جس نے سرحد پر جا کر عظیم کارنامہ انجام دیا تھا۔ میں بھی وہ ذکیہ خانم نہیں ہوں جو تمہاری دوست تھی۔ میں اب تمہاری دشمن ہوں۔ جس کے نزدیک ایک غدار کو قتل کرنا نیک کام ہے۔ اگر میرا باپ غدار نکلے تو میں اس کے سینے کو بھی گولیوں سے چھلنی کر سکتی ہوں۔ لہذا میں تمہیں قتل کرنے آئی ہوں۔ سرگرم کو بھی قتل کر دوں گی۔ ظمیر ریمان کو بھی تم سب وطن فروش ہو۔ تمہارا زندہ رہنا اس زمین کو ہلاک کرنے کے۔“

کھڑکی کے دوپٹے تھے۔ ایک پت کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ جس میں گت لگا ہوا تھا۔ دوسرے پت کا شیشہ سلامت تھا۔ اس شیشے میں میرا اور ذکیہ خانم کا عکس نظر آ رہا تھا۔ میری نگاہیں اس شیشے پر جمی ہوئی تھیں۔ بولتے بولتے اسے یک لخت کھانسی اٹھی تو اس نے ریو الوور میری پشت سے ہٹا لیا تھا۔ یہ لمحہ میرے لیے بڑا قیمتی تھا۔ میں نے تیزی سے پلٹ کر اس کے ہاتھ سے ریو الوور چھین لیا۔ اور وہ میرا منہ دیکھتی رہ گئی۔ پھر وہ دہشت زدہ ہو کر پیچھے ہٹی تو میں نے اسے ریو الوور کی زد میں لے لیا۔ وہ بے حد خائف اور سراسیمہ نظر آ رہی تھی۔ اس کا چہرہ سفید پڑا جا رہا تھا۔ میں نے انگلیوں پر ریو الوور پکڑتے ہوئے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ ”اب کیا خیال ہے؟ کیوں نہ میں تمہیں قتل کر کے تمہاری لاش پانی میں پھینک دوں۔“

”اگر تم مجھے قتل کر دو گے تو مجھے اپنی موت کا کوئی افسوس نہیں ہو گا۔ کیوں کہ میں وطن کی راہ میں شہید ہو رہی ہوں۔ شہادت خوش نصیبی کی بات ہے۔ یہ اعزاز نیک انسانوں کو نصیب ہوتا ہے۔ تم جیسے بد نصیب ذلیل اور کمینے لوگوں کو نہیں۔“ وہ قدرے سنبھل کر بولی۔

میں چند لمحوں تک مسکرا کر اس کی صورت ٹکٹا رہا۔ وہ اپنی دہشت اور سراسیمگی پر قابو پا چکی تھی اور اب قہر و غضب سے مجھے گھور رہی تھی۔ میں اس کی طرف بڑھا تو وہ اپنی جگہ چٹان کی طرح جمی رہی۔ میں نے قریب پہنچ کر اس کی منجھ آ آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا تو وہ سرد ہو رہا تھا۔ پھر میں نے اس کے ہاتھ میں ریو الوور تھما دیا۔ وہ حیران رہ گئی۔ اسے اپنی نظروں پر جیسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے پہلے ریو الوور کو اور پھر مجھے دیکھا۔ میں مسکرایا۔ اور اس کے شانے پر ایک ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”تم بڑے شوق سے اس ریو الوور کی تمام گولیوں سے میرا جسم چھلنی کر دو۔ ہر غدار کا یہی حشر ہونا چاہئے۔ اس سے پہلے کہ تم گولیاں میرے جسم میں اتار دو میری ایک بات تو سن لو اور اسے سمجھنے کی کوشش کرو۔“

”کون سی بات؟“ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر دی۔

”مجھے فور سے دیکھو اور پچھاننے کی کوشش کرو۔ کیا میں واقعی وہی کرمل نیاز ہوں؟“ میں نے سنجیدہ ہو کر کہا اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

اس نے چونک کر مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میں پاگل ہو گیا ہوں۔ وہ چند لمحوں تک مجھے گہری نظروں سے دیکھتی رہی پھر اس نے سر ہلایا۔ ”کرمل! کیا تمہاری دماغی حالت درست نہیں ہے۔ جو ایسی ہلکی ہلکی باتیں کرنے لگے ہو۔ تم کرمل نہیں ہو تو پھر کون ہو؟ کیا تم ساری دنیا کو پاگل سمجھ رہے ہو؟“

”میں کرمل نہیں ہوں۔“ میرے ہونٹوں پر غیر افسانوی مسکراہٹ بکھر گئی۔ ”تم اور ساری دنیا دھوکہ کھا رہی ہے کہ میں کرمل نیاز ہوں۔“

”اگر تم کرمل نیاز نہیں ہو تو پھر کون ہو؟ تم کرمل نیاز ہی ہو۔ سرگرم نے شاید تمہیں ذہنی طور پر یہ بلور کر لیا ہو گا کہ تم کرمل نیاز نہیں ہو۔“

”سنو ذکیہ خانم!“ میں نے سپاٹ لمبے میں کہا۔ ”میں کرمل نیاز نہیں ہوں بلکہ سکندر ہوں۔ قسمت اور حالات نے مجھے یہاں لاپھونک کر لیا۔ کیا کرمل نیاز کی شناخت کے لیے کوئی ایسی نشانی ہے جس سے اسے کسی بھی نسخہ شدہ حالت میں پہچانا جاسکے؟“

وہ ایک دم سے اچھلی سی پڑی۔ تھمر ہو کر مجھے پٹنی پٹنی نظروں سے دیکھتی رہی۔ اسے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی تو اس کا چہرہ دکھ اٹھا۔ ”دائیں بازو پر ایک نشان ہے۔ جنگ کے موقع پر ایک گولی نے اسے شدید زخمی کر دیا تھا۔ اس کا نشان آج بھی موجود ہے۔“

میں نے اپنی آستین ہٹا کر اسے اپنا دایاں بازو دکھایا تو اس کی آنکھوں میں شدید حیرانی سی آ گئی۔ ”اوہ میرے خدا!“ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ”بڑا دل بھائیوں ایسی مشابہت۔ یقین نہیں آ رہا ہے۔ اگر کرمل کی ماں بھی ہوتی تو قریب کھا جاتی۔“

میں نے نشست گاہ میں بیٹھ کر ذکیہ خانم کو اپنی رام کمانی سنائی وہ میری کمانی بڑی توجہ سے سنتی رہی جب میں نے اپنی کمانی ختم کی تو وہ دیر تک حیرت کے دریا میں غوطے کھاتی رہی پھر اس نے سگریٹ کیس مانگا میں نے اسے اپنے کمرے سے سگریٹ کیس لا کر دیا تو وہ بولی۔ ”یہ سگریٹ کیس تو کرمل نجیب کا ہے۔“

اس نے وہ اشارے ایک کھنڈ پر نوٹ کر لیے تھے۔ پھر اسے اپنی جب میں رکھتے ہوئے بولی۔ ”میں کل آؤں گی۔ کرمل نجیب نے کرمل نیاز کو غیر ملکی سازش کا آلہ کار بنانا چاہتا تھا۔ اسے ایک کروڑ ڈالر کی پیشکش کی گئی تھی۔ سرگرم نے اپنے پہلے شوہر سے اس لیے طلاق لی تھی کہ وہ نجمہ آئی کا راستہ صاف کر کے اس کی بیوی بن جائے۔ مگر اس معاملے میں سرگرم کو کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ پھر اس نے ایک جرنیل کے بھائی سے شادی کر لی تاکہ وہ جرنیل سے تعلق پیدا کر کے فوجی راز حاصل کر سکے۔ مگر وہ جرنیل ایک شریف آدمی تھا۔ وہ سرگرم کے حسن کا سیر نہ بن سکا۔ اس نے اپنے بھائی کو مجبور کیا کہ سرگرم کو طلاق دے دے۔ اور کرمل نجیب اپنے کزن نیاز کو بغاوت پر آمادہ نہ کر سکا۔ تو اس نے دو سراسر منصوبہ بنایا۔ وہ منصوبہ میرے علم میں نہ آ سکا۔ مگر اب میری سمجھ میں آ گیا ہے کہ کرمل نجیب نے آپ کی تصویر کالج میگزین میں دیکھی تھی تو اس نے دو سراسر منصوبہ بنایا اور آپ اس کے جال میں آ گئے۔“

”مگر بیگم نیاز نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کیوں کی تھی۔ کیا انہیں منصوبے کا علم ہو چکا تھا؟“

”شاید!“ ذکیہ خانم بولی۔ ”مگر کرمل نیاز یا آئی نے ان کو کبھی اس منصوبے سے آگاہ نہیں کیا۔ انہیں ہنگام مل گئی ہوگی۔ وہ لوگ اصلی کرمل نیاز کو قتل کر کے اس کے ہم شکل کو آلہ کار بنا کر گھنٹاؤں کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ لہذا آئی نے سوچا ہو گا کہ کیوں نہ وہ شوہر کے ہم شکل کو قتل کر دیں تاکہ ان کی سازش کامیاب نہ ہو سکے۔ ان کے شوہر کو کوئی آئی نہ آنے پائے مگر وہ سب کچھ دھرائی رہ گیا۔ دشمنوں کو کامیابی۔ نصیب ہوئی۔ میرا خیال ہے جس طرح کرمل نجیب کو قتل کیا گیا اسی طرح کرمل نیاز کو بھی قتل کر دیا گیا ہو گا۔ آئی کا پتہ بھی اسی لیے صاف کر دیا گیا ہو گا کہ وہ اس منصوبے سے پوری طرح باخبر تھیں۔ کرمل نجیب کو اس لیے قتل کیا گیا ہو گا کہ وہ اپنے بھائی کی افسوس ناک موت کے بعد تائب ہو گیا ہو گا۔“ وہ سوچتے ہوئے بولی۔ ”اس سگریٹ کیس میں جو اشارے ہیں وہ کرمل نیاز کی قبر کے ہوں گے۔ میں چاہوں گی کہ قبر مل جائے تاکہ ان کی قبر پر جا کر

سبق دے سکتی ہوں کہ وہ ساری زندگی یاد رکھے گی۔ تم نے اسے کیا جواب دیا؟  
 ”میں نے اسے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ آئندہ اوھر کا رخ نہ کرے۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔ اس دھمکی کے باوجود اس نے مجھ پر فائر کر دیا تھا۔“  
 ”اس نے تم پر گولی چلائی تھی؟“ سرگم اچھل پڑی۔ ”تمہیں گولی لگی تو نہیں...“ اس نے تشویش اور سراسیمگی سے میری طرف دیکھا۔

”میں کچن میں چائے بنا رہا تھا کہ وہ چوروں کی طرح آئی اور ایک فائر مجھ پر جمونک دیا۔ گھبراہٹ میں اس کا نشانہ خطا گیا۔ اور گولی اس گتے میں سوراخ کرتی ہوئی نکل گئی جو تم نے کھڑکی کے پٹ میں لگایا تھا۔ پھر وہ بھاگ نکلی۔“ میرے ذہن میں یہ کہانی اچانک آئی تھی۔ اب اس سوراخ کا جواز پیدا ہو گیا تھا۔  
 سرگم اپنی کرسی چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور برہمی سے بولی۔ ”میں ابھی فون کر کے اس کی خبر لیتی ہوں... پولیس سٹیشن میں رپورٹ درج کرائی ہوں۔ تمہاری گواہی پر اسے جیل ہو سکتی ہے۔“ سرگم کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو رہی تھیں۔

”دفعہ کرو اس لڑکی کی باتوں کو۔“ میں نے اسے سمجھایا۔ ”اب وہ یہاں نہیں آئے گی۔ آئے گی تو زندہ بچ کر نہیں جائے گی۔ اس وقت اس لیے بچ گئی تھی کہ میرے پاس پستول نہیں تھا۔ اب میں تمہاری غیر موجودگی میں پستول ضرور ساتھ رکھا کروں گا۔“

میں نیند سے بیدار ہوا تو صبح کے نو بج رہے تھے۔ سرگم باہر جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ وہ مجھے بیدار دیکھ کر بولی ”جانم! صبح ظہیر رحمان کا فون آیا تھا۔ ایک مسخ شدہ لاش ہاگس بے اور دوسری کھماڑی پر پائی گئی ہے۔ شاید ان میں سے کوئی لاش کرمل کی ہو۔ میں ظہیر رحمان کے پاس جا رہی ہوں۔ اگر میں کسی وجہ سے رات کو نہ آسکی تو پریشان مت ہونا۔ تمہارے لیے ناشتہ اور ٹیچ تیار کر کے رکھ دیا ہے۔“

وہ چلی گئی تو میں نے غسل کے بعد ناشتہ کیا۔ چائے پی رہا تھا کہ ذکیہ خانم آگئی۔ وہ کچھ افسردہ دکھائی دے رہی تھی۔ رمی باتوں کے بعد اس نے کہا۔ ”سکندر صاحب! ساری رات میں ان اشاروں میں سرکھپاتی رہی۔ میں نے جو معملہ حل کیا ہے، معلوم نہیں وہ کس حد تک درست ہے...“ وہ اپنی جیب سے کانڈ نکال کر مجھے سمجھانے لگی۔ ”م سے مشرق، دو سے دو فرلانگ، س سے سرخ، ہ سے ہٹ، ق سے قیدی یا قبر، ن سے نیاز... کرمل نیاز تو قیدی ہونے سے رہے کیوں کہ یہ ہٹ عرصے سے بند پڑا ہوا ہے۔ البتہ اس میں کرمل نیاز کی قبر ہو سکتی ہے۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔

میں ذکیہ خانم کی ذہانت کو سراہے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے ان اشاروں سے جو مطلب نکالا تھا وہ دل کو لگتا تھا۔ میں نے بیرونی دروازے کو باہر سے چنچنی لگا کر بند کر دیا۔ ہم دونوں اس معملے کو حل کرنے جا رہے تھے۔ ذکیہ خانم جس بوٹ میں آئی تھی میں اس میں سوار ہو گیا۔ وہ اپنے ساتھ ایک نوکری میں کھانا بھی لے آئی تھی۔ جو تین چار آدمیوں کے لیے کافی ہو گا۔ میں نے نوکری کی طرف اشارہ کیا تو وہ بولی۔ ”میں نے سوچا کہ آپ کے ساتھ پکک بھی منالوں گی۔“ یہ کہہ کر وہ ہنس پڑی۔

ذکیہ خانم نے موٹر بوٹ کا رخ مشرق کی جانب کر دیا۔ اس سمت میں وہ دونوں بٹس تھے جو کسی ویران زمین کی طرح نظر آتے تھے۔ ان میں ایک ہٹ سرخ رنگ کا تھا۔ وہ موٹر بوٹ کو بڑی تیزی سے مگر محتاط ہو کر چلا رہی تھی۔ میں اس کے ساتھ بیٹھا اس کے اور قدرت کے حسین نظاروں میں کھو گیا تھا۔ ہم جلد ہی اس ہٹ کے

حاضری دوں۔ اس عظیم شخص کے لیے دعائے مغفرت کروں۔“

”کیا تم کبھی سونیا سے ملی ہو؟“ میں نے اسے سونیا سے ملاقات کا واقعہ سنایا۔

”نہیں... میں سونیا اور اس کے گروہ سے بالکل بلاواقف ہوں۔ شاید سونیا کے گروہ نے ہی مشتاق کو اغوا کیا ہے۔“ ذکیہ خانم جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”میں نے اپنے ایک آدمی کو کیمیا بازی پر سرگم اور ظہیر رحمان کی حرکات و سکنات پر کڑی نظر رکھنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ وہ شخص وہاں بظاہر ایک خواتین لگائے ہوئے ہے۔ مگر دراصل وہ میرا جاسوس ہے۔ اس کا نام عمر ہے۔ وہ جیسے ہی سرگم کی روانگی کی اطلاع دے گا، میں کل آ جاؤں گی۔ پھر ہم کرمل نیاز کی قبر پر فاتحہ پڑھنے جائیں گے۔“ ذکیہ خانم کی آنکھیں پر نم ہو گئیں۔

میں ذکیہ خانم کو رخصت کرنے ڈاک تک گیا۔ وہاں اس کی موٹر بوٹ کھڑی تھی۔ موٹر بوٹ میں چپو بھی تھے۔ میں چپو دیکھ کر سمجھ گیا کہ وہ چپوؤں کی مدد سے، بے آواز، موٹر بوٹ کو یہاں لے آئی ہو گی۔ جب ہی مجھے موٹر بوٹ کے آنے کی آواز نہیں سنائی دی تھی۔

ذکیہ خانم دوسرے میرے ساتھ رہی تھی۔ بظاہر وہ ایک انتہائی ماڈرن لڑکی نظر آ رہی تھی، مگر وہ سلیقہ شعار اور خالص گھریلو قسم کی لڑکی تھی۔ وہ جب تک میرے ساتھ رہی، اس نے مجھے کافی بنا کر پلائی میرے لیے دوپہر کا کھانا بھی تیار کر کے رکھ دیا۔ اس کا حسن نوخیز اور وحشی تھا۔ جب وہ چلی گئی تو مجھے گھر کی تنہائی کاٹ کھانے کو دوڑنے لگی۔ ایک بل کانا بھی مجھے دشوار لگ رہا تھا۔ ہر کیف کسی نہ کسی طرح وقت گزر گیا۔ شام ہوئی، سرگم بھی آگئی۔ وہ بہت پریشان اور مضطرب تھی۔ اس نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ مشتاق کا کوئی سراغ نہیں مل سکا ہے۔ ساحلی علاقوں کے تمام پولیس سٹیشنوں میں خبر پھادی گئی ہے۔

سرگم نے منہ ہاتھ دھو کر پیلے تو کافی پلائی۔ جب وہ کافی بنا چکی تو ایک گھریلو عورت اور شوہر پرست بیوی کی طرح کچن میں رات کا کھانا تیار کرنے لگ گئی۔ اس نے کھڑکی میں لگے ہوئے گتے کے سوراخ کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ شاید نظر نہیں پڑی تھی۔ نظر پڑی تھی تو وہ کبھی ہو گی کہ سوراخ پیلے ہی سے موجود ہو گا۔ اس نے چکن سوپ اور چائناز چکن رائس بنایا تھا۔ ہم خاموشی سے سوپ پی رہے تھے کہ دفعتاً اس نے پوچھا۔ ”کرمل! کوئی فون تو نہیں آیا؟“ اس کی محمد نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ جیسے وہ میرے دلی تاثرات کو بھانپ رہی ہو۔

میں نے بے نیازی سے جواب دیا۔ ”میلی فون تو کسی کا نہیں آیا۔ اگر آیا تھا تو اس کی آواز مجھ تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ کیوں کہ میں اپنا کمرہ بند کر کے سو رہا تھا۔“ میں نے توقف کر کے اداکاری کرتے ہوئے اس انداز سے کہا جیسے اچانک کچھ یاد آ گیا ہو۔ ”ہاں! تمہارے جانے کے کوئی ایک گھنٹہ بعد ذکیہ خانم آئی تھی۔“

سرگم کے ہاتھ سے چیچ چھوٹ کر پیالے میں گرا تو سوپ اچھل کر اس کے امپن پر پھیل گیا۔ اس کا چہرہ فق ہو گیا اور آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا۔ ”وہ یہاں کس لیے آئی تھی؟ کیا اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟“

”مجھ سے اظہار عشق کرنے کے لیے تھا آئی تھی۔ وہ میرے عشق میں پاگل ہو رہی ہے۔ وہ یہ سن کر قہر و غضب کے عالم میں آئی تھی کہ میں نے تم سے شادی کر لی ہے۔“ میں نے اسے مزید چھیڑنے کی غرض سے سنجیدہ ہو کر کہا۔ ”وہ جانتے ہوئے مجھے دھمکی دے گئی کہ اگر میں نے تمہیں طلاق نہ دی تو وہ تمہیں...“ میں نے اپنا جملہ ادھر اور اچھوڑ دیا۔

سرگم چراغ پا ہو گئی۔ اس کا جسم نفرت اور غصے سے کانپنے لگا۔

”اسے کیا ضرورت ہے شادی کی۔ وہ تو رنگین تیلی ہے۔ وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ البتہ میں اسے ایسا



ہم اندر داخل ہوئے تو ذکیہ خانم نے اپنے ہاتھ میں ربوہ اور تمام رکھا تھا اور چونکا تھی۔ وہ میرے پیچھے پیچھے تھی۔ وہ جیسے ہی میرے پیچھے سے نکل کر آئی اس شخص نے جس کی حالت کسی مردے سے بھی بدتر ہو رہی تھی، اس میں جیسے ہی روح داخل ہو گئی۔ اس کی خوف سے محمد ویران آنکھیں جو مجھ پر جمی تھیں، ان میں اچانک ہزاروں واٹ کے برقی قنطوروں جیسی روشنی پھیل گئی۔ اس کے ہاتھوں جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ پھر اس کے ہونٹوں نے حرکت کی۔ وہ کئی پھٹی سی آواز میں بولا۔ ”ذکیہ... ذکیہ...“ فرط سرت سے اس کی زبان لڑکھاری تھی۔

ذکیہ اس شخص کی زبان سے اپنا نام سن کر اچھل پڑی۔ اس نے ایک لمحے کے لیے چونک کر دیکھا۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ دوسرے ہی لمحے ذکیہ اس کی جانب دیوانہ وار چلی۔ ”کرل!...“

ہم اسے زنجیروں سے آزاد کر کے برآمدے میں لے آئے تاکہ وہ کھلی فضا میں سانس لے سکے۔ کچھ دیر بعد کرل مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اور اسے جیسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ دنیا میں ایسے دو ہم شکل انسان بھی ہو سکتے ہیں۔ جنہوں نے الگ الگ ملکوں کے پیٹ سے جنم لیا ہو۔ ایک رنگ، ایک جسامت، ایک جیسا چہرہ، اس قدر مماثلت کہ دونوں کے وجود میں ایک ہی روح کا احساس ہوتا ہے۔

کرل بے حد کمزور اور لاغر ہو چکا تھا۔ قنات بہت بھی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ کئی روز کے قاتلے سے ہے۔ جو شخص اس کے لیے ہفتے میں دو بار کھانا لاتا تھا، وہ ایک ہفتے سے غائب ہے۔ وہ صرف پانی پر گزارہ کرتا رہا ہے۔ ذکیہ خانم نے اس کا منہ دھلویا اور کھانا اس کے سامنے رکھا تو وہ اس پر ٹوٹ پڑا۔ کھانے اور گرم گرم کفی نے کرل کے جسم میں جیسے ہی روح پھونک دی۔ اس کی توانائی کسی حد تک بحال ہو گئی۔ مگر وہ اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ بغیر سارے کے چل پھر سکے۔ اس نے میری پوچھنے پر بتایا کہ اسے یہاں کرل نجیب نے لاکر قید کیا تھا۔ اور ایک برسے کو گتے شخص کو گھر لانی پر مامور کر دیا تھا۔ جو ہفتے میں دو ایک بار آکر اس کے لیے کھانے پینے کا سامان پہنچاتا اور کمرے کی صفائی کر کے چلا جاتا تھا۔

ذکیہ خانم کرل کو اپنے ساتھ جلد سے جلد گھر لے جانے کے لیے بے تاب ہو رہی تھی۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ کرل نیاز اس جہنم سے نکل جائے۔ ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ اسے ساتھ کیسے لے جایا جائے۔ موٹر بوٹ میں صرف دو آدمیوں کی گنجائش تھی۔ پھر یہ طے پایا کہ ذکیہ خانم مجھے ہٹ پر چھوڑ آئے اور پھر کرل نیاز کو آکر لے جائے۔ مگر کرل نیاز کے دل و دماغ پر اس قدر خوف سوار تھا کہ وہ اب یہاں تھارہنے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔ اس کی ذہنی حالت بہت ابتر ہو رہی تھی۔ میں نے ذکیہ خانم سے کہا کہ وہ پہلے کرل کو پہنچا آئے پھر آکر مجھے لے جائے۔

ذکیہ خانم، کرل نیاز کے ساتھ چلی گئی۔ میں اس موٹر بوٹ کو نظروں سے اوجھل ہونے تک دیکھتا رہا پھر ریت پر لیٹ گیا۔ نرم اور چمکیلی دھوپ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ میں لیٹے لیٹے نیلگوں و سیج و عریض آسمان کو ایک نکل دیکھتا ہوا کرل نیاز کے بارے میں سوچتا رہا۔ کرل نیاز کو زندہ پا کر مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی۔ ”معا“ مجھے اس کی حسین بیوی نجمہ کا خیال آیا۔ میں نے سوچا کہ وہ زندہ ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ آج وہ دونوں ایک دوسرے کو پا کر کتنا خوش ہوتے! میں نہیں جانتا تھا کہ بیوی کی موت کی خبر سن کر کرل کے دل کی کیا حالت ہوگی۔

دوسری جانب ایک اور خوشی خنجر تھی۔ اس بٹاک سازش کا جلد ہی خاتمہ ہونے والا تھا۔ جو ملک کو

قریب پہنچ گئے اور بوٹ کو خشکی پر کھینچ کر لے آئے۔

میں ہٹ کی جانب جا رہا تھا اور ذکیہ خانم میرے پیچھے تھی۔ معلوم نہیں کیوں، میرے تمام بدن میں خون کی گردش تیز ہو گئی تھی۔ اور میں ایک عجیب کیفیت سے دوچار ہو رہا تھا۔ ایک نامعلوم سا خوف میرے سینے میں بھر گیا تھا۔ ذکیہ خانم کی بھی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر مرونی چھائی ہوئی تھی۔ اور آنکھوں میں خوف جھانک رہا تھا۔

برآمدے میں داخل ہونے کے لیے جو چند میڑھیوں کا چوبلی زینہ تھا، وہ نصف سے زیادہ ریت میں دھنسا ہوا تھا۔ یہ لکڑی کا بنا ہوا کہیں تھا۔ بے حد پرانا تھا۔ اس کی حالت کسی کھنڈر جیسی تھی۔ مگر ایک بات تعجب خیز تھی کہ اس کی کھڑکیاں اور دروازے مضبوط تھے اور بند تھے۔ بیرونی دروازے پر بڑا سائل پڑا ہوا تھا۔ ہم برآمدے میں کھڑے ہٹ کا جائزہ لے رہے تھے۔ میں ایسے دروازے یا کھڑکی کی تلاش میں تھا جسے توڑ کر اندر جلا جاسکے۔ یک لخت ذکیہ خانم نے میرا بازو تھام لیا۔ ”سکندر صاحب!“ اس نے تالے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حیرت سے کہا۔ ”دروازے کی کھڑکی قدرے زنگ آلود ہے۔ جب کہ تالہ نالگ رہا ہے۔“

”ہاں... یہ بات تو ہے۔“ میں نے تالے کو دیکھتے ہی تسکین کی۔

”اس کا یہ مطلب ہے کہ یہاں کوئی آنا جاتا رہتا ہے۔“

ہم دونوں باتیں کر رہے تھے کہ اچانک اندر سے ایک عجیب سی آواز سنائی دی جیسے کوئی جانور آہستہ سے غریبا ہو۔ اس آواز کو سن کر ہم دونوں ہی اچھل پڑے۔ ہم نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا دوسرے ہی لمحے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی شخص اندر کراہ رہا ہو۔ واقعی اندر ایک انسان کراہ رہا تھا۔ دھنسا، ایک اور آواز گونجی جیسے زنجیریں بج اٹھی ہوں۔ ذکیہ خانم نے چونک کر پوچھا ”یہ کیسی آواز ہے؟“

”کوئی شخص پابہ زنجیر معلوم ہوتا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”شاید مشتاق ہو گا۔“

”مشتاق کون...؟“

میں نے اسے مشتاق کے بارے میں یاد دلایا۔ کل میں نے جو اسے کہانی سنائی تھی۔ اس میں مشتاق کا بھی تذکرہ تھا۔ وہ بولی۔ ”اگر مشتاق ہے تو اسے یہیں سبک سبک کر مرنے دو۔“

”میں بھی یہی چاہتا ہوں مگر دیکھ کر قسلی کر لینا چاہتا ہوں۔ کیوں نہ دروازے کی کھڑکی توڑ کر اس خبیث کو دیکھ لیا جائے۔“

میں کھڑکی کو دروازے سے نکلنے کے لیے کوئی ایسی چیز تلاش کر رہا تھا جو لوہے یا کسی مضبوط لکڑی کی ہو۔ ذکیہ خانم نے تو کڑی میں سے ایک ربوہ اور نکل کر میری طرف بڑھایا جو اس نے تو لیے میں پیٹ رکھا تھا۔ شاید وہ ہر وقت اپنے ساتھ ربوہ رکھتی تھی۔ میں نے ربوہ کی ٹال سے کسی نہ کسی طرح کھڑکی نکال ہی دی پھر دروازہ کھول دیا۔ ہم نے دہلیز پر کھڑے ہو کر اندر دیکھا تو اندھیرا نظر آیا۔ اندھیرا چھنا تو ملگجی روشنی میں کمرے کی ہر چیز نظر آنے لگی۔ ”معا“ ذکیہ خانم میرا بازو ہلا کر بولی۔ ”سکندر صاحب! وہ دیکھئے“ مشتاق پابہ زنجیر نظر آ رہا ہے۔“

میں نے اشارے کی سمت میں دیکھا کمرے کے ایک کونے میں جو شخص پابہ زنجیر تھا، اس کی بڑھی ہوئی داڑھی پورے چہرے پر کسی خاردار جھاڑی کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ سر کے بال شانے تک بڑھے ہوئے تھے اور اٹھے ہوئے تھے۔ اس کا لباس میلا اور بوسیدہ لگ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ اور پیروں کے ناخن لمبے لمبے اور گندے ہو رہے تھے۔ اس کے پیروں پر ایک پرانا اونٹنی کپل پڑا تھا۔ کمرے میں نقصان پھیلا ہوا تھا۔



کھڑے کھڑے کرنے کے لیے تیار کی گئی تھی۔ اب کرل نیاز زندہ سلامت تھا۔ وہ ملک دشمن عناصر کا آسانی سے قلع قمع کر سکتا تھا۔ یہی سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی۔ معلوم نہیں کتنی دیر تک میں گہری نیند سوتا رہا۔ پھر آنکھ کھلی تو مجھے کچھ شور سنا ملتا رہا۔ میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ یہ مونروٹ کے انجن کی آواز تھی۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ذکیہ خانم واپس آ رہی تھی مگر بوٹ نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ سامنے والے نیلے کا چکر کاٹ کر ادھر آ رہی تھی۔ کوئی پانچ منٹ بعد بوٹ نیلے کے عقب سے نکل آئی۔

یہ ذکیہ خانم کی نہیں بلکہ کوئی اور ہی مونروٹ تھی۔ اس میں دو عورتیں سوار تھیں۔ دونوں گہرے بھورے رنگ کے اوور کوٹوں میں تھیں۔ اور ساڑھی پہنے ہوئے تھیں۔ سر پر سکارف تھے اور آنکھوں پر تاریک شیشوں کا چشمہ تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر چوگی تھیں۔ اور پھر انہوں نے اپنی مونروٹ روک لی۔ ایک عورت دو دربین نکال کر مجھے دیکھتی رہی، پھر اس نے جیسے تھیر ہو کر دو دربین ساتھی عورت کی طرف بڑھا دی۔ دوسری عورت نے لمبے بھر کو مجھے دیکھا پھر دو دربین ہٹائی۔ وہ چند ثانیہ میری جانب دیکھتی رہی اور پھر مونروٹ تیزی کے ساتھ میری طرف آنے لگی تھی۔

ان کے خدو خال واضح نہیں تھے۔ چشموں نے ان کے چہرے نصف حد تک چھپا رکھے تھے۔ یہ عورتیں کون ہیں اس دیرانے میں ان کا کیا کام ہے؟ وہ مجھے یوں حیرت سے کیوں دیکھ رہی ہیں۔ کہیں یہ کرل نیاز کی شناسا یا رشتے دار تو نہیں ہیں؟

بوٹ جیسے ہی کنارے پر رکی، دونوں نے اتر کر اسے خشکی پر کھینچ لیا۔ ایک عورت نے نوکری ہاتھ میں لے لی۔ پھر وہ دونوں میری طرف تیزی سے آئیں جیسے ہی ہمارے درمیان فاصلہ کم ہوا ایک عورت خوشی سے چچی۔ ”کرل! تم! تم! تم! زندہ ہو کر مل...؟“

”نہیں... یہ نیاز نہیں ہے۔“ دوسری عورت نے زہر بھرے لہجے میں چیخ کر کہا پھر اپنے اوور کوٹ کی جیب سے پستول نکالا اور بائیں ہاتھ سے چشمہ آنکھوں سے اتار لیا۔ ”اس شخص کا نام سکندر ہے۔ یہ وہی غبیٹ ہے جس کی وجہ سے میرے شوہر کی جان گئی۔ اور میں بیوہ ہو گئی۔ اگر یہ اس روز مر جاتا تو آج مجھے یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔“ اس کے سینے میں سانپوں کا ظالم ہچکولے کھا رہا تھا۔ اور اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ وہ غضب ناک ہو کر بولی۔ ”اس روز تمہاری قسمت اچھی تھی جو تم بچ گئے، مگر تم آج نہیں بچ سکو گے میں...“

”نجمہ...؟“ میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ میں ششدر ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔ دل میں سوچ رہا تھا میرے خدا! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ مردے ایک ایک کر کے زندہ ہو رہے ہیں!

وہ میری زبان سے اپنا نام سن کر چوٹک پڑی۔ ”تو تمہیں میرا نام بھی معلوم ہو چکا تھا۔ سرگم نے تمہیں میرا نام بتانے کی غلطی کیسے کی۔ وہ ذلیل تو بھولے سے بھی ایسی حماقت نہیں کر سکتی...“ وہ حقارت سے بولی۔

”اس نے مجھے آپ کے بارے میں نہیں بتایا بلکہ یہ بات اس اخبار سے معلوم ہوئی تھی، جس میں آپ کے مرنے کی خبر شائع ہوئی تھی۔“

”میری موت کی خبر سے تمہیں بہت خوشی ہوئی ہوگی؟“ اس نے استہزائی انداز میں کہا۔ ”افسوس ہوا تھا، مگر آج آپ کو سامنے دیکھ کر واقعی خوش ہو رہی ہے۔“ میں مسکرایا۔

”اچھا یہ تو بتائیں کہ آپ دوبارہ زندہ کیسے ہو گئیں؟“

”میں تمہاری فریبی باتوں کو خوب سمجھتی ہوں کیا کوئی مر کر بھی زندہ ہوا ہے؟“

”آپ کی مثال سامنے موجود ہے۔“

”اوہ!“ اس کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ ابھر آئی۔ ”تمہیں یہ راز بتانے میں کوئی حرج نہیں کیوں کہ تم اسے کسی پر ظاہر کرنے کے لیے زندہ نہیں رہو گے۔ میں نے ایک منصوبے کے تحت اس حملے سے فائدہ اٹھایا تھا تاکہ سرگم کو فریب دے سکوں۔ مگر اس میں کامیاب نہ ہو سکی۔“

”تو پھر آپ سمندر میں کیا کر رہی ہیں؟“

”میں اپنے شوہر کے قاتلوں کو تلاش کر رہی ہوں تاکہ انہیں چن چن کر قتل کر سکوں اور اپنے انتقام کی پیاس بجھا سکوں۔“

”مگر میں نے آپ کے شوہر کو قتل تو نہیں کیا۔“

”ہاں! تم نے اسے قتل نہیں کیا، مگر تم ہی اس سارے فساد کی جڑ ہو۔“ اس نے پستول پر اپنے ہاتھ کی حرکت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔ ”اس روز تم اس لیے بچ گئے تھے کہ تب مجھے پستول پکڑنا نہیں آتا تھا مگر آج میں پستول چلانے میں خوب ماہر ہوں۔“

نجمہ کی ساتھی عورت جس کی نظریں مجھ پر مرکوز تھیں، وہ نجمہ کی طرف گردن گھما کر بولی تو اس کے لہجے میں خیر تھا۔ ”مجھے تمہاری بات اور نظروں پر یقین نہیں آ رہا کہ یہ شخص بہرہ دیا ہے۔ تم نے اسے کیسے پہچان لیا؟“

”اس لیے کہ میرے شوہر جو اس دنیا میں نہیں رہے۔“ نجمہ کی آواز بھرا گئی۔ ”یہ وہی شخص ہے سمیعہ! جس کی یادداشت ختم کر دی گئی اور پھر سرگم نے اس سے شادی کر کے اپنی منگی میں کر لیا۔ اور حسن و شباب کا اس پر بنا کر اسے تربیت دی جا رہی ہے کہ یہ اپنی پلاٹ کو تباہ کر دے۔“

”تب تو اسے قتل کرنے کے نیک کام میں دیر نہیں ہونی چاہئے۔“ سمیعہ نے تائید کی۔ ”بلکہ اس نیک کام میں مجھے بھی کچھ حصہ لینے دو۔“

”کیا آپ ایک بے قصور شخص کو موت کے گھاٹ اتارنے کے درپے ہو رہی ہیں؟“

”نہیں!“ نجمہ حقارت سے بولی ”تم کسی موڈنگی سانپ سے کم نہیں ہو۔ تمہارے مرتے ہی سارا کھیل ختم ہو جائے گا۔“

”اگر آپ مجھ پر نوازش کریں، میری جان بخشی کریں تو میں یہاں سے فرار ہو کر کہیں روپوش ہو جاؤں گا۔ ساری زندگی اس گروہ کے ہاتھ نہیں لگوں گا۔“

”جو ایک بار سرگم کا اسیر ہو گیا، وہ کبھی رہائی نہیں پاسکتا۔“

”مگر تم یہاں کیسے پہنچے اور یہاں کیا کر رہے ہو؟“ سمیعہ نے گرد و پیش کا جائزہ لے کر پوچھا۔ ”یہاں کوئی بوٹ بھی نظر نہیں آ رہی ہے۔“

”پیدل پہنچا ہوں۔“ میں نے خوش دلی سے جواب دیا۔ ”اور یہاں دھوپ اور ہوا کھا رہا تھا۔“

”زرا یہ بھی کھا کر دیکھو۔“ نجمہ نے گولی داغ دی۔ قسمت اچھی تھی کہ گولی سنسنائی ہوئی، میرے کان کے پاس سے گزر گئی۔ ایک سردی لہر میری ریڑھ کی ہڈی کو چھو گئی۔ اس نے کڑک کر پوچھا۔ ”بچ جتاؤ کیا سرگم تمہیں لینے آئے گی؟“

”وہ تو کراچی شہر شاپنگ کے لیے گئی ہوئی ہے۔“

”پھر تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”میں یہاں آکر یہ سوچ رہا تھا کہ یہ مردے زندہ ہونا کیوں شروع ہو رہے ہیں۔ کہیں قیامت تو نہیں آگئی؟“

”میں تھوڑے لمبے قیامت ہی میں کر آئی ہوں، بتاؤ یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”میں آپ کو یہ کہہ رہا تھا کہ کاش آپ زندہ ہو جاتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔ آج کتنی خوشی ہوتی کہ...“

”یعنی تم ایک تیر میں دو شکار کرنا چاہتے تھے؟ سرگرم اور مجھ... بہت خوب‘ واقعی تم ایک نمبری بد معاش ہو۔“ سمیعہ دانت پیس کر بولی۔

”آپ نے میرے بارے میں غلط اندازہ لگایا۔ میں ان کی بے حد عزت کرتا ہوں کیوں کہ یہ ایک عظیم اور بلور سپاہی کی بیوی ہیں کرمل نیاز وطن پرست ہیں، محب وطن ہیں، ایک نڈر اور سرفروش...“

”وہ تھے۔ اب ہیں نہیں۔“ سمیعہ نے تند لہجے میں کہا۔ ”تمہاری زبان پر یہ نام اچھا نہیں لگ رہا ہے۔“

”تھے کیا مطلب؟“ میں نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ ”کرمل زندہ ہیں، خدا انہیں سلامت رکھے۔“

”زندہ ہیں؟“ نجمہ اچھل پڑی۔ ”تم ہوش میں تو ہو؟ کہیں تم اپنی جان بچانے کے لیے جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو؟“

”پوری طرح ہوش و حواس میں ہوں۔ اسی لیے تو کہہ رہا تھا کہ مردے زندہ ہو رہے ہیں۔“

”دیکھو ایسا سنگین مذاق مت کرو۔“ سمیعہ بولی۔ ”تمہارا یہ جھوٹ کسی کی زندگی اور موت کا معاملہ بن جائے گا۔“

”آپ کو میری بات کا یقین نہیں تو ایسا کریں کہ مجھے شوٹ کر دیں۔ اس طرح سارا قصہ ختم ہو جائے گا۔ پھر آپ دونوں یہ سوچ کر چلی جائیں کہ خس کم جہاں پاک۔“

”نہیں، تم سچ کہہ رہے ہو۔“ نجمہ کے سر میں ایک لہری اٹھی۔ وہ کسی نازک سی شاخ کی طرح لرزائی۔

اس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اسے میری بات کا یقین نہ آ رہا ہو۔ مگر اس کے چہرے سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ میری بات کا یقین کرنے پر مجبور ہے بے تائبہ انداز اور عاجزی میں پوچھ رہی ہیں کہ خدا کے لیے تمنا دو۔ دیکھو، مجھ سے مذاق مت کرو۔“

”ذیابا سے باعزت طور پر رخصت ہونے والا شخص بھلا کیا مذاق کر سکتا ہے۔ میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ آپ کے راز کے ساتھ ساتھ آپ کے شوہر کا راز بھی اپنے سینے میں دفن کر کے لیتا جاؤں۔ آپ کی بھی تو یہی خواہش ہے۔“

”خدا کے لیے میرے زخموں پر نمک مت چھڑکو۔“ وہ کراہ کر بولی۔ ”اگر تم میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟ میں تو ایک عورت ہوں ایک عورت کے لیے اس کے سناگ سے بڑھ کر کوئی شے نہیں ہوتی۔ سچ پوچھو تو میں بھی اسی روز مر جاتی جب مجھے یہ گمان گزرا تھا کہ نیاز کو دشمنوں نے ختم کر دیا ہے۔ مگر میں نے اس لیے خودکشی نہیں کی کہ مجھے اپنے شوہر کا انتقام لینا تھا۔ میں انتقام لینے کے لیے ہی آج تک زندہ ہوں۔“

”تو پھر انتقام لے کر اپنے دل کی حسرت پوری کر لیں۔ اپنے پستول کی ساری گولیاں مجھ پر خالی کر دیں۔“

”میں بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے میرا شوہر مل جائے تو میں ساری دنیا کو معاف کر سکتی ہوں۔“ اس کی آواز ٹوٹ کر رہی تھی۔

دھنسا۔ سمیعہ نے ہدایتی انداز میں سچ کر کہا۔ ”نجمہ ہو شیار رہنا۔ یہ شخص تمہارے جذبات سے کھیل کر

اپنی جان بچانا چاہ رہا ہے۔ اس کے فریب میں مت آنا۔ موقع ملے گا تو یہ ہم دونوں کو ختم کر دے گا۔ اسے شوٹ کر دو۔“

”آپ کی یہ سبیلی جتنی حسین ہیں، اتنی ہی ذہین اور قیادہ شناس بھی ہیں۔ ماہر نفسیات بھی معلوم ہوتی ہیں۔ یہ اس وقت بالکل سچ کہہ رہی ہیں۔ آپ ان کا ٹیک مشورہ قبول کر کے گولی چلا دیں۔“

”مجھے تمہاری بات پر یقین آ گیا کہ نیاز زندہ ہیں۔“ وہ ہلکتے ہوئے بولی۔

”جی ہاں، کرمل نیاز زندہ ہیں۔ چند گھنٹے پہلے ہم اس ہٹ پر اس لیے آئے تھے کہ یہاں کرمل کی قبر ہو گی۔ مگر یہاں پہنچے تو کرمل کی قبر نہیں تھی۔ بلکہ کرمل زندہ تھے۔ اس حالت میں تھے کہ...“ میں سانس لینے کے لیے رکا۔ میری نظریں نجمہ کے چہرے کو تنک رہی تھیں اس کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک رنگ جا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں مجھ سے معلوم ہونے لگیں۔ میں نے ایک گہری سانس لے کر اپنی بات جاری رکھی۔ ”نظروں کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس ہٹ میں انہیں پاب نہ بچ کر کیا ہوا تھا۔ ان کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ اور وہ جان بہ لب نظر آ رہے تھے۔ کئی دنوں کے بھوکے پیاسے تھے۔ ہم تو شاید انہیں اس طے میں پہچان بھی نہ پاتے۔ مگر انہوں نے میری ساتھی کو پہچان لیا۔ تب ہم پر یہ راز ظاہر ہوا کہ وہ کرمل ہیں پھر ہم نے انہیں آزاد کیا اور...“

”تو کیا وہ ہٹ میں موجود ہیں؟“ نجمہ کے ہاتھ سے پستول جھوٹ کر اس کے پیروں میں گر گیا۔

”نہیں، کرمل اندر نہیں ہیں۔“

”تم جھوٹ بول رہے ہو۔ اگر وہ وہاں نہیں ہیں تو پھر کہاں ہیں؟“ نجمہ تیز لہجے میں بولی۔ ”اس سے پہلے کہ میں اس کو کوئی جواب دیتا وہ بھاگی اور زینے پر چڑھنے لگی۔ میں نے اسے پکارا۔“ سننے۔ وہ وہاں نہیں ہیں۔“

مگر وہ میری بات ان سنی کر کے تیزی سے اوپر چڑھتی چلی گئی۔ میں دیکھنا ہی دیکھنا رہ گیا۔ نجمہ کے بدن میں جیسے بجلیاں ہی بھر گئیں تھیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس تیزی سے اوپر بھی پہنچ سکتی ہے۔“

سمیعہ نے لپک کر وہ پستول اٹھالیا۔ اسے میری سچائی کا یقین نہیں آیا تھا۔ وہ مجھے شک و شبہ کی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ جب میں اوپر کی طرف جانے لگا تو وہ پیچ کر بولی۔ ”جہاں کھڑے ہو، وہیں کھڑے رہو ورنہ میں آگ برسا دوں گی۔“

”ان خوش نما ہاتھوں سے تو پھول برسیں گے۔“ میں رک گیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

”کاش جتنے خوبصورت ہاتھ ہیں آپ کا دماغ بھی اتنا ہی خوبصورت ہوتا۔ سنا ہے عورت جتنی حسین ہوتی ہے اس کا دماغ اس کے برعکس ہوتا ہے۔“

میری بات کا مفہوم سمجھ کر اس کا چہرہ تھما اٹھا۔ ”تم نے ٹھیک سنا ہے۔ پستول کی ایک گولی کافی ہو گی، جو میرے دماغ کو تم پر روشن کر دے گی۔“

”مگر نجمہ کی زندگی میں اندھیرا کر دے گی۔ میں مر گیا تو کوئی ساری زندگی کرمل کی گرد کو بھی نہیں پاسکے گا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”عورت بے وقوف ہوتی ہے آپ بھی بے وقوف ہیں، کسے تو اس کا ثبوت پیش کرو؟“

”تو تم مجھے بے وقوف ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہو۔“ اس کے لبوں پر تمسخرانہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

میں نے اس کے عقب میں انگلی کا اشارہ کیا۔ ”وہ دیکھئے اگر مل بوٹ میں آ رہے ہیں۔“

وہ کرمل کا نام سنتے ہی یک لخت چلی۔ مجھے اسی لمحے کا انتظار تھا۔ میں نے فوراً اس پر جست لگا دی۔

کھول کر دیکھی تو اس میں چاندی کی ایک انگوٹھی تھی۔ یہ کرل کی انگوٹھی تھی۔ جسے پہچان کر وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ ساتھ والے کمرے میں ایک بلیک اور بستر موجود تھا۔ میں نے اس بستر کی دھول جھاڑ کر نجرہ کو اس پر لٹا دیا۔ اور باہر آ گیا۔۔۔ پھر مجھے دور سے ذکیہ خانم کی بوٹ آئی دکھائی دی۔ ذکیہ خانم نے بوٹ کنارے پر روکی تو اس کے چہرے پر گہرا استعجاب تھا۔ ”یہ بوٹ کس کی ہے؟“

میں اسے اندر لے گیا نجرہ ہوش میں آ کر سمیٹھ سے باتیں کر رہی تھی۔ ذکیہ خانم، نجرہ کو دیکھتے ہی خوشی سے اچھل پڑی۔ ”آپ... بھی زندہ ہیں نجرہ! آئی! آج ہم دونوں کو کتنی بڑی خوشیاں نصیب ہوئی ہیں۔ اودہ میرے خدا! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔“

ذکیہ خانم اور نجرہ بغل گیر ہو گئیں... عید کی خوشی جیسا منظر لگ رہا تھا اندازہ ہو رہا تھا کہ دونوں میں گہری دوستی اور محبت ہے۔

کچھ دیر بعد ہم لوگ واپس جا رہے تھے۔ ایک موٹر بوٹ میں نجرہ اور سمیٹھ دوسری میں میرے ساتھ ذکیہ خانم تھی۔ انہوں نے مجھے سرگرم کے مکان پر اتار دیا۔ میں دل میں گھبرا رہا تھا کہ کہیں سرگرم واپس نہ آگئی ہو۔ اس کی بوٹ ڈاک پر نظر نہ آئی تو دل کو اطمینان محسوس ہوا۔ میں ان لوگوں کو رخصت کر کے اندر آیا تو میری بھوک کھل گئی تھی۔ میں نے کھانا گرم کیا اور خوب سیر ہو کر کھلایا۔ پھر کمرے میں آکر لیٹا اور گہری نیند سو گیا۔

مجھ پر غنودگی سی طاری تھی کہ کوئی مجھے جھنجھوڑ کر ہوش میں لائے کی تدبیر کرنے لگا۔ میں بیدار تو ہو گیا تھا مگر میری پلکیں نیند سے جو جھل تھیں۔ معلوم نہیں کیوں نیند کا غلبہ اس قدر شدید تھا۔ سرگرم کی تیز آواز میرے کانوں میں سنسنے لگی۔ ”کرل... کیا تم نے آج خوب لی رکھی ہے؟“

میں نے بغیر سوچے سمجھے سر ہلا دیا تو اس نے ٹھنڈا پانی لا کر میرے منہ پر چھینٹے مارے تب کہیں میری نیند ٹوٹی۔ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی اور کھڑکی کے باہر تاریکی نظر آرہی ہے۔ میں سرگرم کا چہرہ دیکھ کر گھبرا گیا۔ وہ زرد ہو رہا تھا۔ سرگرم طوفان کی زد میں آئے ہوئے پتے کی مانند کانپ رہی تھی۔ اس نے مجھے مشکوک نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔ ”تم دن بھر کہاں تھے؟“

میں سوچ میں پڑ گیا کہ کہیں وہ میری غیر موجودگی میں یہاں آکر تو نہیں گئی تھی۔ دوسرے ہی لمحے میں نے خود پر قابو پا کر خوشی سے کہا۔ ”تمہارے دل میں۔“

”وہ تو تم ہمیشہ کے لیے میرے دل میں ہو۔“ اسے غصہ آ گیا۔ اس عالم میں وہ بڑی پیاری لگ رہی تھی۔ میں ہرکاتوہ جزبہ ہو کر بولی۔ ”سچ بتاؤ۔ میرا دل گھبرا گیا تھا۔“

”گھر میں تھا اور کہاں جاسکتا تھا؟“

”کیا میری غیر موجودگی میں کوئی آیا تھا۔ ذکیہ خانم یا کوئی اور...؟“

”نہیں تو۔۔۔ مگر تم یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہی ہو؟“

”میں نے دن میں تین چار مرتبہ فون کیا تھا۔ ٹھنڈی مسلسل بجتی رہی تھی۔ تم نے ریسیور کیوں نہیں اٹھایا تھا؟“

”تھا؟“

میں نے بستر سے نکل کر اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا تو وہ تڑپ کر دور ہٹ گئی۔ وہ جواب کے لیے بے چین ہو رہی تھی۔ مجھے اس کا رویہ پسند نہ آیا لہذا میں نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔ ”میں سارا دن گھر سے باہر ٹھکرا رہا لیٹا رہا۔ دھوپ اور ہوا کھاتا رہا۔۔۔ پھر کو آکر سو گیا اور کیا کرتا۔ شاید اس دوران ٹھنڈی بجتی رہی ہو۔ فون نشست گاہ

دراصل میں اس کے ہاتھ سے پستول چھیننا چاہتا تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو اسے شاید فوراً ہی اپنی حفاظت کا احساس ہوا تھا۔ وہ تیزی سے مڑی مگر میں اس پر جا کر تھا۔ ہم دونوں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکے اور ٹھٹھم گناہو گئے۔ اس نے اپنے ہاتھ سے پستول نہیں چھوڑا تھا۔ اس کی گرفت بہت سخت تھی۔ جان تو ہر ایک کو پیاری ہوتی ہے۔ اسے بھی پیاری تھی۔ میں نے اس کی کلائی مضبوطی سے پکڑ لی۔ اگر میں اس کی کلائی نہ پکڑتا تو وہ پستول میرے سینے پر داغ دیتی۔ تاہم اسے زیر کرنے کے لیے مجھے زیادہ جدوجہد نہیں کرنا پڑی۔ ہم لڑھکتے ہوئے سمندر کے کنارے پر آ گئے تھے۔ جہاں تک لہریں آ رہی تھیں۔ میں نے اسے زیر کر لیا تھا۔ اور اس کے دونوں ہاتھ زمین سے لگا دیے تھے۔ اس کی حالت کسی مردے سے بھی بدتر ہو رہی تھی۔ چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ موت کے خوف سے بڑی بڑی آنکھیں اٹل پڑی تھیں۔ اور سینے میں سانس بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جمائے ہوئے پوچھا۔ ”تمہیں اپنی بے وقوفی کا ثبوت مل گیا؟“

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور پھٹی پھٹی دہشت زدہ آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی۔ میں نے ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ سے پستول چھین لیا۔ اس کے کھلے بال ریت پر بادلوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ لمبوں نے بالوں اور اس کا سر جھگوڑا تھا۔ پستول بھی گھبراہٹ میں نے کھڑے ہو کر کہا۔ ”اب آپ کسی اچھی بچی کی طرح اٹھ کر کھڑی ہو جائیں۔ کیوں کہ مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔ یعنی آپ کی آخری خواہش!“ میں نے اسے پستول کی زد میں لیتے ہوئے نال سے اشارہ کیا۔ ”شاہا! جلدی سے کھڑی ہو جائیں۔“

وہ اپنا آپ سمیٹ کر بدقت تمام اٹھ کھڑی ہوئی اور ساڑھی کا پلو درست کرتی ہوئی اچانک مجھ پر جھپٹ پڑی۔ وہ پستول پر پھینچی تھی۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ ایسا بھی کر سکتی ہے۔ پستول میرے ہاتھ سے جھوٹ کر زمین پر گر اور وہ سرعت سے جھکی تو ایسا محسوس ہوا جیسے طوفان کی شدت سے کوئی پھل دار نشی ٹوٹ کر گر رہی ہو۔ میں نے ایک دم سے اسے دھکا دیا۔ اس کا ہاتھ پستول تک پہنچ نہیں سکا تھا۔ وہ تیرا کر گر گئی۔ پھر کسی گیند کی طرح لڑھکتی ہوئی پانی میں جا گری۔ وہ پانی سے باہر آئی تو پوری طرح بیک چکی تھی۔ اس کا بدن سردی سے یا پھر موت کے خوف سے تھر تھرا کانپ رہا تھا۔ جب اس نے خشکی پر قدم رکھا تو وہ کسی لاش کی طرح نظر آرہی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ”دوبارہ بے وقوفی کا ثبوت دینے کی کیا ضرورت تھی؟ میں نے تو آپ کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے اور اعتماد میں لینے کے لیے پستول چھینا تھا۔ ہر کیف اب آپ اپنی بے وقوفی کی سزا خود ہی بھگتیں۔“

اس کا لباس بدن سے چپک گیا تھا۔ اور پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ میں نے کہا۔ ”ہٹ میں جا کر کپڑے نیچوڑ لو اور پھر انہیں پھینک لینا۔ اب سردی سے بچنے کی یہی ایک صورت ہے۔“

اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ وہ تذبذب میں پڑ گئی شاید دل میں ڈر رہی تھی کہ اس میں بھی میری کوئی چال نہ ہو۔ میں اسے مشکوک پا کر قریب گیا اور اس کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو وہ خوف زدہ ہو گئی۔ پھر میں نے اس کے ہاتھ پر پستول رکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر آپ کو مجھ سے کوئی خطرہ محسوس ہو رہا ہے تو اسے اپنے پاس رکھ لیں۔“ اس کی آنکھوں میں خوف کی جگہ ممنونیت نے لے لی۔ اور چہرے پر خجالت چھا گئی۔ ”میں شرمندہ ہوں۔“ وہ بڑبڑائی۔

”اندر چلی جائیں اور کپڑے اچھی طرح نیچوڑ کر پہن لیں۔ ہو سکے تو نجرہ کا کولٹ لے لیں۔“

وہ ہٹ کی طرف بڑھ گئی۔ میں ریت پر بیٹھ گیا۔ چند لمحے بھی نہیں گزرے تھے کہ مجھے سمیٹھ کی ہدایتی چیخ سنائی دی۔ میں لپک کر اندر پہنچا۔ نجرہ فرش پر بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ اس کی مٹھی بند تھی میں نے اس کی مٹھی

”میرے بہت سے ساتھی اس کام کے لیے یہاں پہنچ گئے ہیں۔ وہ جلد ہی پورے ملک میں پھیل جائیں گے۔ وہ اس تحریک کے لیے پہلے ہی زمین تیار کر آئے ہیں۔ اب صرف ہمیں میں چنگاری ڈالنے کی دیر ہے۔“

”وہ خطرناک بم کب آئیں گے جو مجھے انٹی پلانٹ میں نصب کرنے ہیں؟“

”چوبیس دسمبر کو میرے ساتھی یہاں آئیں گے جن میں ظمیر رحمان بھی شامل ہو گا۔ وہ تمہیں یہاں سے لے جائیں گے پھر تم چکیس دسمبر کو اپنے دفتر جاؤ گے تو تمہارے ساتھ ایک بریف کیس ہو گا۔ اس بریف کیس میں وہ بم موجود ہوں گے۔“

”کامیابی کی کتنی امید ہے؟“

”صد فی صد۔۔۔“ سرگم نے جواب دیا۔

”اس کامیابی کی خوشی میں کیا انعام ملے گا؟“

”دس لاکھ ڈالر اور ایک ترقی یافتہ ملک کی شہریت۔“ وہ خوش دلی سے بولی۔ ”پھر ہم جنت میں زندگی گزاریں گے۔“

”ہاں! میں نے کچھ یاد کرتے ہوئے پوچھا۔“ آج تم بے حد پریشان سی آئی تھیں۔ کیا بات تھی؟“

”میں کسی خیال میں کھوئی ہوئی تھی۔“ اس نے اسی بے خیالی کے عالم میں جواب دیا۔

”آج مجھے نجمہ نظر آگئی تھی۔۔۔“ دوسرے ہی لمحے وہ چونک پڑی اس کا چہرہ زرد ہو گیا۔

”کون نجمہ؟“ میں نے انجان بن کر پوچھا۔

”وہ کبھی میری سہیلی تھی مگر آج میری دشمن ہے۔ میری جان لینے کے درپے ہے۔“ پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”او چلو، چل کر سوتے ہیں۔“

وہ میرے کمرے میں آگئی۔ اس نے بستر لینے سے پہلے اندھرا کر دیا۔ پھر گہری نیند سو گئی۔ مگر میں جاگ رہا تھا۔ دفعتاً! زینے پر ایک آہٹ سی محسوس ہوئی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دروازے کی طرف دیکھا مگر اندھیرے میں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ چند لمحوں کے بعد دروازہ... بے آواز کھلا تو نشست گاہ کے ٹائٹ بلب کی ملنگ جی روشنی اندر داخل ہوئی میں نے زینے پر ایک ہیولا سا دیکھا وہ جو کوئی بھی تھا سیاہ لباس میں تھا۔ پھر تاراج روشن ہو گئی۔ ایک چھوٹا سا ہالہ بھٹکتا ہوا میرے چہرے پر آیا تو میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحوں کے بعد میں نے آنکھیں کھولیں تو سونیا کو بستر کے پاس پایا۔ اس نے ایک رومال سرگم کے منہ پر رکھا ہوا تھا۔

”سکندر صاحب! آپ جاگ رہے ہیں؟“ اس نے سرگوشی کی۔

اگلے ہی لمحے کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ میں نے گردن گھما کر سوچ بورڈ کی طرف دیکھا تو وہاں ایک مسلح نوجوان کھڑا ہوا تھا۔ اس کے کندھے سے کلاشکوف لٹک رہی تھی۔ وہ میری طرف بڑھا تو سونیا بولی۔ ”یہ میرے ساتھی، مسٹر عامر ہیں۔“

میں نے بستر سے نکل کر عامر کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس نے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ ”سکندر صاحب! آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔“

میں نے پلٹ کر سونیا کی طرف دیکھا۔ وہ جیب سے ایک سرنج نکال کر سرگم کے بازو میں گھونپنے کی تیاری کر رہی تھی۔ سونیا نے مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر کہا۔ ”یہ بے ہوشی کا امتحان ہے ہم چاہتے ہیں کہ یہ چند گھنٹے بے ہوشی کے عالم میں رہے۔“

میں ہے۔ میری جیب میں تو نہیں ہے۔“

”ناراض ہو گئے۔“ وہ میرے قریب آ کر بولی۔ ”میرا ذہن آج کل بہت پریشان ہے۔ مشتاق کی پراسرار گمشدگی نے میرا سکون غارت کر رکھا ہے۔ وہ دونوں لاشیں کسی اور کی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ مشتاق کو زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا؟“

”آخر تم اس کے لیے اتنی زیادہ پریشان کیوں ہو؟“

”مشتاق جیسے ذہین لوگ لاکھوں میں ایک ہوتے ہیں۔ وہ دنیا کی ہر شے سے زیادہ قیمتی ہوتے ہیں ایک بے حد قیمتی اور نایاب ہیرا کھو جائے تو کیا دکھ نہیں ہو گا؟“

”مگر میرا خیال ہے کہ تم سے زیادہ قیمتی اور نایاب ہیرا اس دنیا میں نہیں ہے۔“

”اس شاعری کو کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھو۔“ وہ مسکرا کر بولی۔ ”میں ہاتھ روم میں جا رہی ہوں تم بھی تیار ہو کر آ جاؤ۔ میں آج کڑھائی گوشت کا سامان لے کر آئی ہوں رات کے کھانے کے لیے۔“

وہ لہرائی اور بل کھاتی ہوئی کمرے سے نکل گئی لیکن دوسرے ہی لمحے سراسیمگی کے عالم میں واپس آگئی۔

”یہاں میرا پرس تھا۔“ وہ متوحش نظروں سے اپنا پرس تلاش کرنے لگی۔ جو میرے بستر کے سرہانے رکھا ہوا تھا۔

جیسے ہی پرس پر اس کی نظر پڑی۔ اس نے لپک کر اسے یوں اٹھا لیا اور سینے سے لگایا جیسے ایک ماں اپنے بچے کو بچے کو پا کر اٹھالیتی ہے۔ اور سینے سے لگالیتی ہے۔ معلوم نہیں اس پرس میں ایسی کیا چیز تھی۔ اگر اس میں کوئی بڑی رقم ہوتی تو وہ بہت پھولا ہوا ہوتا۔ مگر وہ اتنا پھولا ہوا بھی نہیں تھا۔ وہ اپنا پرس لے کر تیزی سے چلی گئی۔

تجسس نے مجھے اس کے تعاقب میں جانے پر مجبور کر دیا۔ وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو میں کمرے کی دبلیر پر پہنچ گیا۔ میں نے پردے کو ہٹا کر جھانکا اس کی پشت میری جانب تھی۔ وہ اپنی الماری کے خفیہ خانے میں ان کاغذات کو رکھ رہی تھی، جو اس نے اپنے پرس سے نکالے تھے۔ پرس اس کے بائیں ہاتھ میں تھا۔ کاغذات رکھنے کے بعد اس نے الماری بند کی اور جب وہ چلیاں اپنے پرس میں رکھ رہی تھی تو میں وہاں سے ہٹ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ میں بستر پر بیٹھ کر ان کاغذات کے بارے میں غور کرنے لگا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد ہم دونوں نشست گاہ میں بیٹھ گئے۔ گرم گرم کافی کا دور چل رہا تھا۔ وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”کرتل! وہ دن قریب آ رہا ہے جس کا ہم انتظار کر رہے تھے۔ تمہیں ایک عظیم کارنامہ انجام دینا ہے۔“

”میں تیار ہوں۔“

”ہم کچھ دنوں میں تمہارے اس کام کے لیے راستہ ہموار کرنے والے ہیں۔“

”کیسا راستہ؟“

”ہم آئیس دسمبر سے پورے ملک میں ہنگامہ کر رہے ہیں اس دن بڑے بڑے شہروں میں بم کے دھماکے ہوں گے۔ ہڑتائیں ہوں گی۔ بیٹکوں کو لوٹا جائے گا۔ غرض یہ کہ پورے ملک کا نظام ایک ہفتے تک درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ اس کے علاوہ عصبیت کی آگ بھی جھڑک اٹھے گی۔“

”وہ کس لیے...؟“

”اس لیے کہ حکومت کی ساری توجہ ان ہنگاموں کی جانب ہو جائے۔ فوج شہروں میں آ جائے اور تمہارا کام آسان ہو جائے۔“

”یہ کام تم تھا کرو گی؟“



آئے تو موٹر بوٹ کے انجن کی آواز سنائی دی۔ یہ ظمیر ریحان کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔  
ظمیر ریحان کمرے میں داخل ہوا تو ہم دونوں اس کا چہرہ دیکھ کر اچھل پڑے۔ اس کی حالت پاگلوں کی سی ہو  
رہی تھی۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ سرگم سے بولا۔ ”تم ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ چلنے کی تیاری  
کرو۔“

”وہ کس لیے...؟“ سرگم نے اسے حیرت سے گھورا۔ ”یہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے؟“  
”اس لیے کہ حکومت نے ہمارے ان تمام ساتھیوں کو گرفتار کر لیا ہے۔ جو اس مشن کے لیے سارے ملک  
میں پھیلنے والے تھے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ وہ کانفڈنٹ جو تمہارے پاس تھے... حکومت کے ہاتھ لگ گئے ہیں۔“  
”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ سارے کانفڈنٹ میری الماری میں موجود ہیں اور آج شام ہی میں نے ایک نظر دیکھا  
بھی تھا۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“

”پونی نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں خود کو قانون کے حوالے کر دوں۔ میں اسے چکمہ دے کر آیا ہوں۔“  
”پونی نے بتایا...؟ اسے کیسے علم ہوا؟“ سرگم اچھل پڑی۔  
”اس نے مجھے اعتماد میں لے کر سب کچھ معلوم کر لیا تھا۔ دراصل وہ ان نوجوانوں کی خفیہ تنظیم کی رکن ہے  
جو ملک دشمن عناصر کے خلاف سرگرم عمل ہیں جس میں سونیا نامی وہ لڑکی بھی شامل ہے جو یہاں ملازم تھی۔ اس  
میں عاصم بھی شامل ہے جو ایک فوجی جرنیل کا بیٹا ہے۔ یہ سب کچھ آج ہی میرے علم میں آیا ہے۔“  
”ان لوگوں کے گرفتار ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان کا تعلق ایٹمی پلانٹ سے نہیں بلکہ ملک میں تخریبی  
کاروائیوں سے تھا۔ اور پھر ہمارے خلاف ثبوت ہی کیا ہے۔ اگر کوئی ثبوت ہو تا تو سب سے پہلے دھریا جاتا۔“  
”ایٹمی پلانٹ کا منصوبہ بھی دھرا رہا گیا“ سمجھو کر تل نیاز زندہ ہے۔“  
”کیا...؟“ سرگم اچھل پڑی۔ اور اس کا چہرہ بیلا پڑ گیا۔ ”تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا۔ اسے نجیب نے قتل کر  
کے دفن کر دیا تھا وہ کیسے زندہ ہو گیا؟“

”میں نے اسے اور نجمہ کو ایک ہسپتال کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔“  
”خوف کے عالم میں تمہیں ہر شخص پر کرٹل نیاز کا دھوکا ہو رہا ہو گا۔“  
”یہ میری نظروں کا دھوکہ ہی سہی۔“ ظمیر ریحان نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ”میرا ایک ساتھی  
لاچ لے کر یہاں پہنچنے والا ہے۔ میں کسی قیمت پر اس شر اور اس ملک میں رہ کر کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔ بساط  
الٹ چکی ہے۔ حقیقت پسندی کا تقاضا ہے کہ ہم جس قدر جلد ہو سکے یہاں سے نکل جائیں۔“  
سرگم نے ایک لمحہ توقف کیا۔ کیونکہ ایک لاچ اس سمت میں آ رہی تھی۔ اس نے ظمیر ریحان سے کہا۔ ”میں  
اپنا مشن نامکمل چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔ میں دس سال سے اس ملک کو نقصان پہنچانے کے موقع کی تاک میں تھی  
میں نے اس کے لیے اپنے حسن، جوانی اور گہری قربانی دی۔ میں اپنا مشن پورا کیے بغیر واپس نہیں جاؤں گی۔“  
”اب ہم یورپ یا تمہارے ملک میں رہ کر زندگی کا آغاز کریں گے۔“ ظمیر ریحان نے اسے تیز لہجے میں ٹوک  
دیا۔

”ہم تمہیں بھی ساتھ لے جائیں گے کرٹل!“ اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔  
”میں کسی قیمت پر تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی تم جانا چاہتے ہو تو جاسکتے ہو۔“ سرگم بولی۔  
”تم کیوں نہیں چلو گی میرے ساتھ؟“ ظمیر ریحان کے چہرے پر درندگی ابھر آئی۔ ”میں نے تم پر پانی کی طرح

”وہ کس لیے؟“ میں نے پوچھا۔  
”اس لیے کہ ہم اطمینان سے ان کانفڈنٹ کو تلاش کر سکیں۔ جنہیں یہ اپنے ساتھ لے آئی ہے۔“ عاصم نے  
جواب دیا۔

”آپ کو ان کانفڈنٹ کے بارے میں کیسے علم ہوا؟“  
”ہم نے سرگم اور ظمیر ریحان کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھی ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ وہ کانفڈنٹ کہاں  
رکھے ہوئے ہیں؟“  
”ہاں!“ میں نے جواب دیا۔

میں انہیں سرگم کے کمرے میں لے گیا۔ اس کا وہ پرس کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا جس میں چابیاں رکھی  
تھیں۔ کافی تلاش کے بعد وہ پرس باورچی خانے میں رکھا ہوا ملا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ کانفڈنٹ عاصم کے ہاتھوں میں  
تھے۔ عاصم نے جیب سے ایک کیمرو نکال کر ان کی تصویریں اتار لیں۔ اس دوران انہیں سرگم کے منصوبے سے  
آگاہ کرتا رہا۔

عاصم نے تصویریں لینے کے بعد مجھ سے کہا کہ ”ان میں ان غیر ملکی تخریب پسندوں کے نام دیتے اور منصوبے  
ہیں جو اس ملک میں تباہی پھیلانے آئے ہیں۔ اب ان کا کوئی منصوبہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ رب العزت نے اس  
ملک کو تباہ ہونے سے بچالیا ہے۔“

”کیا ۲۵ دسمبر کو میں ان لوگوں کے ساتھ ایٹمی پلانٹ کے مرکز میں چلا جاؤں؟“  
”میرا خیال ہے کہ اس کی نوبت نہیں آئے گی۔“ عاصم نے کہا۔ ”اگر کسی وجہ سے جانا پڑ گیا تو چلے جائیں۔  
میں آپ کو وہیں ملوں گا تاکہ ان کا منصوبہ خاک میں ملا دیا جائے۔“

عاصم کانفڈنٹ کو واپس رکھ رہا تھا۔ تو میں نے پوچھا۔ ”کیا آپ ان کانفڈنٹ کو ساتھ نہیں لے جائیں گے؟“  
”ساتھ لے گئے تو معاملہ چوہٹ ہو جائے گا۔ پھر کوئی بھی ہاتھ نہیں لگے گا۔“ عاصم نے جواب دیا۔  
میں نے ان کو مشتاقی پر اسرار گمشدگی کے بارے میں بتایا تو سوتا بولی۔ ”اس رات اسے ہم نے اغوا کیا تھا۔  
وہ اب ہماری قید میں ہے۔ اس کا اصل نام گھنٹام ہے، وہ بے حد قابل اور ذہین شخص ہے۔ ہم نے اس سے بہت  
کچھ اگوا لیا ہے، یہ ہماری بہت بڑی کامیابی ہے۔“  
میں نے مختصر طور پر کرٹل نیاز کے بارے میں بھی بتا دیا۔

”یہ تو ہمارے لیے بہت بڑی خوش خبری ہے۔ ہم ان سے کل ہی ملیں گے۔ اب دشمن کا خواب کبھی شرمندہ  
تعبیر نہیں ہو گا۔“ عاصم نے خوش ہو کر کہا۔  
ان کو رخصت کر کے میں کمرے میں آیا تو سرگم اب بھی بے ہوش تھی۔

میں بہت خوش تھا کہ سونیا اور عاصم نے بروقت آکر کانفڈنٹ کی تصویریں اتار لیں۔ اس طرح میرا ملک ایک  
بڑی تباہی سے بچ گیا۔ دفعتاً مجھے کرٹل نجیب کا خیال آیا۔ مجھے اس کے بارے میں سونیا اور عاصم سے پوچھنا یا دی  
نہیں رہا تھا۔

دوسرے دن سرگم صبح دس بجے جاگی۔ وہ اتنی دیر سے بیدار ہونے پر حیران تھی وہ سارا دن مجھ سے اس  
منصوبے کے بارے میں پوچھتی رہی اور ایٹمی پلانٹ کے عملے کی تصویریں دکھا کر میرا امتحان لیتی رہی۔ مجھ سے چلنے  
اور بات کرنے کی مشق آتی رہی۔ وی سی آر پر فلمیں دکھاتی رہی۔ رات کے کھانے کے بعد ہم اپنے کمرے میں

گی۔ ”سرگم نے اسے سمجھایا۔  
”میں تو اب تم دونوں کے ساتھ ہی جاؤں گا اور اس کرئل کے بچے کی لاش یہاں چھوڑ جاؤں گا۔“ ظمیر  
ریحان نے دائیں ہاتھ والے پستول کی ٹال سے سرگم اور ذکیہ خانم کو کمرے سے نکلنے کا اشارہ کیا۔ ”میں دیکھتا ہوں  
کہ اب تمہیں میرے ہاتھ سے کون بچاتا ہے؟“

اس نے ایک فائرنگ پر جمونک دیا۔ گولی سنسناتی ذکیہ خانم کے سر سے گزر گئی۔ سرگم اور ذکیہ خانم نے اس  
کے حکم کی تعمیل نہیں کی تھی۔ وہ دونوں اپنی جگہ کھڑی تھیں۔ وہ واقعی مجھے قتل کرنے پر تیار تھا۔ وہ میرا نشانہ  
لے رہا تھا کہ سرگم میرے سامنے آگئی۔ ”ظمیر اگر تم نے اسے کوئی زک بچائی تو ان ہاتھوں سے نہیں بچ سکو گے۔  
تمہیں اس شخص کی اہمیت کا خوب اندازہ ہے۔“

اچانک زینے پر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ تو ظمیر ریحان دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا تاکہ اندر داخل ہونے  
والا اسے دیکھ نہ سکے۔ سونیا اور عاصم کمرے میں داخل ہوئے۔ عاصم مسخ تھا مگر اس کے اندر داخل ہوتے ہی  
ظمیر ریحان نے اسے بھی پستول کی زد میں لے لے کر بے دست دبا کر دیا۔

”آج تو میری قسمت زورور پر ہے۔“ ظمیر ریحان نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ”اب تو سونیا بھی ساتھ ہو گی۔ ایک  
کھٹ میں تین تین مزے۔“ پھر اس نے سرگم سے کہا۔ ”اب تم اپنا فیصلہ سنا دو تاکہ میں بھی اپنا فیصلہ سنا کر یہاں  
سے رخصت ہو جاؤں۔ میرے پاس وقت کم ہے۔ لالچ ڈاک پر پہنچ چکی ہے۔“  
”تمہارے کیا ارادے ہیں...؟“ سرگم نے خوف زدہ ہو کر پوچھا۔

”میں اس کرئل اور عاصم کو قتل کر کے ان تیلیوں کو ساتھ لے جاؤں گا۔“ ظمیر ریحان نے سفاک لہجے میں  
جواب دیا۔ ”تمہیں تمہاری مرضی پر چھوڑ دوں گا۔ کیونکہ ان تیلیوں کے بعد مجھے تمہاری ضرورت نہیں رہی۔“  
”تم ساری دنیا کو قتل کر سکتے ہو مگر کرئل کو نہیں۔“ سرگم میرے لیے ڈھال بن کر کھڑی ہو گئی۔

ظمیر ریحان اپنی جگہ سے ہٹ کر سرگم کے سامنے آیا اور اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”اب اسے  
کوئی طاقت نہیں بچا سکتی۔“

”میں بچا سکتا ہوں۔“ زینے پر سے کوئی کوندا بن کر اندر آیا تھا اور اس نے کلا شکوف کی ٹال ظمیر ریحان کی  
پشت پر رکھ دی۔

میں اچھل پڑا۔ مجھے اپنی نظروں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ لیکن یہ ایک ایسی حقیقت تھی جسے جھٹلایا نہیں جاسکتا  
تھا۔ میں نے سرگم کی طرف دیکھا۔ اس کی پتلیاں ساکت جسم چتر کی طرح مجھ اور منہ حیرت اور دہشت سے اس  
طرح کھلا رہ گیا تھا جیسے اس کی روح قفسِ غصہ سے پرواز کر گئی ہو۔ ذکیہ خانم بھی ششدر تھی۔ ظمیر ریحان نے  
اس کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ مگر اس کا چہرہ بھی پیلا پڑ گیا تھا۔

وہ شخص کرئل تھا۔ کرئل عجیب وہ کرئل کی روح نہیں تھی۔ ایک زندہ جاوید اور متحرک انسان تھا۔ اس کے  
چہرے کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔ وجاہت ماند پڑ گئی تھی۔ وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ بوڑھا دکھائی دے رہا تھا۔ چند منے  
پہلے وہ مردانہ وجاہت کا پیکر تھا۔

”تم تو مجھے میری آواز سے پہچان سکتے ہو، پستول پھینک دو ظمیر! ورنہ تمہارا بدن چھٹی کر دوں گا۔“ کرئل بھی  
غریبا۔

ظمیر ریحان نے حواس باختہ ہو کر دونوں پستول پھینک دیئے تو عاصم نے پک کر انہیں اٹھالیا۔ کرئل عجیب

جیسے ہلایا ہے۔ تمہاری خاطر اپنے ملک کا دشمن ہو گیا ہوں۔ میں پورے دس سال سے تمہارے اشارے پر ٹانچتا چلا  
آ رہا ہوں۔ اور آج تم مجھے ٹھکرا دینا چاہتی ہو۔“

”میں نے تمہاری مہمانوں کی پوری پوری قیمت ادا کی ہے اور میں تمہارے ساتھ چلنے کے لیے تیار بھی ہوں  
لیکن مشن کی تکمیل کے بعد۔“

”سرگم...“ میں نے چیخ کر کہا۔ ”یہ میں کیساں رہا ہوں۔“  
”تم اپنی زبان بند رکھو۔“ ظمیر ریحان نے نفرت اور حقارت سے کہا۔ ”تمہاری حیثیت ایک پالتو کتے سے  
زیادہ نہیں ہے۔“

اس نے اپنا جملہ پورا کیا ہی تھا کہ میں بجلی کی سی تیزی سے اس پر جھپٹ پڑا، ہم دونوں آپس میں جھمکتے گتھا ہو  
گئے۔ ظمیر ریحان کو میرے بارے میں اندازہ نہیں تھا۔ میں نے اس کی زبردست پٹائی کر دی۔ سرگم نے بڑی مشکل  
سے بچ بچا کر لیا۔ ورنہ اس کے چہرے کا جغرافیہ بگڑ کر رہ جاتا۔ پھر بھی اس کی خاصی درگت بن گئی تھی۔ اس کا  
ایک جڑا سوج گیا تھا۔ اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر خون صاف کیا۔ اور خون دیکھا  
تو وہ طیش میں آ گیا۔ اس نے جیب سے پستول نکال کر مجھے زد میں لے لیا۔

اچانک ذکیہ بے آواز قدموں سے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا مگر اس نے ظمیر ریحان  
کو نہیں دیکھا تھا جو دیوار سے لگ کر کھڑا تھا۔ ظمیر ریحان کی طرف اس کی پشت تھی۔ وہ ذکیہ خانم کو دیکھ کر چیخا۔  
”اپنا پستول پھینک دو، ورنہ شوٹ کر دوں گا۔“

ذکیہ خانم ایک لمحے کے لیے سن سی ہو گئی اور پھر اس نے اپنا پستول فرش پر پھینک دیا۔ ظمیر ریحان کے کہنے  
پر وہ میرے قریب آ کر کھڑی ہوئی۔ میں نے سر بیٹ لیا کہ اسے آج بے موقع آنے کی کیا ضرورت تھی۔ ظمیر  
ریحان نے غلط ہو کر ذکیہ خانم کے پستول پر قبضہ کر لیا۔ پھر وہ سابقہ پوزیشن پر کھڑا ہو گیا۔ اور حقارت آمیز لہجے  
میں بولا۔ ”سوئٹ بے بی! آج تم بہت اچھے وقت پر آئی ہو۔ میں تمہیں بھی ساتھ لے جاؤں گا۔ میں ایک مدت  
سے تمہارے لیے تڑپ رہا تھا۔ آج میری یہ حسرت بھی پوری ہو جائے گی۔“

”اور میں تمہاری موت کی آرزو میں تڑپ رہی ہوں۔“ ذکیہ خانم غرا کر بولی۔ ”ذلیل، میں تمہاری موت  
ہوں۔“

ظمیر ریحان نے ایک بھونچا سا قہقہہ لگایا۔  
”بکو اس بند کرو۔“ ذکیہ خانم غضب ناک ہو گئی۔

”تم اپنی چونچ بند رکھو تو بہتر ہو گا۔“ ظمیر ریحان نے پستول کو انگلیوں پر پھالتے ہوئے درشت لہجے میں کہا اور  
سرگم کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔ ”اب تمہارے کیا ارادے ہیں؟“

”تم آگ سے کھینچنے کی کوشش کر رہے ہو ظمیر!“ سرگم نے اسے سمجھایا۔ ”بتر ہے کہ تم چلے جاؤ۔“  
”مزا تو آگ سے کھینچنے میں ہے۔“ ظمیر ریحان نے ذکیہ خانم کی طرف دیکھ کر کہا۔

”تم یہاں کس لیے آئی تھیں؟“ سرگم نے سرد سے لہجے میں پوچھا۔  
”کرئل کو لے جانے کے لیے۔“ ذکیہ خانم نے جواب دیا۔

”اب تم اس کی لاش ہی لے جا سکتی ہو۔“ ظمیر ریحان حقارت سے بولا۔  
”ظمیر! بہتر ہے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔ اس قفس کو طول مت دو۔ ورنہ جو بات بنی ہوئی ہے وہ بگڑ جائے

”یہی سمجھ لو۔“

”تمہیں ندامت اور شرمندگی اٹھانا پڑے گی کیونکہ تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ تم اس بات سے اچھی طرح واقف ہو کہ میں اور ظہیر کسی قدر اثر اور رسوخ کے مالک ہیں۔“

”ہاتھ نکلن کو آری کیا۔ چل کر تسلی کرو۔ اپنے حسن و شباب کا اثر بھی دکھا دینا۔ مگر یہ سوچ لو کہ تمہارے سراپا کی بجلیاں وہاں کسی کو خاستر نہیں کر سکیں گی۔“

”کیا تم اسے اپنے ساتھ نہیں لے جاؤ گے؟“ ظہیر ریحان نے میری طرف اشارہ کیا۔

”نہیں۔“ کرئل نے جواب دیا۔ ”یہ ہمارا سیکرٹ ایجنٹ سکندر ہے جو تمہیں پہلے ہی دن سے بے وقوف بنا رہا ہے۔ یہ شخص اپنی یادداشت سے محروم نہیں ہوا۔ یقین نہ آئے تو اسی سے پوچھ لو۔“

سرگم نے چونک کر حیرت اور صدمے سے میرے طرف دیکھا تو میں نے اثبات میں سرلایا۔ ”کرئل اچ کر رہے ہیں۔ کاش! تم ایک اچھی عورت ہو تیں۔ پہلے ہی دن تمہارا مشن اور منصوبہ میرے علم میں آ گیا تھا۔“

سرگم نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت اور حقارت کی اتنی زہریلی چمک تھی کہ مجھے جھرجھری سی آگئی۔

کچھ دیر بعد سرگم اور ظہیر ریحان کو رسیوں سے جکڑ کر اسی لالچ میں ڈال دیا گیا۔ جہاں مشتاق موجود تھا۔ کرئل نے ذکیہ خانم، سونیا، عاصم اور مجھے وہیں رکھنے کے لیے کہا۔ پھر چند منٹ بعد لالچ روانہ ہوئی تو ہم ڈاک پر کھڑے اسے جانا دیکھتے رہے۔

لالچ خاصی دور جا چکی تھی۔ سردی شدید تھی۔ عاصم کے مشورے پر ہم اندر جانے کے لیے گھومے تھے کہ اچانک ایک زبردست دھماکہ ہوا۔ ہم نے تیزی سے گھوم کر دیکھا تو فضا میں لالچ کے پڑے اڑ رہے تھے۔ اس میں آگ لگ چکی تھی۔ لالچ جل رہی تھی۔



جو لرزہ خیز واقعہ پیش آیا تھا، اس کے بارے میں تو میں خواب و خیال میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا جو کچھ بھی ہوا، اس قدر اچانک اور غیر متوقع طور پر ہوا کہ اس نے ہم سب کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ ہم سکتے کے عالم میں کھڑے، پھٹی پھٹی ہوئی آنکھوں سے سمندر کی طرف دیکھ رہے تھے جس کے سینے پر آگ جل رہی تھی اور اس آگ میں ایسے گناہ گار جل رہے تھے، جنہوں نے نہ جانے کتنے گھروں کی تباہی کے منصوبے بنا رکھے تھے۔ ذکیہ خانم کی حالت سب سے خراب تھی۔ وہ شش کھا کر گر گئی۔ سونیا نے اسے سنبھالا اور ہم اسے اندر لے آئے۔ کلنی دیر بعد اس کی حالت قدر سنبھلی تو وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی ”کرئل کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کاش! وہ ان لوگوں کو قانون کے حوالے کر دیتے۔“

”کرئل نے اپنے ضمیر کی آواز پر عمل کیا۔“ عاصم نے ہماری لمبے میں کہا ”خیر! خدا کو یہی منظور تھا۔“ سب ہی باتیں کر رہے تھے۔ اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے لیکن میرے خیالوں کو شرمندہ اظہار ہونے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ موقع ملا بھی تو شاید میں انہیں کسی پر ظاہر نہ کرتا۔ اس واقعہ کا مجھ پر گہرا اثر ہوا تھا۔ سرگم ایک بے وقوف عورت تھی۔ میرے ملک کی دشمن تھی۔ خود میرے خون کی بھی پیاسی تھی لیکن میرا دل اس کے

نے ظہیر ریحان کو کلا شکوف کی نال سے دھکا دیا تو وہ لڑکھڑاتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس نے پلٹ کر کرئل نجیب کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ”کرئل! تم؟ تم زندہ ہو تم زندہ کیسے بچ گئے۔ تمہیں تو سرگم نے...“

”قدرت کے کھیل نزاع ہیں...“ کرئل نجیب کہنے لگا۔ ”مجھے سونیا اور عاصم نے ایک نئی زندگی دی اور مجھے اندھیرے میں روشنی بھی دکھائی۔ اگر یہ دونوں بروقت طبی امداد نہ پہنچاتے تو آج میں زندہ نہ ہوتا۔ قدرت نے مجھے نئی زندگی شاید اسی لیے دی ہے کہ میں اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر سکوں میں کتنا بد نصیب اور احمق تھا کہ غیروں سے اپنے ملک کا سودا کر لیا۔ مگر اس میں مجھ سے زیادہ میرے مطلق بیوی سرگم کا قصور ہے۔ اس نے مجھے درغلا یا، بھکایا اور لالچ دیا۔ غداری اور وطن فروشی پر اکسلیا۔ یہ سب کچھ اس نے اس لیے کیا کہ ایک غیر ملکی ایجنٹ ہے۔ اس عورت نے ایک منصوبہ بنایا۔ اس منصوبے کے تحت مجھے اسے طلاق دینا پڑی۔ کامیاب سازش اور اقتدار اعلیٰ کے لیے قربانیاں دینا پڑتی ہیں اس لیے میں نے اسے طلاق دے دی۔ پھر میں نے اپنے محب وطن بھائی کو قتل کرنے کی بجائے قید کر دیا۔ اس کی جگہ اس کے ایک ہم شکل شخص کو لایا گیا۔ مگر تم نے اپنے غیر ملکی آقا کے اشاروں پر میرا منصوبہ تباہ کر دیا ظہیر! انہیں مجھ پر شک ہو گیا تھا کہ میں اپنے وطن سے غداری کرنے پر آمادہ نہیں ہوں پھر یہ پروگرام بنایا گیا کہ اس ملک کے ایٹمی مرکز کو تباہ کر دیا جائے۔ میں سرگم کو سمجھانے گیا تو اس نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی بہر حال، اب میں اس ناپاک سازش کو کامیاب ہونے نہیں دوں گا۔“

کرئل نجیب خاموش ہوا تو سونیا بولی۔ ”سرگم! کرئل نیاز اور مجھ بھی زندہ ہیں۔“ سرگم نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ پتھری کی مورچی بنی کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ کفن کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ اس کے بدن میں جیسے جان ہی نہیں رہی تھی۔ وہ صرف سن رہی تھی اور پھرانی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ یوں چپ تھی، جیسے اس کی قوت گویائی چھین لی گئی ہو۔

”ظہیر اور سرگم! میں تم دونوں کو ساتھ لے جانے آیا ہوں۔“ کرئل نجیب نے کہا۔ ”کرئل!“ سرگم چونک کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ میں غیر ملکی ایجنٹ ہوں؟“

”میں جانتا ہوں کہ تم ماماہری سے کہیں زیادہ ہوشیار، چالاک اور عیار ہو۔ تم سرلا دیوی ہو۔ سیکرٹ ایجنٹ ہو۔ کیا تمہیں اس سے انکار ہے؟“

”جو تمہارے جی میں آئے کہہ لو۔“ سرگم نے تلخی سے جواب دیا۔ ”یہ میں نے نہیں بلکہ تمہارے پاس مشتاق عرف گھنٹام نے بتایا ہے۔ جو سونیا اور عاصم کی قید میں ہے۔ وہ اس وقت اس لالچ میں پڑا ہے جسے میں ساتھ لے کر آیا ہوں۔“

”تم نے اسے جبر و طاقت سے گھنٹام بنایا اور مجبور کیا ہو گا کہ میرے خلاف بیان دے۔“ ”باتیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم دونوں کو میرے ساتھ چلانا ہو گا۔“ کرئل کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ”تم ہمیں زبردستی نہیں لے جا سکتے۔“ وہ مل کھا کر بولی۔

”ضد مت کرو! ورنہ باندھ کر لے جاؤں گا۔“ کرئل نے کلا شکوف لہراتے ہوئے کہا۔ ”تم ہمیں کہاں لے جانا چاہتے ہو؟ قانون کے حوالے کرنا چاہتے ہو؟“ ظہیر ریحان نے خشک ہونٹوں پر زبان

لے دکھ رہا تھا۔ اس نے مجھے زندگی اور جذبات کے ایک نئے جہاں سے آگاہ کیا تھا۔ وہ میری بیوی تھی اس نے مجھ سے فرضی محبت کا ڈھونڈ رکھا تھا لیکن اس میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے کبھی کبھی عورت بھی بن جایا کرتی تھی۔ تب وہ بھول جاتی تھی کہ وہ ایک جاسوس ہے اس کا اپنا ایک مشن ہے۔ ایک ایسا مشن جو محبت نہیں بلکہ نفرت کرنا سیکھاتا تھا۔ نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا تھا کہ مشن کی تکمیل کے بعد وہ مجھے قتل نہ کرتی.... بلکہ ساتھ لے کر کسی دور ملک چلی جاتی جہاں وہ اپنے گھناؤ نے ماضی کا ازالہ کرنے کے لیے صرف میری بن کر زندگی گزار دیتی.... یہ ایک خواب تھا۔ ایک آس تھی.... اور میں یہ دل سے نکال کر اسے پھر سے دیران نہیں کرنا چاہتا تھا یہی وجہ تھی کہ میں نے اپنے لبوں پر خاموشی کا بھاری قفل لگا لیا اور چپ رہا۔

اگلے روز میں اپنے گھر آیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں ایک طویل خواب دیکھنے کے بعد بیدار ہوا ہوں۔ میں بہت کچھ کھو کر بہت کچھ پا کر آیا تھا۔ جی میری طویل غیر حاضری سے بہت پریشان تھا وہ روزانہ میرے گھر کا چکر لگاتا رہا اور اس صبح مجھے گھر میں موجود پا کر خوشی سے کھل اٹھا۔ میں نے اسے حالات سے آگاہ کیا تو وہ انگشت بدنداں بیٹھا سنتا رہا پھر ایک طویل سانس لے کر بولا "سکندر بھائی! تم تو واقعی سکندر اعظم بن کر رہ گئے تھے۔"

"ہاں یار.... لیکن میں ایک ایسی چیز مار کر آیا ہوں جو زندگی بھر کسی کانٹے کی طرح میرے دل و دماغ میں چبھتی رہے گی" میں نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے جواب دیا۔

"تمہیں آرام کی ضرورت ہے" وہ محبت سے بولا۔ "بلکہ میرے خیال میں تو تمہیں ایسے ماحول کی ضرورت ہے۔ جہاں کھو کر ماضی کی ان باتوں کو بھولنے میں مدد مل سکے"

"میں اپنے گھر پر ہی آرام کروں گا"

وہ کچھ دیر بیٹھا رہا پھر شام کو آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ میں دن پھر بسزیر لیٹا، سرگم کے خیالوں میں کھویا رہا۔ خیالوں میں گزرے ہوئے لمحے مصور ہو کر سامنے آتے تو میں ان کے لطف و لذت میں ڈوب جاتا۔ معلوم نہیں سرگم نے مجھ پر کونسا جادو کر دیا تھا کہ اس کا سحر ابھی تک نہیں ٹوٹا تھا۔ میں اس ظلم کا امیر ہو کر رہ گیا تھا۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ سرگم مریچک ہے اور وہ دوبارہ کبھی میری زندگی میں نہیں آسکتی.... بعض اوقات ایک بھولی بری اور موبوم سی آواز میرے دل کے کسی چور دروازے پر پہنچ کر دستک دینے لگتی کہ سرگم نہیں مر سکتی وہ زندہ ہے۔ وہ بڑے مضبوط اعصاب کی عورت ہے۔ ذہین ہے۔ حسین ترین ہے۔ بھلا ایسی عورتیں بھی اس آسانی سے ہلاک ہوا کرتی ہیں؟

وہ اس دھماکے سے بچ نکل ہوگی۔ تیرتی ہوئی ساحل پر پہنچ گئی ہوگی اور اب وہ کسی بھی دن کسی بھی لمحے میرے دروازے پر آ جائے گی۔ میرے کان آہٹوں پر لگ جاتے اور میں دن بھر اپنے آپ کو دھوکا دیتا اور اس کا انتظار کرتا رہتا۔ اس صورت حال نے مجھے بالکل مجنوں بنا کر رکھ دیا تھا۔ جی آتا تو میری حالت پر افسوس کرتا مجھے سمجھاتا اور کہیں باہر لے جانے کی پیش کش کرتا لیکن میں اس سے مس نہیں ہوتا مجھے سرگم کا انتظار تھا۔ لہذا میں گھر سے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں جانا چاہتا تھا۔

ایک روز وہ بہت خوش خوش آیا اور بولا۔ "سکندر بھائی! اب اٹھ جاؤ میں تمہیں لینے آیا ہوں"

میں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹوں کا ایک طوفان تھا۔ مسکراہٹ کی ایک لہر ختم نہیں ہوتی تھی کہ یوں کی لرزش

سے دوسری مسکراہٹ نمودار ہو جاتی تھی۔

"تم جانتے ہو کہ میں کہیں نہیں جاؤں گا" میں نے اپنی سوالیہ نظروں کے جواب میں اسے خاموش پا کر کہا۔

"میں جانتا ہوں کہ تم ضرور جاؤ گے۔"

"کہاں؟" میں نے بے اختیار پوچھا۔

"حیدر آباد.... اور کہاں۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

"مطلب صاف ہے۔ میری شادی میں شرکت نہیں کرو گے؟" اس نے دھماکا کر دیا۔

"اوہ.... تو وہ لوگ تمہیں رشتہ دینے پر آمادہ ہو گئے۔" میں بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ جی میرا جگر یار میرا بھائی میرا سایہ تھا۔ اس کی خوشی تھی میں اس کی خوشیوں میں اپنا غم بھول گیا اور چلنے کے لیے آلودگی ظاہر کر دی۔

جی کی شادی کے ہنگامے میں مجھے سرگم کی یاد نے زیادہ نہیں ستایا۔ رفتہ رفتہ اب مجھے بھی یہ احساس ہو گیا تھا کہ اگر میں یوں ہی خوابوں میں ڈوبا رہا تو میری حیثیت کسی چلتی پھرتی لاش جیسی ہو کر رہ جائے گی۔ شادی میں جی کے دور دراز کے عزیزوں اور رشتے داروں نے بھی شرکت کی تھی۔ اس نے مجھے ان لوگوں سے اپنے بھائی کی حیثیت سے متعارف کرایا تھا اس لیے وہ لوگ مجھ سے بہت جلد کھل مل گئے.... اور میں جو برسوں سے اپنوں کو ترس گیا تھا اس اپنائیت کی چاشنی میں ڈوب کر رہ گیا۔

شادی میں شریک ہونے والوں میں جی کا ایک دور کا انکل، بشیر بھی شامل تھا۔ مجھے اس شخص میں خاص طور پر دلچسپی محسوس ہوئی۔ وہ بھی مجھ سے اس قدر مانوس ہو گیا کہ میں اس پھوٹی سی ملاقات میں ہی اسے اپنا حقیقی انکل سمجھنے لگا۔ انکل بشیر کی شخصیت میں عجیب سا سحر تھا۔ وہ کئی سال افریقہ میں گزار کر آیا تھا۔ اور اب اس نے اندرون سندھ ایک ویرانہ آباد کر رکھا تھا۔ وہاں اس کی حویلی تھی اور وہ نوابوں کی طرح زندگی بسر کر رہا تھا۔

اس نے مجھے اپنے ساتھ چلنے اور کچھ دن حویلی میں قیام کرنے کی دعوت دی تو جی نے فوراً اس کی حمایت کر دی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ میرے سرے سرگم کا بھوت اتارنے کے لیے مجھے انکل بشیر کے ساتھ بھیجتا چاہتا ہے۔ خود میں بھی واپس کراچی جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس لیے انکل بشیر کی دعوت قبول کرنے میں کوئی عار محسوس نہ ہوا۔ شادی کے تیسرے ہی روز انکل بشیر چلے گئے۔ جبکہ میں نے دو روز بعد میں آنے کی حالی بھری تھی۔ میں ابھی جی کے قریب رہنا چاہتا تھا۔ شادی کے بعد جی کو اپنی دلن سمیت واپس کراچی چلے جانا چاہیے تھا.... لیکن کراچی میں وہ تنہا تھا اس لیے اپنے عزیزوں میں چند روز مزید قیام کی غرض سے رک گیا تھا۔ پھر دھماکا اور دھماکا نے پنجاب اور پونھوار کے پھاڑی علاقوں میں جی مومن منانے کا پروگرام بنالیا۔ وہ حیدر آباد سے روانہ ہوئے تو میں بھی انکل بشیر کے ہاں جانے کے لیے تیار کیے گئے۔

ایک چھوٹے سے غیر معروف اسٹیشن پر گاڑی سے اتر کر میں نے ادھر ادھر نگاہ ڈور لی تو یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوا کہ کوئی بھی مجھے لینے نہیں آیا تھا۔ انکل بشیر اگر خود نہیں آ سکتا تھا تو اسے کسی نہ کسی ملازم کو ضرور بھیج دینا چاہیے تھا۔ میں اسٹیشن سے باہر آیا تو ایک صدیوں پرانا یکہ دکھائی دیا۔ کوچوان شاید اپنے نانگے سے بھی زیادہ قدیم تھا۔ میں نے بوڑھے کوچوان سے پوچھا۔ "کیوں پاپا! تم نے بشیر صاحب کی حویلی دیکھی ہے؟"

اس نے جواباً ایک طویل سرد آہ بھری۔ "نہیں، ہم غریبوں کو بھلا وہاں کون گھسنے دیتا ہے۔"



”اند رے نہیں‘ باہر سے تو دیکھی ہے‘ حویلی؟“ میں نے اس کی غلط فہمی اڑان پر چیں یہ جہیں ہو کر کہا۔  
”ہاں... باہر سے تو روزانہ دو ٹائم دیکھتا ہوں۔“ اس نے جواب دیا ”ایک بار گھر سے آتے ہوئے اور  
دوسری بار جاتے ہوئے۔“

”کیا تم مجھے اس حویلی تک پہنچا سکتے ہو؟“

”کیوں نہیں سائیں! بیٹھو“ اس نے فوراً آمادگی ظاہر کر دی۔

میں ٹانگے میں بیٹھ گیا تو کوچوان نے گھوڑے کو چلنے کا اشارہ دیا... مگر گھوڑا بھی شاید اس بوڑھے کی رفاقت  
میں فلسفی ہو گیا تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا کھڑا رہا... یا پھر شاید اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ بوڑھے کوچوان کو  
واقعی کوئی سواری مل گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس اسٹیشن پر آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔  
کوچوان بہت دلچسپ اور باتوں آدنی تھا جوں ہی اسے یہ معلوم ہوا کہ میں انکل بشیر کا مہمان ہوں‘ اس کی  
تعریف میں زمین آسمان ایک کر دیئے۔ اس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ انکل بشیر اس علاقے میں کافی مقبول  
ہے۔

راتے میں مجھے بجلی کی تار پر ایک خوبصورت پرندہ نظر آیا۔ میں نے زندگی میں بے شمار پرندے دیکھے تھے مگر  
وہ تو بالکل نئی قسم کا پرندہ تھا۔ کوچوان نے مجھے حیران دیکھا تو کہنے لگا کہ یہ اور اس جیسے بے شمار پرندے انکل بشیر کے  
ہاں موجود ہیں ”ملک ملک کے پرندے اور جانور جمع کرنا ان کا مشغلہ ہے۔ ان میں کچھ تو بہت ہی نایاب قسم کے  
پرندے ہیں۔“

تاہم حویلی کے پھانک میں داخل ہوا تو کوچوان کی باتوں کی تصدیق ہو گئی۔ عجیب عجیب جانور اور پرندے دیکھ  
کر میں واقعی مبسوت ہو گیا۔ حویلی کے بیرونی برآمدے کی سیڑھیوں پر انکل بشیر میرے استقبال کو بہ نفس نفیس  
موجود تھے۔ وہ کوئی چالیس پینتالیس برس کا ہو گا۔ چہرے سے بھولا اور رحمدل نظر آتا تھا۔ اس وقت اس نے  
سفید سلک کالہاس پہنا ہوا تھا۔ منہ میں لمبا سا سگار دبا رکھا تھا۔ اس حسیسے میں وہ افریقہ کا کوئی کاشت کار لگ رہا  
تھا۔

”دیکھو بیگم“ اس نے اپنی پشت پر کھڑی پتلی دہلی عورت کو مخاطب کیا ”میرا مہمان آگیا۔“ اس نے باہیں پھیلا  
کر مجھے آغوش میں لیتے ہوئے کہا۔ ”خوش آمدید“ تمہیں دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ میں تو سمجھا کہ تم نہیں آؤ  
گے۔“

”اس ذرہ نوازی کے لیے میں تمہ دل سے ممنون ہوں“ میں نے مسکرا کر کہا۔ اس کی گرم جوشی نے میری  
طبیعت خوش کر دی۔ ”اُجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس کے برخلاف اس کی بیگم کے روپے میں سرد مری تھی۔  
جیسے وہ میری آمد سے خوش نہ ہو۔ انکل بشیر کے اشارے پر اس نے مجھے سلام کیا اور پوچھنے لگی کہ مجھے سفر میں کوئی  
تکلیف تو نہیں ہوئی۔ مگر اس کی آنکھیں... آنکھیں یہ کہہ رہی تھیں۔“ مجھے تمہارا سماں آنا پسند نہیں آیا... فوراً  
چلے جاؤ یہاں سے...“

وہ اپنے لیے میں افریقہ کی رہنے والی لگ رہی تھی۔ میں نے اس کی سرد مری کو یہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا کہ  
یہاں کی ٹھنڈی آداب سے ناواقف ہے۔ مگر نہ جانے کیوں مجھے مجھے بار بار یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے گھر  
میں میرا وجود ایک لمحے کو بھی براہوش کرنے کے لیے تیار نہیں لیکن مجھے تو انکل بشیر سے دلچسپی تھی اس لیے میں  
نے اس کے نازیبا رویے پر خاموشی ہی مناسب سمجھی۔ انکل بشیر بلاشبہ میری آمد پر بہت خوش تھا۔ اس نے میرے

لے ایک آرام دہ کمرے کا انتظام کیا تھا۔

میرے لیے تیار کیا جانے والا کھانا بہت ہی شاندار تھا۔ دسترخوان طرح طرح کے لذیذ اور مرغین کھانوں سے بچا  
ہوا تھا۔ کھانے کے بعد اس نے مجھے انتہائی نفیس قسم کی کٹنی پلائی اور خوشبودار سگار میری طرف بڑھاتے ہوئے  
بولی۔ ”یہ کٹنی جو ابھی آپ نے پی ہے میری افریقی زمینوں پر کاشت ہوتی ہے۔ اس سگار کا تباکو بھی وہیں پیدا کیا گیا  
ہے۔“

اس کی دلچسپ باتوں اور سحر انگیز شخصیت سے میں پوری طرح متاثر ہو چکا تھا۔ اس کی ظاہری خوش مزاجی کے  
باوجود میں نے اندازہ لگایا کہ وہ درحقیقت بہت سخت گیر قسم کا آدمی ہے۔ دوسری صبح مجھے اس کا بیوت بھی مل گیا۔  
اس کی بیگم نے اچانک ہی میرے خلاف جارحانہ رویہ اختیار کر لیا۔ صبح ناشتے کے بعد اس کا شوہر کمرے سے باہر چلا  
گیا تو اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ ”دن میں حیدر آبلو وہاں ہی کے لیے ایک گاڑی سولہارہ  
بجے جاتی ہے۔“

”لیکن میرا جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔“ میں نے دو ٹوک لہجے میں جواب دیا۔ میں اتنی آسانی سے اس عورت  
کے آگے ہتھیار نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔

”اگر آپ کی یہی مرضی ہے...“ اس کا انداز عجیب تھا۔

”مجھے یقین ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں بوجھ بننے لگوں گا تو انکل بشیر مجھے خود ہی رخصت کر دیں گے۔“  
”ارے... ارے... یہ آپ سے کس نے کہہ دیا۔“ انکل بشیر اچانک ہی آگیا اور شاید اس نے میرا آخری  
جملہ بھی سن لیا تھا۔ اس نے خاموشی سے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی پھر اپنی بیگم کی طرف دیکھا۔ اور شاید ہمارے چہروں  
سے اس نے ہمارے مابین ہونے والی باتوں کا بھی اندازہ لگایا۔ ہر وقت مسکرانے والا معصوم سا چہرہ ایک دم سرخ  
انگاہ ہو گیا۔ آنکھوں سے چند گاریاں سی نکلتی لگیں۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے اس نے مجھ سے  
کہا۔ ”سکندر صاحب! اگر زحمت نہ ہو تو آپ کچھ دیر باہر ٹھل آئیے۔“

میرے نکلنے ہی اس نے دروازہ بند کر لیا۔ میں نے سنا کہ وہ دہلی آواز میں اپنی بیگم کو ڈانٹ رہا تھا۔  
مجھے بلاوجہ کسی کی باتیں سننے کا شوق نہیں چنانچہ میں ٹھٹھا ہوا لان میں نکل آیا۔ یکایک مجھے کسی کے دوڑتے  
ہوئے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ حراتو انکل بشیر کی بیگم کو سامنے پایا۔

”میرے شوہر نے حکم دیا ہے کہ میں آپ سے معافی مانگوں۔“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

اس کا چہرہ زرد پڑ چکا تھا اور آنکھیں آنسوؤں سے لبرز تھیں۔

”خدا را! اس سے زیادہ کچھ مت کہئے گا بیگم صاحبہ!“

”تم انتہائی احمق ہو۔“ اس نے نفرت سے پھنکارتے ہوئے کہا۔ پھر اپنی اڑیوں پر گھومی اور دوڑتی ہوئی حویلی  
میں گم ہو گئی۔

میں ہکا بکا کھڑا دیکھتا رہ گیا۔

میں اس وقت بھی خاموش ہی تھا جب انکل بشیر مجھ سے آگیا۔ ”مجھے یقین ہے کہ بیگم نے اپنے پاگل بہن کی  
معافی مانگ لی ہوگی۔“

”جج... جی ہاں...“ میں اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر لان میں ٹھٹھتے ہوئے کہا ”مجھے یقین ہے کہ آپ اس بات کا اثر نہیں لیں

ہمارے اس بلے نے انسانی خون نہیں پیکھا.... مگر جس روز ایسا ہو گیا، سمجھ لیجئے یہ انتہائی خطرناک ہو جائے گا۔ وہ میرے سوا کسی کو اپنے کمرے میں نہیں آنے دے گا۔ حتیٰ کہ رامن بھی جو اس کا نگران ہے، اس کی ہمت نہیں کر سکتا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے۔ تو میں اس کی ماں بھی ہوں اور باپ بھی...."

میری حیرت اور خوف کی انتہا نہ رہی جب وہ باتیں کرتے کرتے اچانک ہی دروازہ کھول کر اندر گھس گیا۔ اور ساتھ ہی اپنے پیچھے دروازہ بند کر گیا۔

انگل بشیر کی آہٹ پر بلے نے سر اٹھایا۔ پھر اپنے مالک کو سامنے پا کر محبت سے دم ہلاتے ہوئے اپنا سرا اس کے پیروں پر رگڑنے لگا۔ خوف سے میرا بدن سرد پڑ گیا۔ سر سے دم تک اس کی لمبائی کسی طرح بھی گیارہ فٹ سے کم نہیں تھی۔ اونچائی چار فٹ کے قریب ہوگی۔

"چلو نام۔ اپنے بچرے میں جاؤ۔" انگل بشیر نے اسے حکم دیا۔

حکم پاتے ہی ہماری بھر کم بلا کمرے کے ایک کونے کی طرف بڑھا، جہاں ایک بڑا سونوادی بنجرہ بنا ہوا تھا۔ انگل بشیر باہر نکل آیا۔ اس نے باہر گئے ہوئے پہیے کا ہینڈل گھمایا دیوار سے موٹی موٹی سلاخیں نمودار ہوئیں اور انہوں نے بنجرے کا دہنہ بند کر دیا۔ اس نے دوبارہ کمرے کا دروازہ کھولا اور مجھے بھی اپنے پیچھے لے چلا۔ کمرے میں گھستے ہی مجھے تیز دبو کا بھینکا محسوس ہوا۔

"میں اسے رات کو بنجرے میں بند کر دیتا ہوں اور دن میں کھول دیتا ہوں کمرے میں گھوم پھر کر اس کی تھوڑی سی ورزش ہو جاتی ہے۔"

میں نے ہمت کر کے محبت کے اظہار کے طور پر بنجرے کی سلاخوں میں سے ہاتھ بڑھایا تاکہ اس کے سر پر پھیر سکوں۔ مگر انگل بشیر چیخا پڑا۔

"کیا غضب کر رہے ہیں آپ؟ یہ آپ کا ہاتھ چباز لے گا۔"

"میں نے گھبرا کر ہاتھ ہٹا لیا۔"

بلے نے اب دھیرے دھیرے غرانا شروع کر دیا تھا۔

"جب ہو چاؤ نام.... تمہارا کھانا آتا ہی ہو گا۔ انگل بشیر نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔"

بلا اب بے چینی سے بنجرے میں ادھر ادھر ٹھل رہا تھا۔ ایک سیاہ پناز تھا۔ جو متحرک تھا۔ اس کی سرخ سرخ آنکھیں اور نوکیلے دانت دیکھ کر مجھے جھرجھری سی آگئی۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کا گھراں ایک بڑی سی کشتی میں پکا گوشت لے کر آگیا۔ بنجرے کی سلاخوں سے جیسے ہی کشتی اندر کھسکی گئی۔ بلا اسے گھسیٹا ہوا بنجرے کے ایک سرے تک لے گیا۔ وہاں اطمینان سے بیٹھ کر اس نے دونوں پنجوں میں بڑے بڑے پارچے دباے اور انہیں بہنہ بھوننے لگا۔ گاہے گاہے وہ غرا کر ہم لوگوں کی طرف دیکھ لیتا تھا۔

"آپ کو میرے شوق پر حیرت تو نہیں ہو رہی؟" انگل بشیر نے پوچھا۔ "میں نے اس پر ہمت محنت کی ہے جنوبی افریقہ سے اسے یہاں تک لانا اور اس کی پرورش کرنا مذاق نہیں تھا۔ کراچی اور لاہور کے چڑیا گھر والے میرے پیچھے بڑے ہوئے ہیں کہ میں یہ بلا ان کے حوالے کر دوں۔ مگر اب میں اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا۔ آئیے جلیں۔ میں نے آپ کا خلاص وقت خراب کیا ہے۔ ہمیں بھی اب نام کی طرح کھانا کھالینا چاہیے۔"

انگل بشیر اپنی زمینوں اور اپنے مشاغل میں اس قدر غرق تھا کہ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ شاید ہی کسی اور چیز میں دلچسپی لیتا ہو گا۔ مگر جلد ہی میرے اس خیال کی تردید ہو گئی نہ جانے کہاں سے روڑا نہ کئی کئی خطوط آتے، جنہیں وہ

گئے۔ اگر آپ نے اپنے قیام میں ایک گھنٹے کی بھی کمی کی تو مجھے سخت صدمہ ہو گا مجھے قریبی عزیزوں میں مغلزت بری لگتی ہے۔ میں حیران ہوں کہ یکم آپ سے فحاشیوں ہیں۔ دراصل وہ اپنے اور میرے درمیان کسی بھی عورت یا مرد کا وجود برداشت نہیں کر سکتیں۔ ان کا بس چلے تو مجھے کسی غیر آباد جزیرے پر لے جائیں۔ جہاں ان کے اور میرا کوئی نہ ہو۔ یہ پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ جانتے ہوئے آپ کو ان سے کوئی شکایت نہیں رہتی چاہئے۔ مجھے یقین ہے کہ اب آپ اس سلسلے میں زیادہ نہیں سوچیں گے۔"

"ارے نہیں.... بالکل نہیں" میں نے مسکرا کر اسے یقین دلایا۔

"تو پھر یہ سگار چلائیے اور آئیے میرے ساتھ میں آپ کو اپنا زندہ عجائب خانہ دکھاؤں۔"

عجائب خانے کی سیر کرتے کرتے شام ہو گئی۔ ایک بات مانی پڑتی ہے کہ اس شخص نے اپنے شوق کو انتہا تک پہنچا دیا تھا۔ سینکڑوں قسم کے پرندے اور درندے تھے جو اس نے جمع کر رکھے تھے اور سب ہی غلاب تھے وہ ان جانوروں اور پرندوں کو پکڑنے کے قسے سناتا رہا۔ جب کوئی پرندہ اسے دیکھ کر چھمکانا کوئی جانور اچھل کود کرتا تو وہ چھوٹے بچوں کی طرح خوشی سے قہقہے مارنے لگتا۔ آخر کار وہ مجھے ایک طویل برآمدے کی طرف لے چلا جو حویلی کے بالکل سرے پر تھا۔ برآمدے کے باہر ایک وزنی آہنی دروازہ تھا۔ دروازے کے پھونچ ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی جو اتنی چھوٹی تھی کہ اس میں سے صرف جھانک کر ہی دیکھا جاسکتا تھا۔ دروازے کے برابر ہی ایک بڑا سا فولادی ہینڈل ایک پہیے میں نصب تھا۔ اس پورے راستے کو موٹی موٹی آہنی سلاخوں سے بند کر دیا گیا تھا۔

"اب میں آپ کو اپنے عجائبات میں سے سب سے اچھوتا اور سب سے قیمتی نمونہ دکھانے والا ہوں پورے ملک میں اس جیسا ایک ہی جانور ہے۔ یہ افریقہ کا غلاب ترین بلا۔" اس نے کہا۔

"اس میں اور دو سرے بلوں میں کیا فرق ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ دیکھیں گے تو خود ہی سمجھ لیں گے۔" وہ شرارتا مسکرایا "آئیے ذرا اس چھوٹی سی کھڑکی سے جھانک دیکھیں۔"

میں نے اندر جھانکا۔ وہ ایک بہت بڑا کمرہ تھا۔ جس میں اوپر سے نیچے تک پتھر کی سلیں جڑی ہوئی تھیں ایک طرف دیوار میں ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی جس میں لوہے کی مضبوط سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ کمرے کے درمیان وہ بلا لیٹا ہوا تھا۔ مگر.... میرے خدا!.... اسے بلا کتنا سرا سرائانی تھی۔ وہ حساست میں بڑے سے بڑے شیر سے بھی زیادہ تھا۔ اس کا رنگ گہرا سیاہ تھا اور رنگت میں عجیب سی چمک تھی۔ درندگی، طاقت اور عجیب سے سحر انگیز سراپے مجموعہ وہ بلا اتنا غیر معمولی تھا کہ اس سے نظریں ہٹاتے نہیں ہٹتی تھیں۔

"کسے کیا خیال ہے؟" میرے میزبان نے فخریہ انداز میں پوچھا۔

"لا جواب! حقیقت یہ ہے کہ میں نے پہلے کبھی اتنا شاندار جانور نہیں دیکھا۔"

"کچھ لوگ اسے سیاہ پیتا بھی کہتے ہیں مگر درحقیقت یہ بلا ہی ہے۔ چار سال قبل یہ بالکل چھوٹا سا تھا۔ افریقی جنگل میں کچھ لوگوں نے اس کی ماں کو ہلاک کر کے اسے پکڑا تھا۔ اس کی ماں نے وہاں دس بارہ آدمیوں کو پھاڑ کھالیا تھا۔"

"لوہ کیا یہ آدم خور ہے؟"

"دنیا میں اس سے ظالم اور انسانی خون کا پیاسا کوئی جانور نہیں ہو گا۔ آپ افریقہ میں بس اس بلے کا ذکر کر دیجئے اور پھر دیکھیں کہ لوگ کتنے خوفزدہ ہوتے ہیں۔ یہ جانوروں سے زیادہ انسانوں کا شکار پسند کرتا ہے۔ ابھی تک

خودی وصول کرتا تھا اور ایسی بے نالی کے ساتھ پڑھتا جیسے اسے کسی خاص خبر کا انتظار ہو۔ غالباً اشاک ایسی ہی کچھ چکر تھا۔ یا پھر ہو سکتا ہے کہ اس نے باہر کوئی بڑا کاروبار کر رکھا تھا۔ اور وہ کسی بڑی خبر کا منتظر تھا۔ بہر حال میرے وہاں چھ روزہ قیام کے دوران روزانہ سات آٹھ خطوط آتے رہے۔

یہ چھ دن میرے لیے بڑے آرام و اطمینان کے دن تھے۔ اس دوران میں سرگم کو بالکل ہی بھول گیا تھا۔ اور میرے منتشر اعصاب بے حد پرسکون ہو گئے تھے۔ انکل بشیر نے بھی میری ممان نوازی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ وہ مجھ سے خاصا بے تکلف بھی ہو گیا تھا۔ ہر رات کھانے کے بعد ہم نشست گاہ میں جا بیٹھے۔

وہ مجھے جنوبی افریقہ میں گزری ہوئی سمائی زندگی کے عجیب عجیب قصے سناتا۔ بعض واقعات تو اتنے سنسنی خیز تھے کہ مجھے ان واقعات میں اور انکل بشیر جیسے پست قد آدمی میں کوئی مماثلت ہی نظر نہ آتی جواب میں میں اسے کراچی کے قصے سناتا۔ وہاں کی مصروف زندگی، چمپ پھل اور رونقوں کا ذکر کرتا۔ البتہ اپنے ہاتھ کی صفائی والے کارنامے اپنی ذات تک ہی محدود رکھتا تھا۔ آخر اپنے قیام کے ساتویں دن، میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس سے جانے کی اجازت طلب کر لینی چاہیے۔ چنانچہ میں نے نہایت محبت سے اس کی ممان نوازی کا شکریہ ادا کیا اور درخواست کی کہ اب مجھے واپس جانے کی اجازت دے دی جائے۔ وہ خاموشی سے سگار کے کش لیتا رہا اور سب کچھ سنتا رہا آخر بولا۔۔۔۔۔

”ایسی بھی کیا جلدی ہے کچھ دن تو اور ٹھہرتے۔“

میں نے کاروباری مصروفیت کا بہانہ کر کے واپسی کا اصرار کیا تو اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

میرے قیام کے پورے عرصے میں اس کی بیگم کارویہ بدستور دیباہی تھا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے نفرت دن بدن بڑھتی ہی چلی گئی۔ شوہر کے خوف سے وہ اس کا کھل کر تو انتظار نہ کر سکتی تھی مگر اب وہ جان بوجھ کر میرے قیام کو تکلیف دہ بنانے کی کوششوں میں لگی رہتی تھی۔ آخری دن تو اس کا رویہ اتنا ہلکا آہستہ ہو گیا کہ مجھے شک ہوا کہ میں اس کا دماغ تو خراب نہیں ہے۔

اس روز معمول سے زیادہ خطوط آئے تھے۔ رات کے کھانے کے بعد انکل بشیر اپنی لائبریری میں گھسا تو آدمی رات گزرنے کے بعد برآمد ہوا۔ تمام ملازم اور اس کی بیگم کبھی کی سوچتی تھی۔ میں نے سنا۔ وہ دروازہ بند کر رہا تھا۔ یہ اس کا معمول تھا کہ ہر رات کو سونے سے پہلے گھر کے سارے دروازے خود بند کرتا تھا۔ پھر وہ نشست گاہ میں آیا، جہاں میں اس کا بچہ چینی سے شکر تھا۔ وہ آرام کرسی پر بیٹھا تو میں نے دیکھا اس کے ہاتھ میں لمبا سا سگار دیا ہوا تھا۔

”تو بے ہے۔۔۔۔۔ کیسی وحشت ناک رات ہے۔“ وہ بڑبڑایا۔

رات واقعی وحشت ناک تھی۔ باہر زوروں کا طوفان آیا ہوا تھا۔ بدست ہوا چیخ چنگھاڑتی پھر رہی تھی۔ بارش اور طوفان کی وجہ سے کمرکیاں اور دروازے آپ ہی آپ بچ رہے تھے۔

لیپ کی زرد روشنی اور سگار کے دھوئیں نے کمرے میں عجیب سا ماحول پیدا کر دیا تھا۔

”ہاں میرے بھائی! یہ رات ہماری ہے۔ اب مجھے تفصیل سے۔۔۔ شاید آخری رات۔۔۔ مجھے اپنے بارے میں اور بتاؤ۔“

میں نے اپنی داستان شروع کر دی۔ وہ جذبات سے عاری چہرے لیے غلامیں گھورتا رہا۔ اس وقت اس کا ذہن کہیں اور تھا۔ میری باتیں تو شاید وہ سن ہی نہیں رہا تھا۔ اس بات سے مجھے بڑی کوفت ہوئی۔ جب میں سب کچھ سنا

پاکت مار نے اپنا سگار آتش دان میں پھینک دیا۔

بڑے کمرے میں گھڑی نے ایک بجے کا ٹھنڈ بجایا تو وہ چونک پڑا۔ ”ارے ایک بج گیا۔۔۔۔۔ خاصی دیر ہو چکی ہے۔ اب آرام کرنا چاہیے۔“

باہر طوفان اب بھی زوروں پر تھا۔ ہوا بدستور خوفناک سیٹیاں بجاتی پھر رہی تھی۔

”سونے سے پہلے اپنے بے کو دیکھنا پڑے گا۔ تیز ہواؤں سے وہ مشتعل ہو جاتا ہے۔ اب بھی چلیں گے؟“

”ضرور۔۔۔۔۔ چلیں!“

”تو پھر بغیر آواز کے میرے ساتھ آئے۔ سب لوگ سو رہے ہیں۔“

ہم خاموشی سے بڑا کمرہ عبور کر کے بیرونی برآمدے میں جا پہنچے۔ ایک پرانی موی شیخ آنکڑے سے لٹکی ہوئی میں انکل بشیر نے اسے روشن کیا۔ میں نے دروازے کے قریب گئے ہوئے بینڈل کو دیکھا۔ وہ گھوما ہوا تھا۔ اس کا طلب تھا کہ درندہ اپنے بچرے میں بند ہے۔ اس نے ٹام کے کمرے کا دروازہ کھولا اور مجھے اندر آنے کا اشارہ کر کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ بلا ہمیں دیکھ کر خونخوار انداز میں دھاڑا۔ تیز ہواؤں نے واقعی اسے مشتعل کر دیا تھا۔ ہاہ بیت ناک پٹاڑ جیسا بلا بچرے کے ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا۔ شیخ کی تھر تھرائی روشنی میں سفید دیوار پر اس کا ایہ بڑا بھیاں لگ رہا تھا۔ وہ غصے میں بار بار اپنی دم اوہیر اوہر کر رہا تھا۔

”بے چارہ ٹام بہت پریشان معلوم ہوتا ہے۔“ انکل بشیر نے شیخ اونچی کرتے ہوئے کہا ”دیکھئے، کیسا کالا دیو نظر رہا ہے۔ اس وقت۔۔۔۔۔ اس کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے تھوڑا سا گوشت اور دینا ہو گا۔ اگر زحمت نہ ہو تو کچھ دیر یہ ختم لہجے۔“

میں نے شیخ ہاتھ میں لے لی۔

”راسن اس کے لیے گوشت محفوظ رکھتا ہے، میں ابھی لے کر آتا ہوں۔“

وہ دروازے سے نکل گیا۔ ساتھ ہی میں نے دروازہ مقفل ہونے کی آواز بھی سنی! اس آواز نے میرا دل چیر کر کھ دیا۔ خوف کی ایک تیز لہر آئی اور اس نے میرے پورے وجود کو اپنی پیٹ میں لے لیا۔ میں لپک کر دروازے کے قریب گیا مگر اندر کوئی بینڈل نہیں تھا۔

میں نے زور زور سے دروازہ پینٹے ہوئے کہا۔ ”انکل بشیر!۔۔۔۔۔ خدا کے لیے مذاق چھوڑو اور دروازہ کھولو۔“

”مذاق۔۔۔۔۔ باہر سے اس نے ایک زہریلا قندہ لگایا۔“ چلو یہی سمجھ لو۔ تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں اندر روشنی کافی ہے۔“

”روشنی سے کیا ہوتا ہے۔ مجھے یہاں تمہارا قلعہ پسند نہیں۔“

”فکر نہ کرو۔ بہت جلد تمہاری تھائی دور ہو جائے گی!“

”بلکہ مجھے باہر آنے دو۔۔۔۔۔ میں سچ کہہ رہا ہوں اس قسم کے مذاق بالکل پسند نہیں کرتا۔“

”میں تو پسند کرتا ہوں۔“ اس نے ایک اور قندہ لگایا تھا۔

۔۔۔۔۔ اور پھر طوفان کی چیخ و پکار کے درمیان میں نے باہر پیسے کا بینڈل گھونٹنے کی آواز سنی۔ لوہے کی سلاخیں ٹکھٹکنا میں میرے خدا۔۔۔۔۔ وہ اس بیت ناک بے کا بچرہ کھول رہا تھا۔ میں نے شیخ کی مدد میں روشنی میں دیکھا۔ بچرے کی نولادی سلاخیں آہستہ آہستہ کھینچتی جا رہی تھیں اور ایک فٹ کے قریب بچرہ کھل چکا تھا۔ ایک

بھی کھلے فرش کی بہ نسبت کم خطرناک تھی۔

... اور یہ جگہ بھی بچرے کی چھت.... جس پر تین طرف سے لوہے کی موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ سلاخیں دو دو انچ کے فاصلے سے لگی تھیں۔ اور ان کے درمیان مضبوط لوہے کا دائرہ بچھا ہوا تھا۔ یہ سلاخیں کمرے کی چھت تک چلی گئی تھیں۔ بچرے کی چھت اور کمرے کی چھت کے درمیان دو فٹ کے قریب خلا موجود تھا۔ اگر میں کسی طرح سکڑ سمٹ کر وہاں بیٹھ جاؤں تو صرف ایک سمت یعنی سامنے سے ہی غیر محفوظ ہوں گا۔ باقی نیچے پیچھے اور دائیں بائیں سے محفوظ ہو جاؤں گا۔ فرش پر درندہ فوراً ہی حملہ آور ہو سکتا تھا۔ جبکہ بچرے کی چھت پر آنے کے لیے اسے اپنا رخ بدلنا پڑتا۔ زیادہ سوچ و بچار کا وقت نہیں تھا۔ اس لیے کہ اندھیرا ہو جانے کے بعد میرا وہاں تک پہنچنا ممکن نہ رہتا۔

میں نے تھوک نلکے ہوئے ایک جست لگائی اور سلاخیں پکڑ کر بجلی کی سی تیزی سے بچرے کی چھت پر جا پہنچا۔ میری آنکھیں کالے چھتے کی طرف ہی لگی ہوئی تھیں۔ اور وہ خاموشی سے مجھے گھور رہا تھا۔ اس کی بدولت اس سانس مجھے اپنے چہرے پر محسوس ہوئی جو کسی کھولتی کیتلی سے اٹھتی ہوئی بھاپ سے ملتی جلتی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ ایک طویل انگڑائی لے کر اٹھ کھڑا ہوا پھر جھپٹے پیروں پر کھڑا ہو کر اس نے اٹکا بھاؤ وار پر رکھا۔ اور دوسرے پنجے سے اس فولادی جالی کو کھرچنے لگا جس پر میں لیٹا ہوا تھا۔ مجھے اپنے کولے میں خنجر سا گھستا ہوا محسوس ہوا۔ اس کا ایک تیز ناخن میری شلوار سے ہو کر کولے میں دھنس گیا۔ مگر شاید اس نے پھر پور حملہ نہیں کیا تھا۔ وہ میری طاقت آزمایا رہا تھا۔ کیونکہ تکلیف کی شدت سے میری فلک شکاف پنج بند ہوئی تو وہ دھپ سے فرش پر کود گیا۔ اب وہ بڑی بے تابی سے نسل رہا تھا۔ اور منہ اٹھائے میری طرف دیکھتا جا رہا تھا۔ اس کے جواب میں میں پیچھے کی طرف کھسکے لگا۔ یہاں تک کہ میری پیٹھ کمرے کی دیوار سے جا گئی جس نے اپنے ہاتھ پیر سمیٹ کر گٹھری سی بنائی۔ میں جانتا تھا کہ میں جتنا پیچھے ہٹوں گا۔ اس کے لیے حملہ کرنا اتنی دشوار ہو گا۔

اجانک شمع کی لو تھر تھرائی موم بنی جل چکی تھی۔ اس کی روشنی مدھم پڑنے لگی۔ اب وہ خوف ناک بلا بمشکل دیکھا جاسکتا تھا۔ موم بنی آخری بار بھڑکی اور پھر کمرے میں گپ اندھیر چھا گیا۔ اب میں اس روح فرسا اندھیرے میں اس درندے کے رحم و کرم پر تھا۔ میں یہ سوچ کر اپنے آپ کو ہلا رہا تھا۔ کہ میں جو کچھ اپنے بچاؤ کے لیے کر سکتا تھا، کر چکا ہوں بہترینی ہو گا کہ اب خاموشی سے پیش آنے والے حالات کا انتظار کیا جائے۔ میرے اندازے کے مطابق اس وقت رات کے دو بجے تھے اور پوچھنے میں کم از کم دو گھنٹے باقی تھے۔

باہر طوفان اور موسلا دھار بارش میں ایک لمحے کو بھی کمی نہیں آئی تھی۔ چھوٹی سی کھڑکی سے ہلکی ہلکی پھوار کمرے میں آرہی تھی۔ ساتھ ہی خون بنادینے والی سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ اب نہ تو وہ کالا چیتا دکھائی دے رہا تھا۔ اور نہ ہی اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

میں نے اپنا دھیان ہٹانے کے لیے دوسری باتیں سوچنے کی کوشش کی جیسے جیسے سوچتا گیا... ویسے ویسے ساری بات سمجھ میں آتی گئی۔ انگل بشیر نے ایک بے داغ منصوبہ بنایا تھا۔ وہ بظاہر سب کے سامنے سونے چلا گیا تھا۔ پھر جب سب سو گئے تو وہ چپکے سے میرے پاس چلا آیا۔ مجھے اپنی باتوں میں الجھا کر یہاں تک لے آیا اور اب میں اس منقل میں پھنسا ہوا تھا۔ وہ بڑی آسانی سے یہ کہہ کر اپنی جان بھڑا سکتا تھا کہ..... مجھے نشست گاہ میں رگڑ پیٹنے ہوئے چھوڑ گیا تھا اور میں اپنی مرضی سے بلا دیکھنے چلا گیا ہوں گا میں نے بے خیالی میں یہ بھی غور نہیں کیا کہ بچرہ کھلا ہے..... یا بند ہے۔ اس طرح مارا گیا۔

بھیانک چیخ مار کر میں نے چھلانگ لگائی اور کھسکی ہوئی سلاخوں کو پکڑ کر کسی پاگل آدمی کی طرح زور لگانے لگا۔ تاکہ اسے کھلنے سے روک سکوں۔ دوسری طرف بشیر بھی پینڈل پر پورا زور صرف کر رہا تھا۔ پتھر کے پکٹے فرش پر میرے پیر پھسل رہے تھے۔ میں ساتھ ہی چلا چلا کر اس سے رحم کی جھپک مانگ رہا تھا۔ مگر اس سنگ دل پر میری آہ و پکار کا کوئی اثر نہ ہوا۔ میں نے اس سے گڑ گڑا کر پوچھا کہ آخر اس ظلم کی وجہ کیا ہے۔ میں نے کیا تصور کیا ہے۔ میں جو اس کا مہمان ہوں، آخر مجھے کیوں موت کے منہ میں دھکیلا جا رہا ہے۔ مگر اس نے میری ایک نہ سنی۔ پینڈل پر دباؤ بڑھاتا ہی جا رہا تھا۔ بچرے کا دروازے لٹخہ بہ لٹخہ، تھوڑا تھوڑا کھلتا جا رہا تھا۔ میرے بازو نسل ہونے لگے۔ انگلیاں سن ہو گئیں مایوس ہو کر میں نے جدوجہد ترک کر دی۔ اور ایک دھماکے کے ساتھ دروازہ پورا کھل گیا۔

اگلے ہی لمحے میں نے راہداری میں اس کے قدموں کی آواز سنی جو دور دوری جا رہی تھی۔ پھر فاصلے پر دروازہ بند ہونے کی آواز آئی اور ہر طرف سناٹا چھا گیا۔

اس تمام عرصے میں اس درندے نے کوئی حرکت نہیں کی۔ وہ بچرے کے کونے میں دراز تھا۔ میری اس جدوجہد اور چیخ و پکار سے وہ غالباً کچھ حیران سا تھا۔ وہ پلک جھپکائے بغیر اپنی ڈراؤنی آنکھوں سے مجھے گھورے جا رہا تھا۔ جب میں سلاخوں سے زور آزمائی کر رہا تھا تو میں نے غصے سے بچرے کی طرف دیکھ دی تھی۔ یہ سوچ کر کہ شاید روشنی میں زیادہ محفوظ رہ سکوں، میں شمع کی طرف بڑھایا تھا کہ بلے کی لرزہ خیز غراہٹ سن کر رک گیا۔ میرے ہاتھ پیر تھر تھراپ رہے تھے۔ میرے اور اس خونخوار درندے کے درمیان مشکل سے دس قدم کا فاصلہ تھا۔ اس نلکے اجالے میں، اس کی آنکھیں فاسفورس کی ذیلیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ ان میں کچھ ایسی ساحرانہ قوت تھی کہ میں ان سے اپنی نگاہیں ہٹا نہیں سکتا تھا۔ قسمت میرے ساتھ عجیب و غریب کھیل کھیل رہی تھی۔ خدا جانے میرا وہم تھا یا حقیقت کہ مجھے اس کی آنکھوں سے بجلی کی چمک نکلتی محسوس ہوتی کبھی کبھی تو یہ چمک اتنی بڑھتی کہ کمرے کا وہ کونا جہاں درندہ لیٹا ہوا تھا۔ منور ہو جاتا اور پھر یکایک وہ روشنی بجھ گئی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

میں نے سنا تھا کہ انسانی نگاہ میں ایسی عجیب اور انوکھی قوت ہوتی ہے کہ کوئی اور مخلوق اس سے نظر ملانے تو مسخر ہو جاتی ہے۔ وجہ یہی تھی یا کچھ اور..... بہر حال، اس کے حملے کا خطرہ سرے لٹا نظر آ رہا تھا۔ اس نے اپنی سیاہ تھو تھنی اگلے پنچوں پر ٹیک دی تھی۔ ایسا لگتا تھا، جیسے سونے کی تیاری کر رہا ہو۔ میں دم سادھے کھڑا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر ذرا بھی حرکت کروں گا تو وہ پھر اٹھ بیٹھے گا۔ میں تیزی سے اپنے بچاؤ کے متعلق سوچنے لگا۔ انگل بشیر مجھے پوری طرح اپنے جال میں جکڑ چکا تھا۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ اور اندر سے اس کا کھولنا ممکن نہیں تھا۔ کمرے میں صرف ایک کھڑکی تھی، مگر اتنی چھوٹی کہ اس سے بچ نکلنا بعید از قیاس تھا۔ اس پتھر لے کمرے میں میرے لیے کوئی پناہ نہیں تھی۔ کسی کو مدد کے لیے پکارنا بے سود تھا۔ ایک تو یہ کمرہ عمارت کے بالکل سرے پر تھا۔ دوسرے طوفانی ہواؤں کی چنگھاڑ میں میری آواز کون سنتا۔ موت میرے سامنے تھی۔ درندہ کسی بھی وقت مجھ پر حملہ کر سکتا تھا۔ اپنی ہمت اور تقدیر پر بھروسہ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

اجانک شمع کی لو تھر تھرائی اور یہ دیکھ کر میرے بدن میں خون بننے لگا کہ موم بنی نصف انچ سے بھی کم رہ گئی ہے۔ گویا زیادہ سے زیادہ دس منٹ اور روشنی رہ سکتی تھی۔ اور یہی دس منٹ تھے جن میں مجھے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ درندہ اندھیرا ہونے کے بعد میں اور بھی بے دست و پا ہو جاتا۔ میں نے اپنی مایوسی اور پتھرائی ہوئی آنکھیں، اس قتل گاہ میں ادھر ادھر دوڑانا شروع کیں۔ آخر ایک جگہ میری آنکھیں رک گئیں۔ وہ جگہ بالکل محفوظ تو نہیں تھی، پھر



وہ جرم کا یہ منصوبہ نہ جانے کہاں سے لایا تھا۔ شہادت ممکن تھے.... مگر ثبوت کوئی بھائی نہیں دیتا تھا۔  
آدا وہ جان لیوا دو گھنٹے.... کس قدر ست رفتاری سے گزرے.... ایک مرتبہ میں نے ایسی آواز سنی جیسے کلا  
چیتا زبان سے اپنی کھال چاٹ رہا ہو کئی مرتبہ مجھے اندھیرے میں اس کی آنکھیں چمکتی ہوئی نظر آئیں مگر وہ خاص  
طور پر مجھے نہیں دیکھ رہا تھا۔ یہ سوچ کر میرا حوصلہ بڑھنے لگا۔ کہ شاید وہ مجھے فراموش کر چکا ہے۔ خدا خدا کر کے  
سیدہ سحر نمودار ہوا۔ تھوڑی دیر بعد کمرے میں اتنی روشنی ہو گئی کہ میں اس درندے کو دوبارہ دیکھ سکتا تھا۔  
اس وقت وہ رات سے زیادہ خطرناک اور جارحانہ موڈ میں تھا صبح کی ٹھنڈک نے اسے مشتعل کر دیا تھا۔ ساتھ  
ہی وہ بھوکا بھی تھا۔ وہ کمرے میں اوڑھنا پھرتا ہوا پھر رہا تھا۔ غصے سے اس کی مونچھیں تپتی ہوئی تھیں اور دم بل  
کھا رہی تھی۔ کمرے کے سرے پر جا کر وہ جب بھی مڑتا اس کی نظر میری ہی طرف ہوتی تھی اس کی آنکھوں میں  
چھلکتی نفرت اور غصہ دیکھ کر لرز رہا تھا۔ وہ یقیناً مجھے مار ڈالنا چاہتا تھا۔ اس کی غراہٹ بندرتیج پر ہوتی جاتی تھی مجھے  
یقین ہو گیا کہ اب میری زندگی کچھ ہی دیر کی رہ گئی ہے۔ دہشت ناک موت میرے سامنے تھی۔ اس کے ساتھ ہی  
میں مکہ فرار کے امکان بھی ڈھونڈ رہا تھا۔ اگر کسی طرح بچنے کا دروازہ دوبارہ بند کیا جاسکے تو بچنے کا امکان ممکن  
تھا۔ میں نے دیوار میں لگی ہوئی ان سلاخوں کو دیکھا۔ جو ہینڈل گھمانے پر بچنے کے دہانے کو بند کر دیتی تھیں۔ کیا  
انہیں اندر کھینچا جاسکتا ہے؟ درندے کے خوف سے میں ساکت پڑا ہوا تھا۔ ذرا سی جنبش بھی اسے متوجہ کر سکتی  
تھی۔

آہستہ.... بہت ہی آہستہ میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا حتیٰ کہ میرا ہاتھ سب سے اگلی سلاخ سے جا ٹکرایا۔  
میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ایک ہلکے سے جھٹکے پر وہ تھوڑی سی اندر کھینچ آئی۔ میں نے پھر دھڑکایا۔ سلاخ  
تین انچ کے قریب اور ٹھکس آئی۔ یہ سلاخیں باہر لگے پہیے سے ہی چلتی تھیں۔ میں نے ایک بار پھر سلاخوں کو  
کھینچا۔ اور اس کے ساتھ ہی کالے بے نے مجھ پر چھلاٹ لگادی۔

یہ حملہ اتنا چابک تھا کہ مجھے پتہ ہی نہ چل سکا کہ کیا ہوا۔ پلٹ جھپٹنے میں گھورتی ہوئی آنکھیں، لپکتی ہوئی سرخ  
سرخ زبان اور نوکیلے دانت مجھ سے ذرا سی فاصلے پر تھے۔ درندے کے ہماری بوجھ سے پورا بچہرو مل گیا۔ ایک  
لمحے تو میں سمجھا کہ وہ زمین پر آیا ہی چاہتا ہے۔ درندہ ایک لمحے کے لیے ٹکٹا رہا اس کی تھو تھنی اور اگلے نیچے میرے  
قریب تھے۔ پچھلے پیروہ بچنے کے کوئے پر مار رہا تھا۔ مگر وہاں اسے رکھنے کے لیے کوئی سہارا نہیں مل رہا تھا۔  
آہستہ آہستہ غصے میں بل کھاتے ہوئے فرش پر کود گیا۔ اگلے ہی لمحے یقیناً فیصلہ کن تھے۔ اس بار درندہ چھلاٹ  
لگانے میں فاصلے کا ضرور خیال رکھے گا۔ اگر مجھے زندگی بچانی ہے تو بے خوف ہو کر فوراً سرگرم عمل ہو جانا چاہیے۔

اگلے ہی لمحے میں ایک خطرناک فیصلہ کر چکا تھا۔ میں نے بجلی کی سی تیزی سے اپنا کوٹ اتار اور درندے کے  
منہ پر پھینک دیا۔ اس کے ساتھ ہی کنارے پر آکر پوری قوت سے بچنے کے کوہند کرنے والی سلاخیں دیوار سے کھینچے  
لگا۔ میری توقع کے خلاف سلاخیں آسانی سے کھینچ آئیں۔ میں گھبراہٹ میں غلط سمت سے باہر آ گیا تھا۔ شاید مجھے  
دوسری طرف سے ٹکنا تھا۔ ایک لمحے کو رک کر میں اس کھلی جگہ سے جو میں نے چھوڑی تھی واپس مڑا ہی تھا۔ کہ  
درندہ جو میرے کوٹ سے وقتی طور پر اندھا ہو گیا تھا۔ کوٹ کو سر سے جھٹک کر مجھ پر اچھل پڑا۔ اب میرے پاس  
ایک ہی راستہ تھا۔ کہ خود بچنے میں بند ہو جاؤں اور درندے کو کمرے میں رہنے دوں۔

میں نے بجلی کی سی تیزی سے بچنے میں گھٹتے ہوئے سلاخیں کھینچ دیں۔ مگر مجھے دیر ہو چکی تھی۔ میرا ایک پیر  
اس کی گرفت میں آچکا تھا۔ اس کے ایک ہی دھشیاں جھٹکے میں میری پندلی کا سارا گوشت اس کے منہ میں آ گیا۔

زخم سے خون ایسے بننے لگا جیسے کسی نے تل کھول دیا ہو۔ مجھ پر فضاہت طاری ہونے لگی۔ میں بے سدھ ہو کر  
بچنے کے فرش پر گر پڑا۔ مگر اب اس کے اور میرے درمیان لوہے کی سلاخیں حائل تھیں۔

درندہ سلاخوں پر ٹکریں مار رہا تھا۔

زخم اتنا کاری تھا کہ میرے لیے اپنی جگہ سے ہلنا ناممکن ہو گیا۔ ساتھ ہی میرا ذہن ڈھنسا رہا تھا۔ اس وقت میں  
زندہ کم تھا اور مردہ زیادہ.... میں خالی آنکھوں سے اس خون آشام درندے کو دیکھ رہا تھا جو سلاخوں سے سینہ  
چپکائے، دونوں پنجے اندر ڈال کر مجھے پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے میرا لباس تار تار کر ڈالا۔ مگر اب میں اس  
کی پہنچ سے دور تھا۔

آہستہ آہستہ میرے حواس معطل ہو گئے۔ سخت تکلیف اور خون کے اخراج کی وجہ سے میری آنکھیں بند  
ہونے لگیں۔ اور تھوڑی ہی دیر کے بعد میں بے ہوش ہو گیا۔

میں تقریباً دو گھنٹے بے ہوش پڑا رہا۔ ذہنی دروازے کے کھلنے کی کڑکڑاہٹ پر میں ہوش میں آیا۔ ابھی میرے  
حواس پوری طرح درست نہیں ہوئے تھے کہ میں نے انکل بشیر کو کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا جو کچھ اس  
نے دیکھا وہ یقیناً اس کے لیے حیران کن اور ناقابل یقین تھا۔ درندہ کمرے میں بے چینی سے ٹپٹ رہا تھا۔ اور میں  
چیتروں میں لپٹا بچنے کے اندر پڑا ہوا تھا۔ میرے اطراف خون ی خون تھا۔ اس نے دروازے سے جھانک کر  
مجھے دیکھا۔ پھر دروازہ بند کرنے کے بعد بچنے کے قریب آ گیا تاکہ دیکھ سکے کہ میں زندہ ہوں یا مردہ....

مجھے نہیں معلوم پھر کیا ہوا صرف اتنا محسوس ہوا تھا کہ اس کا چہرہ میرے قریب سے ہٹ گیا۔ وہ درندے کو  
دیکھ کر کہہ رہا تھا۔

”ٹام... ٹام... ٹام... میرا پاپا ٹام“

وہ پھر سلاخوں کے قریب آ گیا مگر اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔

”اگرچہ اس وقت میرا ذہن پر آئندہ تھا۔ پھر بھی مجھے انکل بشیر کی بات یاد آگئی کہ ایک بار خون کا مزہ منہ کو  
لگنے کے بعد یہ درندہ آدم خود ہو جاتا ہے.... خون بے شک ٹام نے میرا ہی چکھا تھا۔ مگر اس کا خیاں وہ انکل بشیر کو بھی  
بھگتا تھا۔

”دور ہو.... وہ گلاباڑ کر چلا یا دور ہو شیطان کی اولاد.... رامن.... رامن.... اف میرے خدا!“

میں نے اس کے گرنے کی آواز سنی۔ وہ اٹھا پھر گرا، پھر گرا پھر اٹھا، پھر گرا پھر میں نے ایسی آواز سنی جیسے کورا  
لٹھا بھاڑا جا رہا ہو اور اس کے ساتھ ہی ایک ہولناک جھج سنائی دی جو بندرتیج مدھم پڑتی جاتی تھی۔

میرا خیال تھا کہ وہ مرچکا ہو گا، مگر میں نے جیسے ایک بھیاٹ خواب دیکھا تھا۔ جگہ جگہ سے نچا ہوا، دونوں  
آنکھوں سے محروم، خون میں نمایا ہوا، ایک پیکر تھا جو کمرے میں دہشت زدہ سا بھاٹا پھر رہا تھا۔ اور یہ انکل بشیر کی  
آخری جھلک تھی جو میں نے دیکھی پھر میں دوبارہ بے ہوش ہو گیا۔

مجھے صحت یاب ہونے میں کئی ماہ لگے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میں اب بھی اپنے آپ کو مکمل طور پر صحت  
یاب نہیں کہہ سکتا۔ بغیر چھڑی کے میں اب بھی ٹھیک سے نہیں چل سکتا۔ یہ ایک خفہ ہے۔ جو مجھے افریقہ سے  
کالے بے نے دیا۔ مگر ان رامن اور دوسرے نوکر قلعی طور پر کچھ نہ بتا سکے کہ ہوا کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ جب وہ  
اپنے آقا کی لڑنے خیز جھج سن کر وہاں پہنچے تو انہوں نے مجھے بچنے کے اندر پایا اور انکل بشیر کے جسم کے بچے  
کھجے درندے کے بیٹوں میں دے دیے تھے۔ دروازے میں لگی ہوئی چھوٹی کھڑکی سے فائرنگ کر کے

کے قریب جی آگیا وہ اپنی دلہن کو بھی ساتھ لایا تھا۔ میرے گھر کے اواس ماحول میں اچانک ہی چل پل ہو گئی۔ دلہن کی چوڑیوں کی کھک سے فضا میں موسیقی کی لہریں سی بکھر گئیں۔ دلہن نے آتے ہی گھر کی دیکھ بھال شروع کر دی۔ چیزوں کو سجایا اور باورچی خانے میں پہنچ گئی۔

دوپہر کا کھانا پکا کر اس نے دسترخوان پچھلایا تو ہم نے مل کر کھلایا اور مجھے اتنا لطف آیا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ شام تک اوھر اوھر کی باتیں ہوتیں رہیں۔ جی ہنی مون کے دوران جہاں جہاں گھوم پھر کر آیا تھا وہ ان مقامات کے بارے میں بتاتے لگا۔ دونوں بے حد خوش تھے اور میں دل ہی دل میں بار بار ان کے لیے دعا گو تھا کہ خدا کرے ان کی ساری زندگی اسی طرح خوش و خرم گزرے میں نے انکل بشیر سے اور سیاہ بلبے کے خوفناک واقعات کو ان سے تذکرہ نہیں کیا۔ میں ان کی خوشیوں کا رخ نہیں بدلنا چاہتا تھا۔ وہ خوش تھے اور انہیں خوش ہی دیکھنا میری خواہش تھی۔

شام کی چائے کے بعد انہوں نے واپس جانے کی خواہش ظاہر کی لیکن اس وقت پڑوس کی دو تین عورتیں آ گئیں۔ انہیں تجسس تھا کہ میرے گھر یہ کون دلہن آئی ہے۔ میں نے انہیں جی کی بیوی سے متعارف کرایا تو وہ بہت خوش ہوئیں اور دیر تک ان کی ایک الگ محفل جی رہی۔ رات کے کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔ میری پڑوس نے ہلکی پھلکی دعوت کر ڈالی۔ اس کے بعد جی نے مجھ سے جانے کی اجازت چاہی۔

جی اپنی دلہن کے ساتھ چلا گیا۔ اس کی دلہن نے یہاں آ کر میرے زخموں کو جیسے تازہ کر دیا۔ مجھے سرگرم یاد آ گئی۔ اس روز کی سرگرم جب وہ دلہن بنی تھی۔ میں ساری رات جلتے لحوں کی آگ میں تڑپتا رہا۔ دوسرے دن میں صدر پہنچا۔ میں نے جی کی بیوی کے لیے زیور اور چند دوسری چیزیں خریدیں۔ یہ سب کچھ دس ہزار سے کم مالیت کا نہیں تھا۔ میں یہ سارا سامان ٹیکسی میں لے کر جی کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ جی نے نئی کراچی میں ایک مکان لے لیا تھا۔ اس نے ایک چھوٹا سا کاروبار بھی شروع کر دیا تھا۔ تاکہ دلہن کے ساتھ نئی زندگی کا آغاز کر سکے۔ گھر میں ان دونوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ جی گھر پر تھا وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور تحائف دیکھ کر اس کی خوشی دو چند ہو گئی۔

میں رات بارہ بجے واپس آیا تو میرا ذہن کچھ اور سوچ رہا تھا جی کی نئی زندگی نے مجھے نہ صرف متاثر کیا تھا بلکہ بہت کچھ سوچنے پر بھی مجبور کر دیا تھا۔ مجھے جی کی نئی زندگی اور ازدواجی سفر پرست پند آیا تھا۔ میں گھر پہنچ کر حقیقی دنیا کی سٹھارہ زمین پر آگیا اور سوچنے لگا کہ سرگرم مر گئی ہے یہ کیا حماقت ہے کہ میں اس کے فراق میں ابھر رہا ہوں۔ ان بیٹے دنوں کو یاد کر رہا ہوں جو ایک خواب کی طرح ہیں۔ ماضی بن گئے ہیں اب تو مجھے اپنی زندگی کے اس خلا کو پر کر لینا چاہیے.... اور اس خلا کو شادی کر کے ہی پر کیا جاسکتا تھا۔ مجھے ایک اچھی زندگی کے لیے اچھی شریک حیات کی ضرورت تھی

میں نے فیصلہ کر لیا کہ اپنا گھر سالوں گا۔ عورت کے بغیر زندگی نہیں گزارا جاسکتی۔ مگر وہ عورت کون ہوگی۔ جو میری دنیا آبادی کرے گی۔ میں نے چاروں طرف خیالی گھوڑے دوڑائے مگر ایسی کوئی لڑکی نظر نہ آئی جو میری زندگی میں بہار بن کر آسکے۔ میری نظروں میں کوئی لڑکی نہ تھی جس میں جانتا تھا میں خود بھی یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ مجھے کس قسم کی لڑکی کو شریک حیات بنانا چاہیے۔

دوسرے دن سہ پہر کو میں گھر سے نکلا۔ فیڈرل لی ایریا پہنچ گیا۔ میں رکشا سے اتر کر سڑک کے کنارے کھڑا تھا کہ ٹریفک گزر جائے تو سڑک پار کروں۔ مجھے کھڑے ہوئے چند لمحے ہی گزرے ہوں گے۔ کہ میری نگاہ سامنے چلی

دروازے کو ختم کیا گیا۔ مجھے میرے کمرے میں لایا گیا اور پھر کئی ہفتوں تک میرا علاج ہوتا رہا۔ حیدر آباد سے ایک نرس اور سرجن کو بلایا گیا۔ ایک ماہ بعد میں اس قابل ہو سکا کہ مجھے اسٹیشن پہنچایا جاسکے۔ جہاں سے مجھے حیدر آباد میں جی کے سرال پہنچا دیا گیا۔

انکل بشیر کے گھر میں قیام کے دوران، ایک رات جب نرس کہیں باہر تھی تو میں نے دیکھا کہ دروازہ آہستہ سے کھلا اور مسز بشیر کمرے میں داخل ہوئی اور میرے قریب آ کر اس نے مجھ سے پوچھا آپ سو تو نہیں رہے ہیں؟ میں نے نفی میں گردن ہلائی۔

”میں صرف یہ کہنے آئی تھی کہ جو کچھ ہوا“ اس کے ذمہ دار آپ خود ہیں۔ کیا میں نے آپ کو بار بار آگاہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی؟ میں پہلے دن سے ہی آپ کو یہاں سے بھگانا چاہتی تھی۔ اپنے شوہر کی مرضی کے خلاف میں نے آپ کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی میں جانتی تھی کہ وہ آپ کو کسی قیمت پر جانے نہیں دے گا۔ مجھ سے زیادہ اسے کون جان سکتا ہے میں جو ہمیشہ اس کے ظلم و ستم کا نشانہ بنتی رہی ہوں آپ میرے محسن ہیں آپ نے مجھے آزاد کرایا ہے حالانکہ میں سمجھتی تھی کہ مرکزی آزادی مل سکے گی۔ اگر میری ذات سے آپ کو کوئی تکلیف پہنچی ہو تو میں اس کی معافی چاہتی ہوں۔“

”کاش! آپ نے سب کچھ مجھے صاف صاف بتا دیا ہوتا تو آج یہ نوبت نہ آتی“ میں نے ایک طویل سانس لے کر کہا اس کی وضاحت کے باعث میرے ذہن سے ایک بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا تھا ورنہ شاید زندگی بھر اس کے پر اسرار رویے اور نفرت کے بارے میں سوچتا اور الجھتا ہی رہتا اور کبھی کسی نتیجے پر نہ پہنچ پاتا ”ایک بات تو بتائیے“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا ”بشیر صاحب کی اتنی ڈاک کہاں سے آئی تھی۔ اور مجھ سے اس کی دشمنی تھی۔“

”افریقہ سے....“ اور اسے آپ سے دشمنی نہیں تھی۔ بلکہ یہ اس کی خالانہ فطرت کا ایک پہلو تھا۔ جس کی تسکین کے لیے وہ ایسی حرکتیں کرتا رہتا تھا۔

میں نے حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میرے والد کا وہاں بہت بڑا کاروبار ہے۔“ وہ دھیمی آواز میں کہنے لگی۔ میرا خیال ہے ان کے ملازمین میں سے ایک بشیر کا جاسوس ہے۔ وہ اسے کاروباری رازوں سے آگاہ کرتا رہتا تھا۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں۔ میری ماں کا انتقال ہو چکا ہے۔ اور باپ بہت بوڑھا ہے۔ کسی بھی روز اس کی آخری سانس.... وہ بولتے بولتے رک گئی اور ایک جھرجھری سی لے کر دوبارہ بولی ”بشیر ان کی موت کے بعد کاروبار پر قابض ہو چکا تھا۔ کیونکہ باپ کے بعد سب کچھ میرے ہی حصے میں آئے گا۔“

”اب کیا ارادہ ہے؟“

”میں واپس جاری ہوں، بشیر کا ترکہ مجھے مل رہا ہے۔ میں اپنا حصہ لے کر چلی جاؤں گی۔“

میں کمزوری محسوس کرنے لگا تھا۔ اس لیے میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ کمرے سے چلی گئی اور اس کے بعد میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ شاید وہ اپنا حصہ لے کر واپس چلی گئی تھی۔

مجھے حیدر آباد آئے ابھی کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ میرا علاج کرنے والے ڈاکٹر نے بتایا کہ اب میں بڑی حد تک ٹھیک ہوں اور اپنی کاروباری مصروفیات میں حصہ لے سکتا ہوں۔ جی ابھی تک ہنی مون سے واپس نہیں آیا تھا۔ میں نے ایک دو دن اس کا انتظار کیا پھر کراچی روانہ ہو گیا۔ کراچی آئے مجھے تین روز گزر گئے تو صبح دس بجے

کی جانب انھی تو وہیں جم کر رہ گئی۔ گلی سے چند لڑکیاں نمودار ہوئیں سب کی سب جوان تھیں ان میں کوئی خوش نما تھی تو پرکشش نہیں تھی۔ مگر ان سب میں ایک بات مشترک تھی کہ وہ عمدہ لباس میں تھیں۔ اور بڑی ہمار دے رہی تھیں۔ ان میں ایک لڑکی ایسی بھی تھی جس نے میری تمام تر توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ وہ سفید براق لباس میں لمبوس تھی۔ بظاہر یہ ایک عام سالباں تھا مگر وہ اس لباس میں بے حد سادہ حسین اور پرکشش لگ رہی تھی۔ دوسری لڑکیوں نے رنگین اور بڑکدار لباس پہن رکھے تھے، مگر جو بات اس سفید لباس میں تھی، رنگین لمبوسات میں نہیں تھی۔ سفید لباس نے اس کے حسن کو مزید اجاگر کر دیا تھا اور پھر اس میں کوئی ایسی خاص بات بھی محسوس ہو رہی تھی جس نے مجھے اس پر نظریں مرنکیز کرنے کے لیے مجبور کر دیا تھا۔ میں یوں محسوس کر رہا تھا جیسے وہ مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہو اس میں بے پناہ مقناطیسی کشش تھی۔ وہ اپنی سیلیوں کے ساتھ ہنسی مسکراتی اور لہراتی ہوئی سی سبک خرازی سے بس اسٹاپ کی طرف چلی جا رہی تھی میرا دل اور میری نظریں اس کی ہر ادا کو سراہ رہی تھیں۔ اس کی چال بھی قیامت کی تھی۔ میرے علاوہ بھی بہت سے لوگ ان لڑکیوں کی طرف متوجہ تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ دوسری لڑکیوں کو دیکھ رہے ہوں گے۔ جو یوں لا اہالی پن کا مظاہر کر رہی تھیں جیسے انہیں کسی اور کی موجودگی کا احساس ہی نہ ہو، مگر میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا، وہ سب اسی سفید براق لباس والے پیکر کو دیکھ رہے تھے۔ وہ بے حد پروقار لگ رہی تھی اور ان لڑکیوں میں نمایاں بھی تھی اس جیسی لمبی، مٹھنیری زلفیں، غزالی آنکھیں اور مستانہ خرازی کسی دوسری لڑکی میں نہیں تھی۔ وہ اس قدر حسین تھی کہ میں شاعر ہوتا تو اس کے بے مثل حسن کی تعریف میں فوراً ایک غزل کہہ دیتا۔ اس مد پارہ نے میرے دل میں نقش، سرگرم کی تصویر کے رنگوں کو بھی دھندلا کر دیا۔

میں نے بے اختیار سوچا کہ یہ لڑکی میری زندگی میں داخل ہو کر اجالے بکھیر سکتی ہے۔ مجھے اس لڑکی کا انتخاب کرنا چاہیے مگر اس لڑکی کا حصول اتنا آسان نہیں تھا لڑکی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور کسی اچھے گھرانے کی لگتی تھی۔ وہ لوگ مجھے رشتہ نہیں دیں گے، پھر خیال آیا کہ پاکت مار ہوں تو کیا ہوا؟ پڑھا لکھا تو ہوں۔ میرے پاس اتنی دولت ہے کہ میں یہ پیشہ چھوڑ کر کوئی بھی کاروبار کر سکتا ہوں کسی بھی اچھے علاقے میں رہائش اختیار کر سکتا ہوں اور پھر آج کل تو اچھے اچھے گھرانوں میں ایک سے ایک حسین لڑکیاں رشتوں کے انتظار میں بیٹھی ہیں۔ انہیں اچھے رشتے نہیں ملتے۔ کیا معلوم اس لڑکی کے لیے بھی اب تک کوئی مناسب رشتہ نہ آیا ہو۔ شاید یہ لڑکی میری قسمت میں لکھی ہو۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا کہ ان کے پیچھے پیچھے چلنا چاہیے۔

..... میں ان کے پیچھے چل پڑا اور یوں چلتا رہا کہ انہیں یہ شک نہ ہو کہ میں ان کا تعاقب کر رہا ہوں۔ وہ بس اسٹاپ پر پہنچ کر ایک طرف کھڑی ہو گئیں۔ میں ایک ایسی جگہ کھڑا ہوا گیا جہاں سے اس بہت طائرہ کو اپنی نظروں کی گرفت میں رکھ سکتا تھا۔ اس نے ایک بار بھی میری طرف نہیں دیکھا..... اور میں چاہتا بھی ہی تھا۔ میں اس کا سراپا دیکھ رہا تھا۔ اور نظروں کی پیاس تھی کہ بجھ ہی نہیں رہی تھی۔ بس ابھی نہیں آئی تھی۔ مگر میں دل میں دعا کر رہا تھا کہ بس کبھی نہ آئے چند لمحوں کے بعد ایک بس آگئی۔

وہ پانچوں لڑکیاں بس میں سوار ہو گئیں۔ میں بس میں سوار ہو کر لیڈر پارٹیشن کے پاس آگیا بس کچھ خالی خالی سی تھی لہذا وہاں بھی ایک سیٹ خالی تھی۔ میں اس سیٹ پر بیٹھ گیا۔ صرف تین لڑکیوں کو جگہ مل سکی تھی۔ دو کھڑی تھیں۔ ان میں وہ قدامت عالم بھی تھی کنڈیکٹر آیا تو ایک لڑکی جو بیٹھی ہوئی تھی بولی ”آج کرائے اور کھانے کا خرچ رضیہ کے ذمے ہے۔“

”مجھے کب انکار ہے“ قدامت عالم نے ہنس کر اپنے سر میںی پر س سے ایک نوٹ نکالتے ہوئے کہا۔ ”بس کے ٹکٹ کی کیا بات ہے کو تو تم لوگوں کے ہوائی جہازوں کا ٹکٹ لے لو۔“  
تو اس کا نام رضیہ ہے اس کا نام معلوم ہونے پر مجھے ایک طرح سے خوشی ہوئی تھی۔

لالو کھیت دس نمبر اسٹاپ آئے تک ان میں لوگ جھونک ہوتی رہی۔ وہ اس اسٹاپ پر اتاریں تو میری سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کس ہوٹل میں کھانے کے لیے جا رہی ہیں، وہاں ایسا کوئی ہوٹل یا ریسٹورنٹ نہیں تھا۔ شام کے چھ بج رہے تھے۔ لڑکیاں اس اسٹاپ پر جہاں لائڈر می لیئر جانے والی مٹی بیٹیں ٹھہرتی تھیں۔ لائڈر می جانے والی ایک بس میں سوار ہو گئیں تو میں بھی اسی میں بیٹھ گیا۔ وہ اسٹڈم کے بس اسٹاپ پر اتار گئیں۔ اور اس ریسٹورنٹ کی طرف بڑھیں جس کا نام پنڈارو سا تھا۔ اس ریسٹورنٹ میں مدداری کھانے ملتے تھے۔ مالہ دو سالہ اور اٹلی سا بھرا اور اس کی چشیاں بڑی لذیذ اور ذائقہ دار ہوتی تھیں۔ آج کل یہ ریسٹورنٹ اس لیے بہت زیادہ چل رہا تھا۔ کہ کراچی کے شہری ساج کباب، پکن کٹے، کڑھائی گوشت اور پکن بروسٹ وغیرہ کھا کھا کر آتا گئے تھے۔ یہ نی چڑس تھیں اس لیے ان پر نوٹ پڑے تھے۔ سورج غروب ہونے کے بعد وہاں زیادہ رش ہو جاتا تھا۔ لہذا اس وقت انتظار نہیں تھا۔ میں نے ان کے قریب والی میز کا انتخاب کیا اور ان کی طرف پشت کر کے بیٹھ گیا۔ جس اپنے منصوبے کے مطابق رضیہ کی نظروں میں آنا نہیں چاہتا تھا۔

رضیہ نے اپنی سیلیوں کے لیے مالے دو سے کا آرڈر دیا۔ میں نے بھی وہی منگوایا میں ان کی کھنگو سنا جا رہا تھا۔ اور مالے دو سے بھی فٹل کر رہا تھا۔ اس دوران ایک لڑکی نے رضیہ سے پوچھا ”ہاں بھی رضیہ! اکل تم فرحت کی شادی میں شرکت کر رہی ہو یا نہیں؟“

”کیوں نہیں کروں گی۔ میری کلاس فلورہ بچی ہے۔“ رضیہ نے جواب دیا۔

”مگر وہ تو تم سے سخت الگ تھی تمہاری دشمن تھی اور تم سے جلتی تھی۔“

”مگر میں تو نہیں تھی..... دشمن کو ہمیشہ محبت سے جیتا جاتا ہے۔ میرا دل صاف ہے۔ اور وہ بھی پرانی باتوں کو بھول گئی ہے۔“

”تخفہ کیا دے رہی ہو؟“

”سوچتی ہوں کوئی بہت اچھا اور قیمتی سا تخفہ دوں۔ کل صبح دس بجے صدر جا کر خرید لاؤں گی ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا، رات کو سوچوں گی کیا دینا چاہیے۔“

واپسی پر بھی میں ان کے تعاقب میں رہا۔ میں نے رضیہ کا گھر بھی دیکھ لیا۔ لالو کھیت دس نمبر رضیہ اکیلی ہو گئی تھی اس کی سیلیاں دو مختلف بسوں میں بیٹھ کر چلی گئی تھیں۔

اگلے روز علی الصباح ہی میں رضیہ کے گھر کے پاس ایک گلی کی کھڑ پر کھڑا ہوا گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کس طرح رابطہ قائم کروں؟ کیسے دوستی بڑھاؤں ساری رات میں تدبیریں سوچتا رہا مگر میری سمجھ میں کوئی تدبیر نہیں آئی تھی۔ پھر بھی میں خدا کا نام لے کر گھر سے نکل کھڑا ہوا تھا۔ کافی دیر بعد وہ گھر سے نکلی تو ختما ہی تھی۔ اس نے ہلکے نیلے رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ سر اور سینہ دوپٹے سے اچھی طرح ڈھکا ہوا تھا۔ اس لباس میں بھی اس کا سراپا ہمار دے رہا تھا۔ میں اس کے تعاقب میں چل پڑا۔ وہ مجھ سے دس بارہ گز آگے تھی۔ اس کا قد نکلا ہوا تھا۔ اور بدن بھی متناسب تھا وہ تیز چل رہی تھی۔ ہوا بھی تیز تھی جو اس کا دوپٹہ اڑا رہی تھی۔ اس کے چمکیلے سیاہ بالوں کی ٹلیں ادھر ادھر بکھیر رہی تھیں۔ چھوٹی اڑی کے سینڈلوں میں اس کے پیر مضبوط اور توانا لگے۔



”جی.....“ وہ چونک سا گیا ”پھر آپ کون ہیں؟“ جب اسے جانتے نہیں ہیں تو یہاں کیسے اور کس لیے آئے ہیں؟

”ان کی کھوئی چیزیں پہنچانے آیا ہوں۔“ میں نے جیب سے رضیہ کا منی پرس نکال کر پٹائی پر اس کے سامنے رکھ دیا۔

اس نے منی پرس اٹھا لیا، اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور میری طرف دیکھ کر کہا ”یہ منی پرس تو رضیہ کا ہے آپ کو کہاں سے ملا آپ کو کیسے پتہ چلا کہ یہ رضیہ کا پرس ہے؟“

”یہ منی پرس آج مجھے صدر کی ایک جیولر شاپ میں گرا ہوا ملا تھا۔“ میں نے کہا ”عام لوگ کیش میو پر اپنا پتہ نہیں لکھواتے لیکن سنا اس معاملے میں غلط ہیں۔ پرس میں کیش میو پر یہاں کا پتہ درج ہے۔“

اس نے منی پرس نکال کر بندے اور کیش میو نکالا۔ انہیں دیکھ کر واپس پرس میں رکھ دیا اور بولا۔ ”بہت بہت شکریہ دیے آپ کا شغل کیا ہے۔ کیسے ملازمت وغیرہ کرتے ہیں؟“

”میں ایک فرم میں سیکرٹری ہوں اور.....“ میں اپنا جملہ پورا نہ کر سکا۔ ایسے لگا کہ میری زبان پر مرثبت ہو گئی ہو۔ اس کی عقاب جیسی آنکھیں مجھے اپنی آنکھوں میں اتارتی محسوس ہوئیں۔ پھر میرے سوچنے اور سمجھنے کی تمام صلاحیتیں جیسے سلب کر لی گئی ہوں۔ میں پتھر کے کسی مجسمے کی طرح ساکت بیٹھا رہ گیا میں نے محسوس کیا کہ میرے بدن کو بجلی کے سے جھٹکے لگ رہے ہیں۔ یہ کیفیت کتنی دیر تک طاری رہی اس کا مجھے اندازہ نہ ہو سکا۔ پھر میں نے اچانک ہی اپنے آپ کو نارمل محسوس کرنا شروع کر دیا۔

”یہ بالکل سچ ہے کہ آپ ایک دیانت دار شخص ہیں اور آپ کو یہ پرس دکان میں پڑا ہوا ملا تھا۔ اور میں.....“ درمیان میں اطلاعی تھنٹی جی تو بات نامکمل چھوڑ دی۔ وہ مجھ سے معذرت کر کے دروازے کی طرف گیا۔ واپس آیا تو اس کے پیچھے رضیہ تھی۔

رضیہ کو دیکھتے ہی میرے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ وہ بے حد پریشان اور افسردہ نظر آ رہی تھی۔ اس کا چہرہ اس کی دلی کیفیت کی غمازی کر رہا تھا۔ رضیہ کی نظریں جیسے ہی مجھ پر پڑیں۔ وہ چونک پڑی۔ اس نے مجھے سلام کر کے شاہی کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔ ”ہمارے مہمان مسٹر سکندر ہیں۔ مگر تم اتنی پریشان کیوں نظر آ رہی ہو؟“

”بات یہ ہے بھائی جان!“ رضیہ جھجک رہی تھی۔

”کوئی..... کوئی..... کیا بات ہے۔ سکندر اپنے ہی آدمی ہیں۔“

”میں نے فرحت کی شادی میں تحفہ دینے کے لیے ایک دکان سے بہت ہی خوب صورت بندے خریدے تھے۔ کیا باتوں کتنے خوبصورت بندے تھے۔ وہ بندے معلوم نہیں مجھ سے کیسے کھو گئے۔ تلاش کرنے پر بھی نہیں ملے۔“

”کھو گئے سو کھو گئے..... تم اس دکان سے جا کر ویسے ہی بندے دوبارہ خرید لو۔“

”اس دکان پر اس کی ایک ہی جوڑی تھی؟“

”چلو خیر.....“ شاہی مسکرایا ”میں تمہیں اپنی طرف سے ایک ایسا ہی نادر تحفہ دے دیتا ہوں۔ یہ تحفہ تم اپنی سہیلی کو دے دینا“ اس نے جیب سے اس کا منی پرس نکالا تو رضیہ اچھل پڑی۔ ”یہ تو میرا پرس ہے۔ اس میں بندے تھے..... یہ آپ کو کہاں سے ملا۔ بھائی جان!“

”مجھے نہیں سکندر صاحب کو ملا تھا۔“

رہے تھے۔ میں نے درمیانی فاصلہ کم کرنے کے لیے تیز چلنا شروع کر دیا۔ معلوم نہیں کیوں میں اس حسین لڑکی کی طرف کھینچا جا رہا تھا۔ میں تو کسی طرح بھی اس کے لائق نہیں تھا۔

صدر پہنچ کر وہ بھری بازار کا چکر لگاتی رہی کئی دکانوں میں گئی اسے کوئی چیز پسند نہیں آئی تھی۔ پھر وہ ایک جیولری کی دکان میں داخل ہو گئی۔ میں بھی اندر جا کر ایک طرف کھڑا ہو گیا اور بندے دیکھنے لگا۔ وہ بھی بندے ہی دیکھ رہی تھی..... پھر کچھ سوچ کر میں نے انگوٹھی دکھانے کی فرمائش کی۔ رضیہ نے بے حد خوب صورت بندوں کا انتخاب کیا۔ اس نے اپنے پرس میں سے ایک منی پرس نکالا اور وہ بندے اس میں رکھ لیے۔ منی پس اور بڑا پرس وہ کاؤنٹر پر رکھے کیش میو بنوا رہی تھی۔ سیکرٹری نے کیش میو بناتے وقت رضیہ کا پتہ معلوم کر کے مختصر لکھ دیا۔ میں نے ایک انگوٹھی پسند کر کے خرید لی اور اسے جیب میں رکھ لیا۔

میں رقم ادا کر کے پلاٹا تو دیکھا کہ رضیہ وہاں موجود نہیں تھی۔ ”معا“ میری نظر اس کاؤنٹر کے فرش پر پڑی جہاں رضیہ کھڑی تھی۔ اس کا منی پرس وہاں گرا پڑا تھا۔ سیکرٹری کی اس منی پرس پر نظر نہیں پڑی تھی۔ میں نے جیب سے روٹل نکال کر پرس پر گرا دیا۔ صبح کا وقت تھا..... دکان میں ماسوائے میرے کوئی اور گاہک نہیں تھا میں نے پرس روٹل میں لوٹ کر اٹھا اور جیب میں رکھ لیا پھر میں وہاں سے باہر آ گیا۔

باہر آ کر میں نے رضیہ کو تلاش کیا لیکن اس کا دور دور نام و نشان تک نہیں تھا۔ میں نے گھر آ کر پرس کا جائزہ لیا تو میرا اندازہ درست نکلا۔ اس میں صرف بندے اور دس کا ایک نوٹ پڑا تھا۔ کیش میو بھی موجود تھا۔ رضیہ سے دوستی کرنے کا ایک راستہ پیدا ہو گیا تھا۔ میں ان بندوں کو دیکھ کر مسکراتا اور سوچتا رہا کہ قدرت نے میرے لیے کیا حسین اتفاق اور سنہرا موقع پیدا کر دیا ہے۔

میں سہ پہر کے وقت رضیہ کے مکان پر پہنچا۔ میرا خیال تھا کہ اسے گھر پہنچ کر تحفہ کھو جانے کا علم ہوا ہو گا تو وہ بہت سوگوار ہو گی اور اپنی بے پروائی پر کڑھ رہی ہو گی۔ میں اطلاعی تھنٹی کاٹن دبا کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ میری نگاہیں دروازے پر مرکوز تھیں کہ دروازہ کھلے گا اور رضیہ کا افسردہ چہرہ ابھرے گا۔ جب میں اس کی کھوئی ہوئی چیز اسے پیش کروں گا تو اس کا چہرہ کسی تروتازہ پھول کی طرح کھل اٹھے گا۔ دروازہ چند لمحوں کے بعد کھلا تو میری نظروں کے سامنے رضیہ نہیں بلکہ ایک بے حد سنجیدہ شخص کا سراپا تھا۔ بردباری اس کے چہرے سے عیاں تھی اس کی آنکھیں عقاب کی آنکھوں جیسی تھیں۔ ان آنکھوں نے مجھے مسحور کر دیا۔ ”فرمائیے!“ اس نے مجھ سے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ اس کے لیے میں بڑا سکون اور اعتماد تھا۔ ”خاکسار کو شاہی کہتے ہیں میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

”میں سکندر ہوں“ کیا رضیہ یہی کہتی ہیں؟“

”جی ہاں!“ اس نے ایک طرف ہٹ کر مجھے اندر آنے کا راستہ دیا۔ جو میرے لیے غیر متوقع تھا۔ میرا خیال تھا کہ رضیہ کا نام میری زبان سے سن کر وہ مجھے شک و شبہ کی نظروں سے دیکھے گا اور پھر اس کی آنکھوں میں بہت سے سوال ہوں گے لیکن وہ بہت زیادہ باخلاق ثابت ہوا تھا۔ نشست گاہ بہت آراستہ و پیراستہ تھی۔ اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا ”تشریف لے جائیے“ میں بیٹھ گیا تو..... وہ بھی میرے سامنے بیٹھ گیا ”آپ شاید رضیہ کے کلاس فیلو ہیں؟“

”جی نہیں.....“ میں نے جواب دیا ”میں نہ ان کا کلاس فیلو ہوں اور نہ ہی وہ مجھے جانتی ہیں میں بھی ان سے واقف نہیں ہوں۔“



میں بے چین رہی ہو۔ ہم دونوں بڑی حد تک بے تکلف بھی ہو گئے تھے۔

ایک سہ پہر کے بعد میں رضیہ کے ہاں پہنچا تو وہ گھر پر تھاتی تھی۔ اس روز میں کچھ سوچ کر اور فیصلہ کر کے وہاں گیا تھا۔ رضیہ کو گھر پر تنہا کر بیٹھے میرے دل کی مراد بر آئی تھی ہم نشست گاہ میں آنے سامنے بیٹھے ہاتھیں کر نے لگے۔ اس نے مجھے اپنے ہاتھ کی طرف متوجہ پا کر پوچھا ”سکندر! کیا بات ہے آپ میرے ہاتھ اس طرح دیکھ رہے ہیں۔ جیسے ان میں کوئی خاص بات ہو؟“

”یہ دیکھ رہا ہوں کہ یہ خالی خوبصورت ہاتھ اور اس کی مخروطی انگلیاں کیسی سونی لگ رہی ہیں“

”کیا مطلب؟“ اس نے اپنے ہاتھوں کو حیرت سے دیکھتے ہوئے وضاحت چاہی۔

میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس جا بیٹھا۔ ”پورے ہاتھ میں نہ سہی کسی ایک ہاتھ میں بلکہ اس کی کسی انگلی میں کچھ تو ہونا چاہیے۔“

وہ میری بات کی تہہ تک پہنچ کر سرخ ہو گئی۔

”اگر آپ اجازت دیں تو ہم دونوں کی تنہائیاں دور ہو سکتی ہیں؟“

”کیا مطلب.....؟“ اس نے متوجہ ہو کر میری طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں سوالیہ نشان بنی ہوئی تھیں۔

”مطلب یہ ہے کہ..... میں نے جیب سے انگوٹھی نکالی اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے میری اس حرکت پر تعجب نہ کیا بلکہ اس کی آنکھوں میں شدید حیرانی بھری ہوئی تھی۔ جب میں اس کی انگلی میں انگوٹھی پسنا رہا تھا تب البتہ اس کے عارض دہک اٹھے۔ اس کی رنگت نکھر آئی تھی۔ حیرانے اسے اتنا حسین بنا دیا کہ دل بے قرار ہو گیا۔ میں نے بڑی مشکل سے دل ہٹاؤں کو سمجھایا اور انگوٹھی پسنانے کے بعد اس سے کہا۔ ”یہ ایک حقیر سا تحفہ ہے۔ اور یہ ہم دونوں کی زندگی.....“

اچانک باہر سے گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی۔ غالباً شامی آگیا تھا۔ اس انجن کی جو گڑا گڑھٹ تھی وہ اسی کی گاڑی کی تھی۔ میں رضیہ سے دور ہٹ کر بیٹھ گیا۔ رضیہ نے جھگڑاتی ہوئی انگوٹھی کو ایک نظر دیکھا۔ اور انگلی پر ڈوپٹے کا کونا لپیٹنے لگی۔ اسی لمحے شامی آیا تو رضیہ اٹھ کھڑی ہوئی ”بھائی جان بھی آگئے۔ میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔“

”وہ جانے لگی تو شامی نے اسے آواز دی۔ رضیہ! اوھر آؤ۔“

”شامی کے لیے اور اندازے ہم دونوں کو چونکا دیا۔ میں نے اسے بے حد سنجیدہ پایا اور چہرے پر ناگواری بھی نظر آئی جیسے اس نے کوئی ایسی بات محسوس کی تھی جو قابل اعتراض ہو۔ رضیہ قریب آئی لیکن وہ اس ہاتھ کو چھپائے ہوئے تھی۔ جس کی ایک انگلی میں انگوٹھی تھی۔

”اپنا ہاتھ دکھاؤ“ شامی نے حکم دیا۔

رضیہ نے دوسرا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا ”خیریت وہ مسکرا دی“ کہیں سے پاسٹری پڑھ کر آرہے ہیں۔

”کیا؟“

”یہ ہاتھ“ نہیں دوسرا.....“ شامی کا لہجہ قدرے سخت ہو گیا۔

”دوسرا ہاتھ.....“ رضیہ اپنا وہ ہاتھ چھپے کرتی ہوئی بولی ”یہ ہاتھ بھی اسی ہاتھ جیسا ہے“

ان دونوں میں کش مکش ہونے لگی۔ رضیہ وہ ہاتھ نہیں دکھانا چاہتی تھی۔ جبکہ شامی اسے دیکھنے کے لیے

رضیہ نے بھائی کے ہاتھ سے پرس لے کر بندے دیکھے تو اس کا چہرہ تازہ گلاب لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں برقی قسموں جیسی روشنی پھیل گئی تھی۔ فرط مسرت سے عارض دہک رہے تھے۔ یہ نظارہ بڑا دل کش تھا۔ وہ میرے صوفے پر دوسرے کنارے پر بیٹھ کر بولی تو اس کے لیے میں سرشاری تھی! آپ کا شکریہ کس زبان سے ادا کروں۔“

”میری زبان سے.....“ شامی نے لقمہ دیا۔

”میرے پاس شکریے کے الفاظ نہیں۔“ وہ اس کی بات نظر انداز کر کے میری طرف متوجہ رہی۔

”کوئی بات نہیں مجھ سے ادھار لے لو مگر جلدی واپس کر دینا تمہارا ادھار بہت خراب ہے۔“

”بھائی جان!“ رضیہ نے احتجاج کیا۔

”تم نے یہ کیا تو پٹانگ اور شکریہ ادا نہ کرنے والی باتیں شروع کر دی ہیں۔ شکریہ ادا نہ کرنا تو صاف صاف کوڈو کہ جی شکریہ ادا نہیں کر سکتیں شکریہ ادا کرنا ہو تو کہو..... میں آپ کی بے حد شکر گزار ہوں ممنون ہوں ہزار الفاظ موجود ہیں۔“

”میں نے یہ امانت شکریے کی وصولیابی کے لیے نہیں بلکہ اپنا فرض سمجھ کر پہنچائی ہے“ میں نے کہا۔

”بھئی آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔“ شامی نے سنجیدگی سے مجھے دیکھا ”آپ اس اہماداری کے صلے میں چائے بھی نہیں پیتیں گے؟“

”تکلف نہ کریں مجھے اجازت دیں۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”نہیں“ نہیں سکندر صاحب“ رضیہ فوراً بول پڑی۔ ”میں آپ کو چائے پلائے بغیر نہیں جانے دوں گی۔

پلیز آپ تشریف لے جائیں۔“

رضیہ اندر چلی گئی۔ کچھ دیر کے بعد وہ ورائی دھکیلتی ہوئی آئی تو میں نے دیکھا کہ اس میں گھری تیارہ کردہ کئی اشیاء بھی ہوئی تھیں۔ رضیہ نے مجھے بڑے اصرار سے ایک ایک چیز کھانے پر مجبور کیا۔ اپنے ہاتھ سے چائے بھی بنا کر پلائی۔ شامی نے چائے کے بعد بھی اٹھنے نہیں دیا۔ بلکہ یہ کہہ کر روک لیا کہ رضیہ ابھی تیار ہو کر شادی میں جائے گی۔ تو وہ اسے شادی کے گھر چھوڑ کر مجھے بھی چھوڑ دے گا۔

رضیہ کچھ دیر کے بعد تیار ہو کر آئی تو میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ بہت سادگی سے تیار ہو کر آئی تھی۔ شامی نے اپنی کھٹارہ گاڑی میں سب سے پہلے رضیہ کو فرحت کے گھر پر ڈراپ کیا پھر مجھے میرے گھر پر اتارا۔ پھر میرا شکریہ ادا کیا۔ اور مجھے تاکید کی کہ میں بلا تکلف ان کے ہاں آتا جاؤں۔

شامی سے مل کر میں بہت خوش ہوا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو ڈاکٹر بتایا تھا۔ وہ وسیع النخیال اور زندہ دل نوجوان تھا۔ مجھے کچھ پر اصرار سما بھی لگا۔ جبکہ رضیہ اس کے برعکس تھی۔ مگر دونوں میں ایک بات مشترک تھی دونوں ہی با اخلاق اور بامروت تھے۔ مجھ سے اس طرح کھل مل گئے تھے جیسے میں ان کے خاندان ہی کا کوئی فرد ہوں۔ جہاں مجھے رضیہ کے حسن نے متاثر کیا وہاں اس کی سادگی بھی بے حد پسند آئی۔

شامی کے ہاں آمدورفت شروع ہو گئی وہ ایک بار ایسا بھی ہوا کہ رضیہ گھر پر آگئی تھی۔ پھر بھی اس نے مجھے بلا خوف و خطر گھر میں بلا کر بٹھایا۔ میری خاطر تواضع کی۔ اس دوران شامی بھی آگیا مگر اس نے میری موجودگی کا برا نہیں منایا۔ اور نہ کوئی تعرض کیا۔ مجھے جلد ہی احساس ہو گیا کہ رضیہ مجھے پسند کرنے لگی ہے۔ وہ کہے یا نہ کہے۔ اس کی آنکھیں کسے دیتی تھیں۔ میں نے وہ ایک بار لمبی غیر حاضری کی تو رضیہ بڑی شامی ہوئی جیسے وہ میرے انتظار

مجھے فوراً ہی اپنی حماقت کا احساس ہو گیا۔ میں نے عین غلطی کی تھی۔ میں شامی سے بات کر لیتا تو بہتر تھا۔ جو کچھ ہوا بہت برا ہوا تھا کمان سے تیر نکل چکا تھا۔ میں نے جھل ہو کر فرس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے۔ سچ پوچھئے۔ تو نادانستہ گئی میں مجھ سے یہ حرکت سرزد ہوئی ہے۔“

”یہ نادانستی نہیں تھی“ شامی کا لہجہ سخت تھا۔ ”یہ سب کچھ تم نے دانستہ کیا ہے۔“

”میں بے حد شرمندہ ہوں۔“

”مجھے تم سے ایسی امید نہیں تھی سکندر! میں تمہیں عام لڑکوں سے مختلف سمجھتا تھا۔ ہر کیف تمہیں اس معیوب حرکت کی سزا ملنی چاہیے۔“

یہ ایک جیسے مجھ پر بجلی سی گرتی۔ میرا سرا جکرا گیا اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ جب اندھیرا چھا تو میں نے شای کی طرف دیکھا اس کی آنکھیں گویا مجھے پہتا ناز کر رہی تھیں۔ ہمارے درمیان گہرا سکوت طاری ہو گیا۔ میرے سینے میں دکھ بھر گیا۔ اور دل میں کوئی نوکسیلی چیز اترتی جا رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں اسے کس طرح سمجھاؤں کہ اب میں رضیہ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

”کل سے تم یہاں نہیں آؤ گے؟“

”جی....“ میں نے حواس باختہ ہو کر اس کی طرف دیکھا ”گر شامی..... میں....“ مجھے ایسا لگا جیسے کمرے میں بھونچال مچ گیا ہو۔ کمرہ چکر کھانا محسوس ہونے لگا۔ میرے بدترین خدشات پر تصدیق کی مہر ثبت کی جا رہی تھی۔

شامی ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”یہ میرا آخری اور قطعی فیصلہ ہے ہر جرم کی سزا ہوتی ہے۔ لہذا اس حرکت کی یہی سزا ہے۔“

کمرے کی ہر چیز میری نظروں کے سامنے گردش کرنے لگی۔ میں نے شامی کی طرف دیکھا اس کی سبکت آنکھیں مجھ پر بھی ہوئی تھیں۔ اگلے ہی لمحے میں نے ایک جھرجھری سی لی۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ اس کی آنکھوں میں ایک خاص طاقت ہے۔ جو میرے ہوش و حواس پر اثر انداز ہونے لگتی ہے۔ میرا جسم ٹھنڈے ٹھنڈے سینے میں جھٹکتا چلا گیا اور میری آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہوتی چلی گئی۔

☆☆☆

میں نہ جانے کب تک شامی کی سحر آنکھوں میں ڈوبا رہا۔ میرے ہوش و حواس ساتھ چھوڑ چکے تھے اور میں پوری طرح ذہنی طور پر اس کے قبضے میں تھا۔ ہوش و حواس سے بیگانگی کے یہ لمحے کس قدر طویل تھے، میں بیان نہیں کر سکتا اور اس دوران میں کیا ہوا، وہ مجھے میرے علم میں نہیں تھا۔ جب میں ہوش میں آیا تو اسی جگہ شامی کے سامنے کھڑا تھا، جہاں ذہنی طور پر اداف ہونے سے قبل موجود تھا۔ شامی کی نظریں اب بھی مجھ پر جبی ہوئی تھیں لیکن اس وقت ان آنکھوں میں وہ چمک نہیں تھی جس نے مجھے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے ہی بیگانہ کر دیا تھا۔ وہ بے حد سنجیدہ تھا۔ میں نے اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے زخمی سے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ میں اس سے رحم کی اپیل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے چہرے پر چھائی ہوئی ستانت کے باعث میری زبان ہی گنگ ہو کر رہ گئی۔

”کل تم یہاں نہیں آؤ گے۔“ شاہی نے سراسر قہقہے ہوئی آواز میں کہا۔ اس کا لہجہ ٹھوس تھا اور اس کے انداز

بعد تھا۔ چند لمحوں کے بعد شامی نے رضیہ کا وہ ہاتھ اپنی گرفت میں لے لیا۔ انگوٹھی کو ایک نظر دیکھا اور سپاٹ لمبے میں پوچھا۔ ”یہ انگوٹھی کسی ہے؟ کس نے دی ہے؟“

”انگوٹھی.....“ وہ اپنے بھائی کو سنجیدہ پا کر کڑبڑا سی گئی۔

”رضیہ میں اس انگوٹھی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ یہ انگوٹھی کہاں سے آئی؟“ اس بار شاہی کا لہجہ سرد تھا۔ پھر اس نے رضیہ کا ہاتھ چھو ڈیا۔

رضیہ نے میری طرف دیکھا اور سر جھکا کر دھیمی آواز میں بولی۔ ”سکندر صاحب نے دی ہے۔“

”سکندر نے دی ہے۔“ شامی نے میری طرف گھوم کر دیکھا۔ اس کی عقاب جیسی آنکھوں سے مجھے خوف آنے لگا۔ ٹھیک ہے۔ تم اندر جاؤ۔

میں بے حد خطرناک اور جان لیوا لمحات سے گزر گیا چکا تھا۔ اور مجھے کبھی خوف نہیں آیا تھا اور نہ ہی میں....." پریشان ہوا تھا۔ مگر اس موقع پر میں گھبرا گیا تھا۔ اس لیے نہیں کہ شای کوئی خطرناک آدمی تھا۔ مجھے اس بات کا دھڑکا لگا ہوا تھا کہ وہ کہیں گھر سے نکل جانے کا حکم نہ دے دے اور پھر میرے لیے اس گھر کے دروازے نہ بند ہو جائیں۔ حیرت اس بات پر ہو رہی تھی کہ وہ ایک روشن خیال آدمی تھا۔ اسے میری آمدورفت پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ بلکہ یہ سلسلہ میں نے خود اسی کے کہنے پر شروع کیا تھا۔ دو چار دن غیر حاضری ہوتی تو وہ میرے گھر آ جاتا تھا۔ دو ایک بار مجھے رضیہ کے ساتھ شاپنگ کے لیے بازار بھی بھیجا تھا۔ اس نے مجھے گھر پر تنہا اور بے تکلف ہو کر باتیں کرتے بھی دیکھا تھا۔ مگر آج وہ اور اس کا رویہ یکسر بدلا ہوا تھا۔ اسے میرا رضیہ کو انگوٹھی پہنانا جیسے بہت ناگوار گزر رہا تھا۔

”بیٹھ جاؤ سکندر!“ اس کے لہجے میں تحکم تھا۔

میں بیٹھ تو گیا لیکن میرے دل میں طرح طرح کے دوسوے پیدا ہو رہے تھے۔ اگر شامی نے اس گھر کے دروازے مجھ پر بند کر دیئے اور رضیہ سے ملنے جلنے پر پابندی لگا دی تو کیا ہو گا؟ کیا میں رضیہ کے بغیر زندگی گزار سکوں گا۔“ رضیہ میری کمزوری بن چکی تھی وہ میری محبت تھی میرے خواب کی تعبیر تھی۔ میری سب سے بڑی آرزو اور تمنائیں وہی تھیں۔ اب میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ میں پہلے بھی ایک بار زخمی ہو چکا تھا۔ وہ گھلاؤ بڑا سنگین تھا۔ مگر میں اسے بھولنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ سبے اختیار میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اگر شامی نے میری محبت کی راہ میں کوئی دبوہ کھڑی کی تو میں اسے گرا کے رہوں گا۔

شامی نے چند لمحوں کی گہری خاموشی کے بعد پوچھا۔ ”کیا وہ تم نے ہی دی تھی؟“

”رضیہ جھوٹ نہیں بولتی۔“

”میں تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔“

”ہاں وہ انگوٹھی میں نے ہی اسے پہنائی ہے۔“

میری بات سن کر شامی کے چہرے پر شکنوں کا جال پھیل گیا۔ ”گو یا تم نے اتنی جرات کی اتنے آگے بڑھ گئے۔ میری آزادی اور روشن خیالی سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ میں رضیہ کا بھائی ہی نہیں اس کا باپ بھی ہوں۔ تم مجھ سے رضیہ کے سلسلے میں کوئی بات کرنے کے لیے اپنے کسی بزرگ کو بھیج سکتے تھے۔“

”میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ خدا کے سوا میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔“

”تمہارا نہ سہی لیکن رضیہ کا سر رست تو اس دنیا میں موجود ہے؟“

سکتا تھا۔ لیکن مسزیک کی بیٹی فردوس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ نوٹی ہوئی پتنگ کسی بھی شاخ سے الجھ سکتی ہے۔ ان دنوں میں بھی ایک کئی ہوئی پتنگ کی طرح ڈول رہا تھا۔ اس لیے حسین اور جوان فردوس میسر آئی تو میں اپنے تمام غموں اور دکھوں کو پس پست ڈال کر اس کے دامن میں اتر گیا۔

.... لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں جس دل میں اتر آیا ہوں وہاں میری نہیں بلکہ میری دولت کی قدرو منزلت ہے، فردوس کی فرمائشیں روز بروز بڑھتی چلی گئیں حتیٰ کہ میں تہی دست ہو گیا۔ مجھے تب بھی فردوس کی حریفانہ فطرت پر غصہ نہ آیا۔ میں تو اپنے نوٹے پھونے سپنوں کو سمیٹ کر وہاں آیا تھا اور چاہتا تھا کہ دل کی لگی کچھ بچھ جائے تو میں کوئی باقاعدہ لائحہ عمل تیار کر کے زندگی گزارنا شروع کر دوں۔ رقم ختم ہو گئی تو میں نے ایک فرم میں ملازمت اختیار کر لی ملازمت اچھی تھی اس لیے خوب کمائے لگا اور جو کچھ بھی ملتا وہ میں فردوس کے ہاتھ پر رکھ دیتا، یہ عارضی بہار تھی، جو جلد ہی بے رخصت ہو گئی۔ مجھے نوکری سے الگ کر دیا گیا اور میں بے روزگار ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ اس تہی دستی کے دوران فردوس اور مسزیک میرا ساتھ دیں گی۔ لیکن جب بے روزگاری کے وقفے میں طوالت آنے لگی تو فردوس کی سانسوں میں جہنم کی تپش پیدا ہوتی چلی گئی۔ دولت میرے لیے کبھی مسئلہ نہیں رہی تھی۔ لیکن اب میں اپنی انگلیوں کو جیب تراشی کے الزام سے آلودہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ میں دو تین سال اس طرح گزار کر پاکستان واپس چلا جاؤں گا۔ اس عرصے میں جیب تراشی کی عادت چھوٹ چکی ہوگی اور مجھے رضیہ کے سلسلے میں شامی سے بات کرنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ وقت بھی میرے لیے کس قدر پریشانیوں اپنے جلو میں سمیٹے ہوئے ہے۔

میرے پاس اب ایک چھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ میں فردوس اور مسزیک سے ادھار لی ہوئی رقم پر گزارا کر رہا تھا۔ اس دوران بار بار جی چاہا کہ کہیں ہاتھ مارا جائے۔ لیکن ہر بار شامی کا چہرہ میرے ذہن میں گھوم جاتا اور اس کی گھورتی ہوئی آنکھیں مجھے اپنے دل میں اترتی محسوس ہونے لگتیں۔ ”میں کسی جیب تراشی کو اپنا بہنوئی نہیں دیکھنا چاہتا۔“ یہ جملہ میری روح کو کچھ کے لگاتا اور میں تڑپ کر رہ جاتا۔ پھر میرا یہ ارادہ مزید مضبوط ہو جاتا کہ میں اب کبھی جیب تراشی نہیں کروں گا۔ مالی حالات خراب ہوئے تو میں نے ملازمت حاصل کرنے کی کوشش تیز کر دی لیکن شاید قدرت نے اس بار میرے مقدر میں بڑی سی طویل بے روزگاری لکھ دی تھی۔ میں دن بھر مارا مارا پھرتا اور شام کو تھک ہار کر واپس آ جاتا۔

رفتہ رفتہ فردوس اور میرے درمیان جسمانی اور پھر ذہنی فاصلہ بڑھنے لگا۔ وہ وقت بھی آگیا جب اس نے مجھے طرح طرح کے کچھ کے لگانے شروع کر دیے۔ اس کے جملے شتر کی طرح میرے دل پر گھاؤ ڈالنے لگے اور میں دن بہ دن حوصلہ ہارنا چلا گیا۔ مجھے ایک طویل انگڑائی کی ضرورت تھی اور اب تو یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے مجھے روز گار کے ساتھ ساتھ رہنے کے لئے ایک نئی جھت بھی تلاش کرنا ہوگی اور پھر ایک روز میرے لیے بدترین اندیشوں کی تائید ہو گئی۔ اس روز میں بے حد پریشان تھا اور میرے دل و دماغ پر مایوسی کے گہرے بادل چھا رہے تھے۔ میں علی الصباح ہی ملازمت کی تلاش میں نکلنے کے لیے تیار ہو گیا۔

جی میں مایوسی کے اندھیروں میں ڈگمگاتا ہوا زینے کی سمت بڑھا تو فردوس کے لپکتے ہوئے الفاظ نے میرے وجود میں ایک ڈنک مارا۔ ”آج آپ اپنا کوئی اور ٹھکانا تلاش کر لیں۔“

اس قسم کے زہریلے فقروں کا میں نہ جانے کب سے عادی ہو چکا تھا۔ میں نے سنی ان سنی کر کے زینے کی جانب ایک قدم اور بڑھایا۔ نفروں کی بوچھاڑ کا یہ ٹولس میں روز ہی وصول کرنا اور اسے سر سے گزر جانے دینا۔

میں حکم کی آمیزش تھی۔

”بھائی جان... رضیہ کی آواز نے ہم دونوں کو چونکا دیا۔“ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“

”شٹ اپ“ شامی گرج کر بولا۔ ”اپنے کمرے میں چلی جاؤ۔ اگر تم نے مداخلت کی تو اس گھر میں خون ہی خون پھیل جائے گا۔“ اس کا لہجہ بے حد خوفناک ہو گیا۔ ”میں نے بابا اور ماں کے بعد تمہیں بھائی بن کر نہیں، باپ بن کر پالا ہے۔ اور اس وقت میں تمہیں باپ کی حیثیت سے حکم دے رہا ہوں کہ اپنے کمرے میں چلی جاؤ۔“

رضیہ کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا کر شامی کے حکم کی تائید کر دی۔ وہ ڈوپٹہ منہ میں ٹھونس کر سسکیاں بھرتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ شامی میری طرف متوجہ ہو اور بولا ”سکندر! میں جانتا ہوں کہ تم ایک اچھے اور نیک انسان ہو۔ لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تمہارا حقدہ کیا ہے تم ایک پاکٹ مار ہو اور میں کسی جیب تراش کو اپنا بہنوئی نہیں دیکھنا چاہتا سمجھ گئے۔“

میں نے بڑے کرب سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ”اب تم جانتے ہو۔“ اس نے دروازے کی طرف انگلی اٹھا کر۔ ”آئندہ تم یہاں قدم بھی نہیں رکھو گے۔“

”میں نے سر جھکالیا اور گھر سے باہر آ گیا۔“

پاکٹ مار ہونا میرے لیے بیحد بڑے فخر کی بات رہی تھی مجھے اس ٹائٹل کے تحت کئی بار خاصا نقصان اور بہت سی تکلیف بھی پہنچ چکی تھی۔ لیکن میں ہر دکھ کو بھٹ کر پی جاتا تھا اور نقصان کی تو مجھے کبھی پروا ہی نہیں رہی تھی۔ لیکن آج زندگی میں پہلی بار پاکٹ مار کی حیثیت سے، خود اپنی نظروں میں گر گیا تھا۔ مجھے اپنی انگلیوں سے نفرت ہونے لگی تھی۔ میں ان فن کار انگلیوں کو پکڑ ڈالنا چاہتا تھا۔ جن سے اب تک میری فتوحات کا سلسلہ چارنا تھا۔ مجھے ان سے گھن آنے لگی تھی۔ میں ایک ایسے طوفان میں گھر گیا تھا جس سے نجات ممکن نہیں لگتی تھی۔

رضیہ کے گھر سے لیاقت آباد، اپنے مکان تک میں کیسے پہنچا، مجھے کچھ معلوم نہیں، میں تو جیسے ایک بگولے میں لپٹا ہوا اسفر کر رہا تھا۔ گردش کر رہا تھا۔ گھوم رہا تھا۔ خود کو ایک ایسے گرداب میں محسوس کر رہا تھا جو مجھے کراچی سے دور بہا کر لے جا رہا تھا۔ جب تراشی کے ابتدائی دنوں میں میرا کافی وقت مغربی پاکستان میں اور بھارت میں گزرا تھا۔ میں بنگلہ دیش جا پہنچا اور تب مجھے احساس ہوا کہ میں کہاں آگیا ہوں۔ لیاقت آباد میں واقع اپنے گھر پہنچ کر مجھے اس کی دیواریں کانٹے کو دوڑ پڑی تھیں۔ اس کراچی نے مجھے بہت دکھ دیے تھے۔ مجھے دولت تو بہت دی تھی لیکن اس کے بدلے میں مجھ سے چھین بھی بہت کچھ لیا تھا میں دولت کے اعتبار سے لکھ پتی اور محبت کے معاملے میں دیوالیہ ہو چکا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب اس شہر میں نہیں رہوں گا۔ رضیہ بالغ تھی۔ وہ اپنی مرضی سے، مجھ سے شادی کر سکتی تھیں لیکن میں اسے بھی شامی کی نظروں سے نہیں گرانا چاہتا تھا۔ میری دنیا ایک بار پھر اندھیر ہو گئی اور اس بار تاریکی اتنی گہری تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ بھی سمجھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے اپنی جیب بوجھ نکالی اور دوپٹیک ڈرافٹ بنوائے، ایک میں نے جیب کے نام پوسٹ کر دیا اور دوسرا رضیہ کے لیے ڈاک کے حوالے کر کے پاکستان سے بذریعہ ہوائی جہاز بنگلہ دیش جا پہنچا۔

وہاں میری ایک قریبی رشتہ دار مسزیک رہتی تھیں۔ میں سیدھا انہی کے ہاں جا پہنچا۔ بہت عرصے بعد ان سے ملا تھا۔ اس لیے انہوں نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ میں یہ عزم کر کے یہاں آیا تھا کہ اب کبھی جیب تراشی نہیں کروں گا۔ میرے پاس گزارے کے لیے کافی رقم تھی۔ میں دو چار سال بغیر کوئی کام کیے اس رقم سے وقت گزار

میں تین دن تک مسلسل ایک ہی اشتہار شائع ہو رہا تھا، جس کی عبارت کچھ یوں تھی۔ ”ایک تن تھا، ذہن، تعلیم یافتہ اور شائستہ مزاج جوان کی ضرورت ہے۔ مشاہرہ توقع سے کہیں زیادہ دیا جائے گا۔ نسیم شیخ“ پتا پوسٹ بکس نمبر کا تھا۔

معا میرے دل میں شک کے سائے لہرائے، یہ نسیم شیخ کوئی فراڈی، یا اسمگلر تو نہیں جو کسی نوجوان کو اپنا آلہ کار بنا کر کوئی بڑا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہو۔ ویسے بھی نوجوان لڑکے دولت کے لالچ میں سر پھرے بن جاتے ہیں۔ اس زمانے میں ایسا کون شخص ہو گا جو دولت کی دوڑ میں آگے نہ نکلتا چاہتا ہو۔ میں خود کو بھی انہی لوگوں میں شمار کرتا تھا۔ کیونکہ بغیر پیسے کے اس دنیا میں جینا کتنی کی زندگی سے بھی بدتر تھا۔

میں نے نويس منزل پر پہنچ کر اس کمرے کا دروازہ بڑی آہستگی سے اندر کی طرف دھکیلا تو کمرے میں بھنبھناہٹ سی گونج اٹھی۔ اندر بے شمار امیدوار کسی قدرے بے ترتیبی اور بد نظمی سے چاروں طرف کھڑے ہوئے تھے۔ میں چونک سا گیا اور اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔ امیدواروں میں جوان نوجوان لڑکوں کے ساتھ ساتھ اویس عمر کے مرد بھی موجود تھے۔ مشاہرے کا لالچ ان سب کو کھینچ لایا تھا۔ جب میں نے اس بھیڑ بھاڑ کا سرسری جائزہ لیا تو میرے اندر شکستگی بھرنے لگی۔ ان میں اکثر جوانوں کی پیشانیوں میں اور آنکھوں میں ذہانت کے ستارے جھلما رہے تھے۔ وہ بڑے جاذب نظر، وجیبہ، اور بلند قامت کے تھے، ان کے کلیمن شیو چروں اور ترو تازہ ہونٹوں پر ایک دل کش فاختانہ مسکراہٹ نکھری ہوئی تھی۔ ان کا ظاہری حسن وضع قطع اور شائستگی ہر کسی کو حائر کر سکتی تھی۔

میں نے ایک سرد آہ بھری اور ان سب پر حسرت ناک نگاہ ڈال کر رہ گیا۔ میں نے اپنے دل میں امیدوں کا جو چراغ جلا دیا تھا۔ وہ یہاں آتے ہی مایوسی کے چھپرٹوں سے بجھنے لگا۔ میں نے لمحے بھر کو سوچا بھی کہ یہاں سے ابھی اور اسی وقت واپس چلا جاؤں کیونکہ قسمت آزمائی کا موقع ملنے کی امید بھی نہیں تھی مگر پھر ایک خیال یہ بھی آیا کہ یہاں سے نکل کر کہاں جاؤں گا! باہر چلپاتی دھوپ میں سڑکیں ناپنے سے بہتر ہے کہ اس سرد کمرے میں بیٹھا رہوں۔

جس کسی نے مجھے دیکھا، وہ میرے چہرے مرے اور کپڑوں کو دیکھ کر بے ساختہ مسکرا دیا مگر میں ان سب کو نظر انداز کرتا ہوا سیدھا اس کاؤنٹر کے پاس پہنچا۔ ایک دل ربا ”قیامت“ وہاں موجود تمام امیدواروں سے ہبے نیاز ایک رجسٹر پر جھکی ہوئی تھی جب میں اس کے قریب پہنچا تو میری سانسیں اس کے لباس سے اٹھتی ہوئی خوشبو سے مہک اٹھیں۔ جیسے ہی اسے میری موجودگی کا احساس ہوا اس نے اپنا جھکا ہوا سراور اٹھایا اور اس کی آنکھیں سوالیہ نشان بن گئیں۔ ”نیں پلیز“ اس کے لمبے میں ہلکی سی جھجھلاہٹ تھی۔

میں نے آہستگی سے انٹرویو لیٹر اس کی جانب بڑھا دیا۔ اس نے خط کھول کر اس پر ایک سرسری نگاہ ڈالی اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”آپ کو دس بجے کا وقت دیا گیا تھا اور آپ بارہ بجے تشریف لارہے ہیں!“ اس کے شیریں لمبے میں سرزنش کا انداز تھا۔

میں نے شوخی سے پوچھا۔ ”دس اور بارہ میں کوئی خاص فرق ہے کیا؟“

”یعنی دو گھنٹے کی تاخیر کوئی معنی نہیں رکھتی؟“ اس نے مجھے گھورتے ہوئے جواب دیا۔ ”وقت کی پابندی ضروری ہوتی ہے مسٹر!“

”وقت کی پابندی ہم دونوں پر لازم ہے۔“ میں اس کی گہری آنکھوں میں ڈوب کر بولا۔ ”نہیں تو یہ گاڑی

میرے پاس اس کا کوئی جواب ہو بھی کیا سکتا تھا؟

میں بڑے اطمینان سے زینے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ فردوس شاید میری اس سرکشی پر برہم ہو گئی تھی غالباً آج وہ کوئی اہم فیصلہ کرنے پر تلی بیٹھی تھی۔ وہ اونچی آواز سے چیخی تو اس کے لمبے میں تندی تھی۔ ”میں آج دوپہر تک کمرہ خالی چاہیے ورنہ۔“

اس کا یہ جملہ میرے لیے نیا اور اس قدر سستی خیز تھا کہ بے اختیار میرے قدم ساکت ہو گئے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے پلٹ کر اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں جھانکا۔ ان آنکھوں میں نفروں کے ساتھ ساتھ سفای بھی نمایاں تھی۔ اس کا حسین چہرہ پتھر کے کسی مجسمے کے چہرے کی طرح سچا اور بے حسن دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اور آج اس کی حسین آنکھوں میں محبت کی ہلکی سی رمت بھی نہیں تھی جبکہ... پہلے اس کی یہی دل نواز آنکھیں مجھے دیکھ کر ستاروں کی طرح جگمگاتے لگتی تھیں، اس کے کان میری آہٹ سننے کے منتظر رہتے تھے، اس کی زلفیں ہمہ وقت میرے شانوں پر نکھرنے کے لئے بے چین رہا کرتی تھیں۔

میرا قصور صرف اتنا تھا کہ میں نے فردوس کے توسط سے دس گنگے کے ایک نوٹ کی درخواست مسز بیک تک پہنچانا چاہی تھی کیونکہ آج مجھے کوئی تین سوواں انٹرویو دینے، نسیم شیخ کے ہاں جانا تھا۔ میری جیب میں صرف ایک نکی کانٹ تھا۔ جو بس کے سفر میں یک طرفہ ساتھ دے سکتا تھا۔ میں کل رات سے بھوکا بھی تھا، تاہم مجھے ناشتے کے لیے نہیں بلکہ سفر کے لیے رقم کی ضرورت تھی۔ اپنی ضرورت کا اظہار جب میں نے فردوس کے سامنے کیا تو وہ اس طرح بھڑک اٹھی کہ جیسے میں نے اسے ڈنک مار دیا ہو۔

میں تھکے تھکے قدموں سے زینے اتر کر باہر نکل آیا۔ سڑک پر ایک عورت اپنے کتے کو قصاب کی دوکان سے تازہ گوشت خرید کر کھلا رہی تھی۔ وہ جانور برا خوش نصیب تھا اور میں ایک انسان ہوتے ہوئے بھی اس سے کہیں بدتر تھا لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ آج کل انسان سے نہیں، اس کی حیثیت سے محبت کی جاتی ہے۔ فردوس نے بھی مجھے نہیں چاہا تھا، میری جیب سے محبت کی تھی۔ میری خالی جیب نے اس کے دل سے محبت کا ہر نقش مٹا دیا تھا۔ اس نے یوں آنکھیں پھیر لی جیسے اس کا مجھ سے کوئی واسطہ ہی نہ رہا ہو۔ ان احساسات نے میرے دل پر ایک گھاؤ لگا دیا۔

میں نے بس اسٹاپ پر پہنچ کر اپنے ذہن سے ان خیالات کو جھٹکنے کی پوری کوشش کی لیکن دل پر جو دکھ کی چٹان جم گئی تھی وہ سرک بھی نہیں سکی۔ میں بس میں سوار ہو کر اپنی آنکھوں کی نمی چھپانے کے لیے گھڑکی سے باہر دیکھنے لگا ہر طرف زندگی رواں دواں تھی۔ میرا دل بے طرح بھر آیا اور میں جذبات کی لہروں میں بننے لگا۔ اگر کندہ نگر کی پاٹ دار آواز مجھے نہ چو لگاتی تو میں خیالوں کی رو میں بہتا ہوا جانے کس اسٹاپ پر جا پہنچتا۔ میں بدحواس سا بس سے اتر اور کسی شکست خوردہ سپاہی کی طرح چلتا ہوا ہوٹل انٹرکانٹی نیٹل تک جا پہنچا۔ لفٹ میں سوار ہو کر نویں منزل کی طرف جاتے ہوئے میں نے نسیم شیخ کا ار سال کردہ انٹرویو لیٹر جیب سے نکالا اور اسے بارہویں مرتبہ پڑھنے لگا۔ ایک سفید اور سادہ کاغ پر یہ عبارت ٹائپ کی ہوئی تھی۔ ”آپ اپنی دستاویز کے ساتھ مورخہ یکم مئی بروز پیر صبح دس بجے انٹرویو کے لیے حاضر ہو جائیں۔ نسیم شیخ۔“

میں نے اس سے پہلے شاید ہی کوئی خط سادہ کاغ پر ٹائپ کیا ہوا دیکھا ہو۔ اس پر صرف ہوٹل کا پتا اور کمرہ نمبر درج تھا۔ یہ انٹرویو کسی فرم کی جانب سے نہیں بلکہ شخصی طور پر جاری کیا گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آسکا کہ آخر اسے کس اسامی کو پر کرنے کے لیے کیسے آدمی کی ضرورت ہے۔ نسیم شیخ کی جانب سے ایک مقامی روزنامے



کیسے چلے گی؟" میں نے اس کے اور قریب ہو کر سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" اس نے برہمی سے انگریزی میں پوچھا۔

"آپ لوگوں نے ان سب کو یہاں انٹرویو کے لیے صبح دس بجے بلایا تھا۔" میں نے اس کی برہمی کا اندازہ کرتے ہوئے پلٹ کر امیدواروں کی جانب اشارہ کیا۔ "کیا ان لوگوں کا انٹرویو ہو گیا ہے؟ یا یہ سب پرائز بانڈ کے کسی بڑے نتیجے کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں؟"

اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں اور پھر سکڑتی چلی گئیں۔ وہ لاجواب سی ہو کر مسکرائی تو جیسے کلیاں چلک اٹھیں۔ میں نے محض دل بستگی اور وقت گزاری کے لئے اپنا عذر پیش کیا "دو گھنٹے کی تاخیر میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ اس ملک میں ٹرانسپورٹ کا نظام بڑا ناقص ہے!"

"میں آپ کی معذرت قبول کرتی ہوں۔" وہ ٹھکتے ہوئے لہجے میں بولی "آپ کی سزا یہ ہے کہ آپ کی باری سب سے آخر میں آئے گی۔"

"کیا یہاں دوپہر اور رات کے کھانے کا بھی کوئی انتظام کیا گیا ہے؟" میں نے سنجیدہ ہو کر پوچھا۔

"اس کے حسین چہرے پر تجرہ ابھر آیا۔ وہ کس لیے؟"

"لیکن رات کے کھانے کے وقت سے پہلے پہلے میں اپنی باری کی امید رکھوں؟" میں نے امیدواروں کے جھوم کی طرف اشارہ کیا۔

"کیوں نہیں؟" وہ اپنی ہنسی پر قابو نہ پاسکی اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "صرف ایک گھنٹے میں ان سب کو فارغ کر دیا جائے گا۔ آپ دوپہر کا کھانا بڑے اطمینان سے اپنے گھر پر کھا سکتے ہیں۔"

وہ یکایک اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اس نے ایک رجسٹر اور فائل اٹھائی اور سامنے والے کمرے کا دروازہ کھولی کر اندر داخل ہو گئی۔ اس کمرے کے باہر ایک خزانہ قسم کا گور کھا چڑاسی اسٹول پر بیٹھا ہوا تھا جو تمام امیدواروں کے مقابلے میں کسی قدر صحت مند اور توانا جسم کا تھا۔ مجھ جیسے دس آدمی بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ انٹرویو میں دو گھنٹے کی تاخیر کی وجہ کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ امیدواروں میں بے چینی اور اضطراب کی جولاہی اٹھی تھی وہ بدھتی ہی جا رہی تھی۔ وہ لڑکی چند لمحوں کے بعد مسکرائی ہوئی کمرے سے باہر آئی۔ اس نے اپنے ہاتھ میں جو رجسٹر تھا ہوا تھا اس کو کھولا اور اپنے کاؤنٹر پر بیٹھ کر باریک آواز میں ایک نام پکارا۔ "جناب عزیز الرحمن!"

گور کھا چڑاسی بڑے جارحانہ انداز میں اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازے کے پاس مستعد ہو کر کھڑا ہو گیا۔ سب سے پہلے جس کا نام پکارا گیا تھا۔ وہ ایک وجہیہ اور کسرتی بدن کا نوجوان تھا۔ وہ اپنی ٹائی کی گرہ درست کرتا ہوا اندرونی کمرے کی طرف بڑھا تو اس کی چال میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ تھی۔ اس کے متمنت ہوتے چہرے پر پسینے کی بوندیں پھوٹ رہی تھیں۔ وہ نروس سا ہو کر دروازے کے پاس پہنچا تو چڑاسی نے دروازہ صرف اتنا کھولا کہ ایک آدمی یہ آسانی گزر کر اندر جاسکے اور کمرے کا اندرونی منظر باہر والوں کو نہ دکھائی دے۔ اس امیدوار کے اندر داخل ہوتے ہی چڑاسی نے فوراً دروازہ بند کر دیا۔ اس قدر پر اسرار سی احتیاط میری سمجھ سے بالاتر تھی۔

انٹرویو کا آغاز کیا ہوا اس ہال نما کمرے میں ایک بھونچال سا آگیا یوں لگتا تھا جیسے دشمن نے اچانک ہی طبل جنگ بجادیا ہو اور سب اپنی اپنی محفیں درست کرنے لگے ہوں۔ کسی نے اپنے کوٹ کے بٹن لگائے تو کسی نے اپنے چمک دار جوتوں کی پالش کا جائزہ لیا۔ اگر یہاں میک اپ کے لوازمات اور قدم آدم آئینہ ہو تا تو غالباً میک اپ بھی شروع ہو جاتا مگر ان کے سینوں کا زیر و بم اور اضطراب کی جھللاہٹ دیکھ رہا تھا۔ ہر کسی کو شاید اپنی کامیابی کا دم

تھا۔

میں استقبالیہ کاؤنٹر سے ہٹ کر ایک کرسی پر راجمان ہو گیا جو بیرونی دروازے کے قریب رکھی ہوئی تھی۔ میں اس جگہ بیٹھ کر اس کمرے کے اندر جانے اور باہر آنے والے امیدواروں کے چہرے پر بڑھ سکتا تھا۔ کاؤنٹر پر جو قیامت بیٹھی تھی وہ بھی میری نظروں کی گرفت میں تھی۔ جب بھی میری نظریں اس سے چار ہوتیں تو اس کے لبوں پر ایک پراسرار سی مسکراہٹ ابھر آتی۔ جانے کیوں مجھے اس مسکراہٹ سے ایک انتہائی خوف سا محسوس ہونے لگتا اور جسم میں سنسنی دوڑ جاتی۔

پہلے امیدوار کو اندر گئے ہوئے ایک لمحہ بھی نہیں گزرا تھا کہ وہ دیوانوں کی طرح باہر نکلا۔ اس کی حالت عجیب سی ہو رہی تھی۔ اس کی چھٹی پھٹی آنکھوں میں دہشت نمایاں تھی۔ اور چہرہ زرد پڑا ہوا تھا۔ وہ تیر کی مانند ہمارے درمیان سے نکلتا ہوا چلا گیا۔ میں نے اور دوسرے امیدواروں نے اسے شدید حیرانی سے جالتے دیکھا تھا۔ دوسرا اندر گیا بھی نہیں تھا کہ وہ کسی جانور کی طرح دم دبا کر بھاگا۔ تیسرے نمبر پر جو صاحب گئے تھے وہ سٹ پٹاتے ہوئے نکلے اور لڑکھڑاتے ہوئے سیدھے باہر کا راستہ لپا۔

ہم سب اپنی جگہ دم بہ خود تھے۔ جو امیدوار بھی اندر جاتا، وہ چند لمحوں بعد یہ اس طرح واپس آتا کہ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہوتیں۔ ایک صاحب تو اندر سے نکل کر باہر کی جانب اس تیزی سے دوڑے جیسے ان کے تعاقب میں کوئی غیثت روح لگی ہوئی ہے۔ ان کے اوسان قابو میں نہیں تھے۔ باہر کے دروازے تک پہنچتے پہنچتے وہ کئی بار لڑکھڑائے مگر جیسے تھپتھپے باہر نکل ہی گئے۔ ناکام امیدواروں کی اس ہیئت کدائی پر مجھے ہنسی کے ساتھ ساتھ ترس بھی آ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ خدا معلوم ان امیدواروں کے ساتھ اندر کیا ماجرائیں آ رہا ہے؟ اندر نسیم شیخ ہے یا کوئی بلا انسانی شکل میں موجود ہے۔ مجھے دیکھو وہ لرزے کا مریض بنا ہوا واپس آ رہا ہے۔ ان لوگوں کی بگڑی ہوئی مضحکہ خیز شکلیں دیکھ دیکھ کر اکثر نوجوانوں کے چروں کے رنگ اڑ گئے تھے۔ وہ مسکراتا بھی بھول گئے تھے۔ فضا انتہائی سوگوار ہوتی جا رہی تھی۔

ان امیدواروں میں ایک جانب ایک صاحب بڑے سورما بنے ہوئے کھڑے ہوئے تھے۔ ان کی باری آئی تو وہ سینہ تان کر کسی جرنیل کی طرح اندر گئے مگر جب باہر نکلے تو اپنی ساری چو کڑی بھولے ہوئے تھے ان کے ایک دوست نے انہیں آہستگی سے آواز دی مگر انہیں تو اپنا ہی ہوش نہیں تھا۔ وہ استقبالیہ کمرے میں پاگلوں کی طرح ادھر ادھر بھاگتے رہے جیسے کوئی کھڑکی تلاش کر رہے ہوں تاکہ اس کھڑکی کے راستے چھلانگ لگا کر خود کشی کر لیں۔ موصوف کو کوئی کھڑکی دکھائی نہیں دی تو وہ پاگلوں کی طرح ہستے ہوئے باہر نکل گئے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر کئی امیدواروں نے چپ چاپ کھٹک جانے میں اپنی عافیت سمجھی اور انٹرویو دیے بغیر ہی بھاگے نکلے۔

میرے جسم میں بھی ٹھنڈے پسینے پھوٹ رہے تھے۔ میں کوئی تیس مار خاں تو نہیں تھا۔ میرے دل میں آیا کہ میں بھی کسی زمانے کھٹک ہی لوں یہ سوچ کر میں اپنی کرسی سے اٹھا ہی تھا کہ ایک نوجوان نسیم شیخ کے کمرے سے نکلا۔ اس کی آنکھوں اور چہرے پر خوف و ہراس نمایاں تھا۔ میں نے اس کا راستہ روک کر پوچھا "اندر کون ہے؟" نسیم شیخ کوئی عفریت ہے یا وحشی درندہ؟ جو آپ اس قدر حواس باختہ ہو رہے ہو۔؟"

اس نوجوان نے متوشل نظروں سے میری طرف دیکھا "وہ عفریت ہے۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔" اس کی آواز لرزے لگی۔ "میں نے اپنی زندگی میں کبھی ایسی خوفناک عورت نہیں دیکھی شاید ایسی عورت کا ذکر بھی نہیں سنا۔"

"نسیم شیخ عورت ہے!" میں اس طرح اچھلا جیسے مجھے ڈنک لگا ہو۔ مجھے اپنے کانوں پر اس لیے یقین نہیں آیا

جب میں نے اس کمرے میں قدم رکھا تو میرے پیروں میں ڈنگاٹ تھی۔ میں نے دروازے کے پاس کھڑے ہو کر سامنے نگاہ اٹھاتے ہوئے بدن میں ایک بھر بھری سی محسوس کی۔ میں نے سم کر دیکھا۔ ایک لمبی چوڑی اور بے حد صاف ستھری میز پر ایک فائل کھلی ہوئی رکھی تھی۔ اس فائل پر ایک عورت جھکی ہوئی تیزی سے کچھ لکھنے میں منہمک تھی اس کے لکھنے کے انداز سے حکمت جھلک رہی تھی۔ وہ بغیر آئین کے سفید بلاؤز اور سفید ساڑی میں لمبوس تھی۔

میری آنکھوں کے سامنے پھیلتا ہوا گھپ اندھیرا ایک تیز اور چندھیادینے والی روشنی میں بدل گیا۔ میں نے اپنی پلکیں جھپکاتے ہوئے حیرت سے سوچا کیا پڑیل ایسی ہی ہوتی ہے؟ وہ میرے اس تصور سے یکسر مختلف تھی جو میں نے اپنے ذہن میں قائم کر لیا تھا۔

وہ تو آسمان پر دکھتا ہوا اور مسکراتا ہوا ایک چاند تھا جو نجانے کب اور کیسے زمین پر اتر کر اپنی تمام تر رعنائیوں سمیت اس میز پر جگمگا رہا تھا۔

قدرت کے اس نادر شاہکار کو دیکھ کر میری تیز زدہ آنکھوں میں ایک عجیب سا نشہ چھا گیا تھا۔ میرے سامنے ایک جیتی جاگتی تصویر کسی خوب صورت مجسمے کی مانند حکمت اور وقار سے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ قدرت کی منامی کا منہ بولتا شاہکار تھا۔ اس کے گردن تک نفاست سے ترشے ہوئے بالوں میں چاندنی برس رہی تھی۔ کھلی کھلی پیشانی، بڑی بڑی غلافی آنکھیں، سبیل نقش و نگار ساڑھی کی دودھیارنگت نے اس کے رخساروں اور حسین بانوں کی گلابی رنگت اور پرکشش بنا دی تھی۔ اس کے گلے میں پڑی سچے موتیوں کی مالانے اس کے حسن میں ندرت پیدا کر دی تھی۔ اپنی آن بان اور ظاہری وضع قطع سے وہ کسی شہزادی کے مانند دکھائی رہی تھی۔

میں نے اپنے چکراتے ہوئے دماغ پر قابو پایا اور اپنے تلے قدموں سے چلتا ہوا میز کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اس کا تراشیدہ، چھری اور نازک شاخ جیسا بدن قریب سے اور اس کی شکل نظر آ رہا تھا۔ میری نگاہیں اس کے سراپا کے کسی ایک حصے پر ٹک ہی نہیں رہ تھیں۔

”تشریف رکھیے!“ ایک بارگی فضا میں جل ترنگ بج اٹھے۔ لمبے کی نفاست میں فصاحت بول رہی تھی، تاہم اس کی گردن اب بھی جھلی ہوئی تھی۔ وہ فائل میں لگی ہوئی درخواست پر کوئی نوٹ لکھتی جا رہی تھی۔ میں نے کرسی اپنی جانب کھینچی اور بڑی آہستگی سے اس پر اپنے آپ کو گرا دیا۔ اگر چند لمبے اور مجھے پیٹھے ٹھونکے کئی تو شاید میرے لیے اپنے قدموں پر کھڑا رہنا دشوار ہو جاتا۔

”آپ کا تعلق کہاں سے ہے؟“ اس نے سپاٹ اور کاروباری لمبے میں پوچھا۔

”میرا تعلق“ میں نے فوری طور پر جواب دینے میں پس و پیش کیا۔ میرے حلق میں گراہیں پڑ گئی تھیں۔ میں نے ہشکل جواب دیا۔ ”اس سرزمین سے جو میری دشمن بن گئی ہے۔“

اس نے میری آواز میں لرزیدگی اور طنز محسوس کیا تو اس کا لکھتا ہوا ہاتھ یک لخت رک گیا۔ اس نے چونک کر اپنی صراحی دار گردن اوپر اٹھائی۔ ہم دونوں کی نظریں چار ہوئیں، میں بلور جیسی صاف شفاف غلافی آنکھوں کی تاب نہ لا سکا۔ ان آنکھوں کے حیرنے میرے سینے میں آہوں کا غبار سا بھر دیا۔

نیم شیخ نے مجھے دیکھا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگیں۔ غلابا اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کہ کوئی شخص اس طے میں انٹرویو دینے بھی آ سکتا ہے۔ اس نے تھیر کے عالم میں اپنا سڈول اور حسین ہاتھ میری جانب بڑھایا۔ ”آپ کے کاغذات کہاں ہیں؟“

کہ وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھا۔ میں نے تھیر زدہ لمبے میں پوچھا۔ ”آپ سچ کہہ رہے ہیں۔ واقعی عورت ہے؟“

”اسے عورت کہنا عورت کی توہین ہے۔“ اس نے یک بارگی پلٹ کر اس کمرے کی جانب دیکھا تو اس کی آنکھیں خوف سے پھٹنے لگیں۔ ”اس سے شیطان بھی پناہ مانگے گا۔“

اس نے باہر کی جانب قدم بڑھایا ہی تھا کہ میں نے لپک کر اس کا بازو پکڑ لیا۔ ”آخر وہ عورت ہے کیا چیز؟“ اس نے اپنی سر اسیمبلی پر کسی حد تک قابو پا کر سرگوشی میں کہا۔ ”میرے دوست! یہاں سے بھاگ چلو۔ عورت تو کیا چیز، وہ فرشتہ اجل ہے۔ کیوں اپنا خون اور وقت ضائع کرنا چاہتے ہو؟“

”مجھے یہ بتاؤ کہ اندر داخل ہوتے ہی وہ عورت کس طرح پیش آتی ہے؟ وہ کیا ہاتھ ہے؟ وہ کیا پوچھتی ہے؟ آخر وہ کون سی ایسی بات ہے جس میں ہر کوئی دہشت زدہ ہو کر باہر چلا آتا ہے؟“ میں نے اس کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑ دیا تاکہ وہ ہوش میں آکر کچھ تفصیل بتائے ”کیا وہ کوئی انتہائی بد صورت عورت ہے۔ کہ اسے دیکھتے ہی لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔“

اس نے ایک جھپٹکے سے اپنا بازو چھڑا لیا ”مجھے روکو نہیں.... جانے دو.... وہ ناگن ہے، فتنہ ہے، آسمانی بلا ہے.... وہ آ رہی ہوگی.... آ رہی ہوگی۔“

میں باہر کے دروازے کی راہ میں حائل کھڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر خنقی ابھری۔ اس نے مجھے دھکا دیا تو میرے لیے اپنا توازن برقرار رکھنا مشکل ہو گیا۔ میں دیوار سے جا ٹکرایا اور وہ دروازہ کھول کر یہ جاوہ جا۔

ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو سن کر کوئی آٹھ دس جوان لڑکے اور اویس عمر کے آدمی بھی باہر نکل گئے لیکن میں حیران و پریشان اور کسی قدر ہراساں ہو کر اپنی جگہ ایک بے جان سا مجسمہ بنا کھڑا رہا۔ میں اس عورت کے بارے میں جتنا سوچتا، میرا دماغ اتنا چکراتے لگتا۔ میرے دل میں خوف کی جگہ تجسس نے لے لی۔ نگاہ غیر ارادی طور پر گاؤنٹر کی جانب اٹھ گئی۔ وہ قیامت میری جانب درزیدہ نظروں سے دیکھتی ہوئی، میری دگرگوں حالت پر لطف اندوز ہو رہی تھی۔ میں نے بھی ایک شوخ اور چلبلی مسکراہٹ اس کی جانب بھیجی تو وہ سرخ ہو گئی۔ میں نے کرسی پر بیٹھ کر گہرا سانس لیا۔ میرے دل میں نیم شیخ کا خوف آہستہ آہستہ دور ہوتا جا رہا تھا۔

میں آخری امیدوار رہ گیا تھا۔ جب میری باری آئی تو میں اپنی جگہ سے اٹھا۔ میں پوری طرح اپنے حواس اور قابو میں تھا، پھر بھی میری پیشانی پر پسینے کی بوندیں پھوٹ پڑی تھیں۔ جب میں نے نیم شیخ کے کمرے کی جانب جاتے ہوئے اس بت گنگناز پر ایک نگاہ ڈالی تو وہ یکایک کھکھلا کر ہنس پڑی، پھر اپنی ہنسی دباتی ہوئی بولی۔ ”چلے مسٹر اب آپ بھی اپنی قسمت آزمائیں۔“

اس کے انداز میں کسی قدر متحیر سا تھا مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرے اندر چلنے کی سکت بالکل نہیں رہی ہے۔ میں اندر سے کھوکھلا نڈھال اور بے جان سا ہوا جا رہا تھا جیسے لقی و دق صحرا میں بیٹی ہوئی دھوپ اور ریت پر چلنے ہوئے میلوں کی مسافت طے کر کے چلا آ رہا ہوں۔ نیم شیخ کے خوف نے نہیں بلکہ بھوک نے مجھے اس حالت کو پہنچا دیا تھا۔ رات میں نے ایک معمولی سے ہوٹل میں واپس قسم کی چائے پی تھی اور بھوکا سو گیا تھا۔ صبح سے اب تک ایک کھیل بھی اڑ کر منہ میں نہیں گئی تھی۔ میرے دل کے کسی گوشے میں نیم شیخ بھی خوف بن کر بیٹھی ہوئی تھی اس چیل کا تصور بڑا ہی وحشت ناک تھا۔

گور کھا چرایا جانے کم کام سے باہر چلا گیا تھا۔ دروازہ کھولنے بند کرنے کے فرض بھی مجھے ہی ادا کرنا پڑا۔

”میری نگاہ لمحے بھر تک اس کی حسین اور سڈول کلائی پر جمی رہی۔ میں نے اپنی جیب سے انٹرویو لیٹر نکال کر اس کی جانب بڑھا دیا۔ اس نے میرے خط پر ایک نظر ڈالی اور اسے میز پر بھی سے پھینک دیا۔ ”میں نے آپ سے خط نہیں، آپ کی دستاویزات مانگی ہیں۔“ وہ تپتی سے بولی۔

”اگر دستاویزات دیکھ کر ملازمت دینا تھی تو پھر اس ڈرامے کی کیا ضرورت تھی۔“ میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔

”کیسا ڈراما؟“ نسیم شیخ کی حسین پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔ ”کیا خیال ہے آپ کا یہاں کسی ڈرامے کی ریہرسل ہو رہی ہے؟“

اس کی تیوریاں دیکھ کر میری رگوں میں سرد لہر سن سانگی تاہم میں نے جی کڑا کر کے جواب دیا۔ ”ڈرامے سے میری مراد انٹرویو ہے۔ صرف تعلیمی اسناد کی اہمیت تھی تو اتنے بے شمار امیدواروں کو یہاں بلا کر انھیں خوف زدہ کر کے بھاگنے کی کیا ضرورت تھی؟ آپ کو چاہیے تھا کہ درخواست کے ساتھ دستاویزات منگوا کر اپنی پسند کا امیدوار منتخب کر لیتیں۔“

”کیا آپ مجھے مشورہ دینے کے لیے تشریف لائے ہیں؟“ اس کے رخسار دھک اٹھے۔

میرے خشک ہونٹوں پر پچھلی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ میں اطمینان سے کرسی پر پھیل گیا۔ کرسی کشادہ اور آرام دہ تھی، میرے جسم کو کسی قدر سکون سا محسوس ہوا۔ اب مجھے نوکری کی پرواہ بھی نہیں رہی تھی۔ میں ایک طویل سانس لے کر بولا۔ تقریباً تین سال سے بے روزگار ہوں اور انٹرویو دیتے دیتے تنگ آچکا ہوں مجھے کہیں بھی ملازمت نہیں ملتی حالانکہ میری صورت شریفوں جیسی ہے۔ تنگ آکر میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب جہاں کہیں بھی انٹرویو دینے جاؤں گا۔ وہاں، پہنچ کر انٹرویو لینے والے کا انٹرویو شروع کر دوں گا۔ اسی لیے آپ کو مشورہ دینے کی جسارت کر رہا ہوں؟

”آئی سی۔“ نسیم شیخ کے ترشے ہوئے گلابی لبوں پر مسکراہٹ ابھر آئی اس نے میز پر سے خط اٹھایا اور فائل میں سے میری درخواست نکال کر ریلی آواز میں بولی۔ ”آپ میرا انٹرویو لینا چاہتے ہیں؟“ گھنیری پلکوں کی اوٹ میں جھانکتی ہوئی آنکھیں میرے چہرے پر جم گئیں۔

میں ان نگاہوں کی تاب نہ لا سکا۔ میں نے کسماتے ہوئے پہلو بدلا اور قدرے سنبھل کر جواب دیا۔ ”آپ کی طرف سے مایوس ہو جانے کے بعد میرے لیے یہی ایک صورت باقی رہ جاتی ہے۔ میں آپ سے انٹرویو لے کر اپنی خوش نصیبی پر ناز کرتا ہوا چلا جاؤں گا۔“

اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ میری درخواست بڑے اٹھاک اور توجہ سے پڑھتی جا رہی تھی۔ یک لخت اس کے چہرے پر دل چسپی اور حیرت نمایاں ہونے لگی۔ اس نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں بلور کی سی چمک تھی۔ وہ تجب سے بولی۔ ”آپ بڑے قابل، ذہین، اور تعلیم یافتہ نوجوان ہیں۔ حیرت ہے کہ آپ جیسے شخص کو ملازمت نہیں ملی جبکہ آج کل کسی شخص میں اتنی قابلیت اور صلاحیت موجود نہیں ہوتیں آپ اپنی اسناد ساتھ کیوں نہیں لائے؟“

”اس لیے کہ ان میں دو چیزوں کی کمی رہ گئی ہے، اور ان کے بغیر کہیں نوکری نہیں ملتی۔“ میں نے افسردگی سے جواب دیا۔ ان کے بغیر ادھر رہ گیا ہوں۔“

”وہ کوئی چیزیں ہیں؟“ نسیم شیخ نے اشتیاق سے پوچھا۔

”ایک کا نام ہے شفا رش!“ میں نے گمراہ سانس لیا۔ ”دوسری چیز کا نام ڈو میا سائل ہے۔ میرے پاس ڈو میا سائل نہیں ہے البتہ مسائل کی ایک لمبی فہرست موجود ہے۔ اجازت دیں تو میں پیش کروں؟“

جانے کس خیال سے نسیم شیخ کے چہرے پر ایک دم ابھری اور آنکھوں میں قمقمے روشن ہو گئے۔ اس نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ میں تمہیں ملازمت دے سکتی ہوں لیکن چند ایک شرائط بھی ہیں۔ وہ یکایک ”آپ“ سے ”تم“ کے مخاطب پر آگئی تھی۔

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں فوراً سنبھل کے بیٹھ گیا۔ جب میں بولا تو میری آواز خوشی سے لرزاں تھی ”میں... میں... یہ الفاظ اور جملے سننے کے لیے صدیوں سے منتظر تھا۔“

”لیکن میرے ہاں ملازمت کی نوعیت مختلف ہے!“ اس کا لہجہ ایک دم ہی پر اسرار اور بے رحم ہو گیا۔

”مجھے کام کی نوعیت سے کوئی سروکار نہیں!“ میں نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں جواب دیا۔ مجھے پیسا چاہیے۔ صرف پیسا! جواب میرا بیٹ بھر سکے، مجھے دو وقت کی روٹی دے سکے۔ میری آوازیں تنگی کھلنے لگی۔ میں نے ذہنی طور پر اپنے آپ کو ہر قسم کی ملازمت اور دولت کے لیے تیار کر رکھا ہے۔ اگر آپ مجھے ایک کتا سمجھ کر میرے گلے میں پٹا بھی ڈال دیں تو میں اف تک نہیں کروں گا۔“ میرے سینے میں سانسیں الجھ گئی تھیں۔

”میری شرائط منظور کر لینے کی صورت میں تمہیں منہ مانگی تنخواہ مل سکتی ہے۔“ اس نے کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ”جلد بازی اچھی نہیں ہے۔ ٹھنڈے دل سے خوب اچھی طرح سوچ لو، اس لیے کہ تمہاری منظوری کے بعد ہی میں اپنی شرائط بیان کروں گی۔ اگر تم نے میری شرائط سننے کے بعد انکار کیا تو...“ اس کے لہجے میں یکایک سفاکی ابھر آئی۔ تو میں تمہیں موٹ کے گھاٹ اتار سکتی ہوں۔ تو اس کمرے سے زندہ نہیں مردہ جاؤ گے۔

میں نے حیرت سے نسیم شیخ کے چہرے کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے اب قاتلوں جیسی بے رحمی جھلک رہی تھی۔ اسے یکسر بدلا ہوا پاپا کر میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ کمرے میں سردرات کی سی خشکی پھیلی ہوئی تھی مگر پھر بھی میں سینے میں نما گیا۔

وہ میز پر جھک کر دوبارہ بولی ”لیکن دوسری طرف اس زندگی میں ایک ایسا روشن پہلو بھی شامل ہے۔ جس میں قدم قدم پر دولت کی فراوانی اور آسائشیں تمہارے پیرو میں گی، تم ایک ایسی شان دار زندگی گزار سکو گے جو اس سرزمین پر بہت کم خوش نصیب لوگوں کو میسر ہے۔“

میں کئی لمحوں کے لیے ہموٹ ہو کر رہ گیا۔ میرے کانوں میں جیسے بہت سارے سرائیک ساتھ گنگناٹا اٹھے تھے، دولت کی شانیاں چاروں اطراف کو بجتی ہوئی سنائی دے رہی تھیں۔ چند ثانیوں پہلے نسیم شیخ نے مجھے جو تاریک پہلو دکھایا تھا میں نے اسے یکسر نظر انداز کر دیا۔ جب میں اپنے خوابوں سے چونکا اس کی بڑی بڑی غلابی آنکھیں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ میں کچھ سچا مانا گیا۔ اس کی آنکھوں میں خشک کی پر چھائیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

”تمہیں ابھی اور اسی وقت فیصلہ کرنا ہے۔“ اس نے اچانک ہی حکمانہ لہجے میں کہا۔ ”میں ایک دن تو کیا ایک گھنٹے کی بھی مہلت نہیں دے سکتی۔“

میرے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھر آئی ”مجھے شرائط نہیں صرف دولت اپنا محتاج بنا سکتی ہے۔“

”سنو سنو!“ اس کا لہجہ بچلی کے مانند کڑکا۔ ”تم پھر جلد بازی سے کام لے رہے ہو۔ میں ایک عورت ہوں لیکن جذباتی فیصلے پسند نہیں کرتی۔ جذباتی آدمی صرف غلط اور خواب گاہوں میں اچھے لگتے ہیں۔“ اس نے



میرا جواب میری آنکھوں اور فتنہ چہرے سے ظاہر تھا لیکن اس نے میرے جواب کو نظر انداز کر دیا اور سپاٹ لے کر بولیں ”تمہیں ان لڑکیوں میں سے کسی ایک کو اپنے لیے پسند کرنا ہے۔ تمہیں اس لڑکی سے شادی کر کے پرسکون اور پر مسرت ازدواجی زندگی گزارنا ہوگی“ لہذا خوب سوچ سمجھ کر کسی ایک لڑکی کا انتخاب کر لو۔“

میں نے بے یقینی کے عالم میں نسیم شیخ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بخیدگی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے سراسیمہ سا ہو کر پوچھا۔ ”تو کیا مجھے انہیں لڑکیوں میں سے کسی ایک سے شادی کرنی ہوگی؟“ میری آواز طلق میں اٹک گئی۔

اس نے فوری طور پر میری بات کا جواب نہیں دیا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ وہ تمام امیدوار جنہوں نے اس کمرے میں قدم رکھا تھا، وہ باہر نکلتے وقت اس قدر ہراساں اور دہشت زدہ کیوں تھے۔ شاید نسیم شیخ نے انہیں ان لڑکیوں کی تصویریں دکھائی ہوں گی۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص بھی اپنی قسمت داؤ پر نہیں لگا سکتا اتنی مہنگی قیمت ادا کرنے کا حوصلہ شاید ہی کسی میں ہو سکتا تھا۔

نسیم شیخ نے بائیں ہاتھ کی دراز سے نوٹوں کی دو گڈیاں نکال کر میز پر رکھ دیں۔ وہ کل بیس ہزار کی رقم تھی۔ میں خالی خالی نظروں سے ان گڈیوں کو کھنکھنے لگا۔

مجھے خاموش او بے حس و حرکت پا کر وہ ترشی سے بولی۔ ”کہنا بہت آسان ہے لیکن اس پر عمل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ تم نے جب اپنے آپ کو میرے حوالے کر ہی دیا ہے تو اپنی زبان پر قائم رہنا ہو گا۔ تم ان میں سے کسی ایک لڑکی سے شادی کر کے گھائے میں نہیں رہو گے۔ دولت تمہارے قدم چومے گی۔ تمہاری بیوی بد صورت سہی لیکن وہ تمہیں بے پناہ پیار دے گی۔ تم شاید ہی دیتا کی کسی اور لڑکی میں ایسا جذبہ اور محبت پاسکو۔“

میں چپ چاپ اس کی صورت کے جا رہا تھا وہ خاموش ہوئی تو میں چونکا پھر اپنے آپ کو سنبھال کر ان نوٹوں کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے نوٹوں کی طرف متوجہ پا کر بولی۔ کیا تم اس حقیقت سے انکار کرتے ہو کہ اس دنیا میں دولت ہی سب کچھ ہے۔

میں نے انتہائی انداز میں سر ہلایا ”آپ سچ کہتی ہیں۔ میں ایک دو دن سے نہیں بلکہ مینوں خالی پیٹ سڑکوں کی خاک چھانتا پھرا ہوں خون کا رشتہ بھی برے دنوں میں کام نہیں آتا۔“ میرے لہجے میں تلخی کھلنے لگی۔ ”برا وقت آ پڑے تو اپنے بھی کئی کترا کے نکل جاتے ہیں اور بات تک کرنے کے روادار نہیں ہوتے۔ پھر بھلا غیر کس طرح کام آسکتے ہیں۔“

میں نے محسوس کیا کہ وہ میری جذباتی تقریر سے کسی قدر متاثر ہو گئی ہے۔ میری آواز بھرانے لگی تو مجھے چپ ہونا پڑا میں ایک عورت کے سامنے آنسو بہانا پسند نہیں کرتا تھا۔

اس نے افسردگی سے پوچھا ”کیا تمہیں میرے الفاظ سے تکلیف ہوئی ہے۔؟ اگر ایسا ہے تو میں معذرت چاہتی ہوں۔“

”نہیں“ میں نے نفی میں سر ہلایا ”میرے پاس دل اور جذبات نام کی کوئی چیز موجود نہیں جو مجروح ہو سکے۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔“

”بہر حال“ وہ بولی تمہیں ان تصویروں میں سے اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کرنے کے لیے ایک طویل اور صبر آزا انتظار کرنا ہو گا۔“ اس کا لہجہ کاروباری انداز میں بدل گیا۔ ”کیونکہ یہ لڑکیاں کروڑوں کلوں کی مالک ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ تمہیں اس سلسلے میں قدم قدم پر آزمائشوں اور امتحانوں سے گزرنا پڑے، تاہم شادی میرے منصوبے کا

ذرا توقف کر کے کہا۔ ”میں کئے کا انتخاب کرنے میں بالکل نہیں جھجکتی لیکن کسی آدمی کا انتخاب کرتے وقت مجھے سوچنا پڑتا ہے۔ کیونکہ کتنا اپنی اوقات کبھی نہیں بھولتا جبکہ انسان سارے احسانات کو صرف ایک لمحہ میں بھلا دیتا ہے۔“

”میں انہیں کی نسل کو بھی شرمسار کر دوں گا۔ کہ انسان ان سے کہیں آگے نکل سکتا ہے۔“

”تمہیں اس انداز میں بات نہیں کرنا چاہیے۔“ اس نے ہمدردی کے لہجے میں ٹوکا۔

”آپ میرے بارے میں کچھ نہ سوچیں۔“ میری آواز فضا کے دوش پر ڈولنے لگی۔ ”زمانے نے مجھے قدم قدم پر ٹھوکریں لگائی ہیں۔“ میں نے رک کر گہرا سانس لیا۔ ”آخر مجھے پیدا کرنا بھی تو ادا کرنا ہے۔“

اس نے میری بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا، تاہم چند ثانیوں کے لیے اس کے چہرے پر سختی ابھری اور محدود ہو گئی۔ پھر چپ وہ مجھ سے مخاطب ہوئی تو اس کی آواز میں سفاکی نمایاں تھی۔ ”میں تمہیں کسی بھی لمحے کوئی بھی حکم دے سکتی ہوں تمہیں اس کی تکمیل کے لیے ہر وقت تیار اور مستعد رہنا ہو گا۔ اس کے علاوہ میرا ہر راز تمہیں اپنی ذات تک محدود رکھنا ہو گا“ وہ مجھے بڑی پراسراری دکھائی دینے لگی ”بس ملازمت کی یہی شرائط ہیں... اور“ اس کے سینے میں سانسوں کا زبردوم اٹھا۔ ”میرے نزدیک میرے کسی بھی راز کا افشاء میرے حکم کے انکار، بغاوت یا سرکشی کی سزا موت اور صرف موت ہے۔ میں حکم عدولی پر کوئی رعایت نہیں دے سکتی۔“

میں کرسی پر کسمپاسا اور جی کڑا کر کے کہا۔ ”مجھے منظور ہے۔“

میرا قیاس درست ہی ثابت ہوا تھا کہ نسیم شیخ کا تعلق منشیات کے کسی بین الاقوامی گروہ سے ہے جو مجھ جیسے بے روزگار، مجبور اور فلاح لڑکوں اور حسین لڑکیوں کی تلاش کر کے اس گھناؤنے دھندے میں اس طرح ملوث کر دیتا ہے کہ وہ اپنی آخری سانس تک اس تنظیم سے الگ نہیں ہو سکتا۔ تاہم ایک بات اب بھی میری سمجھ میں نہیں آسکتی تھی وہ یہ کہ محض اس بات پر امیدوار اس قدر دہشت زدہ کیوں ہو گئے تھے۔

نسیم شیخ نے میز کی دراز سے ایک پستول نکال کر میری طرف اچھالا تو میں نے جلدی سے تھام لیا۔ ”تمہیں اس پستول سے اپنے ملک کے صدر کو قتل کرنا ہو گا۔“

”جی!“ میری رگوں میں سنسناہٹ دوڑنے لگی میں نے حیرت اور کسی قدر خوف سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا نگاہ بہ دستور میرے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔

تو کیا نسیم شیخ کوئی غیر ملکی ایجنٹ ہے! میں نے دل میں سوچا اور ہڑبڑا کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا ”کیا آج ہی اور ابھی... اسی وقت؟“

وہ اپنے لبوں پر ابھرتی ہوئی غیر اختیاری مسکراہٹ دیا کر بولی۔ ”ابھی نہیں“ اس کا وقت بھی جلد ہی آ جائے گا۔“ اس نے ہاتھ بوجھا کر پستول لے لیا۔ اور دراز میں سے ایک لفافہ نکال کر میری جانب بوجھایا ان میں کسی ایک لڑکی کو پسند کر لو۔“

لفافے میں چھ عدد پوسٹ کارڈ ساز کی تصویریں تھیں میں نے پہلی تصویر دیکھی تو میرے جسم پر جھرجھری سی دوڑ گئی میں نے یک بارگی گھبرا کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ آج تک میں نے اتنی بد شکل، بھیاںک اور مکروہ صورت کی لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ دوسری تصویریں اس سے بھی کہیں زیادہ بھیاںک اور بد صورت عورتوں کی تھیں۔

میں نے متوحش ہو کر نسیم شیخ کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک ہی سوال تھا ”کیا تمہیں کوئی لڑکی پسند نہیں آئی۔“



آخری حصہ ہے۔“ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ فی الحال ایک بلا تو سر سے ٹلی۔  
اس نے میرے اوپر ایک اچھتی سی نگاہ ڈالی۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ تم آئینے میں اپنی صورت دیکھتے بغیر اندر دیکھنے چلے آئے۔ ذرا اپنا حلیہ تو دیکھو۔ تمہاری آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے ہیں، چہرے پر خون کی ایک بوند بھی دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ شاید تم نے مینوں سے اچھا کھانا نہیں کھایا اور میرا خیال ہے کہ تمہارے پاس ایک دو جوڑوں کے علاوہ اور کپڑے بھی نہیں ہوں گے۔“

میں نے اپنا سر جھکا لیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی آواز پھوٹا بھری ”تم یقیناً مقروض بھی ہو گے۔ میں نہیں چاہتی کہ میری ملازمت کے دوران کوئی قرض خواہ تمہارا گریبان پکڑے۔“ اس نے نوٹوں کی ایک گڈی میری جانب کھسکائی۔ ”تم اس رقم میں سے سب سے پہلے اپنا قرض ادا کرو گے اور بعد میں روٹی کھاؤ گے۔ اپنے لیے چند سلعے ملائے جوڑے بھی خرید لینا۔ تمہیں ہر وقت تیار رہنا ہے۔ میں کسی وقت بھی شام کو بھیج کر اپنے پروگرام سے مطلع کر سکتی ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ ہمیں کسی لمحے یہ شریچھوڑ دینا پڑے۔“

اس نے میز کی دراز سے ایک کانڈ نکال کر میری طرف بڑھایا، میں نے انٹ پلٹ کر اسے دیکھا۔ یہ ایک اسٹامپ پیچہ تھا جس پر دونوں طرف انگریزی میں ایک منمون ٹائپ کیا ہوا تھا۔  
”اس میں اپنا نام اور پتہ لکھ دو۔ شرائط پڑھنے کے بعد اس پر دستخط بھی کر دیتا۔“  
جب میں خانہ پری کر کے شرائط نامے پر دستخط کرنے لگا تو اس نے تعجب سے پوچھا۔ ”تم نے شرائط نہیں پڑھیں!“

میں نے اسٹامپ پیچہ اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ”جب میں نے غلامی کے طوق گلے میں ڈال ہی لیا ہے تو شرائط میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ کیا یہ کافی نہیں ہے کہ میں آپ کا غلام بن چکا ہوں۔“  
وہ میرے لمبے کی تختی محسوس کر کے چونکی اور بولی۔ ”اچھا اب تم جاؤ۔“

دس ہزار کی رقم میرے لیے ایک نئی زندگی کا بیجام ثابت ہوئی تھی۔ میری بھوک، کمزوری اور نڈھال پن جانے کہاں چلا گیا۔ جب میں نسیم شیخ کے کمرے سے نکلا تو کلونٹر پر بیٹھی ہوئی ”قیامت“ نے مجھ پر اپنی دل نواز مسکراہٹ کا جال پھینکا اور فرط مسرت سے بولی۔ ”مبارک ہو مسٹر سکندر!“

میں تھیرزدہ سا ہو کر اس کے پاس جا پہنچا۔ وہ اپنے پرس میں کوئی چیز تلاش کر رہی تھی۔ میں نے تعجب سے پوچھا۔ ”تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“

اس نے پرس سے ایک چھوٹا سا آئینہ نکال کر میری طرف بڑھایا۔ ”آپ آئینہ دیکھیں، آپ کا چہرہ جیج جیج کر آپ کی کامیابی کا اعلان کر رہا ہے۔“ اس نے رک کر مجھ پر ایک نگاہ ڈالی اور آہستہ سے بولی۔ ”مجھے آپ کی کامیابی کے پانچ فیصد بھی امکانات نظر نہیں آ رہے تھے، پھر بھی جانے کیوں میں آپ کے لیے دعا گو تھی۔“

”کیا میں اپنی حسن کا نام دریافت کر سکتا ہوں!“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر شوفی سے پوچھا۔ ”ناکہ زندگی کے ہر لمحے آپ کو دعاؤں میں یاد کرتا رہوں۔“

”صائمہ“ وہ حلقہنگسی سے بولی۔ ”اور ہاں، مٹھائی کا ڈبلا نامت بھولے گا۔“

جب میں نے مسز بیگ کے ہاں پہنچ کر ان کے ہاتھ پر تین ہزار کی رقم رکھی تو انہیں جیسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ ان کی نفرتیں ایک دم ہی محبت میں بدل گئیں۔ انھوں نے اپنے چھوٹے بیٹے امجد کو پچاس کا ایک نوٹ دے کر باہر دوڑا دیا۔ ”جاؤ، جلدی سے مٹھائی لے آؤ۔“

دوسری جانب فردوس کی حالت بھی عجیب ہو رہی تھی۔ اس پر ایسی ندامت طاری تھی کہ نظرس میری جانب نہیں اٹھ رہی تھی۔ فحالت نے اس کی زبان گنگ کر رکھی تھی۔ میں دولت کے اعجاز پر بے اعتبار مسکرا اٹھا۔ اس نے فردوس کی آنکھوں میں بھولی ہوئی محبت کے چراغ پھر سے جلا دیے تھے۔ محبت جاگ اٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر پچھتاوے کا کرب کانپ رہا تھا۔ میرے دل میں ایک نغمہ گونج اٹھا۔ اے دولت زندہ باد!

صبح اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ دروازے پر ہلکی ہلکی دستک ہو رہی تھی۔ دستک دینے والے ہاتھ امجد کے نہیں تھے، وہ تو بڑی بے مبری سے اس وقت تک مسلسل دروازہ دھینتا رہتا تھا۔ جب تک میری آنکھیں کھل نہ جائے۔ ایک آدھ بار مسز بیگ نے بھی میرے فلیٹ پر دستک دی تھی مگر ان کا انداز دروازہ توڑ دینے والا ہوا تھا۔ جبکہ یہ دستک پھول جیسے ہاتھوں جیسی تھی، جیسے فضا میں کوئی نغمہ گونج رہا ہو، مجھے کوئی سرسنا کر نیند سے بیدار کیا جا رہا ہو، ساتھ ساتھ چوڑیاں بھی کلنک رہی تھیں۔ میں نے بستر سے نکلنے میں بڑی تیزی دکھائی اور ایک کمر دروازہ کھول دیا۔ میرا قیاس درست ہی نکلا میرے سامنے فردوس ایک تروتازہ کلی کے مانند شبنم میں نمائی ہوئی کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نعمتوں کی روشنیاں بکھری ہوئی تھیں۔ جانے کس خیال سے اس کے چہرے پر تمازت تھی کہ وہ سر تپا حیا میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کے لبوں پر نکھرتے ہوئے معنی خیز خیمے نے اس کے دل کی بات کہہ دی۔ اس نے اپنے دونوں حسین ہاتھوں میں ایک ٹرے اٹھا رکھی تھی جس میں عمدہ ناشتا سجا ہوا تھا۔ انڈوں کا آلیٹ، سلاکس، پراٹھے، مکھن، فٹس، کٹلس، کچپ کی بوتل، چینی کی خوب صورت سی پیال۔ ایک چھوٹی سی فی کوزی کے اندر کیتلی موجود تھی۔ سبھی کچھ اس ٹرے میں بڑے سلیقے سے رکھا ہوا تھا۔ میں نے اسے دیکھا اور دیکھا رہ گیا۔ اب میرے ستاروں کی گردش کو زوال نہیں آ سکتا تھا۔ مجھے اس طرح اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ لجا گئی۔ ”کیا میں اندر آ سکتی ہوں؟“ اس نے اپنی پلکیں جھپکائیں۔

میں نے ایک طرف ہٹ کر اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ وہ میرے پاس سے نسیم حبر بن کر گزری اور اپنی مہک چھوڑتی ہوئی چلی گئی۔ اب اسے مجھ سے کوئی خوف اور خدشہ نہیں رہا تھا۔ میرے ہاتھوں کی کسی حرکت پر اسے کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔ میں پھر سے اس کی محبت پا کر پرانی تلخ باتوں کو بھول گیا۔ میں نے دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی لگا دی۔ جب میں کمرے میں داخل ہوا تو وہ میز پر ناشتا چن رہی تھی۔

فردوس بڑی دیر تک میرے پاس، میرے دل میں اور آنکھوں میں بسی رہی۔ محبت کی لاش میں نئی روح پھونک کر ایک بار پھر عمدہ ویٹاں کیے گئے۔

سہ پہر کے وقت میں فردوس کو اپنے ہمراہ لے کر بیت المکرم اور نیو مارکیٹ گیا۔ اسے بھی خریداری کرائی۔ مسز بیگ، بیگ صاحب اور امجد کے لیے بھی خریداری کی۔ میں مسز بیگ کا احسان فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ میں ان کے احسانات اور فردوس کی عنایتوں کو زندگی بھر بھول نہیں سکتا تھا۔ میں نے بلا کا سینما میں فردوس کو روٹائی فلم بھی دیکھائی۔ اس کے بعد چائٹرز دستور ان میں کھانا کھایا۔ جب ہم سالن سے لہجے پھندے گھر پہنچے تو رات کے دس بج رہے تھے۔ مسز بیگ کے ہاں ایک گھنٹے تک گپ شپ کرنے کے بعد میں اپنے فلیٹ پر آیا تو میرا سینہ دھک سے رہ گیا۔

نسیم شیخ کا گھر کھانا ملازم میرے فلیٹ کے دروازے پر بڑے پر اسرار انداز میں ٹپکتا ہوا میری آمد کا بے چینی سے منتظر تھا۔ وہ مجھے برا مختار اور چونکا دکھائی دیا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے بڑے مودبانہ انداز میں سلام کیا۔ اور بغیر کسی تمہید کے کہنے لگا۔ ”آپ فوراً اسٹیشن پہنچ جائیں۔“ اس نے اپنی پتلون کی جیب سے کانڈ کا ایک پرزہ نکال کر میری

طرف بڑھایا۔ ”اس پر کپار ٹمنٹ نمبر درج ہے۔“

میں نے اسے روکنا چاہا تاکہ اس کی خاطر مدارت کر سکوں۔ اور اس ہمارے نسیم شیخ کے بارے میں کچھ معلومات بھی حاصل کر لوں گا مگر وہ مجھ سے کہیں کانیاں نکلا۔ اس نے معذرت کی اور مزید کچھ کہنے کا موقع دینے بغیر ہی واپس چلا گیا۔

سارے دن فردوس کی قربت میسر ہونے کے باوجود نسیم شیخ کی ایک ہیبت سی میرے دل پر بیٹھی رہی تھی۔ میں فردوس سے باتیں کرتے کرتے کہیں کھو جاتا اور سوچوں میں گم ہو جاتا۔ پیچھتاوے کا احساس میری رگوں میں کرب بن کر پھیلتا رہا لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ تیر تو مکان سے نکل ہی چکا تھا۔

میں کلا پور ریلوے اسٹیشن وقت سے پہلے ہی جا پہنچا۔ گاڑی پلیٹ فارم پر نہیں آئی تھی۔ نسیم شیخ بھی کہیں دکھائی نہیں دی۔ جب گاڑی پلیٹ فارم پر آگئی تو میں نے کپار ٹمنٹ تلاش کر کے اس میں اپنا چھوٹا سا سوت کیس رکھ دیا اور پلیٹ فارم پر کھڑا ہو کر اپنی حسین باس کا انتظار کرنے لگا۔ گاڑی کی روانگی سے کوئی پانچ سات منٹ قبل نسیم شیخ اپنے گور کھلازم کے ساتھ آتی ہوئی دکھائی دی۔ ملازم کے ہاتھ میں ایک بڑا سا سوت کیس تھا۔

میں نے نسیم شیخ کو دیکھا تو دیکھا رہ گیا۔ وہ نیلے رنگ کی ساڑھی میں ہلاکی حسین دکھائی دے رہی تھی۔ میک اپ سے بے نیاز چہرے پر حسن پھونپڑ رہا تھا۔ اس کے سر اپا کی سی دلکشی میں نے بہت کم عورتوں میں دیکھی تھی۔ وہ ایک ایسا تڑشیدہ پیکر تھی کہ اسے دن رات دیکھنے کے باوجود آنکھوں کی پیاس کم نہیں ہوتی تھی۔ جانے کتنے لحوں تک میں بے خودی کے عالم میں نسیم شیخ کا سراپا نکلتا رہا۔

نسیم شیخ نے مجھ سے چند ایک رسمی باتیں دریافت کیں اور میرے ساتھ کپار ٹمنٹ میں چلی آئی۔ گور کھلازم شامو بھی ہمارے ساتھ تھا۔ نسیم شیخ نے میرے اور اپنے درمیان ایک آقا اور غلام کا فاصلہ رکھا۔ میں نے اس کے انداز اور تیور سے ہی اندازہ لگایا کہ وہ شاید اپنے ملازم کی موجودگی کے باعث مجھے زیادہ لفٹ دینا نہیں چاہتی ہے۔ میں اس سے کھل بھی کیسے سکتا تھا۔ میں اس کی ذات سے اس قدر مرعوب اور دہشت زدہ سا ہو گیا تھا کہ میری آواز میرا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ اس نے اپنی منگھو کا سلسلہ ختم کرنے کے بعد اپنے سوٹ کیس سے انگریزی کا ایک جاسوسی ناول نکالا اور اسے پڑھنے لگی۔ شامو دروازے کے پاس خاموشی سے کھڑا ہوا چھت کو گھور رہا تھا۔ مجھے اس پر ترس آ گیا۔ نسیم شیخ اپنے بونے اور خالی کپار ٹمنٹ میں اپنے چہرے کو برتھ پر بیٹھنے کے لیے نہیں تو کم از کم اسے فرش پر بیٹھنے کا حکم تو دے سکتی تھی۔ مجھے اس کی حاکیت کا انداز بالکل پسند نہیں آیا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے سینے میں ایسا پتھر دل ہو گا۔

میرے پاس پڑھنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ میں باہر جھانکتے ہوئے چور نظروں نے نسیم شیخ کو پڑھنے کی کوشش کرتا رہا۔ ایک دو مرتبہ اس نے میری نگاہ کی چورں پکڑ لی۔ لیکن اس کے بشرے پر کسی قسم کا رد عمل ظاہر نہیں ہوا۔ غالباً وہ ناول کے پر جنس واقعات میں کھوئی ہوئی تھی یکایک اسے کچھ خیال آیا۔ اس نے مجھ سے اور شامو سے سو جانے کے لیے کہا میں اسی حکم کا منتظر تھا چنانچہ اوپر والی برتھ پر جا کر لیٹ گیا۔ شامو نے بھی ایک بڑا سا رومال نکل کر دروازے کے پاس بچھایا اور اس پر آنکڑوں بیٹھ گیا۔

میں اپنے بھیا تک مستقبل کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں نے جس راہ پر قدم رکھ دیا تھا اسے بدل بھی نہیں سکتا تھا۔ میری رگوں میں پیچھتاوے کا زہر سرایت کرنے لگا۔ میں پچھلے دردنوں سے کسی قدر تھکا اور نڈھال سا ہو گیا تھا۔ اس محکن کے باعث جلد ہی مجھے نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا۔

نہ جانے کیسا شور یا دھماکا تھا کہ میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے اپنے سامنے ایک روح فرسا منظر دیکھا۔ ایک شخص کی جسامت دو جیسی تھی اور قد ساڑھے چھ فٹ سے کم نہیں تھا نہایت پر اسرار انداز میں کپار ٹمنٹ میں دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں وحشتانہ چمک دیکھ کر میری جان نکل گئی۔ اس کا چہرہ کوئلہ سے بھی زیادہ سیاہ اور خوف ناک تھا۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ خوف ناک اس کے ہاتھوں میں چمکتا ہوا چھرا تھا۔ جس کی چمک نے میری روح قس کر لی تھی۔

وہ کہاں چھپا ہوا تھا جسے اور کہاں سے اس کپار ٹمنٹ میں داخل ہوا مجھے کچھ خبر نہیں تھی۔ شاید وہ اس کھڑکی کے ذریعے اندر آیا ہو گا جس کے پاس میں بیٹھا ہوا تھا۔ اور اسے کھلی چھوڑ کر اوپر والی برتھ پر چلا گیا تھا یا ہو سکتا ہے کہ وہ ساتھ والے غسل خانہ میں چھپا بیٹھا ہو۔ بہر حال اس کی موجودگی کا مقصد ڈکیتی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ ایسے واقعات تو سنہ کے دوران پیش آتے ہی رہتے تھے۔

نسیم شیخ کے ہاتھ سے ناول چھوٹ کر فرش پر گر پڑا تھا۔ اور وہ دیوار کے ساتھ سہمی ہوئی کھڑی تھی، تاہم اس کے حواس قابو میں تھے۔ شامو اپنی جگہ کھڑے ہو کر اس بد معاش کو گھورے جا رہا تھا۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ اور آنکھیں خوں خوار ملی کی مانند چمک رہی تھیں۔

اس بد معاش نے فضا میں ہمارا ہر لہر اور کسی قدر محتاط انداز میں نسیم شیخ کی جانب بڑھا۔ چند قدم آگے بڑھ کر وہ رک گیا۔ غلام اپنی مہارانی کی نہمت میں سلام غرض کرتا ہے۔ ”وہ کورٹش بجاتے ہوئے بولا۔ ”مہارانی کے مزاج تو اتھے ہیں؟ غلام نے کہا۔۔۔۔۔ کسی سے یہ سنا تھا کہ آپ لندن گئی ہوئی ہیں۔“

مہارانی امیری زبان سے بے ساختہ نکتے نکتے رو گیا۔ میری حیرت بھری نگاہ نسیم شیخ پر جم گئی۔ وہ کوئی مہارانی تھی؟ مگر کس دیس کی مہارانی؟ میرے ذہن میں طرح طرح کے سوال ابھرنے لگے۔

”دھتورا“ نسیم شیخ کی تھمکانہ آواز میں ہلکی سی لرزیدگی تھی۔ ”تم اور میں؟ یہ کیا حرکت ہے؟ کیا تم نہیں جانتے کہ میں ایسی اچھی حرکتوں کو بالکل نہیں پسند کرتی۔“ یہ کہتے ہوئے وہ غصے سے کانپنے لگی تھی۔

”سرکار!“ دھتورے کے چہرے پر ایک حیرانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”آپ جانتی ہیں کہ میں اب کسی کا غلام ہوں۔ میرے آقا کا حکم ہے کہ میں آپ کو موت کے گھاٹ اتار کر اس سے من مانگا انعام حاصل کروں۔ اگر آپ زندہ بچ گئیں تو پھر میں زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ لہذا؟ اس کے چہرے کی تشنگی یکایک دردنگی میں بدل گئی۔“

نسیم شیخ پر دھمکی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ غالباً وہ دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ تاہم اس تصور سے میری رگوں میں خون ٹھمدہ ہو گیا کہ میری نسنروں کے سامنے میرے پاس کو بے رحمی سے قتل کر دیا جائے گا۔

معاً نسیم شیخ نے اپنے ملازم شامو کی طرف دیکھا۔ شامو بے بسی کے عالم میں کھڑا ہوا تھا۔ مگر غلام کی نظروں میں کسی قسم کا تامل نہ تھا۔ وہ انگریزوں کی تیز نگاہوں نے فوراً ہی ناڑ لیا۔ جیسے ہی شامو کے جسم میں جنبش ہوئی وہ خوں خوار انداز میں غرایا ”اوکے!“ اگر تو نے کوئی حرکت کی تو تجھے بھی موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔“

”دھتورا“ شامو نے شیر کی طرح گرج کر کہا۔ کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ میں اپنی ماکن کو تیرے نپاک ہاتھوں سے مرنے دوں گا۔۔۔۔۔ آخ تھو“ اس نے پھر کورٹش پر تھوکا۔ ”کیا تو مجھے جانتا نہیں جو اس قسم کی دھمکیاں دے رہا ہے؟“

دھتورے کے لبوں پر ایک کمرہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے شامو کی جانب حقارت سے دیکھا۔ ”اسے او۔۔۔۔۔ کرائے کے ٹوا اس کا لوجہ استہزائیہ تھا۔“ ”پتہ تو میں نے یہ سوچا تھا کہ تجھے چھوڑ دوں گا۔ لیکن اب تیرے ہاتھوں

کولال کرنا ضروری ہو گیا ہے۔  
 ”کسی غلط فہمی میں مت۔ ہو نمک حرام!“ شامو کی آنکھوں میں خون اٹھنے لگا۔ ”تو میری ماکن کا نمک کھا کر بھی غداری کر رہا ہے۔ کیا تیرن برادری میں تجھ جیسے کتے اور نمک حرام بھی پیدا ہونے لگے ہیں۔“  
 شامو کے آخری جملے۔ شامو کو غضب ناک کر دیا۔ وہ شامو کی طرف جھپٹا ہی تھا کہ نسیم شیخ کا پتی ہوئی آواز میں چینی ”ٹھہرو! میری بات سنو۔“۔ روار جو تم نے شامو کو ہاتھ لگایا۔“  
 دھتویک تخت رک گیا۔ ا کے سینے میں سانسیں دھونکنی بن کر چل رہی تھیں۔ نسیم شیخ نے قہر توڑائی ہوئی آواز میں پوچھا ”تم یہ بتاؤ کہ تمھیں کتنی رقم چاہیے۔ میں تمہیں تمھارے مالک سے کہیں زیادہ نواز سکتی ہوں۔“  
 ”اس کے ساتھ ساتھ مجھے اپنی زندگی کی بھی ضمانت چاہیے۔“ دھتویک ایک سرود پر گیا۔ ”اگر میں آپ کی موت کی خبر ساتھ نہیں لے گیا۔ تو پھر ایک روز بھی زندہ نہیں رہ سکوں گا۔“  
 ”میں تمھیں اتنی دولت دوں گی۔ تم ہندوستان کے کسی کو نہ کھد رے میں اپنی زندگی عیش سے گزار سکتے

”لیکن میری بیوی بچے پر غمائل ہے۔“ نے ہیں۔ ”دھتو نے فکر مندی سے کہا ”وہ زندہ نہیں بچ سکیں گے۔“  
 ”میں ان کی زندگی کی ضمانت دے رہا ہوں۔“ نسیم شیخ نے پرسکون لمبے میں کہا۔ ”انھیں جہاں کو گے وہاں  
 پہنچا دوں گی۔۔۔ تم میری زبان پر بھروسہ کر سکتے ہو۔“

”آپ مجھے اپنے مالک سے غداری کا لالہ؟ تم دیں گی؟“ اس نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔  
 ”دولاکہ نکلے۔“ نسیم شیخ نے جواب دیا۔ ”اس رقم سے کوئی بھی اچھا سا کاروبارہ کر سکتے ہو۔“  
 ”اؤنہ“ دھونے غارت سے منہ پٹایا۔ ”مہ دیش کی رقم کوئی قیمت نہیں رکھتی آپ مجھے ہندوستانی کرنسی  
 میں دولاکہ روپے کی اوائلی کریں اور مزید ایک لاکھ روپے انعام کے طور پر دیں۔“

نسیم شیخ چند لمحے گہری سوچ میں ڈوبی رہی اس ڈرافٹ شفاف پیشانی پر ٹکیریں ابھر آئیں کئی لمحوں بعد وہ گمبیر لمبے میں بولی ”مجھے منظور ہے۔۔۔“ لیکن اس وقت میرے پاس ہندوستانی کرنسی صرف ڈیڑھ لاکھ روپے موجود ہے جو میں ابھی اور اسی وقت دے سکتی ہوں۔ بتایا رقم مندرجہ پوری بچوں کے ساتھ جہاں کو گئے وہاں پہنچا دی جائے گی۔ اگر تمہیں میری زبان پر یقین ہے تو۔“ نسیم شیخ۔ اپنی بات اور حوری پھوڑی۔

”میں یقین کیے لیتا ہوں۔“ وہ مکاری کے انداز میں ہنسا اور پھر یک لخت اس کے تیور بدل گئے لیکن اگر آپ نے کسی قسم کا فریب کیا تو پھر زندہ نہیں بچ سکیں گی اور آپ کے۔۔۔

”دھتو“ جسمِ شمعِ سرامیکی سے جیتی ”اپنی زبان بند رکھو۔ میں نہیں چاہتی کہ تم جہاں بھر کے انکشافات کرتے پھرو۔ اگر تمہیں مجھ پر اعتماد ہے تو ڈیڑھ لاکھ روپے لے کر چلے دو اور اگر میری بات پر شک ہے تو اپنی حسرت پوری کر لو۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ رقم نکالے۔“ دھتو نے اپنا بلیاں ہاتھ اس کی جانب پھیلا دیا ”میں آپ کو بہت سستے میں چھوڑ رہا ہوں۔“

ضمیمہ شیخ نے شام کو اشارہ کیا کہ وہ اوپر والی برتھ سے سوٹ ٹیس اتار کر نیچے رکھ دے۔  
اس دہشت ناک واقعہ نے مجھے شل کر کے رکھ دیا۔ وہاں لوگ سخت بدلتے دیکھ کر میں کسی قدر پرسکون سا  
ہو گیا۔ لیکن سینے کی دھک دھک اب بھی جاری تھی۔ دھتو کے آخری اور نامکمل جملے پر غور کرتا ہوا میں اسے

کمل کرنے لگا۔ دھتو شاید نسیم کے شوہر کے بارے میں کچھ انکشاف کرنے جا رہا تھا۔ جیسی تو وہ یکایک چیخ پڑی تھی۔ وہ نہیں چاہتی ہو گی کہ اس کی ذات کے بارے میں مجھ پر کوئی انکشافات ہو جائیں۔ مجھے اس لمحے یہ شک بھی ہوا کہ نسیم شیخ نے دھتو کی نظر بچا کر شامو کو کوئی اشارہ کیا۔ نظروں کا یہ تبادلہ کسی خوف ناک طوفان کا پیش خیمہ ہو سکتا تھا۔ شامو برقعہ کے پاس پہنچا ہی تھا کہ دھتو زور سے چیخا۔ ”شامو! رک جاؤ۔۔۔ مجھے فریب دینے اور احقر بنانے کی کوئی ضرورت نہیں!“ پھر نسیم شیخ سے مخاطب ہوا۔ ”میں مرجاؤں گا لیکن اپنے آقا کی نمک حرامی نہیں کروں گا۔ یوں بھی۔۔۔“ اس نے رک کر ایک فلک شکن فتنہ لگایا۔ ”آپ دونوں ہی بھیاں موت کے بعد سوٹ کیس کی دولت تو مجھے مل ہی جائے گی۔ اس کے علاوہ اپنے آقا سے بھی ایک بڑا انعام ملے گا۔“

دستو کو پہنوی سے اترتے دیکھ کر میں جیسے برف کا تودہ بن گیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ ان دونوں کو قتل کرنے کے بعد میرا کیا حشر کرے گا۔ اس نے مجھے سوتے، چائے، اور سارا تماشا دیکھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ تاہم ابھی تک اس نے مجھ سے کوئی تعرض نہیں کیا تھا۔ ممکن ہے کہ وہ مجھے کوئی مسافر سمجھا ہو اور اسے میری ذات سے کوئی خطرہ محسوس نہ ہوا ہو۔

اور پھر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ سب کچھ کیسے اور کیونکر ہو گیا۔ شامو جو سوٹ کیس پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا بجلی کی سی تیزی سے گھوما اور سنبھلتے ہوئے تھری کی طرح دھتور پر حملہ آور ہوا اس کے ہاتھ میں بڑا سا چاقو چمک رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ دھتو سنبھل پاتا شامو نے بڑی سنگ دلی سے اپنا چاقو اس کے پیٹ میں گھونپ کر باہر نکال دیا۔ دھتو کے ہاتھ سے چھرا چھوٹ کر فرش پر گر ا اور وہ ایک دل خراش چیخ مار کر پیٹ کے بل جھٹکا چلا گیا۔ شامو نے اسے سانس لینے کی بھی مصلحت نہ دی اور بے درپے اس کی پیٹھ پر گردن، اور بازو پر حملہ کرنا شروع کر دیے۔

کئی لکھوں تک تو میری سمجھ میں آئے۔ سکا کہ میں کہاں ہوں۔ پھر جب میری نظر نسیم شیخ کی پشت پر پڑی تو میری سمجھ میں وہ خونیں واقعہ تازہ ہو گیا۔ میری رگ و پے میں سنسنی دوڑنے لگی۔ میں نے پہلی چٹنی آنکھوں سے نسیم شیخ کی طرف دیکھا۔ وہ زیر لب مسکرائی۔ سکندر! تم بڑے کمزور دل کے آدمی ہو۔ کیا بڑوں کا نام بھی سکندر ہوتا ہے!

میں نے نسیم شیخ کے اس نظریہ لبجے میں شیرینی کی آمیزش محسوس کی تھی۔ وہ میرے پاس سے اٹھ کھڑی ہوئی تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ میری نظروں کے سامنے کسی عظیم الشان ریاست کی مہارانی کھڑی ہو۔ میں اس کے یا قوتی اور ترشے ہوئے لیوں پر ایک دل آویز جہیم دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک ایسی فاتحانہ چمک ابھری ہوئی تھی جیسے اس نے کسی ریاست کو اپنی مسکراہٹ سے فتح کر لیا ہو۔ اس کے دیکھتے رخساروں پر خون کی سرخی کچھ اور تیز ہوئی اور اس کا حسن اور قیامت خیز نظر آنے لگا۔ اس کے شرے پر سکون اور طمانیت دیکھ کر یوں لگا تھا جیسے اس نے ابھی کچھ دیر پہلے ہونے والے خونیں حادثے کا اثر نہ لیا ہو۔ وہ ایک لخت پلٹ کر اپنی جگہ پر جا بیٹھی۔ اس نے ہر تہ پر رکھا ہوا ابلول اٹھایا اور وہ صفحہ تلاش کرنے لگی جہاں سے سلسلہ نوٹ گیا تھا۔ شامو بھی اپنی جگہ پر جا بیٹھا اور دروازے سے پشت نکا کر اٹھنے لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ گویا ان دونوں کے نزدیک قل و غارت گری محض ایک کھیل ہے۔

میں نے پورے کھارٹٹ کا جائزہ لیا۔ مگر نہ تو کہیں دستوں کی لاش دیکھائی دی اور نہ فرش پر خون کا کوئی پھینٹا ہی نظر آیا لگتا تھا کہ یہاں کوئی خونِ واقفہ پیش ہی نہ آیا ہو۔

گاڑی بڑی تیزی سے چلتی، چنگھاڑتی اور رات کا سینہ حرقی چلی جا رہی تھی۔ ایک اسٹیشن پر گاڑی رکی تو شامو



رہے تھے۔ میرے ہاتھ پیروں میں اتنی سکت نہیں تھی کہ شامو کا ساتھ دے سکوں۔ شامو جس قدر پر سکون تھا۔ میں اتنا ہی زورس ہو رہا تھا۔

ایک اونچی پاڑی کے نیلے پر ایک وسیع و عریض کوٹھی بنی ہوئی تھی۔ اس کوٹھی کی شان و شوکت ہماری تھی کہ اس کا مالک لکھ پتی نہیں بلکہ کروڑ پتی ہے۔ چاروں اطراف گھپ اندھیرے میں کوٹھی جگمگاتے چاند کی مانند دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے احاطے میں روشنیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ شامو مجھے اس کوٹھی کے عقبی حصے کی طرف لے آیا۔

جب میں نے اپنی سانسوں پر قابو پایا تو شامو نے دیوار کی جانب اشارہ کیا۔ ”آپ اس جگہ سے دیوار پر چڑھ جائیں، احاطے میں اترتے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ ذرا بھی آواز پیدا نہ ہو سانسے ہی آپ کو ساری کے درخت کے پاس ایک کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی دکھائی دے گی۔ اس کوٹھی میں بغیر گرل کے وہی ایک کھڑکی ہے۔ اس کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل ہو جائیں۔ اس کمرے کے اندر پلنگ پر جو لڑکی سو رہی ہوگی اسی کو ہلاک کرنا ہے۔“

”میں نے تھوک نکلے ہوئے پوچھا۔ لڑکی کا حلیہ کیا ہے؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ غلطی سے کسی اور کو قتل کر آؤں۔“

”اس لڑکی کے دونوں رخساروں پر دو قتل ہیں۔“ شامو نے چونک کر جواب دیا۔ ”اچھا کیا جو آپ نے پوچھ لیا“ مگر اس کھڑکی تک پہنچنا بھی تو ایک مسئلہ ہے۔“ میں بے چارگی سے بولا۔

”گمراہی کے پاپ کے ذریعے اوپر چڑھنا زیادہ دشوار نہیں ہو گا۔“ شامو نے میری ہمت بندھائی۔ میں آہستہ سے زمین پر بیٹھ گیا۔ جوتے اتارتے ہوتے ہوئے اچانک ایک خیال بجلی کی طرح ذہن کی سطح پر ابھرا۔ میں نے اس کے پیر پکڑ کر منت کی۔ ”بھائی شامو! کیوں نہ یہ فرض تم خود ہی ادا کر دو۔“ میں تمہیں اس کے عوض ایک بڑی رقم دینے کو تیار ہوں۔ پانچ ہزار کئے.... بولو منظور ہے؟“

شامو نے جھک کر بڑے ادب سے میرے ہاتھ اپنے پیروں سے الگ کیے۔ ”آپ تو ابھی سے ہمت ہار رہے ہیں وہ بولا آپ کو یہی نہیں بلکہ نہ معلوم کتنے آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارنا ہو گا۔“

شامو نے جیسے میرے سینے میں خنجر اتار دیا تھا۔ میں نے ہراساں ہو کر لرزاں آوازیں پوچھا۔ ”کیا مجھے تنہا سینکڑوں آدمیوں کو قتل کرنا ہو گا۔“

”جی ہاں!“ اسی لیے آپ کا انتخاب کیا گیا ہے۔ شامو کا لہجہ پراسرار ہو گیا۔ اس نے میرے قریب آکر سرگوشی کی ”آپ کو بھی اب مالکن کے دشمن سے ہوشیار اور چوکنا رہنا ہو گا۔ کیوں کہ دھتو سے کہیں زیادہ خطرناک بد معاش مالکن کے دشمن ہیں۔ جب انھیں معلوم ہو گیا کہ آپ مالکن کے خاص ملازم ہیں۔ تو آپ کی جان بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔“

میں نے سٹیپا کر شامو کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر اسرار سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ میرے جی میں آیا کہ سب سے پہلے اسی کو ہلاک کر دوں۔ نسیم شیخ کو بھی موت کی نیند سلا سکتا تھا۔ اس خیال کے ذہن میں آتے ہی میرے پورے جسم میں سنسنی پھیل گئی کئی لمحوں بعد میرے حواس قابو میں آئے تو میں نے سوچا کہ فی الوقت اس خیال کو عملی جامہ پہنانا مناسب نہیں! مجھے ہر صورت سب سے پہلے اس معصوم اور بے گناہ لڑکی کو قتل کرنا تھا۔ پھر کسی طرح نسیم شیخ اور شامو کو اپنے اعتماد میں لینا تھا۔ یہی ایک صورت تھی کہ میں بلا خوف و خطر اپنے منصوبے پر

اتر گیا۔ اور پھر واپس نہ آیا میں نے نسیم شیخ سے پوچھنا مناسب بھی نہیں سمجھا کہ وہ کہاں اور کس لیے گیا ہے۔ نے دھتو کے بارے میں بھی نہیں پوچھا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے سوال کرنے کی جسارت بھی نہیں کر سکتا۔ میری زبان پر شرائط کی مرگھی ہوئی تھی، تاہم میں نے نسیم شیخ اور دھتو کی گفتگو سے اتنا اندازہ کر لیا تھا۔ کہ نسیم کی خاندانی دشمنی رنگ لارہی ہے۔ وہ بد معاش کسی کے ایما پر اسے قتل کرنے آیا تھا لیکن خود لقمہ اجل بن گیا۔ چنانچہ گانگ شرم میں ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک درمیانہ درجہ کے ہوٹل میں نسیم شیخ نے ایک ڈبل بیڈروم اس میں ہم دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے ٹھہرے جب ہم نمادھو کر ٹائٹ سے فارغ ہوئے تو شامو بھی آیا۔ پھر کے وقت ہم دونوں شامو کی رہنمائی میں پیادہ تلی کے ایک جنگلے میں منتقل ہو گئے۔ یہ کرائے کا بنگلا تھا۔ جس کی ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔

رات کے کھانے سے فراغت کے بعد نسیم شیخ نے مجھے ملاقاتی کمرے میں بٹھلایا اور اپنی خواب گاہ میں چلی گئی جب وہ اپنے کمرے سے باہر آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا لفافہ تھا۔ وہ اس نے میرے سامنے رکھ دیا۔

”اس کے اندر جو چیزیں ہیں۔ انھیں باہر نکالو۔“ اس نے رعوت سے حکم دیا۔ اس لمحے وہ مجھے بڑی پراسرار اور خوف ناک دکھائی دی۔

اس لفافے میں ایک آب دار خنجر اور پستول برآمد ہوا۔ میں نے چونک کر ان دونوں چیزوں کو حیرت سے دیکھا تو وہ بولی ”آج تمہارا پہلا امتحان لیا جا رہا ہے۔“ اس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری اور سپاٹ تھا۔

”امتحان!“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”تم ان دونوں میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کرلو۔“ وہ نخوت سے بولی۔

میری زبان پر ہمت سے سوال آئے اور دم توڑ گئے۔ میں نے کچھ نہیں پوچھا صرف مہسوت بن کر اس کی شکل دیکھتا رہا۔

”آج تمہیں ایک لڑکی کو قتل کرنا ہے۔“ نسیم شیخ سفاکی سے بولی۔ ”تم اپنی سولت کے لیے جو ہتھیار چاہو منتخب کرلو۔“

میں نے حواس باختہ ہو کر پستول اور خنجر کی طرف دیکھا۔ ”کسی لڑکی کو قتل کرنا ہے؟“ بولتے ہوئے میرے حلق میں گرہیں پڑنے لگی تھیں۔

”ہاں!“ اس نے سر ہلایا ”وہ لڑکی کون ہے، کہاں رہتی ہے.... یہ سب کچھ تمہیں شامو اپنے ساتھ لے جا کر بتا دے گا۔ اس لڑکی کو کسی قیمت پر زندہ نہیں چھوڑنا ہے۔ اگر وہ زندہ بچ گئی تو تم زندہ نہیں رہ سکو گے۔“

میں گم سم اپنی جگہ پر بیٹھا رہ گیا۔ یہ ایک وقت تھی کہ خیالات میرے ذہن میں جکڑنے لگے تھے۔ میں نے سوچا اس عورت کے جل میں جھنسنے سے کہیں بہتر تھا۔ کہ فٹ ہاتھوں پر بھیک مانگ کر گزارہ کر لیتا۔ ہر حال! میں نے ایک گمراہ سانس لیا اب تو اوکھلی میں سر دے ہی دیا ہے۔ ویسے بھی اس مذہب دنیا میں ہزاروں بے گناہ لوگ مختلف حادثوں میں مرتے رہتے ہیں اگر ایک لڑکی میرے ہاتھوں سے قتل ہو گئی تو کیا فرق پڑے گا؟ اور پھر نیچے سکندر اعظم دس ہزار کی رقم تمہارے باپ کی تو نہیں تھی جو تم پیش کرتے پھر دیا یہ عورت تم سے کوڑی کوڑی وصول کر کے رہے گی۔

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے میں نے اپنا مرتش ہاتھ خنجر کی طرف بڑھا دیا۔ نصف رات کے قریب شامو مجھے اپنے ہمراہ لے کر نکلا۔ گھپ اندھیرے میں ہم دونوں خاموشی سے چلے جا



عمل کر سکتا تھا۔

میں شامو کے کندھوں پر چڑھ کر دیوار کی منڈیر تک جا پہنچا اور بڑی آہستگی سے اعلیٰ میں اتر گیا۔ کوٹھی میں ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھیں میں پیسے میں نہایا ہوا ڈنگاتے قدموں سے گزری پائپ لائن کے پاس جا پہنچا اور سپاری کے درخت کے نیچے رک کر کئی لمحوں تک اس کھڑکی کا جائزہ لیتا رہا جس کی نشاندہی شامو نے کی تھی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ میں پائپ کے سارے آہستہ آہستہ چڑھتا ہوا کھڑکی تک پہنچا اور چوکت پکڑ کر آہستگی سے اندر کمرے میں اتر گیا۔ میں نے دیوار سے پشت لگا کر اپنی سانسیں درست کیں اور کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

یہ خوب صورت سا کمرہ کشادہ، ہوادار اور قیمتی سازوسامان سے آراستہ تھا اس کمرے کے ایک گوشے میں آنوسی کھڑکی کی لمبی چوڑی مسری دکھائی دے رہی تھی جس پر کئی ٹائیلوں کی پھردانی چبھنے کی ہوا سے لہرا رہی تھی۔ کمرے میں زیرو پاؤر کا بلب روشن تھا۔ مدہم روشنی کے باعث یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ مسری پر محو خواب کوئی مرد ہے یا عورت؟

میں نے پچھلی جیب سے خنجر نکالا اور دھڑکتے دل کے ساتھ مسری کی جانب بڑھا۔ فرش پر پیش قیمت قالین بچھا ہوا تھا۔ پھر بھی میں نے حتی الامکان احتیاط برتی کہ کوئی آہٹ نہ ہونے پائے۔ میری ذرا سی بے احتیاطی مجھے جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے جالے جاسکتی تھی۔ میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا مسری کے پاس پہنچا اور اپنا ہتھکڑا ہوا ہایاں ہاتھ آگے بڑھا کر پھردانی کا کونہ اوپر الٹ دیا۔ میری نگاہ سب سے پہلے اس لڑکی کے سرخ رخساروں پر چبکتے ہوئے ان دونوں ٹکوں پر پڑی جو اس کے حسن کو اجاگر کرنے میں نمایاں تھے۔

کئی لمحوں تک میں اپنی جگہ مفلوج سا ہو کر کھڑا رہا۔ مجھ میں اتنی سکت بھی نہیں رہی تھی کہ جنش تک کر سکوں۔ میں پچھرائی ہوئی آنکھوں سے اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ جس کی عمر یہ مشکل نو دس برس رہی ہوگی۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم تھا۔ شاید وہ گہری نیند میں ڈوبی ہوئی کوئی سندس سا پستان دیکھ رہی تھی خود وہ بھی تو اپنے ماں باپ کا ایک سندس پستان ہوگی۔ وہ پھول سے بھی نازک، ریشم سے بھی ملائم اور چاند سے بھی زیادہ حسین تھی۔ اس پر ہلاکی معصومیت اور بھولہ پن چھایا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر میں یہ تک فراموش کر بیٹھا کہ میں یہاں کس مقصد کے لیے آیا ہوں۔ اس وقت میری جگہ کوئی شقی القلب شخص ہو تا تو وہ بھی اس نور کے سانچے میں ڈھلی ہوئی لڑکی کے سینے میں خنجر نہیں اتار سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ یہ خنجر اپنے ہی سینے میں اتار لوں۔

میں عجیب شش و پنج کے عالم میں کھڑا ہوا تھا۔ بار بار میری آنکھوں کے سامنے دھند چھا جاتی۔ ایک معصوم بچی کو ہلاک کرنے کا تصور ہی اتنا لرزہ خیز تھا۔ کہ میرا دل کانپ کر رہ گیا۔ اس لمحے میرے ذہن میں یہ خوف بھی نکل گیا تھا کہ نسیم شیخ اس حکم عدولی پر مجھے سزائے موت بھی دے سکتی ہے۔ میں نے سوچا کہ موت سے کیا ڈرنا؟ وہ زندگی میں ایک ہی بار آتی ہے۔ اور اس کی تکلیف سہلے لیتا کچھ ایسا مشکل بھی نہیں ہوتا۔

معاذ اللہ نے سوتے سوتے کسسا کر کوٹ لی۔ میں چونک پڑا اور بے اختیار میرا خنجر والا ہاتھ فضا میں بلند ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنی پشت پر ایک آہٹ محسوس کی۔ اس سے پہلے کہ میں پلٹ کر اس ناگمانی خطرے کا سامنا کرنا کسی نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ میرا خنجر والا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

میں نے پوری قوت سے مزاحمت کرتے ہوئے پلٹ کر دیکھا تو میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

”شش!“ شامو نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

”ہم... ہم...“ میں نے بولنا چاہا۔

”بس! چپ چاپ نکل چلیں“ شامو نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ اس لمحے میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی ہے۔

میں حیرانی کے عالم میں اس کے ساتھ کوٹھی سے نکل آیا۔ راستے میں میں نے کئی بار شامو کی طرف دیکھا۔ وہ چپ چاپ اور لالٹا سا منظر آ رہا تھا۔ اس کی خالی خالی آنکھوں میں دیرانی برس رہی تھی چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا، وہ نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے جھجھکنے ہوئے پوچھا۔ ”شامو! تم نے اس لڑکی کی جان کس لیے بچائی ہے؟ وہ تو باس کے دشمن کی بیٹی ہے۔“

شامو چلتے چلتے رک گیا اور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے افسروگی سے بولا۔ ”میں بھی اتنی ہی عمر کی بیٹی کا باپ ہوں۔ مجھے یک بہ یک یوں محسوس ہوا کہ مسری پر میری بیٹی سو رہی ہے!“

”اب میں باس کو کیا جواب دوں گا؟“ میں نے اندرونی مسرت دہاتے ہوئے پوچھا۔ میں دل میں بہت خوش ہو رہا تھا کہ ایک سنگین جرم کے ارتکاب سے بچ گیا ہوں۔ ظاہر ہے کہ اب نسیم شیخ بھی مجھے کوئی سزا نہیں دے سکتی تھی کیوں کہ ساری ذمہ داری شامو پر آگئی تھی۔

شامو نے مجھے تسلی دی ”آپ گھرنہ کریں۔ میں باس کو سمجھا لوں گا۔“

پچھلے پر پینچ کر شامو! نسیم کے کمرے میں چلا گیا۔ اس نے اندر جا کر نسیم شیخ سے نہ جانے کیا کچھ کہا کہ مجھ پر کوئی عتاب نازل نہیں ہوا۔ دوسرے دن ناشتے کے بعد نسیم شیخ نے ایک مہربان لافانہ میرے حوالے کیا۔ میں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”جانے تو اس لفافے کو کون سا راز ہے؟“ اس کی تیز نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ میں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو وہ بولی۔ ”اس لفافے میں اس ملک کے صدر کا تختہ الٹ کر اسے قتل کر دینے کا منصوبہ موجود ہے۔“ تمہیں یہ لفافہ زمیں نامی شخص تک بڑی احتیاط سے پہنچانا ہے۔ اور ہاں! ہر قدم پر تمہیں چوکنا رہنا ہو گا کیوں کہ دشمن ہماری گھات میں لگے ہوئے ہیں“ وہ اس لمحے بڑی پراسرار دکھائی دے رہی تھی۔

”زمیں اپنا ہی آدمی ہے۔“ نسیم شیخ توقف کے بعد دوبارہ بولی۔ ”وہ مشتاق نامی ایک لانچ میں تمہارا انتظار کر رہا ہو گا۔ اگر زمیں کی جگہ کوئی اور آدمی لے تو فوراً ہی لفافہ چاک کر کے پانی میں بہا دینا۔ خدا نخواستہ تم دشمن کے ہاتھ لگ جاؤ اور وہ تم سے پوچھ گچھ کریں تو اپنا منہ بند رکھنا۔ اگر تم نے اپنی زبان کھولی تو ہم میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچ سکے گا۔“

میں نے اثبات میں آہستہ سے گردن ہلا دی۔

نسیم شیخ نے مجھے زمیں کی تصویر دکھائی۔ وہ ایک دیو قامت اور کرسیمہ العال شکل سا آدمی تھا۔ اس کی شناخت کچھ مشکل نہیں تھی جب میں نے اس کی صورت اچھی طرح ذہن نشین کر لی تو شامو مجھے اپنے ہمراہ لے کر عرشے پر پہنچا اور مشتاق نامی لانچ کی طرف اشارہ کیا جو ایک فرلانگ دور پانی کی سطح پر ڈول رہی تھیں اس لانچ تک پہنچنے کے لیے مجھے کشتی میں سفر کرنا تھا۔ شامو نے کرائے پر ایک کشتی حاصل کی اور مجھے اس میں سوار کرایا۔ خود وہ گھات ہی پر کھڑا رہا۔ میری سمجھ میں یہ بات نہ آ سکی کہ آخر اس لفافے کو اس قدر اہتمام کے ساتھ زمیں کے حوالے کیوں کیا جا رہا ہے۔ یہ لفافہ وہ شخص کہیں بھی آسانی سے وصول کر سکتا تھا۔

جب کشتی لانچ کے قریب پہنچی تو میں کشتی والے کی مدد سے لانچ کے عرشے پر چڑھ گیا۔ میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی مگر عرشے پر کوئی نظر نہ آیا۔ مجھے یہاں تک لانے والی کشتی جب دور نکل گئی تو میں نے آواز لگائی۔

زماں صاحب....

میری آواز عرش پر گونج کر رہ گئی مگر کسی جانب سے کوئی جواب نہ آیا۔ میں آہستہ آہستہ زینے کی طرف بڑھا۔ لالچ پر ایک گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ یوں محسوس ہوا تھا جیسے یہاں کوئی موجود ہی نہ ہو۔

میڑھیاں اتر کر میں ایک بڑے سے کمرے میں آگیا۔ سامنے ہی ایک اور کمرہ تھا جس کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں لڑکھڑاتے قدموں سے اس کمرے کی جانب بڑھا ہی تھا کہ دفعتاً اس کمرے کا دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھلا اور میں چونک کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کمرے سے چار افراد نہایت تیزی سے باہر نکلے اور انھوں نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ ان میں سے ایک شخص چہرے میرے سے انتہائی خطرناک دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا کر استہزائیہ لہجے میں پوچھا۔ ”آپ زماں صاحب کے لئے کیا تحفہ لائے ہیں؟“

میں اس ناگہانی صورت حال کے لیے قطعی طور پر تیار نہیں تھا۔ یہ مشکل تمام میں نے اپنے حواس پر قابو پایا گویا میرے سینے میں دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا تاہم میں نے اپنے حوصلے اور جسم کی ساری طاقت کو مجتمع کرنے کی کوشش کی اور پھنسی ہوئی آواز سے پوچھا۔ ”زماں صاحب کہاں ہیں؟“

”زماں صاحب!“ اس نے طنز آمیز لہجے سے جیسے میرا دسترخ آڑیا اور اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ وہ چاروں بھی دسترخ انداز میں میری طرف دیکھ رہے تھے۔ وہی شخص دوبارہ میری طرف پلٹا اور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا ”زماں صاحب آرام فرما رہے ہیں۔“

اس کے لہجے میں ایسی ہیچمن تھی کہ میں سامنے میں آگیا۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ چاروں بد معاش میری پاس کے دشمن ہیں اور انھوں نے مل کر زماں صاحب کو ٹھکانے لگا دیا ہے۔ جب وہ میرے گرد اپنا گھیراٹک کرنے لگے تو میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور مرتعش آواز میں بولا۔ ”ایک منٹ صبر کریں میں زماں صاحب کا تحفہ آپ لوگوں کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔“

اس بات کا ان لوگوں پر خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ اپنی اپنی جگہ پر رک گئے۔ میں بڑے اطمینان سے لفافہ باہر نکالا اور اسے چاک کرنے جا رہا تھا کہ ان میں سے ایک بد معاش نے میرا ارادہ بھانپ لیا۔ اور وہ بجلی کی طرح مجھ پر بھینٹا۔ اگر میں غلٹ سے کام نہ لیتا تو لفافہ ان کے ہاتھ لگ جاتا۔ میں نے بغیر کسی تاخیر کے اس لفافے کے پرزے کر ڈالے اور کھڑی سے باہر بھینک دیے۔

ان چاروں نے مل کر میرے ساتھ جو وحشیانہ سلوک کیا اسے شاید میں زندگی بھر نہ بھول پاؤں۔ وہ انسان نہیں درندے تھے۔ میں ان کے ہاتھوں اور لاقوں کی ضربیں برداشت نہ کر سکا اور بے ہوش ہو کر فرش پر گر پڑا۔

مجھے پٹائی کے دوران اس بات کی ذرا بھی امید نہیں تھی کہ میں ان درندوں کے ہاتھوں سے زندہ بچ جاؤں گا۔ ان چاروں نے مل کر جس بے رحمی سے میری دردگت پٹائی تھی، وہ کچھ میرا ہی دل جانتا تھا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں بہت دیر تک یہی سوچتا رہا کہ آخر ان لوگوں نے مجھے زندہ کیوں چھوڑ دیا۔

پوری طرح ہوش آنے کے بعد میں نے درد سے کراہتے ہوئے آنکھیں کھولیں تو میری نگاہ سب سے پہلے لالچ کی چھت پر پڑی۔ خود میں انتہائی کسمپرسی کے عالم میں فرش پر پڑا ہوا تھا۔ میرے ایک ایک انگ سے درد کی ٹپکیں اٹھ رہی تھیں کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اچانک عرش پر آہٹ سنائی دی اور میں اس خیال سے لرز گیا کہ وہ بد معاش اب بھی موجود ہیں اور شاید اس

انتظار میں ہیں کہ ہوش میں آنے کے بعد دوبارہ میری مزاج پر سی کریں۔ اس خیال کے آتے ہی مجھ پر غشی طاری ہونے لگی۔ میں نے دل میں سوچا کہ اب انھیں سب کچھ صاف صاف بتا دوں گا۔

یوں بھی اس بات کو پسند نہیں کرتا تھا کہ میرے ملک کے صدر کو قتل کر کے اس کا تختہ الٹ دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح ملک میں بد امنی پھیلے گی اور ہنگاموں کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ نہ جانے مجھے کیوں یہ یقین ہو گیا تھا کہ نسیم شیخ کوئی غیر ملکی ایجنٹ ہے اور میرے ملک کو نقصان پہنچانا چاہتی ہے۔ میں ایک محب وطن ہونے کی حیثیت سے کسی طرح بھی یہ گوارہ نہیں کر سکتا تھا۔ کہ میرا ملک غیر ملکی طاقتوں کے ہاتھوں کھلونا بن کر رہ جائے۔

میں نے آنکھیں بند کر کے سانس روک لی تاکہ وہ مجھے مردہ سمجھ کر واپس چلے جائیں۔ بیروں کی چاپ بندوق میرے قریب آ کر محدود ہو گئیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ دو افراد ہیں۔ اس کے ساتھ میں نے اپنے ہاتھوں میں ایک عجیب سے منک محسوس کی جو کسی عطریہ پھول کی نہیں ہو سکتی تھی۔ مجھے اس لمبے اپنی سانسوں پر قابو پانا دشوار سا لگ رہا تھا۔ اس منک نے میرے پورے وجود میں فرحت کی لہر دوڑا دی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور وہ کیا ہی تھا کہ کسی کارنم ونازک سر میرے سینے پر جھک آیا۔ کوئی کلن لگا کر میرے دل کی دھڑکنیں سن رہا تھا۔ اس کے سر کا خوش گوار لمس مجھے حیات نو بخشنے لگا۔ میں اپنی ساری تکلیف بھول گیا۔ اور ایک لذت اپنی آنکھیں کھول دیں۔ گھٹاؤں جیسے کالے پل میرے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ نسیم شیخ تھی۔

میرے جسم میں حرکت محسوس کر کے نسیم شیخ نے اپنا سر اوپر اٹھایا تو سنا ”میری نگاہ شامو پر پڑی جو ایک طرف مودب کھڑا ہوا تھا۔ نسیم شیخ میرے پاس ہی دو زانو ہو کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے سر جھٹک کر بالوں کو پیچھے کیا اور اپنے شانے پر ساڑھی کا پلو درست کرنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں ایک انجانا سا خوف جھانک رہا تھا۔ وہ کچھ متشکر اور پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے اپنی طرف دیکھنا پڑا کہ وہ بولی ”تم ٹھیک تو ہو؟ ان لوگوں نے تمھیں زیادہ نقصان تو نہیں پہنچایا؟ اب کیسے ہو؟“ اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

”آپ ہی کے سامنے ہوں۔“ میں نے شوخی سے جواب دیا۔ ”اگر ان لوگوں کے دو چار ہاتھ اور پڑ جاتے تو پھر شاید زندہ نہ رہتا۔“

”مجھے بہت افسوس ہے کہ ان لوگوں نے تمھارے ساتھ زیادتی کی۔“ اس نے افسردگی سے کہا۔ ”لیکن میں تمھاری ثابت قدمی سے بہت متاثر ہوئی ہوں۔ تم نے اپنی جان کی پروا کیے بغیر اس راز کی حفاظت کی۔ میں تمھیں اس کے صلے میں ایک بہت بڑا انعام دینے والی ہوں۔“ اس نے پلٹ کر شامو کو کوئی اشارہ کیا تو وہ تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

اس کے باہر نکلتے ہی میں نے حیرت آمیز لہجے میں پوچھا۔ ”کیسا انعام؟“

”آخر اس کارنامے پر کوئی انعام تو ملنا چاہیے؟“ اس نے اپنے پاس رکھے ہوئے پرس میں سے رومال نکالا اور میرے ہونٹوں کے گوشوں پر پھیلے ہوئے خون کو صاف کرنے لگی۔ ”مجھے تم جیسے ہی ایک نوجوان کی ضرورت تھی، جو میرے راز کا امین بن سکے اور اپنے وعدے کا پاس رکھنے کے لیے اپنی جان بھی داؤ پر لگا دے۔ کیا ایسا شخص کسی بڑے اور اہم انعام کا مستحق نہیں ہے؟“ اس کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں میری آنکھیں اترنے لگیں۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ اس کے ہاتھ کے لمس سے میرے زخموں کی تکلیف دور ہوتی جا رہی تھی۔ یک بارگی اس نے اپنا ہاتھ میرے چہرے پر سے ہٹا کر پوچھا۔ ”کیا تم میرے لیے ایک

بنا سکوں" اس نے بڑی آہستگی سے اپنا سر میرے سینے پر رکھا تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں نے بھی اپنی منزل پائی ہے۔ وہ سبک کر بولی "کیا تم جیلہ کو اپنا پسند کرو گے؟..... مجھے ٹھکراؤ گے تو نہیں؟"

کوئی ایک ہفتے کے بعد میرے زخم مندمل ہوئے اور اس لانچ میں بڑی سادگی کے ساتھ ایک چھوٹی سی تقریب میں شری طور پر اس سے میری شادی ہو گئی۔ وکیل اور گواہ کا بندوبست شامو نے کیا تھا۔ اسی نے لانچ کے کمرے کو جگہ عروسی کے طور پر سجا دیا تھا۔

رات دس بجے شامو رخصت ہو گیا اور لانچ میں صرف میں اور جیلہ رہ گئے۔ جب میں جگہ عروسی کی طرف بڑھ رہا تھا تو میرے ذہن میں فردوس پہلے کی طرح آکڑی ہوئی لیکن اب جیلہ کو پانے کے بعد مجھے فردوس کی کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی "اس لیے کہ اس کی محبت میری جیب اور ملازمت سے مشروط رہی تھی۔

میں نے جگہ عروسی میں قدم رکھا تو جیلہ لمبا سار نکلیں گھونگٹ نکالے، بنگال کے روایتی انداز سے میرے انتظار میں اپنی گردن کو جھکائے کھڑی تھی۔ میں اس کے قریب پہنچا تو وہ ایک دم ہی رکوع کے انداز میں جھکی اور میری پیروں پر آگری۔ میں اسے اٹھانے کے لیے جھکا تو وہ یک لخت پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

میں نے اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا اور پھر اس کے چہرے پر سے گھونگٹ ہٹا دیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں "چہرہ آنسوؤں میں تر تھا، پلکیں اور ہونٹ قرقر رہا ہے تھے۔ میں نے اس سے روئے کاسب پوچھا تو جواب ملا "مجھے اپنے وہ لوگ یاد آ گئے ہیں جن سے میرا رشتہ ناتا ہے، کوئی بھی تو میری ان خوشیوں میں شریک نہیں ہے۔"

وہ جب کسی قدر نارمل ہوئی تو غم کی گھٹائیں چھٹ گئی تھیں رات کا تیزی سے گزرتا ہوا یہ حصہ گلے شکوے اور باتوں میں ضائع کرنے کے لیے نہیں تھا۔ یہ رات تو ایک ذات کو دوسری ذات کا جزو بنانے کے لیے تھی۔ میں اتنا کچھ سمیٹتا تھا کہ دل میں کوئی حسرت باقی نہ رہے، اور پھر صبح ہونے تک ہم دونوں محبت کے ایک ایسے بندھن میں بندھ گئے تھے کہ کوئی طاقت ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتی تھی۔

اگلے ہی روز ہم رنگائی کے پر فضا مقام پر ماہ غسل منانے پہنچ گئے۔ جیلہ نے پانیوں کے بیچ اور اونچے نیچے پرینا ہوا وسیع وعریض بنگلا کرانے پر سے لیا شامو بھی ہمارے ساتھ تھا۔

وہ میری زندگی کے یادگار دن تھے۔ وہ بدلی بن کر مجھ پر برستی رہتی اور میں ہیرا بھرتا۔ صبح کب ہوتی اور رات چپکے چپکے سے کیسے آ جاتی، ہمیں خبری نہیں ہوتی تھی۔ جب ہم دونوں سرشاری کے عالم میں ڈوبے ہوئے ہوتے تو وہ نقلی آواز میں پوچھتی۔ "سکندر اکیا تم مجھ سے واقعی محبت کرتے ہو؟"

میں اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں سمیٹ کر جواب دیتا۔ "جیلہ! میں ان مردوں میں سے نہیں ہوں جو محض حسن اور دولت پر مرتے ہیں تم میری سچی محبت ہو کسی بھی دن آزمائش کی ہو صرف تم سے محبت کرتا ہوں"

"اچھا! وہ خوشی سے کھنکھتی۔ "کیا تم محبت کی آزمائش پر پورے اتر سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں! میں سنجیدہ ہو جاؤں گا۔" تمہارے بغیر میری زندگی ادھوری رہ جائے گی۔"

وہ مسکراتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانک کر کہتی۔ "میں تمہیں ایک روز آزمائش کی گی۔"

جب میں جیلہ پر اپنی شدید محبت کا اظہار کرتا تو میرے دل پر انجانے میں دکھ کی صلیب لہرانے لگتی، مجھے اپنی آواز اور اپنی محبت کھوکھلی سی محسوس ہوتی۔

ایک ماہ کا عرصہ پلک جھپکتے گزر گیا۔ اس کے باوجود میں نسیم شیخ کا معاملہ نہیں کر سکا۔ وہ میرے لیے جیلہ بن کر بھی پر اسرار ہی رہی۔ میں نے کئی مرتبہ اس سے پوچھا بھی چاہا کہ وہ کون ہے اور اس کا کس خاندان سے تعلق

اور قربانی دے سکتے ہو۔؟" اس کی آنکھوں میں ابرو سا چھانکنا اور چہرے پر کرب ابھرنے لگا۔

"میں نے اپنا وجود آپ کے ہاتھوں بچا ہے۔" میں نے ایک گہرا سانس لے کر آہستگی سے جواب دیا۔ "بس آپ رحم دیں۔ میں آپ کے اشارے پر مرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"لیکن یہ قربانی تمہاری اپنی ذات کی ہوگی۔ شاید تمہارا وجود ریزہ ریزہ ہو جائے۔" وہ کہیں کھوسی گئی۔ اس کی آنکھیں نہ جلنے کیا سوچنے لگی تھیں۔ "کئی چٹنوں بعد وہ بولی۔ "تمہیں اپنے اہل خانہ، جذبوں اور احساسات کا خون کرنا ہوگا۔ پھر تمہاری زندگی میں شاید ایک دن ایسا بھی آئے کہ اس قربانی پر تمہیں بچھتاؤ اور تم ایک کرب کی آگ میں جلے رہو۔"

"میں نے قہر زدہ ہو کر پوچھا۔ "آخر آپ مجھ سے کیسی قربانی چاہتی ہیں؟"

"میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں!" اس کی آواز میں لرزیدگی نمایاں تھی "کیا تم مجھے بیوی کے روپ میں قبول کرنا پسند کرو گے؟ میں جس طرح چاہوں گی کسی زندگی میرے ساتھ گزارا سکوں گے؟"

"شادی!" مجھ پر سستہ سا چھانکنا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنے جذبات اور خوشی اور اظہار کیسے اور کیوں کر کروں۔

اس نے مجھے بت کی طرح خاموش پا کر پوچھا۔ "تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟"

"لیکن۔۔۔" میں نے تذبذب سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولی۔

"شاید تم اس بات پر حیران ہو رہے ہو۔ کہ میں تم سے کس لیے شادی کرنا چاہتی ہوں؟"

میں نے اٹھتی انداز میں اپنا سر اٹھایا تو اس نے گھیری پلکیں جھکا کر ایک گہری سانس لی۔

میں ایک خوش نصیب عورت سمجھی جاتی ہوں، اس لیے کہ میرے پاس بے حساب دولت موجود ہے، زندگی کی ساری آسائشیں میرے قدموں میں لوثی رہتی ہیں۔ لیکن دوسری جانب شاید ہی مجھ جیسی کوئی بد نصیب عورت ہوگی جو اتنی بڑی دنیا میں تنہا ہے۔ لڑکیوں اور عورتوں میں حسن و جمال کو بڑی خوش نصیبی تصور کرتی ہیں لیکن میرے نزدیک حسن کسی عذاب سے کم نہیں ہے۔۔۔ اس طرح دولت بھی ایک دیک ہے جو انسان کو بری طرح چلت پھرتی ہے۔ حسن اور دولت کی یہ فراوانی میرے لئے سواہن روح بن گئی ہے۔ میں نے جسے بھی اپنا ہم سفر بنانا چاہا اسے محض اپنے فتن اور دولت کا بھوکا پایا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں محبت کی رمت بھی نہیں پائی۔ میں چاہتی تھی کہ اپنی ساری دولت محتاجوں اور غریبوں میں بٹ دوں اور ایک عام سی عورت بن کر زندگی گزاروں،

میرا شوہر مجھے اپنے ہاتھوں کی کمانی کھلائے۔ مگر کوئی محض بھی اس ایثار اور قربانی کے لیے تیار نہیں ہوا۔ نفسیاتی مریض مجھ کو میرا لفظ اڑایا جانے لگا۔ "شاید اس لیے کہ آج ہر شخص دولت کے پچھے پاگل ہوا جا رہا ہے۔" اس نے رک کر میری جانب دل گرفتہ انداز سے دیکھا۔ اس کے ختماتے ہوئے سرخ رخساروں پر کرب چھلنے لگا۔ وہ خود کھای کے انداز میں کہنے لگی۔ "جب میں بالکل ہی باموس ہو گئی تو میں نے اپنی زندگی کا ایک عجیب و غریب فیصلہ کیا۔ میں نے اپنے دل میں تیرہ کر لیا کہ کسی ایسے مرد سے شادی کروں گی جو بالکل مفلس اور تلاش ہوگا۔ میں اسے سارا دے کر آنکھوں کی، اس کا ساتھ دوں گی، اپنی آخری سانسوں تک اس سے نباہ کروں گی۔۔۔ لیکن یہ راہ بھی آسان نہیں تھی۔ جب مجھے اس سنگھار راستے پر تھا چنانچہ دشوار لگا تو میں نے اپنے پرانے خاندانی ملازم شامو کا انتخاب کیا۔ اسے اچھا میں لیا۔ وہ ایک لمحے کو چپ ہوئی پھر بولی "میں نے اس دشوار گزار اور ٹیڑھے میزھے راستے پر چلنے ہوئے تمہیں پایا۔ میں نے قدم قدم پر تمہاری آزمائش کی، تم کو کڑی دھوپ میں لاکھڑا کیا تاکہ تمہیں کندن



ہے۔ مگر اس نے ہر بار میرے سوالوں کو ہنس کر ٹال دیا۔ وہ میرے شدید اصرار پر کہتی ”تم یہ سب جان کر کیا کرو گے؟“ کیا تمہارے لیے یہ بات خوشی کی نہیں ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو بے حد چاہتے ہیں اور ہمیشہ چاہتے رہیں گے۔“

میں نے اسے اکثر گہری سوچوں میں غرق، متفکر اور پریشان سا پایا تھا۔ وہ کبھی کبھی اس قدر افسردہ اور ملول سی ہو جاتی تھی کہ کسی کو نہ کھدے میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی۔ میرے لاکھ پوچھنے پر بھی جب وہ کچھ جواب نہ دیتی تو میں الجھ سا جاتا جانے کیوں میرے دل میں یہ کھلک سی ہوتی تھی کہ وہ مجھ سے کوئی خاص بات چھپا رہی ہے۔ ایک آدھ بار میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ کہیں وہ کسی اور مرد سے محبت تو نہیں کرتی؟ لیکن اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ مجھ سے شادی کیوں کرتی؟ ایک دولت مند اور حسین عورت کے راستے میں سناج، دیوار نہیں بن سکتا تھا۔ کئی دنوں تک مجھے یہ شبہ بھی رہا کہ وہ مجھ سے شادی کر کے اپنے محبوب سے انتقام لے رہی ہے۔ لیکن جیلہ کی محبت کے اظہار نے یہ احساس بھی زائل کر دیا۔

اس نے مجھ سے ٹوٹ کر محبت کی تھی۔ وہ ہر طرح سے میرے آرام کا خیال رکھتی تھی۔ شامو کی موجودگی کے باوجود اپنے ہاتھوں سے میرے کپڑے دھوتی، ان پر استری کرتی، اپنے ہاتھوں سے مجھے اپنی اور میری پسند کی ڈشیں پکا کر کھلاتی۔ جب کبھی وہ چٹاگانگ جاتی تو میرے لیے جانے کیا کچھ خرید کر لاتی میں اسے فضول خرچی پر ٹوکتا تو وہ برا ماننے کی بجائے ہنس کر کہتی ”میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔ تم خوش رہا کرو۔ غیرت نہیں برتاؤ۔ تم اور میں جدا نہیں ہیں۔“

شامو ایک سنگ دل چٹان کی طرح تھا۔ میں نے جیلہ کے بارے میں جاننے کے لیے اس سے اپنا سر پھوڑ لیا تھا لیکن اس نے جیلہ یا نسیم شیخ کے بارے میں ایک لفظ بھی اگلا گوارہ نہیں کیا۔ کبھی کبھی میں اس کی خاموشی پر بری طرح جھنجھلا جاتا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اس کا گلا گھونٹ دوں یا پھر اپنا ہی گریبان چاک کر ڈالوں۔ کوئی ایک ماہ کے بعد جیلہ نے میرے ہاتھ پر پانچ ہزار کی رقم رکھی۔

”یہ کس بات کے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔  
”تمہاری پہلی تنخواہ!“ وہ مسکرا دی ”میں اپنے پرانے معاہدے کی رو سے تمہیں دے رہی ہوں۔“  
”تو گویا میں تمہارا زر خرید شوہر ہوں!“ میں نے چہچہتے ہوئے لہجے میں اسے جواب دیا۔ ”میں پہلے ہی تمہاری دس ہزار کی رقم کا مقروض ہوں۔“

جیلہ مضطرب اور بے چین سی ہو گئی ”تم میرا مطلب نہیں سمجھے۔ میرا یہ مقصد نہیں ہے۔ آخر تمہیں جیب خرچ بھی چاہیے نا“

”میں کل سے ملازمت کی تلاش میں جا رہا ہوں۔“ میں نے آہستہ سے جواب دیا۔ ”تم میری بیوی ہو۔ میں تمہیں اپنے بازوؤں سے کما کر کھلاؤں گا۔ جیسا کہ تم چاہتی ہو۔“

جیلہ کی سانسیں الجھنے لگیں۔ ”سنو سکندر! تم ملک کے حالات جانتے ہو۔ ہمارا ملک کس قدر نازک حالات میں گزر رہا ہے۔ روز بروز بے روزگاری بڑھتی جا رہی ہے۔ آئے دن کتنی ہی فریض دیوالیہ ہو رہی ہیں۔ ان بات میں تمہیں ملازمت کہاں اور کیسے مل سکتی ہے! اگر تمہیں ناگوار نہ ہو تو میں ایک مشورہ دوں!“

”کیسا مشورہ؟“ میں نے ڈھٹکی ہوئی آواز میں پوچھا۔  
”تم ایسا کرو کہ یہاں ایک درمیانے درجے کا ہوٹل خرید کر اس میں ایک جنرل اسٹور بھی کھول لو۔“ جیلہ

متذبذب ہو کر ہوئی۔ ”یہاں کلوی کے بنے ہوئے ہوٹل اذراں قیمت پر مل جاتے ہیں۔ زیادہ سرمایہ کی ضرورت بھی نہیں ہوگی۔ سرمایہ بھی میں فراہم کر دوں گی۔“

”ناک زندگی بھر تمہارا محتاج رہوں!“ میری آواز ڈولنے لگی۔  
”تم مجھ سے قرض لے لو۔“ جیلہ کی آواز بھرا گئی۔ ”تمہیں قرض لینے میں تو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔“

میں نے بادل غماض ہائی بھری دو سرے ہی دن گھاٹ کے پاس وہ ہوٹل خرید لیا گیا۔ جس پر کئی دنوں سے ”برائے فروخت“ کی تختی لٹکی ہوئی تھی۔ اس کی حرمت اور درنگی میں کوئی ایک ہفتہ لگ گیا ایک روز جب میں شامو کے ہمراہ شہر جا کر جنرل اسٹور کا سالن خرید کر واپس آیا۔ تو جیلہ بہت خوش تھی۔ میں نے ایسی بے پناہ خوشی اور سرشاری کی کیفیت اس پر آج تک طاری ہوتے ہوئے نہیں دیکھی تھی۔ اس کا چہرہ دمک دمک کر کھلا ہوا جا رہا تھا۔ میں نے اس کی خوشی کی وجہ پوچھی تو وہ ٹال گئی۔ یقیناً وہ کوئی بات مجھ سے چھپا رہی تھی۔ میرے دل میں ایک انجانے شک نے جنم لے لیا۔ ایک آدھ بار میں اسے شامو کے ساتھ پر اسرار انداز میں سرگوشی کرتے ہوئے بھی دیکھ چکا تھا۔ آج میری غیر موجودگی میں نہ جانے ایسی کیا بات ہو گئی تھی کہ اس کے تیور اور انداز بدل کر رہ گئے تھے۔

جیلہ نے میرے دل میں ایک نامعلوم شبہ سے کو جنم دے دیا تھا، تاہم میں نے اپنے بڑے سے اس پر اپنے اندرونی اضطراب اور دلی کیفیت کو ظاہر نہ ہونے دیا۔ رات کھانے کی میز پر بھی وہ پورے سوڈ میں تھی اور بات بات پر لطیفے سنارہی تھی۔ میں نے اس کے قہقروں میں پوری طرح ساتھ دیا تھا۔ میں نے دل سے اس کے پکائے ہوئے کھانوں کی تعریف کی تھی۔ ہم دونوں نے چاندنی رات کا لطف اٹھانے کے لیے بری دیر تک بوٹنگ بھی کی تھی۔ اس وقت بھی میرے دل میں آیا کہ جیلہ سے اس خوشی کا راز دریافت کروں لیکن کچھ سوچ کر خاموش رہا۔ ویسے میں نے اپنے دل میں تہہ کر لیا تھا کہ چاہے کچھ ہو جائے میں ہر قیمت پر اس کی بے پایاں خوشی کا راز معلوم کر کے رہوں گا۔ مجھے اب ہر حال میں نسیم شیخ کی شخصیت کا معامل کر کے اس کا اصل چہرہ دیکھنا تھا۔ آخر وہ کون ہے؟ اس کا تعلق کس خاندان سے ہے؟ اس نے مجھ سے شادی کیوں اور کس لیے کی ہے؟

حسب معمول ہم رات گئے تک جاگتے رہے۔  
صبح جب میری آنکھ کھلی تو میرا سارا بدن ٹوٹ رہا تھا اور پلکیں بھاری ہو کر بند ہوئی جاری تھیں۔ مجھ پر کچھ ایسا غماز اور غمو کی سی چھائی ہوئی تھی کہ بستر چھوڑنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا، تاہم جب میں نے کمرے میں دھوپ پھیلی ہوئی دیکھی تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ گھڑی پر نظر مئی تو دن کا ایک بج رہا تھا۔ آج خلاف توقع نہ جانے کیا بات ہو گئی تھی کہ میں اتنی دیر تک نیند میں ڈوبا رہا حالانکہ اس سے پہلے بھی ایسا نہیں ہوا تھا، ہم دونوں روزانہ رات کے آخری پہر میں سو پاتے تھے مگر صبح اٹھ نو بجے تک جاگ جاتے تھے۔ لیکن آج دن کے ایک بجے تک مجھے نیند نے اپنی آغوش میں سمیٹ کر رکھا ہوا تھا۔

میں نے گردن تھما کر جیلہ کو دیکھا مگر وہ بستر پر موجود نہیں تھی۔ میں سمجھا کہ وہ غسل کر رہی ہوگی۔ کتنی ہی لمحوں تک میں نے اپنے کان غسل خانے کی طرف لگائے رکھے لیکن غسل خانے سے پانی گرنے کا کوئی شور نہیں سنائی دیا۔ میں نے برآمدے کی طرف بھی نظر ڈالی کیونکہ جیلہ غسل کرنے کے بعد برآمدے میں کھڑی ہو کر اپنے بال خشک کیا کرتی تھی، مگر آج برآمدہ بھی سناں پڑا ہوا تھا۔ میں نے دیوار میں نصب اطالائی ٹخنٹی کاٹھن دیکھا تاکہ



وہاں میں نے شہر کا چپا چپا چھان مارا مگر جیلہ کا کوئی سراغ نہ ملا۔ اس دور میں رہنمائی بھی کیا کہ شہر سے میری محبت کی کشش وہاں پہنچ لائی ہو مگر وہاں بھی پوسی نے میرا استقبال کیا۔

میں نے ایک سال کے عرصے تک اس کی تلاش جاری رکھی۔ بنگلہ کا کون سا شہر؟ کبھی 'قریب' کبھی 'دور' کونہ تھا جہاں میں نے اس کا کھونج نہ لگایا ہو۔ میرے اندازے کے مطابق اس نے یورپ کے کسی شہر میں جا کر پناہ لے لی تھی۔ تھک ہار کر میں رہنمائی واپس آ گیا۔ میں نے اپنی ساری توجہ کاروبار پر مرکوز کر دی تاکہ اس طرح دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو سکے۔ میں نے ہوش کا کام بھی اس بے وقار کے نام پر رکھ دیا تھا۔

نہ جانے کیوں مجھے اب بھی یہی امید تھی کہ وہ ایک روز ضرور واپس آئے گی۔ میں ہر روز شہر سے آئے والی بسوں اور کاروں میں جیلہ کا چہرہ تلاش کرتا۔ گھٹ پر جا کر کپتلی سے آئے والی مسافر لالچوں میں جھانکنا اور پھر شام ہوتے ہی کھلی فضا میں سڑکوں پر آوارہ گردی کرنا رہتا۔

دو سال کا عرصہ میں نے اس کی یاد میں کرب اور وحشت سے گزار دیا تھا۔ میں نے جیلہ کے بھوکے کچھ نہیں سوچا، کبھی اپنے رب سے گڑگڑا کر دعا مانگی تو جیلہ کے سوا کچھ نہیں مانگا۔ میں اکثر جذباتی ہو کر سوچتا: دو سال گزر گئے۔ دو سال اور گزر جائیں گے۔ پھر دو سال اور گزر جائیں گے۔ اس طرح دو دو سال کر کے صدیاں گزر جائیں گی۔ پھر ایک روز میری زندگی کا آخری لمحہ آچینگے گا مگر جیلہ پھر بھی نہیں آئے گی، اپنے ہاتھوں سے میری قبر پر پھولوں کی چادر نہیں چڑھائے گی۔ میری روح کو مرکز بھی چین نہیں ملے گا۔ میری روح تڑپتی ہی رہے گی۔

اس رات میں ہوش کے ایک کمرے میں بستر لیٹا ہوا جیلہ کے تصور میں گم تھا۔ کڑی کی سلاخوں کے پیچھے پورا چاند مسکرا رہا تھا۔ میرے کمرے میں چاندنی مکمل کر رہی تھی۔ وہ بھی تو اس چاند کی طرح حسین تھی۔ جیلہ وہ اپنی کرفوں سمیت مکمل ہو چکی تھی۔ میرے پاس آج صرف اس کی یادیں ہی رہ گئی تھیں۔ ان بیٹے دنوں کی پرجھپٹیاں ہر سو پھیلی ہوئی نظر آتی تھیں۔ اس کی منک میری سانسوں میں بسی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا تھا کہ میں اس کے دل کی دھڑکنیں سن رہا ہوں، جیلہ کب تک ستار ہوں گا اور آخر تک روزیہ سب کچھ خواب بن کر رہ جائے گا۔

"میری نگاہ غیر اختیاری طور پر دروازے کی طرف اٹھ گئی۔ راہداری میں ایک ہلکی سی چاپ اچھری تھی۔ پھر چند ثانیے بھی نہیں گزرے تھے کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میں ایک جھٹکے سے بستر سے اٹھ آیا۔ دستک کا یہ انداز اس سے پہلے میں نے نہیں سنا تھا۔ میرے ہوش کے ملازمین اور ملاقاتی کسی اور طرح سے دروازے پر دستک دیا کرتے تھے۔ میرا دل ایک عجیب احساس سے دھڑکنے لگا۔ میں نے مرتش آواز میں پوچھا: 'کون ہے؟' دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اندر آ جاؤ۔"

دروازہ بڑی آہستگی سے کھل گیا۔ آسمان پر مسکراتا ہوا چاند میرے کمرے میں اتر آیا تھا۔ دلچیز پر جیلہ کڑی تھی۔ میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی جیلہ کو دیکھا اور دیکھا ہی رہ گیا۔

اس دو سال کے عرصے میں اس کے اندر بڑی تبدیلی آچکی تھی۔ اس کے جسم میں پہلے سے کہیں زیادہ دل کشی اور گداز پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سا نکھار، حسن کا دیدہ اور ملکوتی وقار چھایا ہوا تھا۔ رخساروں کی گلابی رنگت کچھ اور فروزاں تھی۔ وہ بے تابانہ اپنی بانیں پھیلا کر میری جانب بڑھی۔ میں بھی اپنی ذات کو فراموش کر کے جنونی انداز میں آگے بڑھا۔ اس پورے چاند کی رات ہم دونوں ایک دوسرے کا دیکر ترشے رہے۔ جیلہ نے مجھے اپنے خاندان کی سیاست، رنجشوں اور باہمی جھگڑوں کے دردناک واقعات کی ایک لمبی مکملی سنائی۔

شام کو بلا کر اس سے جیلہ کے بارے میں دریافت کروں۔ پانچ منٹ... دس منٹ... اور پھر پندرہ منٹ گزر گئے لیکن شامو نہیں آیا۔ میرا ہاتھ کاٹھا کاندھوں میں ہڑپا کر بستر سے نکل آیا۔

میں نے جھٹکے کا کونہ کونہ چھان مارا۔ جیلہ اور شامو، دونوں ہی غائب تھے۔ میں سنائے میں آ گیا۔ آخر یہ دونوں کسے کہاں؟ 'معا' مجھے جیلہ کے کپڑوں اور سوٹ کیس کا خیال آیا۔ میں سنسناتے ہوئے تیرکی مانند اپنے کمرے میں پانچا اور الباری کھولی تو اس میں جیلہ کے کپڑے کی ایک دھجی بھی موجود نہیں تھی، البتہ سو سو گٹے کے ٹوٹوں کی دو گڈیاں پڑی ہوئی تھیں۔

میرا دل دھک سے رہ گیا اور میں کسے ہوئے شہر کے مانند اپنے بستر پر آگرا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا معاملہ ہے ایک بارگی میں اپنی پوری قوت سے چیخا۔ "جیلہ... جیلہ... شامو... شامو!"

جیلہ کی بے پناہ مسرتوں کا سربستہ راز مجھ پر کھل گیا تھا۔ کل شاید اس کا روٹھا ہوا محبوب اسے تلاش کرنا ہوا یہاں تک آپہنچا تھا۔ میں نے اکثر یہ بات محسوس کی تھی کہ جیلہ جب بھی شہر جاتی تو کچھ اداس اداس سی نظر آتی تھی مگر جب لوٹ کر آتی تو بہت خوش دکھائی دیتی تھی۔ میں یہی سمجھتا رہا کہ وہ میری عارضی جدائی کی وجہ سے اداس ہو جاتی ہے اور شام واپس آتی ہے تو لاپ کا احساس اسے خوش و خرم کر دیتا ہے۔ لیکن آج سب کچھ عیاں ہو گیا تھا، وہ اپنے محبوب کے ساتھ فرار ہو گئی تھی۔ اسی منصوبے کے تحت وہ رات مجھ پر ضرورت سے زیادہ ہی مہربان رہی تھی۔ پھر سوتے وقت اس نے مجھے نہ جانے دودھ میں کیا ملا کر دیا تھا کہ میں دیر تک سوٹا رہا۔

میرا ذہن مفلوج سا ہو گیا تھا۔ مجھے کسی مل قرار نہیں آ رہا تھا۔ اگر اس کے دل میں کوئی اور بسا ہوا تھا تو اسے اتنی دور جانے کی کیا ضرورت تھی؟ اس نے مجھے تماشا کیوں بنایا؟ مجھ سے شادی کرنے اور اس پر فضا مقام پر رہ کر زندگی بسر کرنے کا منصوبہ کس لیے بنایا؟ جیلہ کی پراسرار شخصیت میری سمجھ میں نہیں آئی۔ میں اس کے بارے میں جس قدر سوچتا، اتنا ہی الجھتا جا رہا تھا۔ اس میں ہزار کی رقم کا جواز بھی میری سمجھ میں نہیں آ سکا کہ وہ کس لیے چھوڑ گئی ہے۔ میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ مجھے رشوت اور لالچ دے گئی ہے کہ میں اس کا تعاقب نہیں کروں اس کا خیال چھوڑ دوں، دل سے نکال پھینکوں، اس لیے کہ اس کی منزل میں نہیں کوئی اور تھا۔ اسے اس کی منزل مل گئی ہے۔ کیا مجھے سکندر اعظم؟

میرے دل میں ایک ایک کر کے جانے کتنے چر کے تکتے رہے۔ میری دگوں میں وحشت اور غمے میں جھنجھلاہٹ ہونے لگی۔ میں اس لمحے اس قدر شدید طور پر جذباتی ہو گیا تھا کہ کسی نتیجے اور فیصلے پر نہیں پہنچ رہا تھا۔ ایک شدید اذیت تھی جس نے مجھے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ میں نے اپنے دل کی آواز کو گہرا کیوں میں جھانک کر دیکھا تو ہر گوشے میں جیلہ کے نقش ثبت نظر آئے۔ اس کے بغیر مجھے اپنی زندگی اور ماضی کی محسوس ہونے لگی، اس لیے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کی ذات کا جزو بن گئے تھے۔ میں اس کے بغیر اس کڑی دھوپ میں اپنی زندگی کا سفر جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔ آخر وہ میری بیوی تھی، میری اپنی ملکیت تھی۔ دنیا کی کسی طاقت کو یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ میری روح کو مجھ سے جدا کر دے۔ نہ جانے وہ کون لٹیرا تھا جو میری خوشیوں کو بے رحمی سے روند کر اور پائل کر کے چلا گیا تھا۔ میں بہت دیر تک سوچوں کے گرداب میں الجھا رہا مگر صرف سوچنے سے تو میں اپنی کھوئی ہوئی منزل نہیں پاسکتا تھا۔ مجھے خود چل کر اپنی منزل تلاش کرنا تھی۔ 'معا' مجھے جیلہ کی بات یاد آئی۔ وہ اکثر شرارت آمیز شوخی سے کہتی تھی۔ "کیا تم محبت کی آزمائش پر پورے اتر سکو گے؟"

میں نے ایک بھروسے کے ملازم کو ہوش کی ذمہ داریاں سونپیں اور جیلہ کی تلاش میں چٹا گانگ پہنچ گیا۔

سوال کا جواب کسی قدر محتاط ہو کر دیا تھا۔ جب میں نے جھگڑے پر پہنچ کر اپنی خواب گاہ میں قدم رکھا تو میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ مجھ پر جیسے بجلی گر پڑی تھی۔ میں نے اس کمرے میں چار آدمیوں کو دیکھا جو اپنے چہرے مرے وضع قطع انداز اور تیور سے بد معاشی دکھائی دے رہے تھے۔ وہ سب ہسپتال 'چاقو' اور خنجروں سے مسلح تھے۔ میں نے پلٹ کر شامو کی طرف دیکھا، اس کے چہرے پر کینٹنی اور سفاکی پھیلی ہوئی تھی۔

"شش... شامو؟" میں ہکا کر رہ گیا۔

"ہاں" میں شامو ہی ہوں "اس نے آگے بڑھ کر میرا گریبان پکڑ لیا۔ "تم کوئی خواب نہیں دیکھ رہے ہو! غور سے دیکھو، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھو، میں شامو ہی ہوں"

"میں نے تمہارا کیا کا کا ہے شامو؟" میری آواز گلے میں رندہ گئی۔ میں متوحش نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں تمہاری ماکنن کا شوہر ہوں۔"

"ہاں میں جانتا ہوں۔" اس نے میرے گریبان کو ایک جھٹکا دیتے ہوئے کہا اور اپنی جیب سے یہ کیا ہوا ایک کانڈ نکال کر میری نگاہوں کے سامنے لہرایا۔ "اس پر دستخط کرو۔" اس کے لیے میں زہر بھرا ہوا تھا۔

میں نے تھیر زوہ نظروں سے اس کانڈ کی جانب دیکھا۔ "یہ کیا ہے؟"

اس کے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ "طلاق نامہ"

"طلاق نامہ؟" میری آنکھیں وحشت سے پھٹنے لگیں۔

"تم اپنی بیوی کو طلاق دے دو! شامو نے وحشی دندے کے انداز میں مجھے گھورا "ہم تم سے طلاق لینے آئے ہیں۔"

میرا جسم دل اور سانس جیسے ساکت ہو کر رہ گئی تھیں۔ میں نے کچھ کتا چاہا تو یوں لگا کہ جیسے زبان پر فالج گر گیا ہو۔ میری آنکھوں کے سامنے دھند چھانے لگی۔ میں خوف زدہ نظروں سے شامو کو دیکھ رہا تھا جس کے چہرے پر درد منگی چھائی ہوئی تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کسی روز مجھے اس غیر متوقع اور لرزہ خیز حادثے سے دو چار ہونا پڑے گا اور میری ہستی ریزہ ریزہ ہو جائے گی۔ میں بمشکل تمام انک انک کر بولا۔ "تم کون ہو بھتے ہو جو طلاق لینے آ گئے؟"

میں خود نہیں آیا بلکہ ماکنن نے مجھے تم سے طلاق حاصل کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ اس نے جیسے میرے دل میں خنجر جھونک دیا تھا۔

"نہیں!" میں اپنی پوری قوت سے چیخ پڑا۔ "تم جھوٹ بول رہے ہو.... تم مجھے دھوکا دے رہے ہو.... تم کسی کے اشارے پر میری جیل کو چھین لینا چاہتے ہو۔ میں نے جنونی کیفیت سے اس کا ہاتھ اپنے گریبان سے الگ کر دیا۔ "نکل جاؤ یہاں سے.... دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے!"

"میں یہاں سے خالی ہاتھ واپس نکل جانے کے لیے نہیں آیا ہوں!" اس کی آنکھوں میں انگارے جھنکنے لگے۔

"تمہیں ہر قیمت پر میری ماکنن کو طلاق دینا ہو گی"

میں نے ان چاروں بد معاشوں کے چروں پر نگاہ ڈالی۔ ان کی گھورتی ہوئی خوف ناک آنکھیں مجھے کھا جانے پر تلی ہوئی تھیں میں نے ایک گمراہ سانس لے کر بے خوفی سے کہا۔ "اگر میں جیل کو طلاق نہیں دوں تو؟"

شامو کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ "ہمارے پاس ایک دوسرا راستہ بھی ہے جس کے ذریعے تم سے خود بخود نجات مل جائے گی۔"

جسے کے باعث اسے چپکے سے مجھے چھوڑنا پڑا تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو میری جان کو خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ اس دو سال کے عرصے میں اس کے دل پر کیا جتنی وہ ایک الگ کرب ناک کہانی تھی جس میں میرا دل خون کے آنسو روتا رہا تھا، لیکن مجھے جیل کے خاندان کی سیاست اور باہمی چٹاؤ سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ مجھے صرف جیل کی ذات سے دل چسپی تھی۔ میرے دل کی ساری کشمکش دھل گئی۔ مجھے اپنی منزل دوبارہ مل گئی تھی۔ میرے گھر کے آگن میں وہی چاند اتر آیا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں پیار کی ایک ایسی مضبوط دیوار بناؤں گا کہ جیل اسے ناز و گدگی نہ پھلانگ سکے گی۔

میں نے وہی جگہ کرائے پر لے لیا۔ جہاں ہماری خوشبو، سرسراہٹ، آواز اور سرگوشیاں بسی ہوئی تھیں۔ شامو بھی جیل کے ساتھ لوٹ آیا تھا۔ ایک بار پھر پہلے جیسے رات دن گزرنے لگے۔ لیکن اب ان میں سے پہلے سے کہیں زیادہ شدت تھی۔ چھڑ کر مل جائیں تو جذبات کی چاندی دیوانگی کی آگ میں پھٹنے لگتی ہے۔

میں ہوٹل کے کاروبار سے زیادہ جیل کی ذات میں دل چسپی لینے لگا۔ میں نے اس کے گرد پیار کی دیوار بنانا شروع کر دی مگر ڈیڑھ ماہ کا عرصہ بھی نہیں گزرا تھا کہ وہ دیوار مسمار ہو گئی۔ دو سال پہلے کی طرح جیل ایک بار پھر شامو کے ساتھ اچانک غائب ہو گئی تھی۔

اسے تلاش کرنا بے سود تھا۔ وہ ایک لا ینغل معاشی، تاہم اس مرتبہ اس کا چانک غائب ہو جانا میری سمجھ سے بالا تر تھا۔ میں نے یہ سوچ کر اپنے دل کو یہ تسلی دی کہ شاید وہ دو سال بعد پھر چلی آئے گی مگر چھ ماہ کے اندر اندر میری حالت پاگلوں جیسی ہو گئی۔ مجھے کسی چیز کا ہوش نہیں رہا تھا۔ میں اسی جھگڑے میں پڑا رہتا تھا جسے ایک سکون سا لگتا تھا۔ میں یہاں جیل کے لیے کی ٹھنک، محترمہ بی بی اور دبی دبی سرگوشیاں سنتا رہا تھا۔ ہر لمحے اس کی مانوس آہٹ کو غنچ تھی۔ یہ کیفیت مجھ پر کئی دنوں تک طاری رہی اور پھر وقت کا مرہم آہستہ آہستہ میرے زخم مندمل کرنے لگا۔

میں نے ایک سال کا عرصہ بڑے کرب اور اذیت سے ایک ایک دن گن کر کاٹا تھا۔ ایک روز میں اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا اپنی اداسی دور کرنے کی غرض سے حبلت کی چالچ پڑتال میں مصروف تھا۔ کہ کوئی میری میز کے قریب آ کر کھڑا ہوا۔ میں نے چونک کر سر اٹھایا تو میرے ہاتھ سے قلم چھوٹ کر گر پڑا۔ میرے سامنے شامو کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں اور ہونٹوں پر ایک خوش گوار سی مسکراہٹ نمایاں تھی۔ میں نے پہلی مرتبہ اس کے چہرے پر خوشی کی چمک دیکھی تھی۔

میں شامو کو دیکھتے ہی اس طرح اچھل پڑا جیسے میں نے اس کی آنکھوں میں جیل کا عکس دیکھ لیا ہو، جیسے مجھے ہفت اقصیٰ کی دولت سے بھی بڑھ کر کوئی انمول دولت مل گئی ہو۔ میرا دل خوشی سے ماؤف ہوا جا رہا تھا، میں فرط مسرت سے چیخ پڑا۔ "شامو.... تم؟"

شامو نے جواب دینے میں تامل کیا۔ اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں میری حیرت اور نکمہرتے ہوئے تاثرات کو جذبہ رہی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانکا۔ "سرکار! ماکنن آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔"

"نکلں ہے تمہاری ماکنن؟" میں نے بے تلی سے پوچھا۔

"وہ جھگڑے پر آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔" شامو نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔ "میں آپ کو ساتھ لینے آیا ہوں"

میں شامو کے ہمراہ ہواؤں میں اڑتا ہوا اس سے ان گنت سوال کرتا ہوا جھگڑے پر جا پہنچا۔ شامو نے میرے ہر

اس کے لیے میں نہ جانے کیا بات تھی کہ میں کانپ کر رہ گیا۔ میں نے مرتضیٰ آواز میں پوچھا۔ ”وہ کیسے؟“

”تمہاری موت کے سرٹیفکیٹ سے“ جس کے حصول میں ہمیں کوئی دشواری نہیں آئے گی۔“ شامو نے یہ کہتے ہوئے پلٹ کر اپنے ساتھیوں کی جانب دیکھا اس کا اشارہ پاتے ہی ان چاروں نے میرے گرد اپنا گھیرا نگ کر لیا۔ شامو نے اپنی جیب سے چاقو نکال کر ایک جھٹکے سے کھولا اور اس کی نوک میرے زرخے پر رکھ دی۔ ”اگر تم سیدھی طرح راہ راست پر نہیں آئے تو ہم پانچوں مل کر تمہارے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔“ میرا حلق خشک ہونے لگا تھا۔ میں نے بھرائی آواز میں اس سے پوچھا۔ ”شامو خدا کے لیے جج بناؤ کیا واقعی جیل سے مجھ سے طلاق لینا چاہتی ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم کسی اور شخص کے اشارے پر مجھ سے میری بیوی چھین لینا چاہتے ہو؟“

”نہیں میری بات پر یقین کیوں نہیں آ رہا ہے!“ وہ سچ پا ہو گیا ”کیا تم نہیں جانتے کہ میں اپنی مالکین کا کس قدر وفادار نوکر ہوں۔ میں صرف مالکین کے لیے زندہ ہوں اور انہی کے لیے زندہ رہوں گا۔ میں ان کا حکم نہیں ٹل سکتا۔“ اس کی آنکھیں میرے وجود پر چبھنے لگیں۔ وہ قدرے توقف سے بولا۔ ”اگر مالکین مجھے یہ حکم دیں کہ میں اپنا چاقو اپنے پیٹ میں بھونک لوں تو میں ایک بل کی بھی تاخیر نہ کروں گا۔“

شامو کی آنکھیں اور لمبے میں سچائی کا عکس جھلک رہا تھا۔ یہ حقیقت بھی تھی کہ وہ اپنی مالکین کا انتہائی وفادار اور جان نثار ملازم تھا۔ مگر پھر بھی میں تذبذب اور الجھن میں مبتلا ہو گیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ جیلہ ایسی شقاوت اور سنگ دلی کا مظاہرہ بھی کر سکتی ہے۔ آخر وہ کس لئے مجھ سے طلاق چاہتی ہے؟ میں نے اس کا کیا بگاڑا ہے؟ میں نے اس کو کوئی دھوکا نہیں دیا“ اس کے ساتھ کوئی فریب نہیں کیا۔

میرے ذہن میں اسی طرح کے بہت سے سوالات گردش کرنے لگے۔ جیلہ کے بغیر میری زندگی بے کیف اور اوجھری تھی۔ یہ عذاب میں ایک بار پہلے بھی سہہ چکا تھا۔ میری ساری انگلیں ایک ایک کدم توڑنے لگیں۔ جیلہ کی بے وفائی کا احساس میرے لیے حد درجہ کرب ناک تھا مگر بہر حال یہ کرب، یہ اذیت تو اب برداشت کرنا ہی تھی۔

میں نے شامو کے ہاتھوں سے وہ کاغذ لے لیا اور اپنے امدتے ہوئے آنسوؤں کو لی کر دھتھلا کر دیے۔ جب میں نے اپنے ہاتھوں اپنی محبت کا گلا گھونٹ کر اس کی لاش شامو کے حوالے کی تو اچانک کسی نے پیچھے سے میرے سر پر زور وار ضرب لگائی۔ میرا سر پھرا اور آنکھوں کے سامنے تاریکی پھیلنے لگی۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہ رہا۔

جب میری آنکھ کھلی تو منظر ہی بدلا ہوا تھا۔ میں رنگامانی کے ایک اسپتال کے کمرے میں بستر پر ڈا ہوا تھا۔ یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی کہ میرے ہوٹل کے دو ملازم کسی ضروری کام سے جھگڑے پر پہنچے تو انھوں نے مجھے بے ہوشی کی حالت میں پیلا اور فوراً اسپتال لے آئے۔

مجھ پر کئی دنوں تک ایک جنونی کیفیت طاری رہی۔ میں یہ سوچ سوچ کر پاگل ہوا جا رہا تھا۔ آخر جیلہ نے مجھ سے بے وفائی کیوں کی؟ وہ تو خود محبت کی بھوکی تھی۔ ہم دونوں نے مل کر ایک تاج محل بنائی اور بڑے جزیروں سے بنایا تھا۔ اس کی ایک ایک اینٹ پر آرزوؤں کے کمرے نقش ثبت کیے تھے۔ پھر آخر اس نے اس تاج محل کو جہسار کیوں کر دیا؟ اس نے جیلہ یا نسیم شیخ بن کے نہیں بلکہ ایک عورت بن کر ان بنیادوں میں اپنے لو کا

ایک ایک قطرہ تک نچوڑ دیا تھا۔ وہ مرد وفا کا ایک ایسا تراشیدہ پیکر تھی کہ میں اس سے بے وفائی اور فریب کی توقع نہیں کر سکتا تھا۔

میں اپنی زندگی کے اس غیر متوقع اور الم ناک حادثے کے بارے میں جتنا بھی سوچتا تھا وہی انتشار کا شکار ہو جاتا تھا۔ اسے بھلانے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ جیتے دنوں کی شیریں یادیں مجھے ہر وقت ستاتی رہتیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہ مجھے سکون کہاں اور کس طرح ملے گا۔

ایک ایک کر کے پانچ برس گزر گئے۔ یہ پانچ برس میں نے پانچ صدیوں کی طرح گزارے تھے۔ کبھی کبھار میں حیران بھی ہو تاکہ آخر اب تک کس لیے زندہ ہوں، کس امید پر سانس لیتا ہوں!

ہمارا کاگامی موسم شروع ہو چکا تھا۔ ان دنوں رنگامانی میں سیاحوں کی آمد کا تہہ بندہ جاتا ہے۔ میں سہ پہر کے وقت استقبالیہ کاؤنٹر پر کھڑا ہوا اپنے گاہکوں کو خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ کہ اس جوم میں ایک چہرہ دیکھ کر چونک پڑا۔ وہ بلاشبہ بلا کی حسین اور پرکشش دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا شوہر بھی بڑا وجیہ تھا۔ ایسے جوڑے بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں، تاہم میرے چونکنے کی وجہ اس کا حسن نہیں تھا بلکہ اس کا چہرہ مجھے کچھ مانوس لگا تھا۔ کوشش کے باوجود مجھے یاد نہ آ سکا کہ اس سے پہلے اسے کہاں دیکھا ہے۔ دفعہ اس لڑکی کی نگاہ مجھ پر پڑی تو وہ بھی چونک کر اپنی جگہ پر ٹھک گئی۔ اس کے چہرے پر حیرت کے تاثرات نمایاں ہونے لگے۔ ایک بارگی اس کی حسین آنکھیں روشن ہو گئیں۔ اور اس کا گلاب سا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ اس نے اپنے شوہر سے سرگوشی کی اور میرے پاس آ کر مترنم انداز میں بولی ”اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو آپ کا نام سکندر ہے۔“ اس کی آنکھوں میں شونی سمٹ آئی۔ ”میں کسی کو پہچاننے میں بہت کم غلطی کرتی ہوں۔“

بہت دنوں کے بعد میری ہونٹوں پر ایک ایسی مسکراہٹ ابھری تھی جس میں تروتازگی اور مسرت موج زن تھی۔ ”آپ غلطی پر نہیں ہیں۔“ میں نے اس کی حسین آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ اس سے پہلے آپ کو کہاں دیکھا ہے؟“

اس کی آنکھوں میں ہزاروں بلب روشن گئے۔ وہ تکیجی تکیجی نظروں سے دیکھتی ہوئی شونی سے بولی ”شاید آپ نے مجھے خوابوں میں دیکھا ہو“ اور کسی پرستان میں ملاقات کی ہو۔“

میری مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔ ”وہ شخص واقعی بڑا خوش نصیب ہے جس کے خوابوں میں آپ بے دھڑک چلی آئیں۔“

”اچھا۔“ وہ یک لخت کھلکھلا کر ہنس پڑی اور پھر رسلی آواز میں اپنا تعارف کرایا۔ ”میرا نام صائمہ بلال ہے۔ غالباً سات آٹھ سال کی پہلے کی بات ہے، آپ مسز نسیم شیخ کے ہاں انٹرویو دینے آئے تھے۔ میں نے اس دن ان کی سیکرٹری کے فرائض انجام دیے تھے۔“

”پریشانی کی کوئی بات نہیں!“ میں نے بے تاثر ”دراصل مجھے ہائی بلڈ پریشر کی شکایت ہے۔ کبھی کبھار اچانک طبیعت گھبرا جاتی ہے۔“ میں نے اس کے شوہر کو جواب دے کر صائمہ سے پوچھا ان دونوں بچوں کی عمریں کیا ہوں گی؟“

صائمہ چند لمحوں تک سوچتی رہی پھر بولی۔ ”لڑکی کی عمر کوئی پانچ سال ہوگی اور لڑکا تین چار سال کے لگ بھگ ہوگا۔“

میں بے یقینی کے عالم میں صائمہ کو گھورنے لگا۔ جیلہ سے میری شادی سات سال قبل ہوئی تھی اور اسے



طلاق دے دیے ہوئے چار سال کا عرصہ گزر گیا تھا۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ جیلہ نے مجھ سے طلاق لیتے ہی علی رضا سے شادی کر لی ہوگی تو بھی چار سال کے عرصے میں پانچ سالہ لڑکی کا وجود خاصا معنی خیز تھا میں نے صائمہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ کو معلوم ہے کہ ان دونوں کی شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟“

”دس سال!“ صائمہ نے جواب میں کہا۔ ”مجھے انھوں نے اپنی شادی کی اہم بھی دکھائی تھی۔ دس سال پہلے ان کی شادی ایسی دھوم دھام سے ہوئی تھی کہ کلکتہ کے شہر میں ایک مثالی شادی بن کر رہ گئی ہے۔ لوگ آج بھی اس شادی کے تذکرے کرتے رہتے ہیں۔“ صائمہ اپنی کرسی پر کسمائی اور ساڑھی کا پلو اپنے شانے پر درست کرتے ہوئے بولی ”انھوں نے سوئزر لینڈ میں اس کی جگہ کی تصویریں بھی دکھائی تھیں جہاں وہ دونوں ہنسی مونی ماننے لگے تھے۔“

”دس سال!“ میں حقیر زدہ انداز میں بیڑیا اور بولا۔ ”کیا آپ کے پاس مسز شیخ کا پتا موجود ہے۔“

”جی ہاں!“ صائمہ نے اثباتی انداز میں سر ہلا کر اپنا پرس کھولا اور اس میں جھانک کر کوئی چیز نکلنے لگی۔

اتفاق سے ان کا دیا ہو تعارفی کارڈ نکال کر میری جانب بڑھایا۔

میں نے اس کے ہاتھ سے کارڈ لے کر دیکھا۔ اس پر سنہری حروف میں ایک نام تحریر تھا۔ ”مسز ممتاز علی رضا“ نیچے مکمل پتہ درج تھا۔

میں نے اس بے وفا کے شہر میں قدم رکھ دیا تھا۔

میرے سینے میں ایک ایسی آگ بھڑک اٹھی تھی کہ میں اسے بھانے کے لیے کلکتہ چلا آیا تھا۔ میں نے اپنا سامان ایک ہوٹل میں رکھا اور جیلہ کی محل نما کونٹھی پر جا پہنچا۔ میں صائمہ کے بیان کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ مجھے کلکتہ شہر میں ایسی پر شکوہ عمارت کیس اور نظر نہیں آتی تھی۔ میں اس کوٹھی کے قریب منزل لانے لگا۔ میرا دماغ مایوس سا ہو رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔؟ جیلہ کی اور میری راہیں جدا جدا ہو چکی تھیں۔ اس نے اپنی منزل پالی تھی اور میں ناؤیدہ جنم میں اپنے ناکرہ گناہوں کی سزا بھگت رہا تھا۔

جس سڑک پر کوٹھی واقع تھی وہ دور دور تک سنسان اور ویران پڑی ہوئی تھی۔ ایک لخت اس کوٹھی کا پتلا سا پھانک کھلا اور دربان پر مجھے شامو کا دھوکا ہوا میں ٹھنک کر رہ گیا۔ کوٹھی کے اندر سے ایک لمبی سی کار نکل رہی تھی اس کار کو ایک سفید وردی پوش ڈرائیور چلا رہا تھا۔ اگلی نشست پر ایک نو عمر لڑکی اور لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ دونوں بچوں کی صورتیں بڑی پیاری پیاری تھیں۔ وہ ہو ہو جیلہ کا عکس تھے۔ انھیں دیکھتے ہی دل میں بے اختیار پیار کا جذبہ ابھرتا تھا۔ میں نے بھی کچھ ایسا ہی محسوس کیا۔ پچھلی نشست پر جیلہ اپنے شوہر کے ساتھ تھکنٹ کے انداز میں بیٹھی ہوئی ہنس ہنس کر باتیں کیے جا رہی تھی۔ جیلہ کی نگاہ مجھ پر نہیں پڑ سکی۔ تاہم میں نے اسے نگاہ بھر کر دیکھا تھا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ کھڑکھڑکی تھی۔ میں اس دھول اڑاتی ہوئی کار کو اس وقت تک کھڑا دیکھتا رہا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔ جب میں کسی خیال کے تحت پلٹا تو شامو کو اپنی طرف متوجہ پایا۔ وہ مجھے خالی خالی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں بے خونی سے اس کی جانب بڑھا مگر وہ اپنی جگہ ساکت کھڑا رہا۔ میں اس کے بالکل قریب جا پہنچا۔

”آپ!“ شامو کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ ساتھ خوف کا شائبہ بھی تھا۔ میں نے اس سفاک شخص کو پہلی بار خوف زدہ دیکھا تھا۔

”ہاں! میں سکندر ہوں۔“ میں نے تند لہجے میں جواب دیا۔ ”تم کوئی خواب نہیں دیکھ رہے ہو۔ میں

تمھاری مالکن کو تلاش کرتا ہوں اپنا حساب چکانے آیا ہوں۔“

شامو گویا سکتے کے عالم سے نکل آیا۔ ”آپ کا اب مالکن سے کیا تعلق؟ وہ تو اب کسی اور کی عزت بن گئی ہیں۔ آپ یہاں کیا لینے آئے ہیں؟“

”میں اس عزت‘ ذلت‘ اور دکھ کی کافی اس شہر والوں کو شانے آیا ہوں۔“ نہ جانے کیوں میری آواز بھرا گئی۔ جب میری زندگی اور چین سکون غلٹ کر دیا گیا ہے تو کیا میں تمھاری مالکن کو آسانی سے بخش دوں گا؟“

”نہیں نہیں، میرے سرکار!“ شامو نے سراہیہ ہو کر میرے آگے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ ”بھلے آپ میرے سینے میں خنجر گھونپ دیں لیکن میری مالکن پر کوئی داغ نہ لگائیں، ورنہ ایک گھر اجڑ جائے گا۔ بچے نازک پھولوں کی طرح ہیں۔ وہ پتیاں بن کر بکھر جائیں گے۔ بھگوان کے لیے ان معصوموں پر رحم کریں۔ انھی کے دم سے آج یہ دنیا قائم ہے۔“ وہ میرے پیروں پر گر پڑا۔

میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس وحشی دندے کو دیکھ رہا تھا جس کے اندر چھپے ہوئے انسانی جذبے نے آج اسے اس قدر کمزور اور بزدل کر دیا تھا، محض ایک گھر کی خوشیوں کے لئے! ان دو پھولوں کے لیے، لیکن یہ انصاف نہیں تھا۔ میری خوشیاں اور خواب جھین لیے گئے تھے۔

”تم میرا قصور تو بتاؤ شامو!“ میں نے کرب ناک لہجے میں پوچھا۔ ”مجھے آخر کس جرم کی سزا دی گئی ہے۔ میں نے کیا بگاڑا تھا جو میری زندگی ملیا میٹ کر دی گئی ہے؟“

وہ اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ سرکار! یہ تو زمانے کا دستور ہے کہ اپنی خوشیوں کے لیے کسی دوسرے کا گھر اجاڑا جاتا ہے۔ اب آپ یہاں سے کچھ نہیں پا سکیں گے۔ کیا یہ اچھا نہیں ہو گا کہ آپ واپس چلے جائیں..... میں مالکن سے کہہ کر آپ کے قدموں میں منہ مانگی رقم لاؤں گا۔

”دنیا میں پیسائی سب کچھ نہیں ہوتا شامو!“ میں نے تیزی سے جواب دیا۔

”یہ بات آپ نے پہلے کیوں نہیں سوچی؟“ اس نے گرفتہ لہجے میں جواب میں کہا۔ ”آپ نے محض دولت کی خاطر ایک کتے کی سی غلامی اور وفاداری نبھانے کا وعدہ کیا تھا۔ کہاں ہے آپ کی وفاداری!“ اس کا لہجہ تند ہو گیا۔ ”انسان اور کتے میں یہی فرق ہے۔ کہ کتا اپنی اوقات کبھی نہیں بولتا۔“

”میں اپنے دل میں چھپی ہوئی پھانس نکالنا چاہتا ہوں!“

شامو کی فحش آنکھیں سوچ میں ڈوب گئیں۔ ایک لخت اس کے ہونٹوں پر زہر خند مسکراہٹ ابھر آئی۔

”سرکار! کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ ایک پھانس نکالنے جائیں اور دوسری پھانس لگا بیٹھیں۔“

”کچھ بھی ہوا!“ میں ہٹ دھرمی پر اتر آیا۔ ”میں جیلہ بیگم سے ہر قیمت پر مل کر رہوں گا!“

شامو نے ایک گہری سانس لی۔ ”جیلہ بیگم آج سے چار سال پہلے مر چکی ہیں۔ آج صرف ممتاز بیگم زندہ ہے۔ وہی آپ سے ملیں گی۔ آپ بتائیں کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟“

”میں نے ہوٹل کا نام اور پتا بتایا تو اس نے کچھ سوچ کر کہا۔“ وہ ہوٹل یا عام جگہوں پر نہیں جاتیں آپ ان سے میرے گھر پر مل لیں۔ میرا گھر بیڈن روڈ پر ہے۔“

میں نے شامو کو چھیتی ہوئی نظروں سے دیکھا لیکن مجھے اس کی آنکھوں میں کسی سازش کی پرچھائیاں نظر نہیں آئیں۔ پھر بھی میں نے اسے تنبیہ کی۔ ”شامو! اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ مجھے دھوکے سے لے جا کر قتل کر دو گے تو یہ محض تمھاری حماقت ہوگی، اس لیے کہ میرا ایک دوست اسی شہر میں موجود ہے۔ وہ مجھے نہ پا کر تمھاری ممتاز بیگم



تھا؟ تم نے دولت کے بل پر محبت کا ڈھونگ دھا کر کیا پایا؟ کیا تم نے یہ نہیں سوچا تھا کہ تمہارا سنگین مذاق کسی کے دل پر گہرا گھاؤ لگا دے گا!

وہ بڑے قہر اور صبر و سکون سے آنکھیں بند کر کے میری باتیں سنتی رہی۔ جب میں نے اپنی بات ختم کی تو اس نے آنکھیں کھول دیں اور بولی۔ ”مجھے اپنے کئے پر کوئی ندامت یا پچھتاوا نہیں ہے۔ آپ کو صرف دولت کی ضرورت تھی، میں نے آپ کے قدموں میں ڈال دی۔ مجھے جو کچھ پانا تھا وہ میں نے پایا۔ حساب برابر ہو گیا۔ اب آپ کیا چاہتے ہیں؟“

”لیکن تم نے میرے دل میں محبت کی شمع کیوں جلائی؟“ میں بھڑک اٹھا۔ ”مجھے نفرت کے دریا میں دھکیل دیتیں تو شاید آج میں تمہارے در پر سوالی بن کر نہ آتا۔“ میں نے رک کر ایک سرود آہ بھری۔ ”چند دن پہلے تمہاری صاف ٹہنی تھی، جو ڈھاکہ میں کبھی تمہاری بیکریٹری رہی تھی۔ اس نے مجھے ایک ناقابل یقین، حیرت انگیز اور کسی قدر چونکا دینے والی کمائی سنائی تھی۔ میں نے اس سنا دینے والی کمائی کے آنے والے بنے۔ ٹوٹی پھوٹی، میٹر میٹر اور پھیلی ہوئی کڑیاں ملائیں تو وہ ایک اچھوتی کمائی بن گئی۔“ میں نے قدر توقف کر کے اسے صاف سے ہونے والی گفتگو سنا کر نفرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”آخر تمہیں محبت کی آڑ میں اتنا گھناؤنا کھیل کھیلنے کی کیا ضرورت تھی؟ اگر دس سال پہلے تمہاری شادی علی رضا سے ہو گئی تھی تو پھر مجھ سے شادی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کے علاوہ یہ اسرار بھی میری سمجھ میں نہیں آیا کہ سوزیلینڈ میں تم علی رضا کے ساتھ ہنی مون منانے کے باوجود ایک اچھوتی کلی رہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ تم میرے ہاتھوں پھول بن کر کھلی ہو؟ کیا علی رضا.....

میرا آخری فقرہ ادھر وارہ گیا، وہ تڑپ کر بیچانی لہجے میں چیخی۔ ”سکندر! خدا کے لیے چپ ہو جاؤ۔ بس بھی کرو پلے!“ اس نے وحشت سے اپنا سر پیٹ لیا۔ اس کے سر پائے میں اضطراب کی لہر اٹھی تو وہ پاگل سی ہو گئی۔ ”اف میرے خدا یا!“ وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بڑبڑائی۔ ”میں نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر کسی کا بھرم رکھا تھا۔ مگر..... مگر.....“ اس کی آواز حلق میں اٹک گئی۔

”یہ بچے علی رضا کے نہیں ہیں۔“ میں نے بے تامل اور بے دھڑک کہہ دیا۔ ”تمہاری بدکاریوں کا نتیجہ ہیں۔ ان کا باپ کون ہے۔ یہ شاید تم خود بھی نہیں جانتیں۔“

”سکندر..... سکندر!“ وہ آنکھیں لٹکانے لگے۔ ”تم میرے بچوں پر تہمت نہیں لگاؤ، وہ معصوم اور جائز ہیں۔ میں نے کوئی بدکاری نہیں کی۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا“ اس کی آواز بری طرح کانپنے لگی۔

”کیا تم ایک بدکار اور آوارہ عورت نہیں ہو؟“ میں نے غصے سے کھولتے ہوئے کہا۔ ”تم نے علی رضا سے شادی کرنے کے بعد اسے قریب آنے اور چھوٹے تک نہیں دیا۔ نہ جانے تم نے اس کی کس کمزوری سے فائدہ اٹھایا تھا۔ محض یہی نہیں بلکہ تم اس بد نصیب علی رضا پر ظلم و ستم کے پھاڑ توڑنے کے لیے شادی کی آڑ لے کر سیاہ کاری کی دلدل میں گر گئی۔ کیا یہ سچ نہیں ہے؟“

جیلہ کسی بھری ہوئی شیرینی کے مانند غرائی ہوئی میرے پاس پہنچی اور جھپٹ کر میرا گریبان پکڑ لیا۔ اس کے جسم کا ایک ایک تار جیسے جھننا اٹھا تھا۔ میں نے سسم کر اسے دیکھا تو وہ غضب ناک ہو کر بولی۔ ”سکندر! اپنی زبان کو لگام دو میں ایک صاف شفاف آئینہ ہوں۔ مجھ پر خراشیں مت ڈالو، بہتان تراشی مت کرو۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔“ اس کے سینے میں ایک ہیجان سا برپا تھا اور سانسیں بے ترتیب ہو کر اچھ رہی تھیں۔

کی کمائی کسی اخبار میں چھاپ دے گا۔ تب تم کیا کرو گے؟“ میں نے محض دھمکی دینے کے لیے جھوٹ تراشا۔ ”میں اپنی مالکین کے حکم کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا ہوں۔ آپ میرے ساتھ چلیں۔“

بیزن روڈ کی ایک پرانی عمارت میں شامو کی ایک بڑی اور کسی قدر صاف ستھری کھولی تھی۔ وہ مجھے اپنی کھولی میں چھوڑ کر جیلہ کو لینے چلا گیا۔ میں بڑی بے تابی اور شدت سے جیلہ کا انتظار کرتا رہا..... جب دوپہر بھی گزر گئی تو مجھے ابھمن کے ساتھ ساتھ خوف بھی محسوس ہونے لگا۔ کیس شامو مجھے قتل کرنے کے لیے پروگرام تو نہیں بنا رہا۔ کلکتہ میں ایسے غنڈوں اور بد معاشوں کی کمی نہیں تھی جو محض دس روپے کی خاطر انسانی جان لے سکتے تھے۔ میں سوچ سوچ کر پریشان ہوتا جا رہا تھا۔

سہ پہر کے وقت کھولی کے باہر ایک مانوس سی چاپ ابھری اور پھر دروازے پر دستک ہونے لگی۔ میں نے آگے بڑھ کر دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ کھول دیا۔ میری نظروں کے سامنے جیلہ کھڑی ہوئی تھی۔ میں سمجھا شاید شامو بھی اس کے پیچھے پیچھے آیا ہو گا۔ لیکن وہ دکھائی نہیں دیا۔ ہم دونوں کی نظریں چار ہوئیں اور ہم دونوں کئی ثانویں تک خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ اس کا حسین چہرہ سپاٹ اور ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ مگر اس کی آنکھیں اپنی دلی کیفیت کو چھپا نہیں سکی تھیں۔ ان آنکھوں میں ایک انجانا دکھ صاف جھلک رہا تھا۔ میں چونک کر پیچھے ہٹا اور اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ جب وہ اندر چلی آئی تو میں نے دروازہ بند کر کے چٹنی لگا دی۔ وہ بے رخی کے انداز سے بچے تلے قدم اٹھاتی ہوئی کسی راج کمار کی حکمت کے ساتھ سامنے بڑی ہوئی کرسی پر جا بیٹھی جب میں کندی لگا کر مڑا تو اس کی کھلی ہوئی آنکھوں میں وحشت سی ابھرنے لگی۔ میں نے اس کے سر پائے میں ایک ارتعاش سا دیکھا۔ جسے وہ بدقت تمام مجھ سے چھپانا چاہتی تھی۔ میں پندرہ حسن کے اس دبدبے کے سامنے مرعوب سا ہو گیا۔ اور چپ چاپ چوکی پر جا بیٹھا۔ کمرے میں ایک ابدی سکوت چھا گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنی گفتگو کا آغاز کہاں سے کروں۔

”سکندر صاحب“ اس کی آواز میں لرزیدگی کے باوجود اس کے مزاج کا رعب ابھر آیا تھا۔ ”آپ نے مجھے یاد کیا اور میں حاضر ہو گئی۔ فرمائیے، آپ مجھ سے کس لیے بلنا چاہتے ہیں؟“

”سکندر صاحب نہیں صرف سکندر۔“ میں نے سرکش لہجے میں کہا۔ ”تمہارا اپنا سکندر۔“

”جی نہیں!“ اس کی شبلی پیشانی پر برہمی نے شکنیں ڈال دیں۔ ”کبھی آپ میرے لیے سب کچھ تھے لیکن آج میرے لیے کچھ نہیں ہیں! اب آپ صرف سکندر صاحب ہیں۔“

مجھے جیلہ کا یہ لہجہ اور تحالبہت متاگوار گزرا۔ میں نے نیچے ہوئے انداز سے کہا۔ ”جیلہ! وہ رشتہ اتنا نازک تو نہیں تھا کہ کچھ دھاگے کی طرح توڑ دیا جائے۔“

”میں جیلہ نہیں، ممتاز بیگم ہوں“ اس کی آواز حلق میں گھٹ رہی تھی۔ ”میں آپ سے ممتاز بیگم بن کر ملنے آئی ہوں۔“

”آپ چاہے نسیم شیخ بن جائیں، چاہے جیلہ بن کر کسی کی ہم سفر ہو جائیں؟ میری زبان دکھ سے لڑکھڑاتی۔“ یا اپنے اوپر ممتاز بیگم کا خول کیوں نہ چڑھالیں۔ آپ عورت ہیں اور عورت ہی رہیں گی۔“

”آپ جو کچھ کہنا اور پوچھنا چاہتے ہیں وہ پوچھیں۔“ وہ نخوت سے بولی۔

”میں آج اپنا قصور پوچھنے آیا ہوں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم نے مجھے کن گناہوں کی سزا دی ہے۔“ میرے سینے میں آواز اٹکنے لگی۔ ”کیا تم نے ایک شخص کی زندگی اور اس کے احساسات اور محبت کو ایک کھیل سمجھا

میں نے طنز بھرے میں پوچھا ”کیا تم اچھائی اور برائی میں تمیز کرنا جانتی ہو؟ تمہیں گناہ اور ثواب کا فرق معلوم ہے؟“

”سکندر! اس نے بیگنی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ اس کے نازک ہونٹ پڑ پڑانے لگے۔“ وہ تمہیں بھی بتائے دے رہی ہوں۔ صرف اس لیے کہ کل کلاں کو کوئی ان بچوں کو ناجائز کہہ کر نہ پکارے۔“

”کیا تم اپنے راز پر شرافت کا خول چڑھانا چاہتی ہو؟“

جیلہ نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کسی ٹوٹی ہوئی شاخ کے مانند کرسی پر گر کر سسکتے لگی۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ میں اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کو دیکھ کر کھٹکنے لگا۔ جب میں اس کے آنسو پونچھے کے لئے اپنے ہاتھ اس کے رخساروں تک لے گیا تو اس نے بے رخی سے مجھے جھڑک دیا۔ ”مجھے تمہاری ہمدردی کی ضرورت نہیں تم میرے لیے نا عزم ہو مجھے ہاتھ بھی نہیں لگانا۔“

میرے لبوں پر استغنائیہ مسکراہٹ ابھر آئی۔ میں نے سوچا ایک مکار عورت کے پاس کس قدر حربے اور رنگ ہوتے ہیں۔ وہ مرد کو بڑی آسانی کے ساتھ اپنی باتوں سے شیشے میں اندر لیتی ہے۔

اس نے جلد ہی اپنے حواس اور جذبات پر قابو پایا۔ جب وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی تو اس کا لہجہ منتشر ہو رہا تھا۔ ”سکندر! تم اس دور کی محبت کی ایک عجیب و غریب کمائی سنو“ اس کے ایک ایک لفظ پر دھیان دو اور اسے اپنے دل میں نقش کرتے جاؤ۔ وہ تاج محل ہے جو ممتاز بیگم نے بنایا ہے“ اس نے رک کر ایک گہرا سانس لیا ”علی رضا کے خاندان کی ایک لڑکی کوثر جہاں علی رضا سے اس کی امارت، لیاقت، شہرت کی وجہ سے محبت کرنے لگی تھی۔ علی رضا نے کبھی اس کی محبت کو درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ کوثر جہاں کوئی بد صورت یا عام سی لڑکی نہیں ہے۔ اگر تم اسے ایک بار دیکھ لو تو تمہارے سینے میں ٹھنڈی اور حسرت بھری سانسوں کا غبار بھر جائے۔ اس کے چندر جسم میں پھول کی منک، سبک پن اور تناسب میں آتش فشاں دکھتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ جوانی کی ایسی شان شادیدی کسی لڑکی میں نظر آئے۔ ہر کیف کوثر جہاں نے جب یہ محسوس کیا کہ علی رضا اس کے چندر حسن کو مجروح کر رہا ہے۔ اور کسی طرح بھی اس کی طرف راغب نہیں ہو رہا ہے تو وہ انتقام کی آگ میں اس قدر اندھی ہو گئی کہ اسے اچھے برے کی تمیز نہیں رہی اس نے علی رضا کو بیک میل کرنے کے لیے اسے اپنے ہاں کسی بہانے سے بلایا اور اپنی سہیلی کو تیار کیا کہ وہ اس کمزور لمحے کی عکس بندی کر لے جب وہ ناگن بن کر علی رضا کو ڈسنا شروع کر دے لیکن اس کی حسرت پوری نہ ہو سکی۔ علی رضا پر ان قیامتوں کا ذرہ برابر اثر نہیں ہوا۔ تب کوثر جہاں نے ایک مشہور طوائف کو ایک بڑی رقم دے کر کلبوں، محفلوں اور پارٹیوں میں یہ پردیگنڈہ کروایا۔ کہ علی رضا عورت کے قابل نہیں ہے۔ علی رضا نے اس داغ کو مٹانے کے لیے اور کوثر جہاں کا منہ بند کرنے کے لیے مجھ سے شادی کر لی۔ میں ایک غریب گھرانے کی بیٹی تھی۔ جب علی رضا کا پیغام آیا تو میرے باپ کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو گئے وہ سمجھ نہیں سکا کہ آخر ایک کروڑ پتی خاندان کے بیٹے نے ایک معمولی لڑکی کو کس لیے پسند کیا؟ میری نیندیں بھی یہی کچھ سوچ سوچ کر حرام ہو گئی تھیں..... لیکن جب اس نے شادی کی پہلی رات میرے قدموں پر گر کر اور گڑگڑا کے عزت کی بھیک مانگی تو مجھے پتا چلا کہ وہ واقعی عورت کے قابل نہیں تھا۔ میں نے اس رات اپنی زندگی کا اہم ترین فیصلہ کیا۔ نہ صرف اس کی عزت کے لیے اپنے ارمانوں کا خون کیا بلکہ اسے اپنے من کے گوشے میں بسا کرچی محبت دی۔ میری وہ پہلی اور آخری محبت تھی۔ میں ایک آگ میں جلتی رہی لیکن جلد ہی مجھے صبر آ گیا۔ حالانکہ علی رضا نے مجھے اشارے کئے میں واضح بھی کر دیا تھا کہ اگر میں کسی قدم پر ہمک جاتی تو وہ کوئی تعرض نہیں کرے گا۔ مگر میں ایک

عورت تھی، کوئی طوائف نہیں تھی؟ کیا میں اپنے محبوب کے لیے اتنی قربانی نہیں دے سکتی تھی؟ عورت تو نام ہی ایثار اور محبت کا ہے۔ میں نے اس کے اور اپنے اعتماد کی لاج رکھ لی۔ ”جیلہ نے توقف کر کے حسرت سے سر دھوا بھری۔“ کوثر جہاں اس شادی پر جل بھن کر رہ گئی اور مجھ سے انتقام لینے کے لیے موقع کی تلاش کرنے لگی۔ وہ علی رضا سے ناامید نہیں ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ میری موت اس کے لیے راہ ہموار کر دے گی لیکن اس کا خواب پورا نہیں ہو سکا۔ جب ہماری شادی کو دو سال کا عرصہ گزر گیا اور میں امید سے نہیں ہوئی تو اس نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا علی رضا پر ہستان اور تھمتوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ محفلوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں، اشاروں کنایوں میں فقرے چست کیے جانے لگے۔ مجھ سے بھی معنی خیز سوالات کیے جاتے تھے۔ علی رضا نے بہت سوچ سمجھ کر ایک منصوبہ بنایا اور میرے سامنے رکھ دیا۔ منصوبہ اچھا تھا لیکن مجھے ذہنی طور پر تیار ہونے کے لیے ایک سال کا عرصہ لگ گیا۔ ہم دونوں نے لندن روانگی کا ڈراما چلایا۔ اس ڈرامے کے آغاز سے پانچ ماہ پیشتر علی رضا نے مجھے خفیہ طور پر طلاق دے دی۔ اور میں اپنے باپ کے پاس چلی گئی۔ علی رضا کے ساتھ بظاہر میں لندن روانہ ہوئی تھی لیکن میں بنگال چلی گئی اور وہاں سے ڈھاکہ کا چلی آئی۔ میرا وفادار نوکر شامو ڈھاکہ میں میرا منتظر تھا۔ میں نے پہلے ہی اسے اپنے اعتماد میں لیے لیا تھا۔ میں نے اس منصوبے کا آغاز کیا۔ اس منصوبے میں جو خامیاں تھیں وہ بعد میں سامنے آئیں ہم نے اس پہلو پر غور ہی نہیں کیا تھا ورنہ تم زندگی بھر میرا کھوج نہیں لگ پاتے۔ کوثر جہاں نے میرے ایک پرانے ملازم کو توڑ کر اسے شامو کے قاتل اور میرے قتل کے لیے بھیج دیا لیکن وہ خود موت کا شکار ہو گیا۔ میں نے، تمہیں ایک مفلس اور قلاش مضمض سمجھ کر انتخاب کیا۔ میں نے دو مرتبہ تمہارا امتحان لیا اور تمہارے سینے میں انسانیت کا احساس پا کر مجھے بڑی خوشی ہوئی میں سمجھی کہ تم کبھی میری راہ میں دیوار نہیں بنو گے۔ یہ سوچ کر میں نے تم سے شادی کر لی پھر ایک روز تم اور شامو جب سالن کی خریداری کے لیے چٹاگانگ گئے تو ایک میری طبیعت گڑبڑ گئی۔ میں ڈاکٹر کے پاس گئی تو اس نے بتایا کہ میں امید سے ہوں۔ اس روز میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ مجھ کو جیسے دنیا کا سب سے بڑا اعزاز مل گیا تھا۔ میں ایک بچے کی ماں بننے والی تھی۔ علی رضا کے دامن پر سے ایک بد نما داغ مٹنے والا تھا۔ اب وہ سراٹھا کر محفلوں میں جاسکتا تھا۔ کوئی نگاہ اس کی جانب تسخیر سے نہیں اٹھ سکتی تھی۔ اس قسم کے احساسات نے میرے اندر خوشی کی لہر دوڑادی تھی۔ تم مجھے شامو سے سرگوشیاں کرتے دیکھ کر اور خوشیوں سے سرشار پا کر کسی غلط فہمی کا شکار ہو گئے میں نے تمہاری آنکھوں اور بشرے سے تمہاری دلی کیفیت کو بھانپ لیا تھا۔ میں نے تمہارا شک دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، بڑے والمانہ انداز میں تم پر اپنی محبت بھجھواری، حالانکہ تم سے محبت کا اظہار میرے لیے حد درجہ کرب ناک تھا۔ اس لیے کہ میں اپنی محبت میں علی رضا کے سوا کسی اور شریک کرنا نہیں چاہتی تھی لیکن تجھی کا یہ گھونٹ بھی چینا پڑا۔ میں نے پہلے ہی سے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت تمہارے دودھ میں بے ہوشی کی دوا ملا دی تاکہ یہاں سے نکلنے میں تم رکاوٹ نہ بن سکو۔ میں چاہتی تو ایک روز اور ٹھہر سکتی تھی، مگر میں اس خوف سے نہیں رکی کہ کہیں تمہیں میرے ماں بننے کی روانہ لگ جائے یا نہ لگے مجھے پتہ نہ ہو کہ تمہاری پہچان ہوئے گی۔ ہم حال کوئی نو ماہ بعد میں نے ایک خوب صورت بچی کو جنم دیا جس کا نام کرن رکھا گیا۔ اس لیے کہ وہ ہماری تاریک زندگی کی پہلی کرن تھی۔ جب کرن سو اسال کی ہوئی تو میں دوبارہ تمہارے پاس پہنچ گئی۔ میری اور رضا کی دلی خواہش تھی کہ ہمارے یہاں کم از کم دو بچے ہوں۔ جب میں دوبارہ امید سے ہوئی تو پہلے کی طرح غائب ہو گئی۔ نو ماہ بعد قدرت نے ایک لڑکے کی خواہش بھی پوری کر دی..... کوثر جہاں کی زبان ہمیشہ جیش کے لیے بند ہو گئی۔ اس نے علی رضا سے ناامید ہو کر کسی اور سے شادی کر لی۔ تب میں نے اور علی رضا نے

سکون کا سانس لیا۔ اب مسئلہ تم سے طلاق لینے کا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ تم میری محبت میں اس قدر جذباتی ہو گئے ہو کہ تمہاری دہائی ناممکن ہے۔ میں نے اسے ممکن بنانے کے لیے شام کو جبر و زیادتی کا حکم دیا۔ اگر شامو تمہارے ساتھ یہ رویہ اختیار نہ کرنا تو تم سے طلاق ملنی مشکل ہو جاتی..... ہر کیف مدت کے دن گزرنے کے بعد ہم دونوں نے ایک دن کی بھی تاخیر کیے بغیر اور بھگور پہنچ کر دوبارہ شادی کر لی۔ کسی کو قانون کن خبر نہ ہو سکی۔ اور یہ راز ہم تینوں کے سینے میں دفن رہا۔ مگر اب جو تم نے کمائی سنائی وہ اس قدر گھٹاؤنی تھی کہ مجھے اپنا راز اگل دینا پڑا۔ مجھے اپنے کیے پر کوئی ندامت یا شرمندگی نہیں ہے، اس لیے کہ میں نے اپنے محبوب کی خاطر ایک باعزت راستہ اختیار کیا تھا۔ کل یہ راز کسی طرح آشکار ہو بھی جائے تو ان بچوں پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکے گا۔ میرے پاس ثبوت موجود ہے۔“ اس نے توقف کر کے گہرا سانس لیا۔ ”کیا تم اب بھی ان بچوں کو ناجائز کہو گے؟“

”تو گویا وہ دونوں بچے میرے ہیں۔“ میں نے تڑپ کر وحشت سے پوچھا۔

”مجھ پر آسمان گہر پڑا تھا۔ میں سکتے کے عالم میں اسے نجد نظروں سے دیکھنے لگا۔ میرے کانوں کو دھوا کا نہیں ہوا تھا۔ میرے سامنے پھیلی ہوئی دھند چھٹ گئی تھی۔ یہ ایک ایسی تلخ حقیقت تھی کہ میں اسے جھٹلا بھی نہیں سکتا تھا۔ جیلہ نے مجھے جو کمائی سنائی تھی وہ میری کمائی سے یکسر مختلف تھی۔ وہ مجھے بڑے پرسکون انداز اور محنت سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر طمانیت چھائی ہوئی تھی، جیسے اس۔۔۔ سرے منوں بوجھ اتر گیا ہو۔ اس کے لبوں پر بکھرا ہوا فاقہ خانہ تبسم مجھے ریزہ ریزہ کیے دے رہا تھا۔ میرے حواس اس قدر منتشر تھے کہ میں انھیں متوجع بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جیلہ نے اپنی محبت کی یادگار ’تاج محل‘ کی صورت میں بنالی تھی۔ اسے اپنی منزل مل گئی تھی لیکن مجھے جانے کب تک اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتنا تھی۔ یہ مرے لیے کتنا بڑا الیہ تھا کہ میں اپنے بچوں کے وجود سے بے خبر تھا۔ میرے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا تھا۔ میں نے اپنی الجھتی ہوئی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے سوچا..... کاش میں اپنے بچوں کے وجود سے بے خبر رہتا۔ نہ جانے کس لیے تقدیر کا پھیر یہاں لے آیا تھا۔ ورنہ میں اک آگ میں جل کر اپنی زندگی گزار لیتا۔ میں نے تڑپ کر بدقت تمام دہرایا۔ ”وہ بچے واقعی میرے ہیں جنہیں میں نے تمہارے ساتھ دیکھا تھا؟“



جیلہ نے فاقہ خانہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر ایک زہر آلود مسکراہٹ پھیل گئی ”وہ میرے بچے، میری سیاہ کاریوں کا نتیجہ ہیں۔ میرے گناہوں کا پھل ہیں۔ ایک آوارہ عورت کیسے بتا سکتی ہے کہ اس کے بچوں کا باپ کون ہے“

ان طنزیہ باتوں نے میرا دل چھلنی کر دیا۔

میں تڑپ کر رہ گیا۔

میرے سینے میں ایک عجیب سی تکلیف شروع ہو گئی تھی..... میں اس اذیت ناک چھین کو کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔ بس یوں لگتا تھا جیسے کوئی نوکیلی شے بار بار میرے دل میں چبھ رہی ہو۔ میں بہت دیر اور بڑے دل گردے کا آدمی ہوں لیکن اس وقت یوں لگ رہا تھا جیسے میں ایک بھگیا ہوا چوہا ہوں اور جیلہ کے رحم و کرم پر

ہوں۔ وہ اپنی چند مار آکھوں سے میری طرف مگراں تھی۔ ان آکھوں میں کبھی میرے لیے محبت کے دھب چلتے تھے۔ میرے لیے ان میں انتظار ہوا تھا۔ ایک نشتے کی سی کیفیت ہوا کرتی تھی لیکن اس وقت وہ آنکھیں میرے لیے اجنبی ہو رہی تھیں۔ ”جیلہ.....“ میں نے تڑپ کر کہا ”نہیں۔۔۔“

”مجھے جیلہ مت کہو میں جیلہ نہیں ہوں ممتاز بیگم ہوں“ اس نے پروقار لہجے میں کہا ”اگر تم جیلہ سے منسوب رہے ہو تو جاؤ اسے تلاش کرو ممکن ہے وہ تمہارے بچے تمہیں لوٹا دے“

”تم جو کوئی بھی ہو، میرے بچوں کی ماں ہو“

”زبردستی“ وہ ہنس کر بولی ”میں تمہیں نہیں جانتی..... اور شاید تم بھول رہے ہو کہ اس طرح تم مجھ پر ایک الزام لگا رہے ہو جس کی کم سے کم سزا موت ہے“

”میں مرنے سے نہیں ڈرتا“ میں نے جواب دیا ”تم چاہو تو مجھے ہلاک کر دو۔ میں دیر بھر جھکا لیتا ہوں اپنے ہاتھوں سے میری گردن کاٹ دو..... لیکن ایک بار مجھے میرے بچوں سے ملو دو۔ میں نے انہیں اپنے سینے سے لگا کر، ان کے لمس سے اپنے دل کو ٹھنڈک سے بھر لیتا چاہتا ہوں“

”سنو سکندر“ وہ کھنکھور لہجے میں بولی ”اگر تم حقیقت پسند بن گئے ہو تو ماضی میں لوٹ جاؤ اور اس معاملے کو یاد کرنے کی کوشش کرو جو تم نے دولت حاصل کرنے کے لیے مجھ سے کیا تھا“

”میں نے ملازمت حاصل کرنے کے لیے تمہارے ٹکڑے تک چائے کی ہالی بھری ہوگی۔“

میں نے تڑپ کر کہا ”میں وہ سب کچھ کر گزروں گا جو تم چاہو گی..... لیکن خدا کے لیے میرے بچوں کو مجھ سے مت چھینو۔ وہ میرا خون ہیں کیا تم چاہتی ہو کہ میں جینے ہی مر جاؤں“

”اس دنیا میں سب کچھ ممکن ہے“ وہ دعوت سے بولی ”اسے تقدیر کا ایک بے رحم فیصلہ سمجھ کر قبول کر لو اور ان بچوں کے راستے سے ہٹ جاؤ وہ ایک اعلیٰ خاندان کے چشم و چراغ ہیں، تم انہیں کیا دے سکو گے؟“

”توگ اپنے بچوں کے ساتھ جھوٹیریوں میں اور فٹ ہاتھوں پر، کھلے آسمان کے نیچے بھی رہتے ہیں۔ ایک ساتھ بھوک پیاس برداشت کرتے ہیں اور زندہ رہتے ہیں انہیں ایک دوسرے کا بڑا سارا ہوتا ہے۔“

”یہ افسانوی باتیں ہیں وہ پاؤں بیخ کر بولی“ انسانوں اور کتوں میں کچھ تو فرق ہوتا ہے۔ کوئی انسان اس طرح زندگی نہیں گزار سکتا جیسے تم کہہ رہے ہو“

”میں انسان نہیں، کتا ہی سہی“ میں نے دلدرد لہجے میں کہا ”کتوں کے بھی تو بچے ہوتے ہیں اور وہ انہیں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہوتے ہیں۔“

”کتوں کے بچے، کم سنی میں ہی بک جایا کرتے ہیں“ اس نے ٹھوس لہجے میں کہا ”تم بھی یہی سمجھ لیتا کہ تمہارے پلے بک گئے اور عالیشان گھر میں ان کی پرورش ہو رہی ہے..... اور تم جانتے ہو کہ جب پلے فٹ ہاتھوں سے اٹھ کر محلوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ تو آوارہ کتوں کو ان سے ملنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔“

”لیکن وہ کسی کتے کے نہیں بلکہ ایک جیتے جاگتے باپ کے بیٹے ہیں“ میں نے تھلا کر کہا ”اور یہ مت بھولو کہ تم جن بچوں کو پلے کہہ رہی ہو وہ میرے ہی نہیں تمہارے بھی بچے ہیں“

”میں بچوں کی نہیں تمہارے بچوں کی بات کر رہی تھی“ اس نے غور سے گردن اٹھا کر جواب دیا۔ بے بسی اور غصے کے ملے جلے احساسات نے مجھ پر دیوانگی سی طاری کر دی تھی۔ میں اس حسین ڈائن کا سر

آخری بار تم سے ملنے آئی تھی۔ اب جاری ہوں یاد رکھو۔ اگر تم نے کہیں بھی میرے آڑے آنے کی کوشش کی تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“

”آخر یہ مجھے کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے؟“

”یہ سزا نہیں قسمت کا فیصلہ ہے۔“

”قسمت کا فیصلہ خدا کرتا ہے۔ تم کون ہوتی ہو؟ یہ فیصلہ کرنے والی۔“

”اس وقت یہ فیصلہ میرے ہاتھ میں ہے“ وہ سخت لہجے میں بولی ”میں نے بھی وقت کے بے رحم فیصلے کو قبول کیا تھا۔ میں نے اپنے جذبات، اپنے احساسات اور اپنے ارمانوں پر بھاری پتھر رکھ کر تم سے تعلق جوڑا تھا۔ وہ ایک ایک لمحہ میرے لیے عذاب سے کم نہیں تھا۔ ان بچوں کے لیے میں نے ایک بہت بڑی قربانی دی ہے، سکندر“ تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں نے جو کچھ کیا ہے وہ کوئی عورت کبھی نہیں کر سکتی۔

”گویا میں ان بچوں سے کبھی نہیں مل سکوں گا۔“

”کبھی نہیں..... تم انہیں یاد کر سکتے ہو۔ جہاں تم اور خواب دیکھو گے ان بچوں کے بھی خواب دیکھتے رہنا۔“

”وقت بڑا بے رحم ہے۔ جیلہ“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا ”ہو سکتا ہے کہ کسی روز وہ کوئی ایسا فیصلہ میرے ہاتھ میں بھی دے دے جس پر تمہاری زندگی کا انحصار ہو۔“

”میں کہہ چکی ہوں کہ تمہیں خواب دیکھنے سے کوئی بھی نہیں روکے گا۔“ یہ کہہ کر وہ چلی اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

”جیلہ..... رک جاؤ جیلہ..... یوں مت جاؤ..... سنو..... میں نے تڑپ کر کہا اور چاہا کہ لپک کر اسے روک لوں لیکن میرا پورا جسم جیسے شل ہو کر رہ گیا تھا۔ میں اپنی جگہ سے حرکت بھی نہ کر سکا۔ اور وہ دروازے سے ہی نہیں میری زندگی سے بھی نکل گئی شاہو نے سچ کہا تھا کہ سرکار کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ ایک پھانس نکالنے جائیں اور دوسری پھانس لگا بیٹھیں..... میں بے بسی کا مجسمہ بنا دیں کھڑا رہ گیا۔“

بیڈن روڈ پر واقع شامو کی کھولی میں اب میرا دم گھٹنے لگا تھا..... لیکن میں وہاں کھڑا رہا اور اپنے مستقبل کے اہم فیصلے کرتا رہا۔ میرے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اس کی بنیاد یہ بھی تھی کہ میں تلاش تھا۔ اگر میں غریب نہ ہوتا تو ایک دولت مند عورت مجھے یوں کھلونا سمجھ کر مجھ سے کھیلنے میں بھی کامیاب نہ ہوتی..... لیکن میں صرف اس لیے غریب تھا کہ رضیہ کے بھائی شانی نے مجھے پاکت مار ہونے کا طعنہ دیا تھا اور میں نے جیب تراشی ترک کر دی تھی۔

اب وقت آگیا تھا کہ میں اپنے ماضی کے بعض باب بند کر دوں اور بعض بند ابواب دوبارہ کھول لوں۔ مجھے دولت حاصل کرنا تھی، اتنی دولت کہ میرا قد بھی ممتاز ٹیکم کے نواب شوہر، علی رضا بھٹا بلند ہو جائے۔ تب میں ان لوگوں سے بہ آسانی منت سکتا تھا میرے سینے میں ایک لاوا دھک اٹھا تھا۔ جس کی آگ اتنی تیز تھی کہ اس کے شعلوں کی تپش سے میرا سینہ جل رہا تھا۔ یہ انتقام کی آگ تھی..... یہ محرومی کا زہر تھا جو انتقام کے شعلوں پر اہل رہا تھا۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ جب تک میرے بچے مجھے نہیں مل جاتے، میں ہندوستان سے واپس نہیں جاؤں گا۔ بچوں کو حاصل کرنے کے بعد اس ڈائن سے بھی نمٹنا چاہتا تھا۔ جس نے میری زندگی میں انگارے بھر دیے تھے۔

پکھل ڈالنا چاہتا تھا لیکن میری منجیاں غصے سے بھنچ کر رہ گئیں میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں؟

”وہ..... وہ بچے..... میرے بھی تو ہیں“ میں نے تھوک نکل کر جواب دیا۔

”تم اس بات کا کوئی ثبوت پیش کر سکتے ہو۔“

”جب تم جیسی عورتیں دولت کے نشے میں بہکنے لگتی ہیں تو ثبوت پیش کرنا ممکن نہیں ہوتا۔“

”چلو تم شادی کا ہی کوئی ثبوت دے دو“ وہ میری بے بسی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولی۔

”میں تسلیم کرتا ہوں کہ میرے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں۔ اس سارے معاملے کی واحد گواہ تم خود ہو لیکن تمہارے دماغ پر دولت کا نشہ طاری ہے اس لیے تم منحرف ہو رہی ہو۔“ میں نے سنبھال لیتے ہوئے کہا ”اگر تم سچیدگی سے غور کرنے کا وعدہ کرو تو میں ایک تجویز پیش کر سکتا ہوں جس سے یہ معاملہ خوش اسلوبی کے ساتھ منت جلائے گا۔“

”میں سن رہی ہوں۔“

”تم نے پہلی ملاقات میں مجھے ایک فلاش فوجوان کے روپ میں دیکھا تھا..... لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں جس قدر دولت پیدا کر سکتا ہوں شاید دنیا کا کوئی اور شخص نہیں کر سکتا۔ اگر تم بچوں سمیت میرے پاس آ جاؤ تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری ایک ایک اولاد انھوں میں خرید لوں گا۔ تمہیں سونے سے پہلی کر دوں گا۔“

وہ کھل کھلا کر ہنسی پڑی۔

”یقین کرو جیلہ میں..... میں ایک..... وہ بولتے بولے رک گیا“ میں جتنی دولت چاہوں پیدا کر سکتا ہوں۔“

”جس وقت تم میرے پاس ملازمت حاصل کرنے آئے تھے اس قوت دولت پیدا کرنے کی صلاحیت کہیں گروی رکھو اگر آئے تھے کیا؟“ وہ طنز پر بولی۔

”نہیں اس وقت بھی میں ایک فن کار تھا اور آج بھی فن کار ہوں اس وقت میں مجبور تھا لیکن آج میں نے اس مجبوری کا طوق اپنے گلے سے اتار پھینکا ہے۔“

”میں بھی تو سنوں کہ تم کیا شے ہو؟“

”میں ایک ماہر جیب تراش ہوں۔“

اس بار جیلہ کا قہقہہ اس قدر بلند تھا کہ میرے کانوں میں جھن جھناہٹ ہونے لگی۔ وہ ہنسنے ہنسنے بے حال ہوئی جا رہی تھی اس کی آنکھوں میں زیادہ ہنسنے کی وجہ سے آنسو حیرنے لگے۔ ”جیب تراش..... پاکت مار۔“ اس نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا ”تم پاکت مار ہی نہیں، اول درجے کے احمق بھی ہو“ وہ دیکھا کہ سنجیدہ ہو گئی ”دنیا کی کوئی بھی عورت کسی نواب خاندان سے تعلق تو نہ کر کسی پاکت مار سے منسوب ہونا پسند نہیں کر سکتی..... اور نہ ہی کوئی بچہ یہ گوارا کر سکتا ہے کہ اس کا باپ ایک پاکت مار ہو۔ مجھے دولت کی ضرورت نہیں اس لیے ایسی باتیں کر کے اپنا اور میرا وقت ضائع مت کرو۔ مجھے تمہاری سادگی پر ترس آ رہا ہے اگر تم چاہو تو میں تمہیں اتنی دولت دی سکتی ہوں کہ تم شادی کر کے کہیں بھی آرام سے زندگی بسر کر سکو گے۔ بولو کتنی دولت چاہیے؟“

”مجھے صرف میرے دو بچے دے دو“ میں نے کہا۔

”ناکہ تم انہیں بھی پاکت مار بنا دو۔“ وہ طنز پر لہجے میں بولی ”انہیں بھول جاؤ سکندر اور چا جاؤ۔ میں



”آئیے میں چھوڑ دوں“ اس نے کہا اور میں واپس آکر کار میں بیٹھ گیا۔ اس نے گاڑی اشارت کر کے آگے بڑھا دی۔ بڑی جاں ناسپ سناٹا چھایا تھا۔

ریلوے اسٹیشن تک ہم دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں پارکنگ میں کار سے اترا تو شامو نے دروازہ بند کر کے عقبی سیٹ سے ایک بریف کیس نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ میں نے بریف کیس دیکھ کر پوچھا۔ ”تم بھی کیس جا رہے ہو؟“

”نہیں میں تو آپ کو خدا حافظ کہنے جا رہا ہوں“

”اور یہ بریف کیس“

”یہ آپ کے لیے ہے“

”تمہاری طرف سے؟“ میں نے پوچھا

”نہیں مگر کی طرف سے“

”اس میں کیا ہے“

”چند ضروری اشیاء اور تھوڑی سی رقم۔۔۔“

”اولاد! اسے میری ضرورت کی اشیاء کا کس قدر خیال ہے“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا

”کاش! وہ میری ضرورت کی صرف ایک چیز مجھے دے کر حלב کر دیتی“

”وہ کیا سرکار؟“ شامو نے چونک کر پوچھا۔

”میری اولاد۔۔۔ میرے بچے کے کھڑے۔۔۔ یہ کہتے ہوئی میری آواز بھرا گئی۔“

شامو نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے چلا رہا۔ مجھے ریلوے اسٹیشن کی انتظار گاہ میں بٹھا کر اس نے بریف کیس میرے قریب رکھا اور پوچھا کہ ”کہاں کا ٹکٹ لاؤں سرکار؟“

”بیمینی۔۔۔ میں نے جواب دیا۔“

”جگہ دیش نہیں جائیں گے“

”وہاں سے چلا جاؤں گا“ میں نے ضبط کرتے ہوئے جواب دیا۔ مجھے وہاں کچھ کام ہے۔“

وہ چند لمحوں تک تولنے والی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر اثبات میں سر ہلا کر وینٹک روم سے نکل گیا۔ میں نے آرام کرسی پر خود کو گرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ میری آنکھیں جل رہی تھیں۔ سینہ بھاری ہو رہا تھا۔ اور سانسوں پر گرم بجلیوں کا گمان ہوتا تھا۔ حلق سے میری بوٹی بوٹی دھک رہی تھی۔ ایک بچی۔۔۔ اور حسین بچے کا چہرہ۔۔۔ میرے بچے۔۔۔ میرے دل سے اک ہو کر سی نکل گئی۔

شامو میرے لیے ٹکٹ لے آیا۔

”سرکار۔۔۔ شامو نے دھیمی آواز میں کہا۔“

”کیا بات ہے“

”آپ بیمینی کیوں جا رہے ہیں؟“

”کتنے دن قیام کریں گے۔ وہاں؟“

”شاید ایک ہفتہ۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ زیادہ دن لگ جائیں۔ مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“ میں نے مٹھوک

فلکٹ میرے لیے کوئی یا شمر نہیں تھا۔

میں یہاں کی زیر زمین دنیا میں بھی جانا پہچانا تھا۔ میرے بہت سے دوست تھے جن سے ملاقات ہوئے ایک عرصہ ہو گیا تھا۔ لیکن مجھے توقع تھی کہ وہ آج بھی مجھے ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ بن ماں باپ کے ایک تھڑکے کی حیثیت سے میں نے جگہ دیش، ہندوستان، اور پاکستان کے ہر بڑے شہر میں کچھ نہ کچھ وقت گزارا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات تھی جب میرے سامنے سوائے جیب تراشنے اور جیسے تیسے زندگی گزارنے کے علاوہ کوئی مقصد نہیں تھا۔ میں ایک سے دوسرے استاد کے ہاتھوں میں ہوتا ہوا جب اپنے فن میں ماہر ہو گیا تھا تو میں نے کراچی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی اور پھر وہیں کا ہو کر رہ گیا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے یہاں سے سیدھا بمبئی چلے جانا چاہیے۔ اس طرح میں وقتی طور پر اپنا ذہن اور دل سنبھالنے میں کامیاب ہو جاؤں گا اور اس دوران شاہو اور جمیل بھی مطمئن ہو جائیں گے۔ کہ میں فلکٹ سے جا چکا ہوں۔

کھولی سے باہر آیا تو سڑک پر ایک سفید چمک دار کار کھڑی تھی جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر شامو موجود تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کار سے اترا اور میرے لیے دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔ میں آہستہ آہستہ اس کے قریب پہنچا۔ اور اس کے سامنے رک گیا۔ میں براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی بوا بوا مجھے گھورنے لگا۔ چند لمحوں تک ہماری آنکھیں ایک دوسرے کی آنکھوں میں پوست رہیں پھر اس نے نظریں جھکا لیں۔

”شامو! میں نے ٹھوس لہجے میں کہا ”میری طرف دیکھو شامو! مجھے بتاؤ کہ قصور کس کا ہے؟“

وہ نظریں جھکائے کھڑا رہا۔

”جواب دو شامو! میں نے سخت لہجے میں کہا۔“

”سرکار! کبھی کبھی بڑے لوگوں کے معاملے چھوٹے لوگوں کی سمجھ میں بالکل نہیں آتے یہ وقت کے کھیل ہیں؟“ قسمت کے تماشے میں انسان ہی تماشہ ہے اور انسان ہی تماشائی ہے“ اس کے لہجے میں دکھ کی آمیزش تھی۔

”تب پھر اس وقت کا انتظار کرنا جب تمہاری آنکھیں ایک اور تماشہ دیکھیں گی۔۔۔ لیکن اس تماشے کے کردار بدل جائیں گے۔ جو آج تماشہ ہے۔ وہ کل تماشائی ہوں گا۔“ میں نے ایک عزم کیا۔

”سرکار! میں تو آپ کو ایک حقیر سی رائے ہی دے سکتا ہوں“ وہ دھیمی آواز میں بولا۔

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

”آپ جو ان ہیں آپ کی حیثیت کسی پھل دار درخت جیسی ہے۔ اگر کسی نے ایک دو پھل توڑ لیے ہیں تو اسے معاف کر دیں اور۔۔۔“

”اولاد! اور پھلوں میں بہت فرق ہوتا ہے شامو! انسان اور نباتات کو آپس میں گنڈ مت کرو۔ اگر یہ آگ تمہارے دامن میں لگی ہوئی تو تمہیں ایسی مثالیں بھی نہ سوچیں“ یہ کہہ کر میں ایک طرف کو چل دیا۔

”کہاں جا رہے ہو، سرکار!“ اس نے پوچھا۔

”کیا تم مجھے کہیں لے جانا چاہتے ہو؟ میں نے پلٹ کر اس سے سوال کیا“ تم میرا کیوں انتظار کر رہے

تھے؟“

”آئیے جہاں آپ کو جانا ہو، میں پہنچا دوں“

”مجھے ریلوے اسٹیشن جانا ہے“

گاڑی حرکت میں آگئی۔

شامو ڈبے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

”خدا حافظ سرکار“ اس نے کہا خدا کرے کہ آئندہ ہماری کبھی ملاقات نہ ہو۔“

”پھر ملیں گے، شامو“ میں نے الوادی انداز میں ہاتھ لہراتے ہوئے کہا ”زندگی رہی تو ضرور ملیں گے“

گاڑی کی رفتار تیز ہو گئی تو شامو ڈبے سے پیچھے رہ گیا اور پھر جلد ہی پلیٹ فارم پر کھڑے بے شمار لوگوں کے جھوم میں کھل مل گیا کہ اسے شناخت کرنا بھی مشکل ہو گیا۔ میں دیر تک کھڑکی سے سر نکالے عقب میں دیکھتا رہا حتیٰ کہ ہوا ناقابل برداشت ہو گئی میں نے سر اندر کر لیا اور آنکھیں بند کر کے سیٹ کی پشت گاہ سے ٹیک لگائی۔ گاڑی کے ہچکولوں اور پیروں کی کھڑا کھڑٹ کے باوجود میں جلد ہی گہری نیند میں ڈوب گیا۔

رات کا نہ جانے کونسا پر تھا کہ میری نیند اچانک ہو گئی آنکھیں کھلیں تو میں نے کسی کو خود پر جھکے ہوئے پایا میں اجنبی نظروں سے اس بیوے کی طرف دیکھتا رہا جس کے نقش و نگار آہستہ آہستہ واضح ہو رہے تھے۔ میرے حواس ٹھکانے آئے بینائی کام کرنے لگی تو میں نے ایک بیضوی چہرہ دیکھا.... نسوانی چہرہ.... جس پر جی ہوئی دو گہری سیاہ چمکدار آنکھیں میری طرف دیکھ رہی تھیں اور ان میں تشویش کے سائے تیر رہے تھے۔ چہرہ مجھ سے اتنا قریب تھا کہ میں لڑکی کے خوشبودار سانس کی محک محسوس کر رہا تھا۔

”آپ... کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ ایک سر ملی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

میں یوں ایک ہوش میں آ گیا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیاں مجھ پر جھکی ہوئی لڑکی بھی سیدھی کھڑی ہو گئی تب مجھے احساس ہوا کہ ریل کے ایک ڈبے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اور گاڑی تیز رفتاری سے کسی طرف اڑی جا رہی تھی۔ لڑکی کے نقش و نگار کچھ جانے پہچانے سے لگ رہے تھے۔ میں نے ذہن پر زور دیا تو یاد آیا کہ لڑکی کلکتہ سے ڈبے میں آئی تھی۔

”آپ ٹھیک تو ہیں؟“ لڑکی گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھ رہی تھی۔

”ہاں میں ٹھیک ہوں شکریہ“ میں نے دھیمی آواز میں جواب دیا ”کیا میں نیند میں کچھ کہہ رہا تھا؟“

”آپ بری طرح سچ رہے تھے“ جیلہ کو پکار رہے تھے اس سے استدعا کر رہے تھے کہ وہ آپ سے بچوں کو نہ جھینے کیا آپ کوئی خواب دیکھ رہے تھے۔

”ہاں.... شاید.... میں نے ایک طویل سانس لے کر کہا“ میں کئی دنوں کا تھکا ہوا تھا۔ میرے اعصاب شاید کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گئے ہیں۔ میں نے اپنے ہونٹوں پر ندامت آمیز مسکراہٹ بکھیری۔ مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے آپ کی نیند خراب ہوئی۔

”اوہ کوئی بات نہیں“ لڑکی کے چہرے پر اطمینان کی جھلک نمودار ہو گئی۔ ”ویسے میں سو نہیں رہی تھی ایک ٹاول پڑھ رہی تھی۔“

میں نے ایک سگریٹ نکال کر سلگالی۔

”کہاں جا رہے ہیں“

”بمبیسے....“ میں نے مختصر کہا۔

”میں بھی وہیں جا رہی ہوں۔ میں وہاں کے ایک کالج میں لیکچرر ہوں میرا نام شیلا ہے۔“

نظروں سے دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

”اس لیے کہ سات دن کے اندر آپ کو ہندوستان سے نکل جانا چاہیے“

”کیا مطلب؟ کیا یہ کوئی دھمکی ہے؟“

”یہ آپ کی بھلائی کے لیے کہہ رہا ہوں سرکار“

”اگر میں سات دنوں میں یہاں سے نہ گیا تو کیا ہو گا؟“ میں نے دریافت کیا

”تو پھر شاید آپ بھی نہ جاسکیں“ میں ہنس پڑا

”تم دھمکارہ ہو، مجھے“ میں نے ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا یہ دھمکی تم اپنی ماکن کے حوالے سے دے

رہے ہو؟ یا پھر یہ تمہاری اپنی سوچ ہے؟“

”یہ ماکن کا حکم ہے“

”میں اس کے کسی حکم کا پابند نہیں ہوں“

”آپ مجھ سے بستر سمجھ سکتے ہیں“

”ہوں....“ میں سوچ میں پڑ گیا گاڑی آ رہی تھی اور پلیٹ فارم پر بہت شور ہو رہا تھا۔ لوگوں کی بھاگ دوڑ

بھی شروع ہو گئی تھی۔ سنو شامو میں نے اس کا ہاتھ تمام کر کہا ”اپنی ماکن سے کہہ دینا کہ میں اپنی امانت لیے بغیر

ہندوستان سے نہیں جاؤں گا اور وہ ان بچوں کو سات روز میں میرے حوالے کر دے تو میں اس کی ہر خطا معاف کر

دوں گا۔ اور اگر اس نے سات روز میں ایسا نہیں کیا تو اس کے بعد گزرنے والا ہر دن اس کے عذاب میں اضافے کا

باعث ہو تا چلا جائے گا۔“

شامو نے کوئی جواب نہ دیا۔

ڈبہ سامنے ہی تھا شامو نے برف کیس اندر لے جا کر رکھ دیا اور خود باہر کھڑکی سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اس

کی نظریں پلیٹ فارم پر موجزن انسانوں کے سمندر میں بھٹک رہی تھیں۔ یا تو وہ یونٹی اوہر اوہر دیکھ رہا تھا۔ یا پھر

اسے کسی کی تلاش تھی میں سیٹ پر بیٹھ گیا فرسٹ کلاس کا کمپارٹمنٹ تھا اور اس میں دو سینیٹ تھیں.... دوسرا مسافر

ابھی تک نہیں آیا تھا۔ گاڑی کی روانگی سے ایک منٹ پہلے اچانک ایک جوان لڑکی قلی سے سلمان اٹھوائے آئی اور

کمپارٹمنٹ کی دوسری سیٹ کے نیچے سلمان لگوانے لگیں شامو نے کن انکیوں سے لڑکی کی طرف دیکھا پھر میری

طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی دھند تھی میں جانتا تھا کہ وہ ایک سفاک آدمی ہے۔ اپنی

ماکن کا وفادار ہے اور اس کے اشارے پر اپنی گردن بھی کالنے پر آمادہ ہو سکتا ہے۔..... لیکن بہر حال وہ ایک

انسان تھا۔ وہ میرے اور ممتاز بیگم کے معاملے میں واحد چشم دید گواہ تھا ہمارا راز دار تھا.... اور جو کچھ میرے ساتھ

ہوا تھا وہ بھی اسے کے علم میں تھا میں نے اپنے لیے اس کے دل میں ہمدردی محسوس کر لی تھی لیکن وہ میری

ہمدردی میں ممتاز بیگم کے خلاف نہیں جاسکتا تھا۔ البتہ یہ ضرور کر سکتا تھا۔ کہ اپنی ماکن کے اشارے پر میرا ہی کام

تمام کر دے۔ میں اب تک زندہ تھا تو اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ممتاز بیگم شاید میرے خون سے اپنے ہاتھ

نہیں رنگتا چاہتی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ میں واپس چلا جاؤں اور پھر کبھی اس کی دنیا میں قدم نہ رکھوں دوسری

صورت میں میری موت ناگزیر تھی اور شامو نے مجھ سے جو کچھ کہا تھا اس سے بات واضح ہو جاتی تھی گویا میرے پاس صرف سات دن تھے.... خیریت اور زندگی کے سات دن.... اس کے بعد میری موت یقینی تھی۔

میں نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ جو اہم میں نے اپنا تعارف پیش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ وہ شاید غصہ تھی کہ میں بھی اپنے بارے میں کچھ کہوں گا جب میں خاموش رہا تھا تو وہ بولی۔

”آپ نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔“

”میں....“ میں نے پھینکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا ”میرے پاس بتانے کے لیے کچھ بھی نہیں

ہے۔“

”کوئی نام تو ہو گا“ وہ مسکرا کر بولی۔

”ہاں ہے تو سہی“

”بتائیے گا، نہیں۔“

”کیوں نہیں بتاؤں گا؟“

”تو پھر بتا دیجئے نا“

”میرا نام سکندر ہے۔“ میں نے ہتھار ڈالتے ہوئے کہا ”اور میں....“ میں نے دائیں ہاتھ کی دو انگلیاں اٹھا کر قہقہے کی طرح چلائے ہوئے جملہ پورا کیا۔ ”یہ کام کرتا ہوں“

وہ بے یقینی سے ہنسی پڑی ”لیکن کوئی ٹیلر ماسٹر فرسٹ کلاس میں سفر نہیں کر سکتا۔“

میں ذریعہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ میرے اشارے کو غلط سمجھی تھی اس کی دانست میں میں ایک درزی تھا۔ میں نے اس کی غلط فہمی دور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ ”ٹیلر ماسٹر کی طرح کے ہوتے ہیں۔“ میں نے قدرے سنجیدگی سے بات بڑھائی ”کچھ لوگ ٹیلر ہوتے ہیں، کچھ ٹیلر ماسٹر ہوتے ہیں اور کچھ صرف ماسٹر ہوتے ہیں۔ اور جو ماسٹر ہوتے ہیں وہ ہمیشہ فرسٹ کلاس میں ہی سفر کرتے ہیں۔“

”اوہ تب پھر آپ فیشن ماسٹر ہوں گے“ لڑکی نے مسکرا کر کہا ”آپ اتنا طویل سفر کر رہے ہیں اور آپ کے پاس بستر بھی نہیں ہے“

”اوہ یہاں میرا خیال تھا کہ شاید پلیٹ فارم پر کوئی بستر بیچتے والا مل جائے گا لیکن.... میں نے بات ادھوری ہی چھوڑ دی کیونکہ لڑکی کھل کھلا کر ہنس پڑی تھی اس کی ہنسی میں نفرتی گھنٹیوں جیتی نغمہ گئی تھی اور اس کے سفید دانت موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ چہنئے سے اس کے رخساروں پر کشمیری سیبوں جیسی سرخی جھلک آئی تھی میں چند لمحوں تک اس کی طرف دیکھتا رہا، پھر رخ پھیر کر کھڑکی سے باہر پھیلے ہوئے لامتناہی اندھیرے میں گھورنے لگا۔“

”آپ بہت دلچسپ آدمی ہیں“ اس نے ہنسی روک کر گویا میری معلومات میں اضافہ کیا۔

”ہرگز نہیں“ میں نے سخت لہجے میں جواب دیا

”کیا مطلب“ وہ ہکا بکا رہ گئی

میں ہرگز دلچسپ آدمی نہیں ہوں ”میں نے اس بار بھی سخت لہجے میں کہا ”اور نہ ہی تم ایک حسین لڑکی

ہو“ میرا لہجہ بے حد توہین آمیز تھا۔

”لڑکی چند لمحوں تک حیرت سے میری طرف دیکھتی رہی پھر اس کے ہونٹوں پر خفت آمیز مسکراہٹ آگئی اور بالائی لب پر دانت اور توہین کی وجہ سے پیدا ہونے والے پینے کے قطرے جھلک کرنے لگے۔“

”مجھے افسوس ہے، مسٹر آپ مجھے غلط سمجھے“ کچھ دیر بعد وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی تو اس کی آنکھوں

میں آنسوؤں کی نمی بھی موجود تھی ”میں کوئی ایسی ایسی لڑکی نہیں ہوں“

میں خاموش رہا مجھے اپنے رویے پر افسوس ہو رہا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں وہ جیسے ہی بے تکلف ہونے لگی تھی، میری کھوپڑی پر برقرار شروع ہو گئی تھی میں اس سے بے تکلف نہیں ہونا چاہتا تھا۔ معلوم نہیں وہ کون تھی کیا تھی بظاہر تو معصوم سی اور بے ضرر لڑکی لگ رہی تھی۔ لیکن اب تک میں نے جس بھی لڑکی سے دھوکا کھایا تھا۔ وہ شروع میں ایسی ہی سیدھی سادی اور معصوم لڑکی نظر آتی تھی لڑکی نے جب اپنی وضاحت کے جواب میں مجھے خاموش پایا تو وہ ٹاول کھول کر دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہو گئی میں اس کے ہتھارے ہوئے رخساروں اور اس کے کان کی سرخ ہوتی ہوئی لوٹوں سے اندازہ لگا سکتا تھا۔ کہ وہ دل ہی دل میں میرے اس توہین آمیز رویے پر بری طرح تلملا رہی ہے۔

میں نے سرکٹ کے کش لگاتا ہوا باہر دیکھتا رہا۔

میری کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی ایک بج رہی تھی یکایک مجھے شدت سے چائے کی طلب محسوس ہوئی کچھ پاس بھی لگ رہی تھی میں اٹھا اور ہاتھ روم میں چلا گیا۔ واپس آیا تو دیکھ کر حیران رہ گیا لڑکی اپنی سیٹ پر بستر بچھائے لیٹی ہوئی تھی اور لیٹ کر ٹاول پڑھ رہی تھی جبکہ ایک ننگی اور ایک چادر میری سیٹ پر بھی پڑی ہوئی تھی میں کچھ دیر اس مختصر بستر کو دیکھتا رہا پھر چادر بچھا کر ننگیے پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔

”چائے قہر مومس میں موجود ہے“ لڑکی جیسے ٹاول کا کوئی ڈائیلاگ پڑھ رہی ہو۔

”تمہیں کیسے معلوم ہوا مجھے چائے کی طلب محسوس ہو رہی ہے۔“ میں نے قدرے نرمی سے پوچھا۔ دل ہی دل میں مجھے اپنے اس اچانک ہی خراب ہو جانے والے رویے پر افسوس بھی ہو رہا تھا۔

”میں جانتی ہوں کہ ہاتھ روم کے ق سے پانی تو بچا جاسکتا ہے چائے نہیں پی جاسکتی۔“ ”میں ہنس پڑا“ تم ایک ذہین لڑکی ہو“

”ہرگز نہیں“ وہ چیخ پڑی۔

”کیا مطلب“ وہ میں ہکا بکا رہ گیا۔

”میں ہرگز ذہین لڑکی نہیں ہوں“ اس نے اپنا حساب چکا دیا تھا۔ بہر حال مجھے خوشی ہوئی کہ اس طرح مجھے اپنی زیادتی کے سلسلے میں اس سے معذرت نہیں کرنا پڑے گی۔ کیونکہ اس نے بدلہ لے لیا تھا۔

”میں واقعی حسین نہیں ہوں“ میں نے تائید کی۔ ”لیکن تم ضرور ذہین ہو.... بلکہ حسین بھی ہو“

کتاب چھینک کر وہ اٹھ بیٹھی

”بھول جاؤ لڑکی“ میں نے نرمی سے کہا ”دراصل اس میں میرا بھی کوئی قصور نہیں ہے میں جب سے دماغی امراض کے اسپتال سے فارغ ہوا ہوں کبھی کبھی مجھ پر ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔“

”دماغی اسپتال....“ وہ بیڑائی اور چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں اچانک ہی سراسیمگی کے تاثرات پیدا ہو گئے تھے۔

”ہاں.... لیکن گھبرانے کی ضرورت نہیں کیونکہ میں اب بالکل ٹھیک ہوں یوں بھی مجھے خطرناک قسم کے پاگلوں والے وارڈ میں نہیں رکھا گیا تھا“ میں نے سنجیدگی سے کہا اور دل ہی دل میں اطمینان محسوس کرنے لگا کہ چلو

بہتی پہنچنے سے دو تین گھنٹے قبل اچانک ہی مجھے اس بریف کیس کا خیال آیا جو شامو نے گلگتے سے روالپہل کے وقت میرے حوالے کیا تھا۔ میں نے اسے ابھی تک کھول کر نہیں دیکھا تھا۔ مجھے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی کیونکہ شیلہ تمام ضروری سامان کے ساتھ سفر کر رہی تھی اور اس نے بڑی فراخ دلی سے اپنی ہر شے استعمال کرنے کی اجازت دے دی تھی۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اپنا سامان سینٹنے میں مصروف تھی میں بستر باندھنے اور چیزیں سینٹنے میں اس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے منع کر دیا اس طویل سفر کے دوران ہم ایک دوسرے سے کافی حد تک بے تکلف ہو گئے تھے لیکن ہمارے درمیان نجی قسم کی گفتگو بس شروع ہی میں ہوئی تھی اس کے بعد ہم عام باتوں میں مصروف رہے تھے۔ حد سے تجاوز کرنے کی ہم سے دونوں میں سے کسی نے بھی کوشش نہیں کی تھی۔

”بہتی میں کہاں قیام رہے گا؟“ شیلہ نے سامان..... باندھتے ہوئے میری طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

”یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا“

”کیا مطلب؟ کیا تمہارا گھر؟“

”نہیں میرا کوئی گھر نہیں عزیز رشتے دار بہت ہیں کسی ایک کے ہاں رک جاؤں گا یا پھر ممکن ہے کسی ہوٹل میں قیام رہے۔“ میں نے جواب دیا۔

اس نے اپنے پرس میں سے اپنا ملاقاتی کارڈ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ ”کبھی فرصت ملے تو ضرور آنا“

”کوشش کروں گا“ میں نے کارڈ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا ”تمہارے ہاں کون رہتا ہے۔“

”صرف میں اور میری بیٹی..... بیلا“

”اوہ.....“ میں نے ایک طویل سانس لی۔

”اسٹیشن پر اترنے کے بعد ہم ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر چلی گئی اور میں ٹیکسی اسٹینڈ کے قریب کھڑا غور کرنے لگا کہ اب مجھے کہاں جانا چاہیے۔ اور زندگی کا نیا باب کس طرح شروع کرنا چاہیے۔“

میرے ذہن میں آتما کا خیال آیا

جن دنوں میں بہتی میں تھا۔ مجھے جو ہو روڈ کے بے تاج بادشاہ آتما کی سرپرستی حاصل تھی وہ جیب تراشی کے فن میں میرا استاد بھی تھا اور اسے مجھ سے اپنے بیٹوں جیسی محبت تھی۔ آتما کا خیال آتے ہی میرے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئیں اسی لمحے ایک نو عمر لڑکا دوڑتا ہوا آیا اور مجھ سے ٹکرا گیا وہ منہ اٹھائے کسی اور طرف دیکھ رہا تھا کہ مجھ سے ٹکرا ہو گئی میرے ایک ہاتھ میں وہی بریف کیس تھا جسے کھولنے کی ابھی نوبت نہیں آئی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ اب کسی منزل پر پہنچنے کے بعد ہی اس کا جائزہ لوں گا۔ مگر گتے سے بریف کیس میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہوتا تو یہ چاہیے تھا کہ میں بریف کیس اٹھاتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ میرا دایاں ہاتھ بڑھا اور میں نے لڑکے کی کلائی تھام لی۔

”معاف کرنا باوجی“ میں دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔ لڑکے نے جلدی سے معذرت چاہی۔

”کوئی بات نہیں یہ عمری ایسی ہے۔“ میں نے مسکرا کر نرمی سے کہا اور اس کی کلائی چھوڑ دی ”دیکھ کر چلا کرو۔ مجھ سے ٹکرانے کی بجائے تم کسی گزرتی بھی کر سکتے تھے۔“

اس طرح لڑکی مجھ سے دور رہے گی اور میرے خراب رویے کا ایک بہترین جواز بھی سامنے آجائے گا۔

”کوئی ذہنی صدمہ تھا“

”ہاں..... ذہنی بھی اور قلبی بھی.....“

”کوئی عورت؟“

”ہاں..... عورت ہی تھی۔“

”جیلہ.....؟“ اس نے ذہن پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔ میں اس بار خاموش رہا تھا۔

”گویا آپ نیند کی حالت میں جو کچھ کہہ رہے تھے اس کا آپ کے ماضی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔“ اب اس کے انداز اور لہجے میں میرے لیے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔

میں نے سگریٹ پھینک دیا اور تنکے پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے میرے لیے چائے کا ایک کپ انڈیلا اور میری طرف بڑھا دیا۔ میں کمنیوں کے بل اٹھا اور کپ اس کے ہاتھوں سے لے لیا۔ چائے کی چمکیوں کے دوران میں نے اسے جیلہ کے ساتھ ساری گزار دی ہوئی زندگی کی داستان سنائی لیکن میں نے واقعات کا صرف خاکہ ہی پیش کیا۔ حقائق اور حقیقی ناموں کو سامنے لانے کی کوشش نہیں کی۔ اس طرح گویا میں نے اسے ایک ایسی عورت کی داستان سنائی جو میری بیوی تھی، میرے دو بچوں کی ماں تھی اور جس نے دولت کی خاطر مجھے چھوڑ دیا۔

”لیکن وہ بچوں کو اپنے ساتھ کیوں لے گئی؟“ شیلہ بحث پر اتر آئی۔ اگر وہ بے وفا تھی اسے صرف دولت کی ہوس تھی تو بچوں سمیت کیوں گئی۔ اور وہ جس کے پاس گئی اس نے بچوں کو کیسے قبول کر لیا؟

”میں نہیں جانتا مجھ سے تو طلاق طلب کی گئی تھی مجبوراً“ میں نے طلاق دے دی کیونکہ جب بیویاں طلاق مانگتی ہیں تو ان سے مصالحت کرنا حاکمیت ہی ہوتی ہے۔“

”اس نے ایک طویل انگڑائی لی۔“

”رات کے تین بج رہے ہیں“ اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا ”میری کمائی بھی تم سے کچھ ملتی جلتی ہی ہے“ اس کے لہجے میں اداسی پیدا ہو گئی۔ میرا شوہر مجھے چھوڑ گیا..... لیکن بچے..... دو بچے..... ہم نے انہیں آپس میں بانٹ لیا لڑکی میرے ساتھ ہے لڑکا اس کے پاس۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ کاش ممتاز بیگم بھی کچھ اس انداز کی مصالحت پر آمادہ ہو جاتی..... لیکن نہیں وہ ایسا کرنے پر کبھی رضامند نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ اس نے تو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت یہ سب کچھ کیا تھا۔ مجھے اپنے سینے میں ہلکی سی جھپٹ کا احساس ہونے لگا۔ جب سے بچوں کے بارے میں علم ہوا تھا۔ ان کے متعلق سوچتے ہوئے یہ جھپٹ کئی بار مجھے محسوس ہوئی تھی۔

میں نے چائے ختم کر کے پیالی اسے دے دی۔

ہم دیر تک باتیں کرتے رہے اور پھر میری آنکھ لگ گئی اس بار میں خوب سویا میری آنکھ کھلی تو کھڑکی سے باہر دھوپ چمک رہی تھی میں نے سامنے والی برتھ کی طرف دیکھا شیلہ ابھی تک سو رہی تھی اس نے چادر اوڑھ رکھی تھی وہ نیند کے عالم میں ڈھلک گئی تھی اور اس کے بال بکھر کر سیٹ سے نیچے تک بھول رہے تھے۔ اس کے چہرے پر بڑا ہی محسوس سا نیم بکھرا ہوا تھا۔

میں کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اٹھ کر ہاتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔



خطرناک تھے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے چاقو نکال کر کھول لیے۔

”بڑے جی دار ہو، بابو۔“ ایک نے دانت نکال کر کہا۔

”کیا تم میری جی داری کا امتحان لینے آئے ہو۔“

”ہاں.... اور اس کے ساتھ تھیں کچھ سبق بھی دینا چاہتے ہیں تاکہ آئندہ تم محتاط

رہو۔“ دوسرے نے چاقو لہراتے ہوئے کہا۔

”میرا خیال ہے، تم لوگوں کو مجھ پر کسی اور کا شبہ ہو رہا ہے۔“ میں نرمی سے بولا۔ ”میں

پرہیزی ہوں اور آج ہی شرمیں داخل ہوا ہوں۔“

”اور شرمیں قدم رکھتے ہی وارداتیں بھی شروع کر دیں۔“ مجھے اپنی پشت کی طرف سے

آواز سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا یہ وہی نوجوان تھا جو اسٹیشن پر کچھ دیر قبل مجھ سے ٹکرا گیا تھا۔

”اوہ، تمہیں تو شاید کمرانے کا ضبط ہو گیا ہے۔“ میں نے ہنس کر کہا ”پہلے مجھ سے کمرائے

پھر ٹیکسی سے ٹکراتے ٹکراتے رہ گئے اور اب تم چاروں طرف سے کمرانے کا بندوبست کر کے آئے ہو۔“

”بک بک مت کرو اور بڑا نکالو۔“ وہ غرایا۔ اس کی سانس دھونکی کی طرح پل رے تھی

اور وہ بے پناہ غصے میں معلوم ہو رہا تھا۔

میں نے بڑا نکال کر اس کی طرف اچھال دیا اس نے کچھ کرنے کے انداز میں بڑا سنبھالا

اسے جیب میں رکھا اور اس کے لبوں پر بڑی ہی عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”دوسرا بڑا بھی نکالو....“ اس کا لہجہ زہریلا تھا۔

”آدی ایک ہی بڑا رکھتا ہے، فرزند۔“ میں نے کہا ”کبھی کسی آدی نے دو بڑے بھی

رکھے ہیں؟“

”تم ایسے ہی آدی ہو۔“ وہ غرایا۔

”بڑی قیامت کی نگاہ پائی ہے۔“ میں نے کہا۔

”لیکن میرے پاس دوسرا بڑا نہیں ہے۔“

”میں کتنا ہوں، میرا بڑا میرے حوالے کرو ورنہ آنتیں نکال کر بیس ڈھیر کر دوں گا۔“

”تمہارا بڑا؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”ہاں میرا بڑا، جو تم نے اسٹیشن کی پارکنگ میں میری جیب سے پار کیا تھا۔“ وہ آنکھوں

کے اوپر آئے ہوئے پسینے کو ایک ہاتھ کی انگلی سے پونچھ کر بولا۔

”میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا اور دوسرا بڑا نکال کر اس کی طرف اچھال دیا۔“ اب کہیں

تم مجھ سے تیسرے بڑے کی فرمائش نہ کر بیٹھنا۔“ میں نے کہا۔

”میں اندھا نہیں ہوں۔“ وہ تھلا کر بولا۔

”آئندہ خیال رکھوں گا“ یہ کہہ کر دوڑتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔ میں دیر تک کھڑا اسے

جاتے ہوئے دیکھتا رہا اس دوران میری نگاہ ایک خالی ٹیکسی پر پڑی جو اسی وقت پارکنگ میں داخل

ہوئی تھی۔ میں بریف کیس اٹھا کر اس کی طرف بڑھا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا تو جلدی سے اتر کر دروازہ کھولا اور

پوچھنے لگا ”کہاں جائیں گے؟“

”جو ہو روڈ....“ میں نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔

ڈرائیور نے ٹیکسی آگے بڑھائی تو اچانک وہی لڑکا۔ دکھائی دیا جو کچھ دیر پہلے مجھ سے ٹکرایا

تھا۔ وہ اب بھی دوڑتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ اور رخ ٹیکسی کی طرف تھا۔ ٹیکسی گھوم کر آگے بڑھی تو وہ

اس سے ٹکراتے ٹکراتے رہ گیا۔

”دیکھ کر فرزند“ میں نے کھڑکی سے سر نکال کر کہا ”اس بار تم ٹیکسی کے نیچے آ جاتے“

”رکو... ٹھہرو....“ وہ چیختا ہوا ٹیکسی کے پیچھے دوڑا لیکن ٹیکسی ڈرائیور نے تھپتھپ لگا

کر رفتار تیز کر دی میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا وہ لڑکا ایک اور ٹیکسی کی طرف دوڑا جا رہا تھا۔

”گدھے کا پیچ“ ڈرائیور نے ہنس کر کہا۔ ایک تو اندھا دھند دوڑ رہا تھا۔ اوپر سے نیچے رہا

تھا کہ رک جاؤں گی تو چاہتا تھا۔ کہ اتر کر دو ایک جھانپڑ سالے کے.... لیکن سوچا کہ مفت میں بات

بڑھانے سے کیا فائدہ۔“

”تم نے اچھا کیا“ میں نے اس کی سمجھ داری کو سراہا اور دل ہی دل میں ہنسے بغیر نہ رہ سکا

کیونکہ وہ ٹیکسی ڈرائیور سے نہیں بلکہ مجھ سے رکنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ ”راستے میں کہیں رک

کر میرے لیے سگریٹ لے لینا۔“ میں نے ڈرائیور سے کہا اور عقب نما آئینے میں پیچھے دیکھنے لگا۔ وہ

لڑکا ٹیکسی میں بیٹھ چکا تھا۔ اور ٹیکسی تیزی سے ہمارے پیچھے آ رہی تھی۔

”ٹریفک کے جھوم میں جلدی ہی اس ٹیکسی کو کھو بیٹھا اور غالباً لڑکے کی ٹیکسی والا

ڈرائیور بھی ہماری ٹیکسی کو کھو بیٹھا تھا۔ راستے میں میں ایک جگہ رک کر ڈرائیور نے مجھ سے پیسے

لے کر سگریٹ خریدے اور ہم دوبارہ منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

جو ہو روڈ پہنچ کر معلوم ہوا کہ اس کا نام بدل کر جوشی روڈ رکھ دیا گیا۔ میں ایک جگہ اتر

گیا۔ غالباً پندرہ سال بعد یہاں آیا تھا۔ اس عرصے میں تو یہاں کی کایا ہی پلٹ گئی تھی۔ میں آہستہ

آہستہ بازار میں چلتے لگا اور اس دوران اطراف بھی دیکھتا جا رہا تھا.... دوکانداروں میں سے ایک

بھی شناسا نہیں لگ رہا تھا۔ ہر چیز میرے لیے اجنبی اجنبی سی تھی۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ کہیں ایسا تو

نہیں کہ استاد آتما بھی یہاں سے کہیں اور منتقل ہو گیا ہو؟ میں اسی ادھڑبن میں ایک جگہ رک کر نمبر

دیکھنے کے بعد ایک سنسان سی گلی میں گھوم گیا۔ ابھی چند قدم ہی آگے گیا تھا کہ اچانک ہی ٹھک جانا

پڑا۔

دائیں بائیں جھے دو اور سامنے سے ایک نوجوان نے میرا راستہ روک لیا۔ ان کے چہرے

کسی بھیک سنگے کی جھولی میں ہاتھ ڈالا تھا۔ تم آتما کے چیلے ہو، تمہاری انگلیوں میں تو ایسا جادو ہوتا چاہیے کہ نوٹ دور دور سے خودی ان انگلیوں کی طرف کھینچ آیا کریں۔“

”استاد..... اس شکار کو سنبھالو۔“ لڑکے نے عقب سے مجھے دھکا دیتے ہوئے کہا۔ ”اس نے لالو کی جیب پر ہاتھ صاف کر دیا تھا.... اور وہ بھی اسٹیشن پر....“

آتما یوں اچھل کر پلٹا جیسے اسے بھونے ڈک مار دیا ہو۔ ”لالو کی جیب کون کاٹ سکتا ہے۔“ وہ کسی چپتے کی طرح لپک کر میرے سامنے آکھڑا ہوا اس کی سانس دھونکی کی طرح چل رہی تھی اور وہ اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کے تور ڈھیلے پڑتے چلے گئے اور اس کی خونخوار آنکھوں میں میرے لیے شامانی کی چمک پیدا ہو گئی تھی پھر وہ کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ ”بہت خوب بہت خوب سکندر؟“ یہ کہہ کر اس نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔

”سکندر....“ بیک وقت غانے میں کئی آوازیں گونج کر رہ گئیں ”سکندر۔“

ہم دیر تک ایک دوسرے سے لپٹے رہے۔ مجھے وہاں تک لانے والے چاروں پاکٹ مار ہکا بکا کھڑے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ اس نوجوان کی حالت سب سے خراب تھی جس کے ساتھ یہ ساری واردت پیش آئی تھی۔ اور جسے اس کے ساتھیوں نے لالو کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ آتما کے دل میں آج بھی میرے لیے وہی گہری اور شفقت تھی۔ جو پندرہ سال پہلے ہوا کرتی تھی۔ آتما محض ایک جیب تراش فن کاری نہیں تھا، وہ ایک عظیم انسان بھی تھا۔ وہ دو مختلف شخصیتوں کا مالک تھا۔ اس نے مجھے اتنا کچھ سکھایا تھا کہ شاید ہی کوئی استاد اپنے شاگردوں کو اس حد تک سکھاتا ہو گا.... استاد ایک دو گریز اپنے پاس رکھنے کے عادی ہوتے ہیں لیکن آتما نے مجھ سے کچھ نہیں چھپا رکھا تھا.... اس نے تو مجھ سے اپنے دل کا درد بھی نہیں چھپایا تھا۔ ایک ایسا درد جو آہستہ آہستہ اسے اندر ہی اندر سے گھن کی طرح چاٹ رہا تھا۔ بیس سال پہلے آتما نے ایک بنگالی لڑکی سے شادی کر لی تھیں یہ لڑکی پہلے تو اس کی شاگرد تھی بعد میں بیوی بن گئی.... اور پھر وہ آتما پر اس حد تک چھا کئی کہ آتما اس کا غلام بن کر رہ گیا تھا.... کچھ عرصے بعد نہ جانے کیا ہوا۔ دونوں ایک دوسرے سے ناراض ہو گئے اور ہر ایک روز وہ بنگالی لڑکی اپنے اکلوتے بیٹے کو ساتھ لے کر نہ جانے کہاں چلی گئی۔

استاد نے اسے پورے ہندوستان میں تلاش کیا، بنگال بھی گیا، پاکستان بھی گھوم لیا نہ بیوی ملی اور نہ ہی اسے بیٹے کا کوئی سراغ مل سکا۔ ہو اس کا اکلوتا بیٹا تھا اور آتما نے اس کے لیے بڑے بڑے خواب دیکھ رکھے تھے۔ لیکن وہ اس کی نظروں سے ایسا داغ جھل ہوا کہ لاکھ تلاش کرنے کے باوجود بھی اس کا کوئی آنا پڑنا نہ چل سکا۔ آتما ان کی تلاش میں سرگرداں تھا استاد کا اڑا تبدیل نہ ہوا.... اس کا مطلب تھا کہ ابھی تک مجھڑے ہوئے آپس میں نہیں ملے تھے آتما اس خوف سے اپنا اڑا نہیں بدلتا تھا کہ شاید کبھی چن اور بیو لوٹ آئیں اور اسے وہاں نہ پا کر کہیں دوبارہ نہ کھو جائیں۔

”حالانکہ تم اندھوں کی طرح ہی ادھر ادھر کراتے پھر رہے ہو۔“ میں کہا۔  
”یہ بریف کیس میرے حوالے کر دو۔“ دوسرے نوجوان نے چاقو لہرا کر کہا۔ لہجہ سخت اور سفاک تھا۔

”مجھے قلی کی ضرورت نہیں۔ میں خود ہی اسے اٹھا سکتا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے آگے بڑھنے کے لیے قدم اٹھایا تو وہ کھلے ہوئے چاقو لے کر آہستہ آہستہ میرے گرد اپنا گھیرا تنگ کرنے لگے۔

”ایسا معلوم ہوتا ہے، اس علاقے میں تمہیں لوگوں کا راج ہے۔“ میں نے کہا ”مئی وچ ہے کہ تمہیں نہ تو کسی کی آمد کا خوف ہے اور نہ تمہیں یہ فکر ہے کہ قانون کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں۔“

”تمہاری زبان خوب چلتی ہے۔“ تیسرے نے برہمی سے کہا۔ ”یہ بریف کیس دیتے ہو یا دوں ایک ہاتھ۔“

میں نے بریف کیس اس کی طرف بڑھا دیا۔  
اس نے مسکرا کر بریف کیس لے لیا اور اپنے ساتھی سے بولا۔ ”آدی بڑا سمجھ دار معلوم ہوتا ہے، میرا خیال ہے، دو چار ہاتھ مار کر رخصت کر دینا چاہیے۔“  
”نہیں، میں اسے اپنے استاد کے پاس لے جاؤں گا۔“

وہی پاکٹ مار بولا جس نے اسٹیشن پر میری جیب صاف کر دی تھی اور پھر جواباً میں نے اپنا ہی نہیں ”اس کا بڑا بھی نکال لیا تھا اسٹیشن ہمارے علاقے میں ہے۔ اسے وہاں واردات کرنے کی جرات کیسے ہوئی۔ اس بات کا فیصلہ استاد ہی کرے گا۔“

”چلو.... خاموشی سے سیدھے چلتے رہو۔“ ایک چاقو بردار نے حکم دیا۔ ”ہم چاقو اپنی جیب میں رکھ رہے ہیں۔ لیکن اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو تمہاری ایلی کی تھپی کر دیں گے۔“  
میں خاموشی سے ان کے ساتھ چل دیا۔

مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی کہ یہ چاروں استاد آتما ہی کے شاگرد ہیں ہم خاموشی سے گلی میں بڑھتے رہے حتیٰ کہ ایک موٹر گراج آگیا۔ انہوں نے مجھے گیراج میں چلنے کا اشارہ کیا۔ اگر وہ مجھے اشارہ نہ بھی کرتے تو میں خود ہی گراج میں داخل ہو جاتا کیونکہ یہاں سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا میں نے پندرہ سال پہلے دیکھا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس گیراج کے نیچے ایک بڑا خانہ ہے۔ جس میں آتما کی گدی لگتی تھی وہ وہیں اپنے چیلوں سے دن بھر کی کمائی کا حساب لیا کرتا تھا۔ اور اسی جگہ نئے لڑکوں کی تربیت ہوا کرتی تھی۔

غانے کے زینے سے اترتے وقت ان میں سے دو میرے آگے اور دو پیچھے چل رہے تھے بیڑھیاں اتر کر میں نے جیسے ہی غانے میں قدم رکھا آتما کی دھاڑ سنائی دی۔

”ابے ابے ابے ابے“ عرف تیس... ایک لڑکے کو تھپڑ مارتے ہوئے جج رہا تھا۔ ”کیا

سفارش کر دیں تاکہ یہ ہم چاروں کو معاف کر دیں۔"

آتما نے میری طرف دیکھا وہ جانتا چاہتا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ میں نے اسے پوری کہانی سنا دی۔ استاد کا ہنسنے ہنسنے برا حال ہو گیا۔ اس کے بعض چلے بھی دانت نکالنے لگے لیکن چاروں جو مجھے اڑے تک لائے تھے، ان پر تو جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔ وہ سر جھکائے کھڑے تھے۔ پیٹنے میں شراہور بغلیں جھانکتے ہوئے۔

"مانتے ہو، میرے شاگرد کی استاد۔" آتما نے فخریہ لہجے میں کہا "چلو نکالو اس کا بڑا اور اس کے حوالے کر دو۔" استاد نے لالو کو حکم دیا۔

لالو نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ پہلے ایک جیب میں پھر دوسری جیب میں اور اس کے بعد تو وہ یوں باری باری اپنی تمام جیبوں کو نکل رہا تھا۔ جیسے اس کے پورے جسم پر شہید کی کھیاں چٹ گئی ہوں اور وہ انہیں خود سے الگ کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"تم شاید اس بڑے کو تلاش کر رہے ہو۔" میں نے اپنی جیب سے لالو کا بڑا نکالتے ہوئے کہا۔

میرے ہاتھ میں اپنا بڑا دیکھ کر لالو کی آنکھیں حیرت اور بے چینی سے پھیل گئیں۔

"ناممکن...." وہ بڑبڑایا "یقیناً" میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔"

"خواب کے بچے" آتما نے دونوں ہاتھوں سے پیٹ سنبھال کر ہنسنے ہوئے کہا۔ "خواب دیکھنا چھوڑو گے تو کسی کام کے آدمی بنو گے۔" یہ کہہ کر وہ میری طرف متوجہ ہوا اور اس نے میرا کندھا تھپ تھپایا "شاباش سکندر تم نے واقعی کمال کر دیا۔ لالو کو بھی کم نہ سمجھو۔ تمہارے بعد یہ سب سے ہونہار چیلر ثابت ہوا ہے۔" "بہر حال، میری طرف سے دل براندہ کرو۔" میں نے ان چاروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم میرے بھائی ہو اور بھائیوں سے چھوٹی موٹی جھپٹ ہو ہی جاتی ہے۔ میں نے تم سب کو معاف کر دیا۔ تم بھی مجھے معاف کر دو۔"

چاروں کے دانت نکل پڑے۔

جس جوان کے پاس میرا بریف کیس تھا، وہ آگے بڑھا اور اس نے بریف کیس میرے سامنے رکھ دیا۔ وہ پلٹتا تو میں نے کہا "اور میرا بڑا بھی نکال کر میرے حوالے کر دو۔"

"آپ کا بڑا؟" وہ حیرت سے اچھل پڑا۔

"ہاں.... میں نے لالو کی جیب سے نکال کر تمہاری جیب میں بطور امانت رکھ دیا تھا۔"

اس انکشاف پر وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے اپنی تلاش لینے لگا اور جب بڑا اس کی جیب سے برآمد ہو گیا تو اس کے پسینے اور دوسروں کے قہقہے چھوٹ پڑے۔

"واقعی بہت کھر گئے ہو، سکندر۔" آتما نے ستائشی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر اپنے چیلوں سے بولا۔ "اب گدھوں کی طرح کھڑے ہاپتے نہ رہو۔ جاؤ اور سکندر کے لیے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرو۔"

"سکندر...." آتما نے مجھے سینے سے الگ کیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ تم... تم کہاں کھو گئے تھے بیٹا؟

میں اس کے لمبے میں درد محسوس کر کے تڑپ ہی تو اٹھا اور دوبارہ اس کے گلے لگ گیا۔ میرا اور اس کا درد اب ایک ہی جیسا تھا۔ بلکہ میرا دکھ کچھ زیادہ ہی تھا۔ کیونکہ مجھے بیٹے کے علاوہ اپنی بیٹی کی بھی تلاش تھی جبکہ استاد صرف اپنے بو کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ استاد کے لمبے میں اتنی محبت تھی کہ مجھ پر رقت طاری ہو گئی اور میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

"چند سال پہلے میں بھی آیا تھا تو اس اڑے پر بھی آیا تھا۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "آپ یہاں نہیں تھے۔ معلوم ہوا کہ...." میں نے اپنا جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا۔

"ہاں.... میں اپنی منزل کی تلاش میں گیا ہوا تھا۔ منزل نہ ملی تو واپس آ گیا مگر اب میں کہیں بھی نہیں جاتا۔ ہر وقت اڑے پر رہتا ہوں۔ نگاہ دروازے پر جمی رہتی ہے اور دن رات ان کی راہ نکارتا ہوں ایسا لگتا ہے، اب کسی بھی لمحے میری منزل میرے سامنے آ جائے گی۔"

"اٹھارہ سال ہو گئے استاد۔ پھر بھی آپ نے اپنے آپ کو فریب دینا بند نہیں کیا۔ آخر کیوں استاد۔"

"اس لیے کہ میری امیدیں ابھی زندہ ہیں... اور تم جانتے ہو کہ امیدیں زندہ ہوں تو انسان بھی زندہ رہتا ہے۔ آخری امید دم توڑ جائے تو وہ زندگی کی آخری رفق بھی اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔"

"کاش! ان کو واپس لانا میرے بس میں ہوتا۔" میں نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ میرے دل میں ایک ہوک سی اشگی میں آتما کے بیٹے کو کیا واپس لاسکتا تھا، میں تو خود اپنے بچوں کو بھی حاصل کرنے کے قابل نہیں تھا۔

"تمہیں دیکھ کر دل ٹھنڈا ہو گیا۔" آتما نے بڑی محبت سے مجھے اپنے قریب بٹھاتے ہوئے کہا۔ لیکن یہ تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے؟ تمہاری آنکھوں کے نیچے یہ سیاہ دائرے، تمہارے رخساروں پر پھیلی ہوئی یہ زردی.... آخر یہ سب کچھ کیا ہے، سکندر "کیس تم نے بھی تو کوئی روگ نہیں لگا لیا؟"

"روگ تو لگا بیٹھا ہوں، استاد لیکن امید ہے کہ اسے جلد ہی دور بھی کر لوں گا؟"

"منزل سامنے ہو تو اس تک پہنچنے کے سینکڑوں راستے اور بے شمار طریقے اختیار کیے جاسکتے ہیں۔ بد قسمتی تو میری ہے کہ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ میری منزل کسی سمت میں ہے، کہاں ہے؟" وہ ایک سرد آہ بھرتے ہوئے بولا پھر اچانک ہی اس کی نگاہ اپنے چیلوں کی طرف اٹھ گئی "یہ تم لوگ اس طرح منہ پھاڑے ہمیں کیا دیکھ کر رہے ہو۔ یہ سکندر ہے، میرا شاگرد، مینا بیٹا جس کے بارے میں میں اکثر تمہیں بتاتا رہتا ہوں۔"

"استاد ہم سے بہت بھولتی ہو مٹی۔" لالو نے ندامت سے سر جھکا کر کہا "سکندر بھائی سے

اسی لمحے زینے کی طرف کچھ بل چل محسوس ہوئی۔

میں نے چونک کر ادھر دیکھا تو دو جوان لڑکے سیڑھیاں اتر کر یہ خانے میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک کے چہرے کا جغرافیہ بگڑا ہوا تھا۔ تھوکتھی سوچی ہوئی تھی اور قیض کے دامن پر لال لال دھبے پڑے ہوئے تھے۔ دوسرے لڑکے کی حالت بھی خراب تھی لیکن اس کے لباس پر خون کا کوئی دھبہ نہیں تھا۔ ان کے بال بکھرے ہوئے تھے اور کپڑوں کی چھابا دھجیاں لٹک رہی تھیں۔  
”بھجوں کی اولاد“ آتما دھاڑا ”تم دونوں نے یہ کیا علیہ بنا رکھا ہے آپس میں بھڑگئے تھے یا کسی نے دھر لیا تھا۔“

انہوں نے انک انک کر اپنی روداد سنائی دونوں ایک ہی بس میں سوار تھے۔ اتفاق سے دونوں کو موقع نظر آیا اور انہوں نے ایک ساتھ دو جیبوں پر ہاتھ صاف کر دیے اور یہ ان کی بدبختی تھی کہ شکار ابھی بلا ٹکٹ سفر کر رہے تھے۔ انہوں کنڈکٹر کے ہتھکنے پر ٹکٹ لینے کے لیے جیبوں میں ہاتھ ڈالے تو بوئے غائب پا کر شور مچا دیا۔ بس رک گئی اور باری باری سب کی تلاشی لی گئی۔ ان کے پاس سے بوئے برآمد ہو گئے جس کے نتیجے میں تمام مسافروں نے ان کی خاطر تواضع شروع کر دی۔ ”ٹھوکر، گھونسوں، اور تھپڑوں سے ان کا علیہ بگاڑنے کے بعد ایک بوڑھے کی رحم دلی سے ان کی جان بچ گئی تھی ورنہ انہیں پولیس کے حوالے کر دیا جاتا۔

ان لڑکوں کا پیٹ کراور زخمی حالت میں آنا کوئی نئی یا پریشان کن بات نہیں تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر وہ گرفتار ہو جاتے تو آتما چند لمحوں میں انہیں مکھن سے بال کی طرح نکال لاتا۔ استاد اپنے علاقے کے تھانے میں باقاعدگی سے بھستہ دینے کا قائل تھا۔ اور بھستہ بھی وہ دوسرے علاقے کے استادوں سے کہیں زیادہ دیا کرتا تھا۔

میں استاد کے ہاں ڈھائی سال تک زیر تربیت رہا تھا۔ یوں تو مجھے اس لائن کے لیے کئی استادوں کی شاگردی کا اعزاز حاصل تھا لیکن میرے فن کو جلا آتما سے ملی تھی، وہ کسی اور استاد سے مجھے نصیب نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی میں نے روئے زمین پر آتما جیسا کوئی استاد دیکھا تھا۔ آتما کی ایک سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ رحم دل تھا۔ اس کا چوٹ کھایا ہوا دل درد آشنا تھا۔ آتما نے ان دونوں کو مرہم پٹی کرائے بھیج دیا اور خود چرس کی گولی نکال کر تبا کو میں مسئلے لگا۔ وہ نیم وا نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ خانے میں اب ہم دونوں ہی رہ گئے تھے۔  
”ہاں اب بتاؤ کیا پکڑ ہے؟“ آتما نے پوچھا۔

میں سوچ میں پڑ گیا کہ استاد کو حقائق سے آگاہ کروں یا ٹال جاؤں.... پھر میں نے سوچا کہ اسے بے خبر رکھنا نقصان دہ ہو گا۔ کل کلاں صورت حال کھل گئی تو استاد کا اعتماد کھو بیٹھوں گا۔ میں نے آہستہ آہستہ سب کچھ آتما کے گوش گزار کر دیا۔

اس کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں۔ ”تم ان سب کو گولی مار دیتے اور بچوں کو لے کر میرے پاس آ جاتے باقی سب کچھ میں خود ہی سنبھال لیتا۔“ وہ غصے میں بولا۔ وہ اولاد کا دکھ سہمہ رہا

تھا۔ اس لیے میری کمائی نے اسے بہت زیادہ دکھی کر دیا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو.... استاد“ میں نے جواب دیا۔ ”عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے.... لیکن میں نے اپنے سینے پر صبر کی چٹان رکھ لی کیونکہ میری شخصیت کے پاتال میں ایک ایسا جذبہ پرورش پا رہا ہے جس نے مجھے مصلحت سے کام لینے پر مجبور کر دیا۔ میرے لیے ایک چیلنج ہے اس عورت نے ایک مرد کو خریدا تھا.... اب میں ایک عورت کو خریدنا چاہتا ہوں مجھے دولت چاہیے استاد“ دولت.... میں جذباتی ہونے لگا۔

”لے جاؤ.... کتنی رقم چاہیے۔“ استاد نے فراخ دلی سے کہا۔ ”دس ہزار“ میں ہزار تیس ہزار....

”بات ہزاروں کی نہیں ہے استاد۔“

”تو پھر ایک لاکھ لے جاؤ۔“

”بات اس سے بھی زیادہ کی ہے۔“

”اوہ....“ استاد سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور گہری نظروں سے میری طرف دیکھنے لگ۔ ”تو پھر کروڑوں کے چکر میں ہو“ اس نے حیرانی سے پوچھا۔

”ہاں استاد۔ اس سے کم میں بات نہیں بنے گی۔“ میں نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ”اتنی رقم ہم بھٹی کے تمام لوگوں کی جیبیں کاٹ کر بھی حاصل نہیں کر سکتے۔“ استاد سوگوار لہجے میں بولا۔ ”تم جانتے ہو کہ آج کل لوگ دو چار ہزار سے زیادہ جیب میں لے کر نکلتے ہی نہیں۔“

”اور وہ بھی سب کے سب کہاں“ میں نے کہا ”ایسا قیمتی شکار اکا دکا ہی ہوتا ہے۔“  
”تم پھر کیا تم ڈاکے ڈالنا شروع کرنا چاہتے ہو؟“ استاد نے چونک کر دریافت کیا۔  
”نہیں استاد تم زیر زمین دنیا میں ایک جانی پہچانی شخصیت ہو کسی ایسے کام کا سراغ لگاؤ جس میں دولت برستی ہو۔“

”جب پھر دوی کام ہیں جن سے تم اپنی مرضی کے مطابق دولت کما سکتے ہو۔“ استاد سوچ میں پڑ گیا۔

”اسنگنگ اور منشیات۔“

”نشر آور چیزوں کا تو نام مت لو استاد۔“ میں نے کہا۔ ”کل کلاں خدا کے سامنے بھی جانا ہے۔ اپنے ہی جیسے انسانوں کو تباہی کے راستے پر ڈال کر دولت کمانا انسانوں کا کام نہیں ہو سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ منشیات کا دھندا کس قدر گھناؤنا ہے۔ یہ تو پوری ایک نسل تباہ کرنے کا کاروبار ہے۔ مجھ سے یہ دھندہ نہیں ہو گا۔“ میں نے صاف جواب دے دیا۔

”تو پھر اسنگنگ کے میدان میں قسمت آزمائی کرو۔“ استاد نے مشورہ دیا۔  
”اس پر البتہ غور کیا جاسکتا ہے“ میں نے کہا۔ ”ہر حال“ ذہن میں رکھنا، سب بھی دولت



”بہر حال.... استاد نے ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔“ کھن بازی کا وقت ختم۔ اب کام کی بات کرو۔“

”مجھے کسی اور جگہ قیام کرنا پڑے گا۔“ میں نے کہا۔ ”اس کے علاوہ مجھے اپنی شخصیت بھی بدلنا پڑے گی۔“

”جاسوسی ناول کافی پڑھنے لگے ہو۔“ استاد نے کہا۔ ”یا پھر ایسی فلمیں دیکھتے رہے ہو۔“ اس کے ہونٹوں پر شریر سی مسراہٹ آگئی۔ جب تم یہاں تھے تو ایک دو بار ڈرامے وغیرہ میں بھی تو حصہ لیا تھا تم نے... اور نواب جلال اکبر کا کردار تم نے خوب ادا کیا تھا۔

”نواب..... جلال..... اکبر..... میں نے دہرایا اور چنگی بجاٹی۔“ خوب یاد دلایا استاد۔ بڑی مہربانی، تمہاری میں پر جوش انداز میں آتما سے لپٹ گیا اور اسے خوب سمجھنے لگا۔

”ارے تو کیا اب میری ہڈیاں توڑے گا۔“ استاد نے خفگی سے کہا اس کا یہ انداز بہت پرانا تھا اور اس خفگی میں اتنی محبت ہوتی تھی کہ بعض اوقات میرا دل بھر آتا تھا اور آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے تھے اس وقت بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔

میں نے استاد کو چھوڑ دیا اور اپنی آنکھوں کے پھٹکے ہوئے کنارے پونچھنے لگا۔ ”تو اب تم جج نواب جلال اکبر بننا چاہتے ہو۔“ استاد نے گہری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

استاد میرا کندھا تھپ تھپا کر نہ خانے کے زینے کی طرف بڑھ گیا اور میں عقبنی کر کے میں چلا آیا۔ ایک آرام دہ کمرہ تھا اور اس کا دروازہ کچھ اس طرح بنا ہوا تھا کہ نہ خانے کی دیوار میں اس کا سراغ لگانا کسی ناواقف آدمی کے لیے ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ یہ ایک ایسی پناہ گاہ تھی کہ استاد اور اس کے چند قابل اعتماد شاگردوں کے علاوہ کسی کو اس کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔ یہاں قانون کی نظریں بھی نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ استاد عموماً فحریہ کہا کرتا تھا کہ یہ کمرہ صفحہ ہستی پر موجود نہیں ہے اگر کسی کو یقین نہیں تو اسے تلاش کر کے دکھا دے۔ میں اس کمرے میں اطمینان سے رہ سکتا تھا لیکن یہاں ٹھہرنے میں سب سے بڑی قیاحت یہ تھی کہ اس کمرے میں داخل ہونے کے بعد بار بار باہر نہیں نکلا جاسکتا تھا اور اس کا بہت کا خیال رکھنا پڑتا تھا کہ اس وقت نہ خانے میں کوئی موجود تو نہیں اگر کوئی موجود ہو تو خفیہ دروازہ نہیں کھولا جاسکتا تھا۔ اس اعتبار سے یہ کمرہ قانون سے فرار ہونے والوں کے لیے بہترین پناہ گاہ تھا۔ جبکہ مجھے میدان عمل میں اترنا تھا۔

”اس کمرے میں ضرورت کی تقریباً ہر شے موجود تھی اس لیے یہاں محصور ہو کر رہنا کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ ایک دو بار مجھے بعض مجبور یوں کے تحت یہیں پوٹیدہ رہنا پڑا تھا... لیکن یہ بہت پرانی بات ہے، ان دنوں کی بات جب مجھے آتما کی شاگردی میں آئے ابھی دوسرا ہی سال تھا۔

میں نے برف کیس رکھ دیا اور ایک آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کمرے میں میرے بعد کافی

کمانے کا کوئی کام نکلے، مجھے ضرور آگاہ کرنا۔“

”کیا تم نرمیان کو جانتے ہو؟“

”نہیں استاد۔ میرے بعد کی پیداوار معلوم ہوتا ہے۔ کون ہے یہ؟“ میں نے پوچھا۔

”تم اسے زیر زمین دنیا کا گمبھ کہہ سکتے ہو۔“ استاد نے مسکرا کر کہا۔ ”وہ تمہارے لیے کار آمد ثابت ہو سکتا ہے۔“

”کہیں مجھے ہی نہ نکلے۔“

استاد ہنس پڑا ”سکندر کو لکھا آسان نہیں، میں جانتا ہوں، دنیا کا کوئی بھی گمبھ تمہیں ایک منٹ سے زیادہ اپنے پیٹ میں نہیں رکھ سکتا تم اپنی فکرا انگلیوں سے اس کے پیٹ میں نقب لگا کر کل آؤ گے۔“

میں استاد کی بات پر ہنسے بغیر نہ رہ سکا اور پوچھا ”تو استاد اس سے کب ملوا رہے ہو؟“

”جب چاہو۔ ابھی چلیں۔“

”ارے اتنی جلدی نہیں استاد“ میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا ”کل کسی وقت سنی۔“

”اچھا اب تم مجھے کمرے میں چلے جاؤ اور سفر کی ٹکان آمارو۔ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔“ استاد نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا ”اور ہاں، اب تمہارا قیام یہیں رہے گا۔“

”نہیں استاد۔ مجھے کہیں اور رہنا ہو گا۔ اس کے علاوہ ایک غلطی ہو گئی، مجھے تمہارے شاگردوں کے سامنے بے نقاب نہیں ہونا چاہیے تھا۔“

استاد کا موڈ خراب ہو گیا ”اتنے سالوں میں تم نے صرف بدگمان ہونا ہی سیکھا ہے؟“

”یہ بات نہیں استاد“ میں نے کہا۔ ”چلتے وقت شامو نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں سات دن کے اندر اندر ہندوستان سے کہیں اور نہ چلا گیا تو پھر کبھی نہیں جاسکوں گا۔ اس کا صاف مطلب میری موت ہے۔“

”اگر یہ بات تھی تو تمہیں سیدھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔“ استاد سوچ میں ڈوب گیا

”ویسے میرے تمام چیلے وفادار ہیں۔ پیسوں میں ڈنڈی مار جاتے ہیں لیکن اڈے کی آن بان پر حرف نہیں آتے دیتے۔“

”میں جانتا ہوں۔“ میں نے اعتراف کیا ”اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تم ان سب کو اپنے بیٹوں کی طرح چاہتے ہو۔ یہ پیار کو تری ہوئی روحیں ہی تو ہیں تمہاری پدرانہ شفقت میں بھی ایک

سماں سرور اور نشہ ہے، استاد... اور یہ کیفیت آج بھی مجھ پر طاری ہے۔“

”بس بس رہتے دے۔“ استاد نے مجھے آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا۔ ”خوشامد تمہاری زبان

کو زیب نہیں دیتی۔“

”استاد کی تعریف، خوشامد نہیں ہوا کرتی۔“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”میں نے جو

کچھ کہا ہے وہ میرے دل کی آواز ہے۔“

تبدیلیاں کی گئی تھی۔ پہلے یہ آرکٹڈ مشن نہیں تھا جبکہ اس وقت دیوار میں نصب جدید ترین ای سی نظر آ رہا تھا۔ کمرے کی آرائش میں بھی کافی تبدیلیاں کی گئی تھیں۔ میں گری نظروں سے جائزہ لیتا رہا اور پھر میری نگاہ ایک آئینے پر جم گئی اس آئینے میں عکس نہیں بلکہ اس کے پار دیکھا جاسکتا تھا جبکہ دوسری طرف سے کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ یہ آئینہ میں نے پہلی بار دیکھا تھا کیونکہ پہلے جب میں یہاں مقیم رہا تھا تو اس وقت آئینہ یہاں نہیں تھا۔ اس آئینے کی مدد سے یہ خانے کا جائزہ لینا بہت آسان ہو گیا تھا۔

میں آرام کرسی پر نیم دراز ہو گیا اور کمرے میں ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ نہ جانے میں اس کرسی پر کب تک نیم دراز حالت میں ہی سوتا رہا کہ اچانک دروازے کی سرسراہٹ اور قدموں کی دھیمی چاپ سے میری آنکھ کھل گئی۔

آنے والا آتما ہی تھا۔  
”ارے“ تم اب تک اسی طرح بیٹھے ہو۔“ استاد نے برہمی سے کہا۔ ”کپڑے اتار کر بستر پر کیوں نہیں لیٹے۔“  
”یونہی بیٹھے بیٹھے نیند آگئی تھی۔“ میں نے ایک انگوٹھی لیتے ہوئے کہا۔ ”اس مگر مجھ سے ملاقات ہوئی۔“

”اسے فون کر دیا تھا“ استاد نے جواب دیا۔  
”وہ کل دوپہر کا کھانا ہمارے ساتھ ہی کھائے گا۔“  
”گویا وہ مگر مجھ ملاقات کے لیے آئے گا تو بھوکا ہو گا۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”میرے چہرے کی مرمت کے لیے بھی کوئی بندوبست کیا یا نہیں؟“  
”رات کو ایک خاص آدی آئے گا۔“

”استاد....“ میں نے تفکر آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یوں تو میرا تم پر بہت حق ہے لیکن پھر بھی میں زندگی میں تمہارا احسان نہیں بھولوں گا۔“  
”مت بھولنا۔“ استاد نے براہمتے ہوئے کہا۔ ”کون کہہ رہا ہے کہ تم بھول جاؤ گے.... اور بھول بھی جاؤ تو میری بلا سے....“

”بس ناراض ہو گئے۔ برا مان گئے۔“ میں ہنس کر اس سے لپٹا تو وہ فوراً ہی خوش بھی ہو گیا۔ ”تمہاری بچی تو ایک ادا قاتل ہے۔“

”مقتول صاحب! اب؟“ ری سے ہاتھ روم میں چلے جاؤ ورنہ....“ استاد نے اپنا ہاتھ اٹھایا اس نے اٹھیاں پھیلانیں اور پھر باری باری ہر انگلی کو ہتھیلی کی طرف جھکاتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ طاقتور گھونہ بن گیا۔ اس نے نقل کیا کہ استاد اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہناتا، میں نے اس کی کہنی کے نیچے سے غوطہ لگایا اور ہاتھ روم کی طرف باقاعدہ دوڑ لگا دی۔

فصل کے بعد استاد کے پاس بیٹھ گیا۔ اس دوران بڑی خوشبو دار چائے تیار ہو چکی تھی

استاد نے چائے پیالیوں میں انڈیلی اور سگریٹ سلگا کر بولا۔ ”تم سوتے ہی رہے یا اپنے بارے میں کچھ غور بھی کیا ہے؟“

”تمہارے ہوتے ہوئے مجھے غور کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔  
”ہوں.... استاد نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے عجیب سے انداز میں کہا“ تمہارے انداز میں کچھ چالپوسی آگئی ہے، سکندر.... اور یہ کوئی بری بات نہیں آج اسے بھی ایک بہترین ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن اپنا یہ ہتھیار مجھ سے دور ہی رکھو تو بہتر ہو گا۔ کیونکہ میرے کان کسی ایسی آواز کو جذب نہیں کرتے جس میں چالپوسی کی آمیزش ہو۔“  
میں کھیا کر ہنس پڑا۔

چائے کی پیالی سے چسکی لینے کے بعد میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”میں اس آرام کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا استاد۔ اس دوران میں بھیا تک قسم کے خوب تو دیکھتا رہا ہوں سوچا کچھ بھی نہیں۔ حتیٰ کہ میں نے تو ابھی تک وہ بریف کیس بھی کھول کر نہیں دیکھا جو چلتے وقت شامو نے مجھے تھما دیا تھا۔“

استاد نے بریف کیس کی طرف دیکھا پھر ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھایا اور کھولنے کے بعد میز پر رکھ دیا میں نے بریف کیس کو گھما کر اپنی طرف کیا اور دیکھا کہ اس میں چند کپڑے، کافذات اور سب سے اوپر ایک سترے رنگ کا لفافہ رکھا ہوا تھا اس میں ایک صفحے کا کافذ تھا جس پر صرف اتنا تحریر تھا کہ زندگی ایک ایسی نعمت ہے جس کی قدر کی جانی چاہیے۔ انسان زندہ رہے تو وہ بڑے سے بڑا نقصان بھی پورا کر سکتا ہے۔ جبکہ مرنے کے بعد..... آخر میں جملہ ادھر اچھوڑ دیا گیا تھا۔ اس تحریر کے ساتھ ایک لاکھ روپے کا پے آرڈر تھا۔ جو میرے ہی نام کا تھا۔ میں نے پے آرڈر پر اسے بنوانے والے کا نام پڑھا تو اس پر شامو تحریر تھا۔ میں نے پے آرڈر استاد کی طرف بڑھا دیا۔  
”یہ کیا ہے؟“ استاد نے پوچھا ”ایک لاکھ روپے بہت خوب شروعات تو بہت اچھی ہے۔“

”یہ میرے بچوں کی قیمت ہے“ استاد“ میں نے جواب دیا یہ پے آرڈر کہیں محفوظ کرلو“  
استاد میں وقت پڑنے پر تم سے لے لوں گا  
”اس رقم کو استعمال کیوں نہیں کرتے؟“ استاد نے مجھ سے پوچھا۔ واپس کرنا ہے تو بعد میں کر دیتا۔“

”نہیں استاد۔ میں اپنی شخصیت پر اب ایسا ایک بھی دھبہ نہیں لگانا چاہتا جس سے یہ پتہ چلے کہ میں نے مصیبت ہی سہی لیکن اس قیمت کو قبول کر لیا تھا“ جو میرے بچوں کے عوض مجھے دی گئی تھی۔“

”معاملہ جذبات کا ہے۔ اس لیے میں کچھ نہیں کہہ سکتا“ استاد نے ٹھوس لہجے میں کہا۔  
”زیربان کی آمد سے پہلے تم نکل سے مل لو.... وہ تمہاری مرضی کے مطابق تمہاری شخصیت بنا دے

گئے۔" بسل نے کہا اور کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد رخصت ہو گیا۔

رات کا کھانا ہمیں فائو اسٹار میں کھانا تھا۔ استاد نے گھڑی پر وقت دیکھا اور مجھے اٹھنے کا اشارہ کر دیا۔ "چلو..... اب تم نرمیان سے بھی مل لو تمہارے ان چکروں سے فارغ ہو جاؤں تو مجھے اپنے بھی چند ضروری کاموں کی طرف توجہ دینا ہے"

میرا حلیہ کافی حد تک تبدیل ہو گیا تھا لہذا اب مجھے یہ فکر بھی نہیں تھی کہ نرمیان کے سامنے اصلی صورت میں جانا کہیں بعد میں میرے لیے نقصان دہ ثابت نہ ہو۔

یہ خانے سے نکل کر ہم باہر آئے گیرج میں لالو موجود تھا۔ اس نے استاد کی طرف دیکھ کر سلام کرنے کے انداز میں سر ہلایا پھر میری طرف اجنبی نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ مجھے پہچانتے میں ناکام رہا ہے میں دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ کہ استاد کے ہاں کھلم کھلا آکر مجھ سے جو غلطی ہوئی تھی اس کا بہت اچھے انداز میں ازالہ ہو گیا ہے۔

گیرج سے ایک گاڑی لے کر استاد نے مجھے اپنے ساتھ بٹھایا اور ہم فائو اسٹار کی طرف روانہ ہو گئے۔

فائو اسٹار ایک اچھا ہوٹل تھا اس کے ڈائننگ ہال میں قدم رکھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ یہاں شہر کے مشہور لوگوں کی آمدورفت رہتی ہے۔ نرمیان ابھی نہیں پہنچا تھا اس لیے استاد اور میں ایک میز پر بیٹھ گئے۔ استاد نے بوسے ہی پر تکلف کھانے کا آرڈر دے دیا۔

ابھی کھانا میز پر چنا جا رہا تھا کہ ایک نوجوان ڈائننگ ہال میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ایک جوان سالن لڑکی بھی تھی۔ استاد نے ان پر نگاہ پڑتے ہی ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا تو نوجوان لڑکی کے ساتھ سیدھا ہماری میز کی طرف آ گیا۔

استاد نے ہمیں متعارف کرایا۔ لڑکی کا نام ایما تھا اور وہ اینگلو انڈین لڑکی نرمیان کی دوست تھی۔ وہ اسے مختلف کاموں میں استعمال کرتا رہتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ لڑکی بہت گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی اس کی آنکھوں میں میرے لیے ستائش کا تاثر تھا۔ یوں بھی ایک وجہ یہ نوجوان تھا لیکن بسل کے فن کار ہاتھوں نے یہ کشش کئی گنا بڑھا دی تھی۔

کھانے کے دوران ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں

اس عرصے میں ایما کی نظریں بار بار میری طرف اٹھی لیکن میں اس کی طرف سے لاپرواہ رہا۔ نرمیان ایک اچھا آدمی تھا استاد کا اس سے تعلق بہت پرانا تھا۔ اس کے باوجود استاد نے میرے بارے میں اسے صرف اتنا ہی بتایا کہ میں اس کا شاگرد ہوں اور لمبے لمبے ہاتھ مارنا چاہتا ہوں۔ نرمیان نے بہت سی باتیں کیں۔ مجھ سے مختلف نوعیت کے سوالات کیے ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ میں کتنے پانی میں ہوں۔

ڈنر کے بعد کچھ دیر تمباکو نوشی ہوتی رہی پھر استاد نے کافی طلب کر لی۔

"آپ کا قیام کہاں ہے" سکندر صاحب "نرمیان نے دریافت کیا۔

گا۔" بسل بس آنے ہی والا ہو گا۔

ابھی استاد نے بات ختم ہی کی تھی کہ یہ خانے کا دروازہ کھلا۔ استاد نے آئینے کے اس پار دیکھا "بسل آگیا" اس نے کہا اور کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

بسل مسکراتا ہوا کمرے میں آ گیا۔

"استاد نے ہم دونوں کو متعارف کرایا۔"

بسل کا تعلق فلم انڈسٹری سے تھا اور اسے اپنے کام میں خاصی مہارت حاصل تھی.... استاد کے اشارے پر میں نے اسے اپنی نئی شخصیت کا خاکہ بتایا تو وہ سوچ میں ڈوب گیا۔ وہ اپنے ساتھ ایک الہم اور ایک چھوٹا سا بریف کیس لایا تھا۔ اس نے الہم میری طرف بڑھا دیا اور کوئی ایسی تصویر منتخب کرنے کے لیے کہا جو میرے تقاضے سے قریب تر ہو۔

میں الہم کے صفحات الٹ پلٹ کرنے لگا۔

کچھ دیر بعد میں ایک تصویر منتخب کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے وہ تصویر بسل کی طرف بڑھا دی وہ چند لمحوں تک تصویر کا مجھ سے موازنہ کرتا رہا پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وقفے وقفے سے وہ میرے چہرے کی طرف آنکھیں کھول کر دیکھ لیتا پھر انگلیوں کو عجیب سے انداز میں گھما کر اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے خاکے سے موازنہ کرنے لگتا.... کوئی پندرہ بیس منٹ بعد وہ مطمئن ہو گیا۔

دو گھنٹے بعد جب میں نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تو حیران رہ گیا مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے ایک اجنبی چہرہ آئینے کی دوسری طرف سے میری طرف دیکھ رہا ہو۔ استاد نے بھی میری صورت دیکھ کر اطمینان کا اظہار کیا۔

"بسل کے ہاتھ میں جادو ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں... آخر شاگرد کس کا ہے۔" استاد فخریہ لمبے میں بولا۔ "میرے شاگردوں میں یہ سب سے ذہین لڑکا تھا... لیکن اسے جیب تراشی پسند نہیں تھی"

"فن کار بڑا موڈی ہوا کرتا ہے" استاد "میں نے کہا۔ بسل کی انگلیوں نے جو کمال دکھایا ہے۔ جیب تراشی کافی اس کے سامنے کوئی معنی نہیں رکھتا۔

استاد مسکرا کر سرگرمیٹ سلگانے لگا۔

"یہ ایک جدید قسم کا میک اپ ہے سکندر۔" بسل نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "اسے اتارنے یا اسے استعمال کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ اب مجھے شخصیت کی مناسبت سے لباس بھی سوچنا پڑے گا۔ میرا خیال ہے کہ اس مقصد کے لیے تم مجھے ایک دو دنوں کی مہلت ضرور دے دو گے۔"

"ٹھیک ہے میں منتظر رہوں گا۔"

"اس لباس کے بعد تمہاری شخصیت مکمل ہو جائے گی اور تم واقعی کوئی نواب ہی دکھائی دو

چھوٹے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

میں نے ہر بات ذہن سے جھٹک دی اور آنکھیں بند کر لیں۔ صبح مجھے جلدی اٹھنا تھا۔ مجھے کئی کام کرنے تھے اور پھر ہوٹل اپالو میں منتقل ہونا تھا۔ میں نہ جانے کب تک کروٹیں بدلنے کے بعد سو گیا۔ استاد رات کو کس وقت واپس آیا، مجھے اس کی خبر نہ ہوئی۔

ہوٹل اپالو میں قیام کے چند گھنٹے بعد اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ نرمیان یا ایما نے اس دوران میں مجھ سے رابطہ قائم نہ کیا تھا۔ اور اس ایک عرصے میں، میں مرنے کی حد تک بیزار ہو چکا تھا.... لیکن میں نے جیسے ہی دروازہ کھولا، ایما کی صورت نظر آ گئی۔ اس کے ساتھ بوڑھا آدمی اور ایک حسین لڑکی تھی.... سرود.... شہرے بالوں والی.... کوئی انگریز لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ بوڑھا بھی انگریز ہی لگتا تھا۔ لیکن جب ان سے تعارف ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ بھی ایما کی طرح اینگو انڈین ہی ہیں۔

بوڑھا چھوٹے قد کا تھا اور کسی حد تک جھکی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے اپنی بغل میں ایک کتاب دبا رکھی تھی۔ پتلی سی لیکن ساز میں کسی رجسٹر جتنی بڑی کتاب تھی جس پر سرخ چڑے کی جلد تھی۔ بوڑھے کی عمر 53 سال کے لگ بھگ تھی.... وہ ایک ممتاز اسٹاک ہولڈر تھا۔ اور دولت مندی کا اظہار اس کی باتوں سے تو نہیں البتہ اس کی بیٹی کو دیکھ کر ضرور ہوتا تھا۔

ابتدائی چند رسمی جملوں کے بعد میں نے ایما کی طرف دیکھا تاکہ وہ ان لوگوں کی آمد کا مقصد بیان کرے۔ ایما نے بوڑھے سے کہا ”مسٹر ہاروم۔ سکندر صاحب کو بتائیے کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟“ بوڑھے نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا لیکن وہ خاموش بیٹھی رہی۔ بوڑھے کے انداز میں ہچکچاہٹ تھی جیسے وہ سوچ رہا ہو کہ مدعا بیان کرے یا نہ کرے.... پھر اس نے ایما کی طرف دیکھا۔ جس نے اثبات میں سر ہلا دیا کہ وہ مجھ سے کھل کر بات کر سکتا ہے۔ بوڑھے نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور پھر بغل میں دبی ہوئی کتاب نکال کر اسے کھولا، اس میں سے کسی رسالے کا ایک صفحہ نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔

”پہلے یہ مضمون پڑھ لو، اس کے بعد مزید بات چیت ہو گئی۔“ بوڑھے نے کہا۔

میں نے وہ صفحہ لے لیا اور اسے تیزی سے پڑھ ڈالا۔ یہ نوادرات کے کسی پرانے میگزین سے چھڑا ہوا ایک صفحہ تھا جس میں بعض تاریخی مجسموں کے بارے میں حالات تحریر تھے۔ خاص طور سے پندرہویں صدی کی ایک یادگار کا احوال درج تھا۔ اس یادگار کو ”سگواران“ کا عنوان دیا گیا تھا اور یہ یادگار 82 چھوٹے چھوٹے مجسموں پر مشتمل تھی۔ تمام مجسمے، ساز میں سولہ انچ بلند تھے اور ان میں سے کوئی بھی ایک دوسرے سے مماثل نہیں تھا۔ یہ پادریوں، راہبوں اور گرجے یا مندروں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے مجسمے تھے اور ان سب کو ماتم زدہ حالت میں پیش کیا گیا تھا۔ غالباً اسی لیے یہ مجسمے سگواران کہلاتے تھے۔

ان مجسموں کو فرانس کے چند مقبروں میں رکھنے کے لیے بنایا گیا تھا اور ان مجسموں کے

”فی الحال میرے ساتھ ہے“ استاد نے جواب دیا۔ ”لیکن کل پرسوں سے کسی اور جگہ منتقل ہو جائے گا۔“

”کسی ہوٹل میں....“ میں نے کہا۔

”میرا خیال ہے، آپ اپالو ہوٹل میں کمرہ لے لیں۔ نرمیان نے مشورہ دیا ”وہاں آپ سے رابطہ قائم کرنے میں آسانی رہے گی۔ آج کل ایک بوڑھا میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہوا ہے میں اس سے بات کروں گا.... لیکن شاید یہ کام آپ کو پسند نہ آئے۔“

”کیا کام ہے“ میں نے دریافت کیا۔

”کچھ نوادرات کا چکر ہے۔“

”نوادرات....“ میں نے دہرایا۔ ”کام کا آغاز کرنے کے لیے برا نہیں۔ بات کرلو۔“

”اگر اس سے بات ہو گئی تو کل ایما سے آپ کے پاس لے آئے گی۔ شام سات بجے ٹھیک رہے گا؟ آپ اس وقت تک اپالو میں منتقل ہو جائیں گے۔“

”ہاں کافی وقت ہے۔“

”کس نام سے قیام کریں گے۔“

”سکندر....“ میں نے جواب دیا۔

”کمرے کا نمبر تو استقبالیہ سے معلوم ہو جائے گا۔ نرمیان نے کہا اور استاد کی طرف متوجہ ہو گیا۔“

”دونوں دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے پھر استاد کھڑا ہوا بل استاد نے ہی ادا کیا۔“ واپس گھیراج آتے ہوئے استاد بہت خوش تھا۔ جیسے وہ اپنے کندھوں سے یہ فرض کا بوجھ اتار کر پرسکون ہو گیا ہو۔

استاد کے ہاں واپس آنے کے بعد میں ان کاغذات کی طرف متوجہ ہو گیا جو شامو کے دیئے ہوئے بریف کیس سے برآمد ہوئے تھے۔ یہ ایک طرح کا معاہدہ تھا.... جس کی رو سے میں بنگلہ دیش کے ایک ہوٹل اور ایک بنگلے کا مالک بن سکتا تھا.... لیکن اس کی شرط یہ تھی کہ میں ممتاز بیگم کے آڑے نہ آؤں۔ اس معاہدے کی ہر سال تجدید ہونا تھی۔ گویا میں جب بھی ممتاز بیگم کے آڑے آنے کی کوشش کروں گا، ہوٹل اور وہ بنگلہ اس سال کے آخر میں میرے قبضے سے نکل جائے گا۔

میں نے وہ کاغذات استاد کے حوالے کر دیے تاکہ انہیں بھی اس ایک لاکھ کے پے آرڈر کے ساتھ محفوظ کر لیا جائے جو میں پہلے اس کے حوالے کر چکا تھا۔ استاد اپنے کسی کام سے چلا گیا اور میں لیٹ گیا بار بار میرے ذہن میں یہ بات گھوم رہی تھی کہ جیلہ نے مجھے راستے سے کیوں نہیں ہٹا دیا؟ اس نے مجھے ایک لاکھ روپے، ہوٹل اور بنگلے کے ذریعے خریدنے کی کوشش کیوں کی، اس کا صرف ایک ہی مطلب لگتا تھا کہ وہ مجھے مردہ نہیں دیکھنا چاہتی تھی لیکن کیوں؟

ایک بہت بڑا سوالیہ نشان میرے ذہن میں نمودار ہوا اور وہیں نقش ہو کر رہ گیا۔



کے بعد بوڑھے ہاروم کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”مسٹر ہاروم! میں بے داغ کام کرنے کا عادی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ایما نے آپ کو میرے بارے میں بہت کچھ بتا دیا ہو گا۔ میں سودے بازی کو پسند نہیں کرتا۔ اپنی شرائط پر کام کرتا ہوں اور نتائج اپنے منکوں کی مرضی کے مطابق دیتا ہوں“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا ”جلد بازی کی ضرورت نہیں۔ آپ اطمینان سے سوچ کر مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کر سکتے ہیں۔“

”لیکن پانچ لاکھ....“

میں رخ پھیر کر سگریٹ سلگانے لگا۔

بوڑھے نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا لیکن لڑکی نے بھی اس کی کوئی مدد نہ کی اور خاموشی ہی رہی۔ بوڑھے نے ہتھیار ڈال دیے۔ ”ٹھیک ہے“ وہ بے بسی سے بولا۔

”میں آدمی رقم ایڈونس لیتا ہوں۔“

”ڈھلتی لاکھ تمہیں کل مل جائیں گے۔“

”شکریہ... میں نے کہا“ اب میں آپ سے چند باتیں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

بوڑھا ہاروم میری طرف متوجہ ہو گیا۔

میں نے اس سے جوزف کی قیام گاہ کے سلسلے میں کئی سوالات کے مکان کا اندرونی نقش، ٹیکنوں کی عادات و اطوار، ملازمین کی تعداد اور وہ کمرہ جہاں مطلوبہ مجسمہ موجود تھا۔ اس کے بارے میں سب کچھ تفصیل سے دریافت کیا لیکن مجھے ہاروم سے کوئی مفید اور کارآمد بات معلوم نہ ہو سکی۔ اس کا مشاہدہ بہت کمزور معلوم ہوتا تھا۔

بوڑھا اور اس کی بیٹی رخصت ہو گئی لیکن ایما ان کے ساتھ نہیں گئی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بھی سوالیہ نگاہوں سے ہی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ ”میرا خیال ہے، اب تمہیں بھی رخصت ہو جانا چاہیے۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا میں جانتی ہوں وہ تملاکر بولی ”کچھ دیر بیٹھ کر تم سے باتیں کروں گی۔ تمہیں کاٹ نہیں لوں گی۔“

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ اب تک تو میں اس میدان میں دلوالیہ ہی ہوتا چلا آیا ہوں۔ ہر حال، میں اسے زیادہ لفٹ نہیں دینا چاہتا تھا تاکہ وہ زیادہ آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرے۔ اس کی آنکھیں بہت بولتی تھیں اور جو کچھ وہ کہہ رہی تھیں۔ بہت سنی خیز تھا۔

”چرے سے تو تم ایسے معلوم نہیں ہوتے“

”کیسے؟“

”عورتوں سے بھاگنے والے۔“

”حال ہی میں بھاگنا شروع کیا ہے“

”کوئی حادثہ؟“

”ہاں.... سنگین حادثہ.... جس میں مجھے خاصی چوٹیں آئی ہیں اور میں زخموں کے مندل

زریعے تمام ممکنہ المیہ انداز اور حرکات سکنات کی عکاسی کی گئی تھی تاریخی نوادرات کی حیثیت سے ان مجسموں کو دنیا میں بیش قیمت سمجھا جاتا تھا۔ اور ان کی اہمیت اس وقت اور بھی بڑھ گئی جب انقلاب فرانس کے بعد ان کو مقبروں کے ان طاقوں میں سے چرایا گیا جہاں انہیں بطور نمائش سجایا گیا تھا۔ تاریخی اہمیت کی بنا پر حکومت فرانس نے بڑی کوششوں سے ان مجسموں کو دوبار حاصل کیا لیکن تین مجسمے پھر بھی غائب ہی رہے۔ میں نے مضمون پڑھ کر بوڑھے کی طرف دیکھا۔

”معلوم ہوتا ہے کہ قرون وسطی کے نوادرات آپ کی کمزوری ہیں۔“ میں نے کہا ”کیا آپ فرانس کے مقبروں میں موجود ان 82 مجسموں کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ جنہیں فرانس کی حکومت نے دوبارہ حاصل کر لیا تھا۔“

”اوہ، مائی گاڈ“ بوڑھے کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ ”ان مجسموں کا تذکرہ اتنے سرسری انداز میں مت کرو۔ تم ان کی مالیت کا بھی اندازہ نہیں لگا سکتے۔“

میں اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

ہاروم نے مجھے بتایا کہ اسے ان تین گم شدہ مجسموں کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے کہ وہ کہاں ہیں.... اور وہ انہی تین مجسموں کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔

کچھ عرصہ قبل ہاروم کی ملاقات ایک شخص سے ہوئی جو امریکی سفارت خانے کا عہدیدار تھا اور ان دنوں بمبئی میں مقیم تھا۔ باتوں باتوں میں ہاروم پر انکشاف ہوا کہ اس امریکن شخص جوزف کو بھی نوادرات جمع کرنے کا شوق ہے اور اس کے پاس بھی چند مجسمے ہیں۔ جوزف کو جب یہ معلوم ہوا کہ ہاروم کو بھی نوادرات سے دلچسپی ہے تو اس نے اسے اپنے ہاں مدعو کر لیا اور اپنا ذخیرہ دکھایا۔ اس ذخیرے میں سنگ سفید کا ایک چھوٹا سا انسانی مجسمہ دیکھ کر ہاروم پر حیرتوں کے پھاڑ ٹوٹ پڑے کیونکہ وہ گم شدہ سوگواران میں سے ایک تھا۔ باتوں باتوں میں ہاروم کو یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ جوزف اس مجسمے کی حقیقت سے بے خبر ہے۔ اس نے جوزف سے معلوم کر لیا کہ سنگ سفید کا یہ مجسمہ اس نے کہاں سے خریدا تھا۔ پھر ہاروم نے ذاتی طور پر تحقیقات کیں تو اسے اس تاریخ کا علم ہوا جو انقلاب فرانس کے لوٹ مار سے لے کر جوزف کی خریداری کے عرصے پر محیط تھی۔ یہ تاریخ بڑی دلچسپ ہے۔ اس دوران میں اس مجسمے نے بہت طویل سفر کیا تھا۔ عجیب اور انقلابی عوامل سے گزرا تھا۔ اس عرصے میں یہ مجسمہ تین بار چرایا جا چکا تھا۔ اور بوڑھا ہاروم چاہتا تھا کہ میں چوتھی بار یہ مجسمہ اس کے لیے حاصل کر لوں۔

میں سوچ میں پڑ گیا کام دلچسپ تھا اور اس میں خاصی آمدنی کی توقع تھی۔ میں نے پانچ لاکھ روپے زمین میں رکھتے ہوئے بوڑھے ہاروم سے بات چیت کا آغاز کر دیا۔

”نہیں.... یہ بہت زیادہ ہیں۔“ ہاروم نے احتجاج کے انداز میں ہاتھ لہرایا۔

مجھے صحیح معنوں میں اندازہ نہیں تھا اس لیے میں نے ایما کی طرف دیکھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا اور خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی میں چند لمحوں تک اس کی طرف دیکھنے

بوڑھے ہاروم سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں ہم نے اپنا منصوبہ ترتیب دیا۔ جوزف کے ہاں پانچ ملازمین تھے۔ جن میں سے صرف ایک ہی رات کو وہاں رکنا تھا۔ یہ ایک بٹر تھا لیکن اپنے ذیل رول سے باڈی گارڈ لگتا تھا۔ اس کا کمرہ دوسری منزل پر سامنے کی جانب دوائیں کوٹے پر تھا جبکہ جوزف عقبی حصے کے کسی کمرے میں رہتا تھا۔

جوزف کی قیام گاہ اطراف کے مکانوں سے الگ نہیں تھی۔ علاوہ ازیں جوزف کا تعلق چونکہ امریکی سفارت خانے سے تھا۔ اس لیے یہ عمارت غیر معمولی توجہ کی حامل تھی اور پولیس گاڑیاں غیر متوقع وقتوں سے ادھر کا رخ کرتی رہتی تھیں.... یہ پیڑوں لگ دن کے علاوہ رات کو بھی جاری تھی۔ ممکن تھا کہ یہ مکان کسی اور سرکاری ایجنسی کی نظروں میں بھی رہتا ہو۔ اس اعتبار سے جوزف کے ہاں سے اس سوگوار مجھے کو آڑا نا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ استاد نے جب مجھے ڈاکہ زنی کا مشورہ دیا تھا تو میں نے انکار کر دیا تھا۔ اور اس وقت میں نے جو کام ہاتھ میں لیا تھا، وہ ایک چوری کا دھندہ تھا.... لیکن ڈاکہ زنی اور چوری کے اس معاملے میں بھی ویسا ہی نازک مافن کارانہ فرق تھا جیسا کہ پاکٹ مارنے اور جیب تراشنے میں ہے.... ڈاکہ زنی ایک جارحانہ فعل ہے۔ جس میں طاقت اور اسلحہ کے زور پر دوسروں کو بے بس کر کے لوٹا جاتا ہے جبکہ اس معاملے میں بڑی ذہانت سے منصوبہ بندی کی ضرورت تھی خطرہ تو دونوں ہی میں برابر تھا لیکن مجھے اس واردات میں لطف آنے لگا تھا۔

عمارت کا جائزہ مکمل ہونے کے بعد زیمین سے مشورہ کیا کہ آئندہ اقدام کے لیے کیا صورت اختیار کی جائے؟ ہم دیر تک غور کرتے رہے اور اس سلسلے میں ہمارے درمیان خاصی بحث ہوئی پھر ہم اس نتیجے پر پہنچ گئے۔ کہ وہی پرانی لیکن آزمودہ ترکیب سے کام لینا چاہیے۔ یعنی پہلے اس گھر کی کسی ملازمہ سے تعلق استوار کیا جائے اور اسے اعتماد میں لے کر چابیوں کے نقش حاصل کر لیے جائیں۔ نئی چابیاں بنوانے کے بعد زیادہ رات گئے عمل کرنے کی بجائے رات کے ابتدائی حصے میں سیدھے بے دھڑک عمارت میں داخل ہو جائیں۔

نگرانی کے دوران جو ملازمین ہماری نظروں میں آئے تھے، ان میں ایک جواں سال کرسچین لڑکی کلارا بھی تھی۔ زیمین نے اسے پہلی ہی نگاہ میں پسند کر لیا تھا۔ اس لیے میں نے اجازت دے دی کہ وہ اس سے تعلق استوار کر کے چابیوں کے نقش حاصل کر لے۔

زیمین ایک پُرکشش نوجوان تھا اس لیے مجھے توقع تھی کہ وہ اس معاملے میں ناکام نہیں رہے۔ گا۔ یہ ملازمہ پیر اور جمعات کو شام کے بعد زیادہ تر وقت رنڈ ہول کے قریب واقع ایک بار میں گزارتی تھی۔ وہیں زیمین اور کلارا کی پہلی ملاقات ہوئی اور زیمین نے کچھ ایسا جادو چلایا کہ اگلی ہی شب کلارا نے اسے اپنے اپارٹمنٹ پر مدعو کر لیا۔ زیمین نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ چابیوں کے نشان حاصل کر کے گیارہ بجے تک میرے ہول میں پہنچ جائے گا۔

میں استاد کے ہاں چلا گیا اور دس بجے واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ ایک گھنٹہ گزر گیا۔

ہونے کا انتظار کر رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔  
"بعض زخم محض انتظار کرنے سے نہیں بھرتے۔" وہ مسکرا کر بولی "ان پر مرہم رکھنا پڑتا ہے۔"

"آؤ مارا دیکھنا پڑے گا۔" میں نے کہا "کیا تم زیمین سے منسوب ہو؟"

"ہم صرف دوست ہیں۔ اچھے دوست۔"

"میں بھی تمہارا دشمن نہیں ہوں۔"

"تو پھر کیا دوست ہو؟"

"اگر تم مجھے اس قابل سمجھو تو...."

"قابل تو تم بہت ہو۔" وہ تعریفی انداز میں مسکرا کر بولی۔ "آتما گے شاگرد زیادہ ترجیب

تراش ہیں.... تم پہلے شاگرد ہو، جو جیب تراشی کے علاوہ بھی بہت کچھ معلوم ہوتے ہو۔ بوڑھے ہاروم جیسے شخص کو پانچ لاکھ ادا کرنے پر آمادہ کرنا بس تمہارا ہی کام ہو سکتا تھا۔ زیمین ہوتا تو شاید یہ ایک لاکھ کے اندر اندر ہی بات پکی کر لیتا۔"

"زیمین کیوں نہیں آیا۔" وہ ذرا دور ہی رہنا چاہتا ہے تاکہ اگر تمہیں اس کو

استعمال کرنے کی ضرورت پیش آئے تو وہ تمہارے لیے کار آمد ثابت ہو سکے۔

وہ صبح تک میرے ساتھ ہی رہی اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ مجھے ایسی رفاقت کی شدید ضرورت تھی جس سے میرے زخمی دل کو کچھ سکون میسر آتا.... اور وہ بہت ہی اچھی رفیق ثابت ہوئی۔

اگلے روز ہاروم نے ایڈولف ادا ہوئی کردی اور میں نے زیمین کے ساتھ مل کر کام کا آغاز کر دیا۔

جوزف کا مکان چرچ گیٹ اسٹریٹ پر واقع تھا۔ یہ بڑے بڑے ہولوں اور ڈیپارٹمنٹل اسٹورز کا علاقہ تھا اور اس علاقے کی سڑکیں راتوں کو یوں روشن ہوتی تھیں کہ سوئی بھی گر جائے تو آسانی سے نظر آجائے۔ تاہم جوزف کا گھر سڑک سے کچھ ہٹ کر واقع تھا اور اس کے گرد پانچ فٹ اونچی باڑ لگی ہوئی تھی۔ عقبی حصے میں گیراج تھا جس میں دو گاڑیاں کھڑی کرنے کی گنجائش تھی۔ مین روڈ سے بائیں جانب گھوم کر جو سڑک جاتی تھی، اس سے ایک سنگ راستہ اس دو منزلہ عمارت کی طرف جاتا تھا اور باڑ سے گزر سے کمرنگا ہوں سے اوچھل ہو جاتا تھا۔ کچھ آگے جا کر اس پتھر لے راستے سے ایک شاخ نکل کر بائیں جانب مرکزی دروازے پر ختم ہوتی تھی جبکہ باقی راستہ سیدھا عقب میں گیراج تک چلا گیا تھا۔

میں اور زیمین تین دن اور تین راتوں تک اس عمارت کی نگرانی کرتے رہے۔ ہم دو دو گھنٹے سے ڈیوٹی بدل لیا کرتے تھے اس طرح تو ایک تھکن سے نجات مل جاتی تھی دوسرے ایک ہی شخص کا بہت دیر تک کسی جگہ دکھائی دینا بعض اوقات اسے مشکوک بھی بنا دیتا ہے۔ اس نگرانی اور

اس سے پہلے کہ میں سنبھلا اس بعد معاش نے مجھے آزاد کر دیا۔ پھر وہ سنبھل کر دروازے کی طرف تیزی سے دوڑتے ہوئے اپنے ساتھی سے بولا۔ ”شامی! بھاگ چلو... اب مشکل ہے اسے ختم کرنا۔“ پھر وہ دونوں دروازہ کھول کر کمرے سے نکل گئے۔ مجھے فرش سے اٹھ کر کھڑے ہونے میں چند لمحے لگ گئے تھے۔ اس مہلت سے دونوں نے فائدہ اٹھایا تھا۔ میں نے ان کا تعاقب کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ اس سے کچھ حاصل بھی نہیں تھا۔ اور پھر یہ بات مجھ سے پوشیدہ نہیں رہی تھی کہ دشمن کون تھا اور کیوں آیا تھا۔

شامی میرے تعاقب میں تھا اور اس نے اپنے آدمی بھی لگا رکھے تھے۔ اگر میں جاگ نہیں رہا ہوتا تو وہ مجھے قتل کر کے چلا جاتا۔ مگر اسے ناکامی ہوئی تھی وہ یہ بھول گیا تھا کہ مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہوتا ہے۔

میں نے کمرے میں روشنی کی۔ چند لمحوں کی تلاش کے بعد مجھے ریوالتور پٹنگ کے نیچے ایک کونے میں پڑا نظر آگیا۔ میں نے اسے اٹھایا۔ یہ ایک امریکی ساخت کا ریوالتور تھا جس کی ٹال پر سائیکلر بھی نصب تھا۔ میں نے اسے اپنے سوٹ کیس میں رکھ دیا۔ پھر ہوٹل کی انتظامیہ کو اطلاع دی کہ میرے کمرے میں ایک چور کھڑکی کے راستے چوری کی نیت سے داخل ہوا تھا۔ وہ پولیس کو رپورٹ کرنا چاہتے تھے۔ میں نے انہیں منع کر دیا کیوں کہ پولیس سے جتنا دور رہا جائے اتنا ہی اچھا تھا۔ مجھے ہوٹل والوں نے دوسرا کمرہ دے دیا۔

صبح زیمان ہوٹل آیا۔ وہ مجھے دوسرے کمرے میں دیکھ کر حیران ہوا۔ میں نے اسے رات کا واقعہ مختصر طور پر سنایا۔ پھر میں نے اس سے پوچھا۔ ”تمہاری کیا رپورٹ ہے...؟ کلارا کیا کام کرنے کے لیے تیار ہو گئی؟“

”وہ ڈرتی ہے کیوں کہ اس کے نزدیک یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے۔“ زیمان نے جواب دیا۔

”رات تم پہنچے کیوں نہیں...؟“ میں نے دریافت کیا۔ ”تم نے ٹیلی فون بھی کر کے مجھے نہیں بتایا کہ میں نہیں آسکتا ہوں۔“

”کلارا کے اپارٹمنٹ پر پہنچنے کے دو گھنٹے کے بعد مجھے اطلاع ملی تھی کہ پولیس نے میرے دو آدمیوں کو شک کی بنیاد پر گرفتار کر لیا ہے۔ پھر مجھے کی رہائی کے لیے جانا پڑا۔ میں کلارا سے اس موضوع پر بات نہیں کر سکا۔ نہ وہاں رک سکا۔ دل کی حسرتیں دل میں رہ گئیں۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔

”آج کی رات کا کیا پروگرام ہے؟“ میں نے دریافت کیا۔

”میں آج شام تھیں کلارا سے ملائے دیتا ہوں۔ تم کلارا کو کسی طرح شیٹے میں اتار لو...“

”میں کیوں...؟ کلارا تمہاری دوست ہے۔“

طے شدہ وقت گزر گیا لیکن زیمان نہیں آیا۔ مجھے بڑی تشویش ہوئی کیونکہ زیمان وعدے کا بہت پکا تھا۔ اگر اسے نہ آتا ہوتا تو وہ گیارہ بجے فون کر کے مجھے اس کی اطلاع ضرور دے دیتا۔ جب ساڑھے گیارہ اور پھر رات کے بارہ بج گئے۔ تو میں نے سوچا کہ اب اس کا انتظار کرنا فضول ہے۔ یقیناً وہ چابیوں کے نشان حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔

یہ نوعیت کے اعتبار سے میری زندگی کی پہلی واردات تھی اس لیے پروگرام میں التوا میرے لیے بے حد تکلیف وہ ثابت ہو رہا تھا۔ میں نے روشنی بجھائی اور سونے کے ارادے سے لیٹ گیا لیکن نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں کروٹیں بدلتا رہا۔ کسی کدوٹ بھی چھین نہیں آ رہا تھا... میرے ذہن میں بے شمار اندیشے مختلف شکلیں اختیار کر کے مجھے اور زیادہ پریشان کر رہے تھے۔ لاکھوں روپے کا معاملہ تھا زیمان کی نیت بھی خراب ہو سکتی تھی... میں اس پہلو پر غور نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ میرے اور زیمان کے درمیان آتما کی شخصیت بطور ضمانت موجود تھی۔ لیکن اس کے باوجود میں دیر تک اس خیال کو ذہن سے جھٹکنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

اندھیرے میں لیٹے لیٹے مجھے دو گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا۔ نیند اب بھی مجھ سے روٹھی ہوئی تھی۔ اچانک میں ایک آہٹ سن کر چونک اٹھا۔ میں نے اندھیرے میں آنکھیں کھلیں پھاڑ پھاڑ کر اس آہٹ کا سراغ لگانا چاہا لیکن ناکام رہا۔ چند لمحوں بعد آہٹ دوبارہ ہوئی اس بار آواز ایسی تھی جیسے کسی نہ کسی کوئی تیز دھارے سے کسی ٹھوس چیز پر لکیر کھینچ دی ہو۔ پھر کچھ ٹوٹنے کی آواز آئی۔ میں نے سانس روک لی۔

اس بار آواز واضح تھی اور میں نے اسے کھڑکی کی طرف سے سنا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی کھڑکی کا شیشہ کاٹ کر کھڑکی کھولنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کھڑکی کا پردہ درمیان میں حائل تھا۔ اس لیے وہ مجھے نظر نہ آ سکا۔ بہر حال، کھڑکی کھولنے کے بعد وہ کسی بھی لمحے میرے سامنے آنے والا تھا۔ اور اب میں اس کا شہر تھا۔

میں تاریکی میں دیوار سے چپکا ہوا تھا۔ اس کے استقبال کے لیے تیار تھا۔ وہ جیسے ہی کھڑکی سے اترا۔ سب سے پہلے پردے کی اوٹ سے اس کے ریوالتور پر ہاتھ ڈال دیا اور ساتھ ہی میرا گھونہ پوری قوت سے اس کے جڑے پر پڑا۔ وہ کراہتا ہوا فرش پر گر گیا۔ ریوالتور بھی ایک جانب گر کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کا گریبان پکڑنے کی کوشش کی تو اچانک ہی میرے حلق سے ایک بے ساختہ کراہ نکل گئی۔ عقب سے کسی نے مجھ پر جھٹ لگا دی تھی او وہ کسی بندر کی طرح میری پشت پر سوار ہو گیا تھا۔ میں نے فوراً ہی خود کو فرش پر گرا دیا۔ اور اندھیرے کمرے میں لڑھکتیاں کھاتا چلا گیا.....



Scanned By:

Azam & Ali

”اس لیے کہ آج رات میں لالچ سے اپنے آدمیوں کے ساتھ مال لے کر دینی جا رہا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”یہ پروگرام اچانک اور غیر متوقع بن گیا ہے۔ میں اسے کسی قیمت پر ملتوی نہیں کر سکتا ہوں۔ مجھے توقع سے کہیں زیادہ فائدہ ہو رہا ہے۔ کلارا ایک ہی ملاقات میں تمہاری دوست بن جائے گی۔ اسے تو کوئی سناٹھی چاہیے اس کی تنہائی دور کرنے کے لیے... وہ راتیں اکیلی اپنے اپارٹمنٹ میں گزارتی ہے۔ ہر شخص اس سے مل کر خوش ہوتا ہے۔“

شام کے وقت زریمان مجھے کلارا سے ملانے کے لیے ایک ایسے ہوٹل میں لے پہنچا جو شر سے بہت دور تھا۔ وہاں صرف ایسے لوگ آتے تھے جو شور شرابا پسند نہیں کرتے ہیں۔ پرسکون ماحول چاہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایسے جو بے بھی آتے تھے جو محبت کے بندھن میں جکڑے ہوتے تھے۔ یہاں بیٹھ کر وہ محبت بھری باتیں کرتے تھے۔ یہاں ان کی دل بھٹی کا سامان بھی تھا۔ کمرے بھی تھے بلکہ وہ تنہائی میں آزادانہ مل سکیں اور کوئی ان کی تنہائی میں خلل نہ ہو۔ ہر قسم کی شراب بھی میا کی جاتی تھی۔ میں نے یہاں ہر عمر کے مرد اور عورتوں کو دیکھا تھا۔ ان میں شادی شدہ عورتیں بھی تھیں۔ یہ مرد اور عورتیں اپنے ناجائز تعلقات استوار کرنے آتے تھے اور کمروں میں چلے جاتے تھے تاکہ ان پر کسی جاننے والے کی نگاہ نہ پڑ سکے۔

یہ کلارا سے ملنے کے لیے بہت ہی مناسب اور موزوں جگہ تھی۔ اس کے علاوہ میں شادی کی نظروں میں آنا نہیں چاہتا تھا۔ میں اب اس سے بہت محتاط اور ہوشیار ہو گیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرے کسی کام میں رخنہ ڈالے۔ وہ یہاں میرا بال بیکا نہیں کر سکتا تھا۔ یہ نکتہ نہیں تھا۔ بسی تھا۔ مگر دشمن سے قافل رہنا اور اسے کمزور سمجھنا بے وقوفی تھی۔

ہم دونوں مقررہ وقت سے دس منٹ پہلے ہی اس ہوٹل میں پہنچ گئے تھے۔ وہ ٹھیک وقت پر ہوٹل کے وسیع و عریض ہال میں داخل ہوئی میں نے اسے چونک کر دیکھا اس کے کپڑے ہی ایسے تھے۔ ایک ٹی شرٹ جس پر دل کے مقام پر دل بنا ہوا تھا۔ جینز بھی بہت چست اور نیک تھی۔ اس نے میرا دور ان خون تیز کر دیا تھا۔

وہ عورت کیا تھی۔ قیامت تھی۔ اس کا رنگ ایسی کافی کی طرح تھا جس میں کریم ملا دی گئی ہو۔ اس کے چست لباس نے اسے بغیر نام کی تلواری کی طرح کر دیا تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسا متناسب جسم رکھنے والی بہت کم عورتیں دیکھی تھیں۔ اس کے خدو خال بہت غضب کے تھے۔ بڑی بڑی آنکھیں سیاہ اور زندگی کی بھرپور حرارت سے چمکتی ہوئی۔ بھرے بھرے گداز خوب صورت ہونٹ جو بہت سے ان کے ہوئے دعوے کرتے ہوئے۔

کلارا کو دیکھ کر میرے جذبات میں ہیجان پیدا ہو گیا۔ اب مجھے اس سے سابقہ پڑنے والا تھا۔ کلارا ان لڑکیوں میں سے تھی جو بیکس کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہیں اور ان کا کوئی معیار خلاق نہیں ہوتا ہے۔ انہیں جب بھی فکشی محسوس ہوتی ہے وہ کہیں نہ کہیں اپنی پیاس بجھا لیتی ہیں۔

وہ میز پر آئی تو اس کی حشر سامانیاں اور واضح ہو گئیں۔ اس کا سراپا میری نظروں میں جذب ہونے لگا۔ اس کا پر شباب خوب صورت جسم کسی آتش فشاں کی طرح دھک رہا تھا۔ میرے جذبات کو ابھارنے لگا۔ یہ ایک ایسی لڑکی تھی جو وقت سے پہلے حسین ہو چکی تھی۔ اس کے ساتھ وقت تو گزارا جا سکتا تھا۔ زندگی نہیں... اور پھر عورت صرف جسم ہی نہیں ہوتی ہے۔ اس کے جسم کے خزانے زندگی میں کام نہیں آتے ہیں۔ اور پھر ایسی عورت ساری زندگی ایک مرد کے ساتھ چل نہیں پاتی ہے۔

تفاریق رسم ہونے کے بعد پینے پلانے کا دور چلا۔ اس مجھے کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ زریمان نے اسے بتایا کہ وہ آج رات ایک ضروری کام سے جا رہا ہے۔ سکندر اس کے فلیٹ پر رات کو آکر کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہے۔ کلارا خوش اور رضامند ہو گئی۔ اس نے مجھ سے مل کر بڑی گرم جوشی کا اظہار کیا تھا۔ ہم کوئی ایک گھنٹے تک بیٹھے رہے تھے۔ اس دوران وہ مجھے خود پیردگی کی نظروں سے دیکھتی اور میرے دل کو گرماتی رہی تھی۔

رات ٹھیک گیارہ بجے میں اس کے اپارٹمنٹ پر پہنچا تو وہ بڑی بے تابی سے میری منتظر تھی۔ اس نے شب خواہی کا جو لباس پہن رکھا تھا وہ بہت ہی نامناسب تھا۔ اس نے بڑی محبت اور گرم جوشی سے میرا استقبال کیا جس کی مجھے توقع نہیں تھی۔ مجھے اپنی منزل آسان دکھائی دینے لگی۔ ایسی لڑکیاں، عورتیں ہر کام کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہیں۔ کوئی نصف گھنٹے کے بعد میں نے اصل موضوع کو چھیڑا۔ ”زریمان تمہیں بتا چکا ہو گا کہ میں اس مجھے کو حاصل کرنا چاہتا ہوں؟“

”میں اسے بتا چکی ہوں کہ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ اس کا خیال دل سے نکال دیں۔“

”دنیا میں کوئی کام مشکل نہیں ہوتا ہے۔ شرط حوصلے کی ہے۔ عزم کی ہے۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“ وہ بولی۔ ”تم نہیں جانتے ہو کہ اس مجھے کی نگرانی پر جو لوگ مامور ہیں وہ کس قدر خطرناک ہیں۔ وہ اتنے بے رحم اور سفاک ہیں کہ قتل کر دینا ان کے لیے ایسا ہی ہے جیسا میرے اور تمہارے لیے راستے کے پتھر کو ٹھوکر مار کے ہٹا دینا...“

”بظہر حال کسی تدبیر سے میں چاہیاں حاصل کر لیتا ہوں تم پر کوئی آنچ بھی نہیں آئے گی...؟“

”اگر انہیں مجھ پر شک ہو گیا تو وہ میرے جسم کے کھڑے کھڑے کر کے کتوں کو کھلا دیں گے۔“

”تم جوزف کی کمزوری مجھے بتا سکتی ہو؟“

”ہر مرد کی کمزوری عورت ہوتی ہے۔“

”اس نے تمہیں اپنی کوٹھی میں کس لیے ملازم رکھا ہوا ہے؟“



بیجان خیز موسیقی گونج رہی تھی۔ اس سے کہیں بیجان خیز کلارا کا رقص تھا۔ میں تھوڑی دیر تک اس کے رقص سے محظوظ ہوتا رہا۔ واقعی وہ بہترین رقصہ تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ فلمی دنیا میں کیوں نہیں گئی۔

میں جب کمرے میں داخل ہوا تب کلارا نے رقص کرنا بند کر دیا تھا۔ وہ جوزف کو اپنے خوبصورت ہاتھوں سے شراب پلا رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی دونوں چونک پڑے۔ کلارا کے ہاتھ سے گلاس پھوٹ گیا۔ وہ مجھے خوف زدہ نظروں سے دیکھتی ہوئی جوزف سے چٹ گئی۔ اس نے اس وقت بہترین اداکاری کی تھی۔ جوزف کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ کیوں کہ میرے ہاتھ میں خوف ناک قسم کا ربو الور تھا۔

”کون ہو تم...؟“ جوزف گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔

”تمہارا باپ... مجھے جلدی سے اپنی تجوری کی چابیاں دے دو...“ میں نے ترختے لمبے میں کہا۔

”تم چابیاں لے کر کیا کرو گے...؟“

”میں ڈاکہ مارنے آیا ہوں... تم نے مجھے چابیاں نہیں دیں تو میں تم دونوں کو گولی مار کر چابیاں حاصل کر لوں گا۔“

جوزف سمجھدار اور حقیقت پسند تھا اس نے فوراً ہی ہتھیار ڈال دیے۔ اس نے کلارا کو اشارہ کیا۔ وہ اس کی گود سے نکل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ جوزف کے کپڑے جو صوفے پر پڑے تھے۔ اس میں سے اس نے چابیاں نکال کر میری طرف بڑھا دیں۔ میں نے چابیاں جیب میں رکھنے کے بعد کلارا سے کہا کہ وہ دو جام تیار کرے۔ اس نے فوراً میری ہدایت پر عمل کیا۔ میں نے جیب سے بے ہوشی کی دوا نکالی۔ اس میں آدھی آدھی دوا گھول دی۔

پھر میں نے جوزف سے کہا۔ ”یہ زہر نہیں ہے۔ بے ہوشی کی دوا ہے۔ مجھے قتل کرنا مقصود ہوتا تو میں گولی مار دیتا۔ میں تم دونوں کو اس لیے بے ہوش کر رہا ہوں کہ... اطمینان سے اپنا کام کر کے جاؤں۔“

پھر ان دونوں نے میرے حکم کی فوری تعمیل کی۔ صرف پانچ منٹ میں دونوں بے ہوش ہو گئے۔

پھر میں چابیوں کا کچھالے کر اس کے بیڈروم میں پہنچا۔ ایک نیم عریاں امریکی اداکارہ کی تصویر جو ایک بہت بڑے اور خوبصورت فریم میں آویزاں تھی دیوار پر لگی ہوئی تھی۔ میں نے اس تصویر کو ایک لمحے کے لیے دیکھا۔ کلارا نے مجھے بتا دیا تھا کہ تجوری اس تصویر کے پیچھے دیوار میں نصب ہے۔ میں نے تصویر اتار کر نیچے رکھ دی۔

تھوڑی دیر کے بعد تجوری کھل گئی۔ اس کے پہلے خانے میں وہ مجسمہ رکھا ہوا تھا جس کے

”اس لیے کہ اس کا دل بسلاؤں“ اس کی تمنائی دور کروں، راتیں رنگین کروں، ساقی بنوں... رقص کروں...“

”کیا اسے رقص بہت پسند ہے...؟“

”ہاں بہت زیادہ... مگر ایسا رقص جو یورپ کے ٹائٹ گلوب میں ہوتا ہے۔ میرے جسم پر رقص کے وقت ایک دھجی تک گوارا نہیں...“

”کیا تم بہت اچھا رقص کرتی ہو؟“

”ہاں... بہت اچھا“ تم دیکھو گے تو دیکھتے ہی رہ جاؤ گے۔“

”کیا ان سب لوگوں کی موجودگی میں تم رقص کرتی ہو...؟“

”نہیں... جس وقت میں رقص کرتی ہوں تب کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہوتی ہے۔ پوری کوششیں میں صرف ایک نظر ہوتا ہے وہ نیچے رہتا ہے۔ باقی دوسرے آدمیوں کو چھٹی دے دی جاتی ہے۔ اس لیے میرے رقص کے دوران وہ دل کھول کر مجھ پر نوٹوں کی بارش کرتا ہے۔ محظوظ ہوتا ہے۔ مجھے کھ پتلی بنالیتا ہے۔ پھر میں اس کے اشاروں اور حرکتوں کا نشانہ بنتی رہتی ہوں۔“

”اس تجوری کی چابیاں اس کے پاس ہوتی ہیں یا وہ کسی جگہ چھپا کر رکھتا ہے؟“

”وہ اپنے پاس ہی رکھتا ہے۔ اسے کسی پر اعتماد نہیں ہے۔“

”میرے ذہن میں ایک تدبیر ہے۔“ میں اس پر جھک کر اس کے بالوں کو سسلانے لگا۔

”تمہیں ساتھ دینا ہو گا۔“

”مجھے معاف رکھو...“ وہ خوف زدہ ہو کر بولی۔

”تم پر کوئی آج نہیں آئے گی...؟ میں تمہیں دس ہزار روپے بھی دوں گا۔“

”وہ کیسے...؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

میں نے اسے اپنا منصوبہ بتایا تو وہ خوش ہو کر بولی۔ ”میں تیار ہوں۔ یہ منصوبہ نہ صرف آسان ہے بلکہ مناسب بھی ہے۔ تم نے کیا اٹمول اور بے داغ منصوبہ سوچا ہے۔“ اس نے مجھے بے ساختہ چوم لیا۔

دوسرے دن میں اکیلا رات گیارہ بجے کوشی کے عقی جسے میں پہنچا۔ کلارا نے عقی دروازہ کھلا رکھا تھا۔ میں نے اندر داخل ہو کر اسے بند کر دیا۔ پھر میں دسے پاؤں بٹلر کے کمرے کی طرف بڑھا۔ وہ سرونٹ کوارٹر میں رہتا تھا۔ اس وقت وہ اپنی کوشی میں دی سی آر پر انتہائی فحش انگریزی فلم دیکھ رہا تھا۔ اسے قابو اور بے ہوش کرنے میں مجھے دس منٹ بھی نہیں لگے... اس وقت میں جس بہروپ میں تھا مجھے کلارا بھی نہیں پہچان سکتی تھی۔

میں جب اوپر پہنچا تو ایک کمرے میں رقص و سرور کی محفل بھی ہوئی تھی۔ کلارا کے کپڑے فرش پر بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے جو شاید اس نے ایک ایک کر کے اتارے تھے۔ ڈیک پر

عوض مجھے پانچ لاکھ روپے مل رہے تھے۔ اس کے دوسرے خانے میں ہندوستانی کرنسی اور امریکی ڈالر کے نوٹوں کے بنڈل رکھے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک لفافہ بھی رکھا ہوا تھا۔ میں نے بادل خواست لفافہ اٹھایا۔ اس میں جو کاغذات رکھے تھے انہیں دیکھا۔ یہ ان امریکی ایجنٹوں کی فہرست تھی جو سی آئی اے کے ادارے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے نام دیتے تھے۔ ان کے ناموں کے آگے رقم کا اندراج تھا۔ ان ایجنٹوں کو ہر ماہ جو رقم دی جاتی تھی وہ درج تھی۔

میں نے ہندوستانی کرنسی دیکھی جو بڑے نوٹوں کی شکل میں تھی۔ وہ دس لاکھ سے کم رقم نہ تھی۔ امریکی ڈالر پانچ لاکھ تھے۔ میں نے ایک لحظہ کے لیے سوچا کہ کیا کروں... اس رقم سے میرا مستقبل بن سکتا تھا۔ میں راتوں رات دولت مند بن سکتا تھا۔ میرا خواب پورا ہو سکتا تھا۔ اس رقم کو ہڑپ کرنے سے امریکی حکومت پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا۔ یہ رقم اونٹ کے منہ میں زیرہ تھا۔

میں نے نیک کام میں دیر نہیں کی۔ اس کمرے میں ایک بریف کیس تھا۔ اسے کھولا تو اس میں بھی امریکی ڈالر کے سو سو کے نوٹوں کی دس گڈیاں تھیں۔ میں نے اس بریف کیس میں تجوری کی ساری رقم رکھی۔ لفافہ بھی رکھ لیا۔ پھر اس جگہ سے ایک ساتھ لائی ہوئی تھیلی میں رکھا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں وہاں سے نکلا۔ سکندر اعظم نے امریکہ بھی فتح کر لیا تھا۔

میں نے دستانے پہن رکھے تھے۔ اس لیے میرے فنگر پر تمس مل نہیں سکتے تھے۔ میں سیدھا اپنے ہوٹل پہنچا۔ وہ تینوں چوبیس گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آسکتے تھے۔ میرا ذہن بڑی تیزی سے سوچ رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں اس جگہ سے نکال کر دیکھنے لگا۔ جس کی وجہ سے میں اس وقت کروڑ پتی بن گیا تھا... تھوڑی دیر کے بعد جب میں مجتے کو تھیلی میں رکھنے لگا تو جانے کیسے اور کیوں کہ اس کا سر گھوم گیا۔ اس کے سر گھومتے ہی اس کا سینہ شق ہوا۔ اس میں مجھے دو ہیرے دکھائی دیئے جو ٹیپ سے چپکائے ہوئے تھے۔ وہ اپنی قیمت آپ بتا رہے تھے۔ میں نے وہ ہیرے نکال لیے۔

میں نے استاد کو ٹیلی فون کر کے بلایا۔ نہ صرف مجھے بلکہ استاد کو بھی یہ سب کچھ خواب کی طرح لگ رہا تھا۔ استاد نے کہا۔ ”جب اوپر والا دینے پر آتا ہے تو چھپڑ چھاڑ کر دیتا ہے۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں یہ سب کچھ لے کر سیدھے بنگلور چلا جاؤں۔ کیونکہ سی آئی اے فوراً حرکت میں آجائے گی یا پھر میں بنگلہ دیش چلا جاؤں۔

میں دوسرے دن کلکتہ روانہ ہو گیا۔ تاکہ وہاں سے بنگلہ دیش چلا جاؤں۔ میں نے بوڑھے ہاروم کے ہاتھ مجھ سے کر باقی رقم لے لی۔ استاد کو دس ہزار روپے دیئے کہ وہ گلاراکو دے دئے۔ میں کلکتہ پہنچ کر ایک دلال جعفر کے ہمراہ بنگلہ دیش خیریت سے پہنچ گیا۔ مجھ پر اور میری رقم پر آج نہیں آئی۔ اب مجھے پلاننگ کرنا تھی۔

اب میرے پاس اتنی دولت موجود تھی کہ میں رضا علی سے ہر محاذ پر مقابلہ کر سکتا تھا۔ جیلہ

اور اپنے بچوں کو بھی حاصل کر سکتا تھا۔ جیسے پیسے کو کھینچ سکتا ہے۔ میں اپنی دولت سے اپنی موجودہ دولت میں بے پناہ اضافہ کر سکتا تھا۔ دولت ہو تو اور دولت کمانے کے ذرائع بھی پیدا ہو جاتے ہیں اور تھے بھی۔ وہ ہیرے جو مجتے سے برآمد ہوئے تھے وہ قدیم تھے۔ ان کی مالیت لاکھوں ڈالر سے کم نہیں تھی۔ کیونکہ اس حجم کے ہیرے نایاب تھے۔ ان میں اتنی آب و تاب تھی کہ ایک بڑا کمرہ روشن کر دیتے تھے۔ اس قدر دولت ہونے کے باوجود ابھی تک میں نے بچوں کے جھول کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا۔ میں نے کچھ سوچا نہیں تھا کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ میں جلد بازی سے اب کوئی قدم اٹھانا نہیں چاہتا تھا کہ ہاتھ ملتا رہ جاؤں۔ تقدیر نے میری بڑی مدد کی تھی۔ اس نے مجھے راتوں رات دولت مند بنا دیا تھا۔

ایک نادیہ آواز مجھ سے کہتی تھی۔ ”سکندر اعظم! تم دنیا کی ہر چیز دولت سے خرید سکتے ہو... حسین و جمیل اور نوجوان عورت کا جسم خرید سکتے ہو۔ ایک بات یاد رکھو کہ عورت کا دل اور اس کی روح نہیں خرید سکتے ہو۔ نہ تم جیلہ کو خرید سکتے ہو اور نہ اپنے بچے حاصل کر سکتے ہو۔ تم اپنی اس دولت پر بھروسہ رکھو... اللہ پر بھروسہ رکھو۔ صابر و شاکر رہو۔ اپنے گناہوں اور خطاؤں کی معافی مانگو... اسے ہر حال میں یاد رکھو۔ اس سے مدد مانگتے رہو... وہ بڑا کار ساز ہے۔“

یہ میرے ضمیر کی آواز تھی۔ میرے اندر کا سویا ہوا آدمی بیدار ہو چکا تھا۔ میں نے اللہ سے لوگالی تھی۔ اپنے آپ کو نیکریدل لیا تھا۔ میں اس کے حضور پانچوں وقت گڑگڑا کے اگلے بچھلے گناہوں کی معافی مانگتا... اس سے التجا کرتا کہ وہ کسی طرح میرے بچے مجھے دلادے۔ میرے بیٹے کی آگ سرد کر دے۔ میری خالی جھولی بھر دے۔ اس طرح میرے دل کو سکون و قرار آ گیا تھا۔ صبر اور نماز اور اس پر توکل سے بڑی چیز کوئی نہیں تھی۔ کوئی چار ماہ کے بعد ایک روز اخبار میں ایک خبر پڑھی تو میں حیرت اور خوشی سے اچھل پڑا۔ جیلہ کا شوہر جس جہاز میں لندن سے امریکہ جا رہا تھا اسے حادثہ پیش آ گیا تھا۔ وہ اس حادثے میں بچ نہ سکا تھا۔ جیلہ بیوہ ہو گئی تھی۔ پھر نجانے کیوں مجھے گھرے صدمے کا احساس ہوا۔ میں نے رضا علی کی مغفرت کی دعا کی... مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں تھی۔

میں پانچ دن کے بعد کلکتہ پہنچا تاکہ جیلہ سے مل کر تعزیت کروں۔ شامی سے کون کہ... جو قدرت کو منظور تھا وہی ہوا۔ اب کوئی رکاوٹ نہیں رہی ہے... عدت ختم ہونے کے بعد میں جیلہ کو اپنا چاہتا ہوں۔ اب اسے کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن نہ جیلہ کلکتہ میں تھی اور نہ ہی بچے۔ شامی بھی نہیں تھا۔ اس کے ایک ملازم نے بتایا کہ وہ عدت کے دن گزارنے اپنے بچوں سمیت کسی نامعلوم مقام پر چلی گئی ہے۔ وہ کہاں گئی ہے یہ کسی کے علم میں نہیں ہے۔

پھر میں واپس آ گیا۔ جیلہ کی عدت ختم ہونے کے دس دن کے بعد میں پھر کلکتہ پہنچا۔ وہ ابھی تک لوٹی نہیں تھی۔ اس کے ملازم نے بتایا کہ وہ عدت ختم ہونے کے دوسرے دن بچوں سمیت

یوسوں کی بارش کر دی۔ جب میں کچھ زیادہ جذباتی ہونے لگا تو وہ میرے بازوؤں میں کسمپاتی ہوئی بولی۔ ”بچے نہ آجائیں... وہ دوسرے کمرے میں بیٹھے ہیں۔“

میں اور جیلہ کمرے سے باہر آئے۔ میرے بچے صوفوں پر بیٹھے مکتے پھولوں کی طرح لگ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر میرا دل بے پناہ مسرت سے جھوم اٹھا۔ خون جوش مارنے لگا۔

میں ان کی طرف تیزی سے بڑھا تو جیلہ بچوں سے بولی۔ ”راہو!...! سلمان!...! یہ تم دونوں کے ابو ہیں۔“

میں نے انہیں باری باری خوب پیار کیا۔ سینے سے لگایا تو میری آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔ جذبات اٹھ اٹھے۔ میرے دل کو بڑا سکون ملا۔ فرحت سی ہوئی۔ رگ و پے میں روح دوڑ گئی۔

میں نے جیلہ کی طرف دیکھا وہ مسکرا رہی تھی۔ ساری کائنات مسکرا رہی تھی۔ میری زندگی میں چپکے سے بہار آگئی تھی۔ مجھے آخر صبر کا پھل مل گیا تھا.....

ختم شد



PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY  
www.pdfbooksfree.pk

آئی تھی۔ تین دن کے بعد وہ شامی اور بچوں کو ساتھ لے کر امریکہ چلی گئی تاکہ وہاں مستقل رہائش اختیار کر لے۔ اس نے کس شرمیں رہائش اختیار کی ہے انہیں کچھ نہیں معلوم تھا۔

مجھ پر کوئی بجلی سی آگری تھی۔ میں حوصلہ ہارنے والوں میں سے نہیں تھا۔ اب میرے پاس اس قدر دولت تھی کہ میں اسے دنیا کے چپے چپے میں تلاش کر سکتا تھا... جیلہ نے جو حرکت کی تھی محض اس لیے کہ میں اسے اور اپنے بچوں کو حاصل نہ کر سکوں۔ مجھے اس کی اس حرکت پر بڑا دکھ ہوا تھا۔ حیرت ہوئی تھی۔ اب وہ کس لیے مجھ سے انتقام لے رہی ہے؟ کیا اسے اور بچوں کے لیے سامان اور سہارے کی ضرورت نہیں ہے...؟ ایک جوان اور حسین عورت مرد کے سہارے کے بغیر کیا زندگی گزار سکتی ہے؟ کیا اسے دولت تحفظ دے سکتی ہے؟ وہ کس لیے مجھ سے اس قدر شدید نفرت کرنے لگی ہے جب کہ میرے دل میں کبھی کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ جب وہ میری بیوی تھی تب میں نے اس سے محبت کی تھی۔ اس کے خوبصورت پر شباب جسم سے نہیں۔ پھر کیوں وہ میرے سامنے سے بھی بھاگ رہی ہے؟

میں پھر واپس بنگلہ دیش آ گیا۔ پھر میں امریکہ جانے کی تیاری کرنے لگا۔ تاکہ جیلہ اور بچوں کو تلاش کروں۔ روانگی سے دو دن قبل رات کے نو بجے میں اپنے بیڈروم میں اکیلا بیٹھا حساب کتاب دیکھ رہا تھا۔ اب کچھ نہیں معلوم تھا میری امریکہ سے کب واپسی ہوگی۔ میں سارا حساب کتاب اپنے میجر کو سونپنا اور سمجھانا چاہتا تھا۔ چاہیں سنائی دیں۔ میں نے سر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ کیونکہ میرا ملازم میرے لیے چائے لے کر آیا تھا۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے اس سے چائے لانے کے لیے کہا تھا۔

وہ چائے میز پر رکھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ واپس نہیں گیا تھا۔ جیسے کوئی بات کہنا چاہتا ہو۔ میں نے ایک کانڈ پر لکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ”عبدال بابا! کیا بات ہے؟“

”میرے حضور! میں آپ کے لیے چائے لائی ہوں...!“

میں اچھل پڑا... یہی تو وہ آواز تھی جسے میں سننے کے لیے صدیوں سے تڑپ رہا تھا۔ میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ مجھے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔ میری نظروں کے سامنے جیلہ کھڑی تھی۔ پہلے تو میں نے اسے اپنی نظروں کا واہمہ سمجھ کر جھک دینے کی کوشش کی۔ کیونکہ میں اکثر جیلہ کو تصور میں دیکھتا اور اس سے باتیں کرتا تھا۔ لیکن وہ جیلہ ہی تھی۔

”جیلہ! تم...؟“ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”تم واقعی میرے پاس آ گئی...؟“

”میں سدا کے لیے تمہارے پاس آ گئی ہوں۔“ اس نے اپنا خوشنما سر ہلایا۔ ”تم جیت گئے سکندر! میں ہار گئی۔“

دوسرے لمحے وہ میرے بازوؤں کی گرفت میں تھی۔ میں نے اس کے چہرے اور ہونٹوں پر